مقالاتِ شامِ ہمدرد

۱۹۶۵-۶۶ء

مرتّبہ
حکیم محمد سعید

مقالاتِ شامِ ہمدرد

۶۶-۱۹۶۵ء

مرتبہ:

حکیم محمد سعید

ہمدرد اکیڈمی، کراچی

نامِ کتاب : مقالات شامِ ہمدرد ۶۶-۱۹۶۵ء

مرتب : حکیم محمد سعید

ناشر : ہمدرد اکیڈمی، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی ۱۸

طابع : نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد ۲، کراچی

پہلا ایڈیشن : جولائی ۱۹۸۱ء - گیارہ سو

قیمت : -/۵۰ روپے

حرفِ اوّل

افکار کے ارتقا اور علم و دانش کے پھیلاؤ کے لیے دُوسرے ذرائع کے علاوہ ایک ایسا پلیٹ فارم بھی ضروری ہے جو اجتماعی اور قومی مسائل و موضوعات کی وسعت و ہمہ گیری کا حامل ہونے کے ساتھ علمی لحاظ سے کسی خاص مکتبِ فکر کے لیے مخصُوص و محدُود نہ ہو۔ محترم حکیم محمد سعید صاحب نے شامِ ہمدرد کا آغاز و اہتمام اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے فرمایا تھا اور اَب شامِ ہمدرد ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جس کے توسط سے ممتاز دانش ور اپنے اپنے دَوائر میں اپنے ذہنی تجربات اور فکری نتائج کو مُلک کے ذہین و تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۹۶۳ء سے اب تک شامِ ہمدرد میں علمی، ادبی، سماجی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی موضوعات پر سیکڑوں مقالات پڑھے گئے۔ ۱۹۶۳ء-۶۴ کی تقاریر مقالاتِ شامِ ہمدرد جلد اوّل کے نام سے شائع کی گئی تھیں، لیکن اس کے بعد چوں کہ مختلف وجوہ سے مقالات تاریخی ترتیب و تسلسل سے شائع نہ ہوسکے اس لیے آئندہ جلد نمبر کے بجائے سلسلۂ مقالاتِ شامِ ہمدرد کو سنین سے ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ کتاب کا حوالہ سنین سے دیا جاسکے۔ مقالاتِ شامِ ہمدرد ۱۹۷۲ء (احترام) کی جلد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ زیرِ نظر جلد ۱۹۶۵ء - ۶۶ کے مقالات پر مشتمل ہے اور نہایت متنوع اور اہم موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اِس طرح مقالاتِ شامِ ہمدرد کے سلسلے کی یہ جِلد بھی پاکستان کے منتخب و ماہر دماغوں کے افکار کی ایک کہکشاں ہے جس کی روشنی میں پاکستان کے ذہنی رُجحانات اور مسئلوں پر دانش وروں کے زاویۂ نگاہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مقالات کے اس سلسلے کی ایک خصوصیت جناب حکیم محمد سعید کی زبانی ہر مقالہ نگار اور اس کی خدمات کا تعارف بھی ہے۔

علمی، طبّی، دینی، سائنسی اور ثقافتی موضوعات پر دیگر معیاری کتابوں کے علاوہ مقالاتِ شامِ ہمدرد کی اشاعت بھی ہمدرد اکیڈمی کے اشاعتی پروگرام کا ایک مستقل حصّہ ہے۔

یہ جلد اُن محترم شخصیّات کے نام معنون کی جاتی ہے جن کے مقالات اس میں شامل ہیں، مگر جو اَب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مسعود احمد برکاتی

ناظم مجلسِ تحقیق و تصنیف ہمدرد

پیش لفظ

جناب جسٹس ایس۔ اے رحمٰن۔ سابق چیف جسٹس پاکستان

اقبالؒ نے اپنی مشہور فارسی نظم "تنہائی" میں چاند سے سوال کیا تھا۔ ع

سفر نصیب، نصیب تو منزلے است کہ نیست

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی طرح، حکیم محمد سعید، صدر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، بھی سفر نصیب واقع ہوئے ہیں۔ میں نے انھیں ہمیشہ سفر ہی میں دیکھا ہے۔ کبھی جسمانی سفر میں، کبھی رُوحانی سفر میں۔ آج ڈھاکہ سے آ رہے ہیں۔ کل راولپنڈی جا رہے ہیں۔ آج لاہور میں ہیں۔ کل کراچی ہوں گے۔ ہر عارضی مقام پر ایک ماہر طبیب کی حیثیت سے جسمانی دُکھ درد کے لیے نسخے لکھ رہے ہیں اور ساتھ ہی عوارضِ ملّت کے نباضوں کو صلائے عام دے رہے ہیں کہ آئیے "شامِ ہمدرد" کو اپنے نورِ علم و عرفان سے جگمگائیے تاکہ کاروانِ ملّت کی راہِ سفر درخشاں ہو سکے اور اُس کی سمتِ منزل متعین ہو سکے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں اگر حکیم صاحب کی نسبت یہ کہا جائے کہ "خستہ شوی از مقام" تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اُن کی کوششِ پیہم کبھی قومی صحت کے منصوبے کا رُوپ دھار لیتی ہے اور کبھی ثقافتی اور دینی اقدار کے احترام کے لیے مجلس طرازی کا۔ اُن کے دنوں کا سوز اور اُن کی شبوں کا گداز ملّی تعمیر اور انسانی ہمدردی کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ ع

حکیم نکتہ دانِ ما جنوں کرد

لیکن، اس جنون کی کیفیات دیکھ کر ہر صاحبِ دل پکار اُٹھتا ہے "اللہ کرے زورِ جنوں اور زیادہ!" کیونکہ یہ ایسا جنون ہے جو قوموں کے لیے تاریخ ساز ہو سکتا ہے اور افراد کے لیے حیات افروز۔

حکیم صاحب کے رُوحانی سفر کا ایک سنگِ میل "مقالات شامِ ہمدرد" جلد اوّل کی صورت میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اس جلد میں وہ مقالات شامل تھے جو ۶۴-۱۹۶۳ پر حاوی ہیں۔ اُس جلد کی اشاعت میں راقم الحروف کی ایک حد تک ذاتی گرفتاری بھی مضمر ہے۔ کیونکہ اتفاق سے جب لاہور کے سلسلۂ تقاریب کا آغاز ہوا تو گفتارِ اوّل کا گنہگار یہی ناچیز تھا اور "شامِ ہمدرد" کا نام تجویز کرنے کی جسارت کا بھی یہی خاکسار مرتکب ہوا تھا۔ اب اُسی سلسلے کی دوسری کڑی "مقالات شامِ ہمدرد" جلد دوم کی شکل میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ یہ جلد ۶۶-۱۹۶۵ کے مقالات پر مشتمل ہے۔ حسبِ معمول اس محفلِ علم و ادب میں علمائے دین، شعرا اور ادیب، ماہرین سائنس، متخصصینِ قانون، نکتہ شناسانِ تعلیم و تدریس اور شہسوارانِ صحافت شانہ بشانہ نظر آتے ہیں۔ حکیم صاحب کے ذاتی کمالات میں وہ ملکوتی صفت بھی شامل ہے جس کے غیر مرئی دام میں لاکر وہ علم و ادب و ہنر کے تمام شعبوں کے شاہینوں کو بآسانی رام کر لیتے ہیں۔ خدا کرے کہ اس رُوحانی ضیافت کا میزبان ہمدرد فاؤنڈیشن کے اِس صدقۂ جاریہ کو بفضلہٖ قائم و دائم رکھے تاکہ فکر و نظر کے سوتے خشک نہ ہونے پائیں اور جسدِ ملّی میں ہر دم تازہ خون کی گردش اس کی صحت و سلامتی کی ضامن ہو سکے۔ "شامِ ہمدرد" کی تقریبیں اب معروف و مقبول ادارہ بن چکی ہیں اور اہلِ ذوق و شوق اُن میں شرکت کے لیے جوق در جوق تشریف لاتے ہیں اور یوں حکیم صاحب کی مساعیِ مشکور کی عملی داد دیتے ہیں۔ اِس علمی گفت و شنید کے سلسلے میں جاذبیت اور افادیت دونوں ہی قابلِ اعتنا ہیں۔ اِن تقریبات میں جہاں اہلِ کمال سے تقاضا ہوتا ہے کہ "برآور ہرچہ اندر سینہ داری"، وہیں سننے والوں کی علمی تشنگی کے اطفا اور اُن کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامانِ وافر بھی موجود ہوتا ہے۔ ایسی محفلوں کے برپا کرنے کی توفیق صرف سعید روحوں کے حصّے میں آتی ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ حکیم صاحب اس نکتہ کی روشنی میں اسم بامسمےٰ نظر آتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ میری دُعا تو یہی ہے:

خدا جنوں کا، ترے سلسلہ دراز کرے

ایس۔ اے۔ رحمٰن

لاہور
۱۵ر فروری ۱۹۷۲ء

مقالہ نما

حکیم احمد شجاع

یہ ایک حقیقت ہے کہ دہلی کے ذکر سے قلب وجگر پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کے اظہار کے لیے زبان تصورات اور تاثرات کا پوری طرح ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ مجھے بھی دہلوی ہونے اور کہلانے پر فخر ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی اسلامی ہند کی ابتدا سے تہذیب و تمدّن کا ایک مرکز بنی رہی ہے۔ دجلہ و فرات سے علم وعرفان کی جو موجیں اٹھی ہیں وہ جمنا اور گنگا ہی کے کناروں سے ٹکرائی ہیں۔ بغداد و بخارا سے جو علمی اور روحانی قافلے چلے ہیں وہ یہیں آکر ٹھہرے ہیں۔ ہندستان کا یہ دارالسلطنت رشکِ بغداد و عزّتِ مصر بنا ہوا تھا۔

یہی دلّی تھی جسے زمانے کی تند و تیز گردشوں نے غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ یہاں بہت سی تہذیبیں نمودار ہوئیں، بہت سے تمدّنوں نے جنم لیا، بہت سی قومیں آئیں اور اپنا جاہ و جلال دکھا کر رخصت ہوگئیں۔ اب دلّی کے کھنڈرات پر پھر ایک نئی بستی شاہ جہاں آباد کے نام سے تعمیر ہو رہی تھی۔

دلّی اب پھر ایک بہت بڑی شان دار اور باوقار قوم کا مرکز بن رہی تھی۔ اس ویرانے میں ایک نئی زندگی کروٹیں لے رہی تھی۔ یہ خطّہ پھر ایک نئی تہذیب، ایک نئے تمدّن، ایک نئی تاریخ کا نشیمن بن رہا تھا۔ دلّی اب سلطنتِ مغلیہ کا مرکزِ حکومت تھی۔ دیکھتے دیکھتے دلّی دنیا کا بہت بڑا پُر رونق اور پُرشکوہ شہر بن گیا۔ یہاں محلّات تعمیر ہوئے۔ کوشکوں کی بنیاد پڑی۔ باغات بنے۔ چمن بندی ہوئی۔ شان دار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مسجدوں خانقاہوں اور دانش کدوں کی بنیاد پڑی۔ لال قلعہ عالمِ وجود میں آیا جو شاہ جہانی عظمت و جلال کا حسین و جمیل مرقع تھا۔

اس دلّی نے شاہ جہاں کا جلال و جمال دیکھا۔ اس نے عالمگیری دبدبہ اور طنطنہ دیکھا۔ اس نے عالمگیر کے جانشینوں کی خانہ جنگیاں دیکھیں۔ اس نے نادر شاہ کی خوں ریزی دیکھی۔ اس نے احمد شاہ

ابدالی کے لیے اپنے دروازے کھولے۔ اسے مرہٹوں کے لشکر نے پامال کیا۔ یہیں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ اور یہیں سے انھیں دیس نکالا ملا۔

دِلّی کا لال قلعہ جب تک اس میں غدر کے سبز قدم نہیں آئے تھے اپنی گودیوں کے پالوں کے لیے سچ مچ کا گہوارہ تھا۔ ایسا گہوارہ جس میں عیشوں اور راحتوں کے سوا ہزاروں چیزیں پرورش پاتی ہیں۔ وہاں کا طرزِ تمدّن، وہاں کی معاشرت اور بولیاں ٹھولیاں سب جداگانہ تھیں۔ ہمارے باپ دادا نے وہ دَور دیکھا تھا اور ان کے بعد ان کی اَولاد کو مدتوں وہی بہار نظر آتی رہی بلکہ آج تک ان ہی کہانیوں کو کہنے اور سننے میں مگن ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ اور کچھ نہ سہی گزری ہوئی بہاروں کا ذکر بھی نہ کریں، ان کی بولیاں بھی نہ بولیں!

دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔ جب اس کا وقت آیا وہ بھی نہ رہا۔ ہاں ختم ہونے سے پہلے اس سرزمین نے ایسے ایسے لال اُگلے اور وہ گل ہائے سرسبد اُگائے جن کا ہر دانہ تاجِ شاہی کے قابل اور ہر پھول درخورِ طرّہ و دستار تھا۔

دِلّی والے ہی دِلّی کے دلدادہ نہ تھے بلکہ دل لینے والی دِلّی نے باہر والوں کے دل بھی موہ لیے تھے۔ مولانا حالی دِلّی سے اپنی شیفتگی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

دِلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
جانا کہ نہیں اب کہیں دنیا میں ٹھکانا
حالی بس اب یقین ہے دِلّی کے ہو لیے
ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اِس دیار کا

اُردو کے پہلے شاعر ولی دکنی فرماتے ہیں ع

دل ولی کا لے لیا دِلّی نے چھین

شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال کو رومتہ الکبریٰ کی عظمت دیکھ کر دلّی کی عظمت یاد آتی ہے اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلتا ہے ع

سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دِلّی یاد آتی ہے

دلّی کی داستان تو نہ ختم ہونے والی داستان ہے۔ اسے میں کہاں تک بیان کیے جاؤں گا۔ اسے آپ یہیں چھوڑیے، اور اب ادیبِ مغتنم اور صاحب قلم جناب محترم خان بہادر حکیم احمد شجاع صاحب سے ملاقات فرمایئے۔ جناب حکیم صاحب آج کی صحبت میں دہلی کی

چند ادبی صحبتوں کی یاد مناہیں گے حکیم صاحب عظمتِ دہلی کے ایک دیرینہ پرستار ہیں۔ دہلی پر اُن کی زبان و قلم سے جو بات نکلے اسے گرہ میں باندھ لیجیے، کیوں کہ اس مزاج کی اور علم و ادب میں اس گہرائی کی شخصیت آنے والا زمانہ شاید ہی پیدا کر سکے۔ دنیائے علم و ادب میں حکیم صاحب کا پایۂ مرتبت ہم بہت جانتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے حکیم صاحب کا حافظہ اس قدر زبردست ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک واقعے کو صحت کے ساتھ محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ اندازِ بیاں ایسا شگفتہ کہ آپ عش عش کر اُٹھیں۔ زبان آبِ کوثر سے دُھلی ہوئی۔ ڈرامائیت ایسی کہ بس وحد۔

حکیم محمد سعید

دہلی کی چند ادبی صحبتوں کی یاد

جناب خان بہادر حکیم احمد شجاع

جس محبت و مروت سے حکیم محمد سعید صاحب دہلوی نے مجھے اور میری ادنٰے ادبی خدمتوں کو آپ سے متعارف کیا ہے اس کے لیے میں بدرجۂ غایت شکر گزار ہوں۔ اور یہ اعتراف میرے لیے باعث مسرت ہے کہ حکیم محمد سعید صاحب دہلوی نے ہر ماہ "شامِ ہمدرد" کی تقریب میں جن ادبی مجالس کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے ایک خوش آئند فال ہیں اور ان کے ذوق شعر و سخن اور شوق سرپرستی علم و ادب کی روشن دلیل۔

میں نے آج کی تقریب میں دہلی کی جن ادبی مجالس کا ذکر کیا ہے "شامِ ہمدرد" کی تقریب ان مجالس کی یاد کو نہ صرف تازہ ہی رکھنے کا سامان بہم پہنچاتی ہے بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ شعر و سخن کی جو بساط دلی کے اُجڑتے ہی الٹ گئی تھی حکیم محمد سعید صاحب دہلوی اور ان کے رفقائے کار کے دم قدم سے لاہور میں ایک نئی رونق اور احیائے زبان اُردو کے نئے ساز و سامان سے آراستہ ہو کر پھر "جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش" ہو گئی ہے۔ خدا کرے یہ ماہانہ محفل پاکستان میں اردو زبان کی مقبولیت کا ذریعہ اور ہمارے وطنِ عزیز کی مجلسی اور ثقافتی ترقی کا وسیلہ بن جائے اور جس طرح "ہمدرد" ہمارے جسمانی آلام کو دور کرنے کے لیے گوشے گوشے میں درماں بکف ہے "شامِ ہمدرد" بھی تشنگانِ علم و

ادب کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے شربت روح افزا کا کام دے۔ مجھے یقین ہے کہ حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کی یہ کوشش کہ پاکستان اردو زبان کی نشاۃِ ثانیہ کا مرکز بن جائے ضرور بار آور ہوگی اور ان کے ابرِ کرم کی آبیاری سے گلشن اُردو پر ایک دن پھر وہی بہار آجائے گی جس کی شمیم عنبر بیز سے کبھی سوادِ ہند ہی کا نہیں بلکہ ممالک شرق و غرب کا مشامِ ذوقِ سخن سبدِ گل اور حجلۂ عروسی تھا۔

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

تعلیم کے ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد میں ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ چلا گیا اور خوبیٔ قسمت سے مجھے سرسید کورٹ میں جگہ مل گئی۔ اللہ اللہ یہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ کبھی آپ نے چراغ کو بجھنے سے پہلے دیکھا ہے؟ وہ لو بھی دیکھی ہے جو خاموش ہونے سے پہلے شمع کے قلب و جگر سے اُٹھتی ہے؟ بس یوں سمجھ لیجیے کہ علی گڑھ میں اُس وقت مسلمانوں کے اقتدار کے چراغ کی یہ آخری بھڑک تھی اور اسلامی تہذیب کی شمع کی آخری چمک۔ سرسید کے بعد نواب محسن الملک اور سید محمود اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے اور علی گڑھ کی عنانِ سیادت اسلامی عظمت کے اُس آخری سرمایہ دار کے ہاتھ میں تھی جو وقار الملک کے محبوب لقب سے آج تک مشہور ہے اور جس کی خودداری، صمیمیتِ عزم، حق پرستی اور شریعتِ اسلامی کی پابندی ہندستان میں اسلام کا آخری وقار اور ملتِ اسلامیہ کا آخری اعتبار تھیں۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خان جن کی صورت اور سیرت کی خوبیاں ملا ملک فریب اور علی گڑھ کالج کے لیے جن کا ایثار ہماری قومی روایات کا طغرائے امتیاز ہے بھیکم پور، چھتاری، دتاؤلی، پہاسو اور طالب نگر کے معزز خاندانوں کے وہ تمام نامور افراد جن کی ذاتی سخاوتوں اور خاندانی فیاضیوں کا احسان علی گڑھ کالج کی گردن پر ہے اور ہمیشہ رہے گا، دن رات اس کوشش میں مصروف تھے کہ علی گڑھ کالج کو مسلمانانِ عالم کا ایک عظیم الشان تعلیمی مرکز بنا دیں۔ اور اس عظیم درس گاہ کو ایک مستقل اور آزاد اسلامی یونیورسٹی کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔

مسٹر محمد علی (آکسن) اور اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی جو بعد میں اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے ہندستان کی سیاسیات کے رہنما ہوئے، سرکاری ملازمت کی پابندیوں کو

اپنے حسب حال نہ پاکر اپنے اپنے بلند مرتبت عہدوں سے سُبکدوش ہو چکے تھے اور اب علی گڑھ میں مقیم تھے۔ مولانا شوکت علی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے بھُوس والے بنگلے کے قریب ایسوسی ایشن کے دفتر میں رہتے تھے اور مسٹر محمدؐ علی ممتاز ہاؤس کے قریب ایک چھوٹے سے کچے بنگلے میں اقامت گزیں تھے۔

مسٹر محمدؐ علی خود بھی شاعر تھے اور کالج کے طالب علموں میں شعروسخن کا ذوق پیدا کرنے کے شائق۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ وہ اپنے بنگلے میں مجلسِ مشاعرہ کا اہتمام کرتے، جس میں وہ خود بھی اپنی تازہ غزل پڑھتے اور مولانا حسرت موہانی بھی اپنا کلام سناتے۔ ان کے علاوہ کالج کے ایسے طلبہ، جنھیں سُخن فہمی اور سُخن گوئی کا دعویٰ تھا اس مجلس میں شریک ہوتے۔ میں بھی اس بزمِ مشاعرہ میں اکثر حاضر ہوتا تھا اور یہ دیکھ کر خُوش ہوتا تھا کہ محمد علی جوہر اور حسرت موہانی جیسے اُستادانِ فن کالج کے طلبہ کا دل بڑھانے میں بڑی فیاضی سے کام لیتے ہیں اور شاعری کو محض بے کاروں کا مشغلہ سمجھنے کی جگہ اسے طلبہ کے ذہنی نشوونما اور ان کی ادبی تربیت کا ایک ضروری عنصر خیال کرتے ہیں۔

اس مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُن اولڈ بوائز کو بھی اس بزمِ شعروسخن میں کھینچ لاتی، جنھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی اپنے حلقۂ اثر میں اس صنفِ ادب میں بڑے بڑے میدان مارے تھے۔

اِنھیں مجالسِ مشاعرہ میں وقتاً فوقتاً محمدؐ علی جوہر نے اپنی وہ غزلیں پڑھیں جو بعد میں زبان زدِ خاص وعام ہوئیں اور جن کے چند اشعار مجھے اب تک یاد ہیں:۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اور پھر!

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اور اس کے بعد!

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسی مشاعرے کی ایک مجلس میں حسرت موہانی نے ایک غزل پڑھی جس کے دو شعر سن لیجیے۔ ان میں فیدِ فرنگ کے آلام کی یاد صاف جھلکتی تھی :-

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہے سو دُکھ دے لو کچھ اور بھی کُھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

یہ وہی زمانہ ہے جب جنگِ بلقان نے مسلمانانِ عالم کے دل میں ایک ہیجان و تلاطم برپا کر دیا تھا اور ہر قومی ادارہ وفورِ غیرت اور ہجوم دردِ ملت سے ایک محشرستان بن رہا تھا۔ ہاشمی فریدآبادی نے، جو اُس وقت کالج میں پڑھتے تھے، جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے میڈیکل مشن کو عساکرِ قاہرہ ترکیہ کے زخمیوں کی امداد کے لیے روانہ ہوتے دیکھا تو اپنا وہ مشہور نعرۂ مستانہ جس نے کالج کے لڑکوں کی زبان پر ایک ترانے کی صورت اختیار کر لی تھی بلند کیا۔

لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل!

یہ ترانہ کوئی نغمہ نہ تھا بلکہ اس سیلِ جذبات کا ردِ عمل تھا جو ایک دردمند دل کی گہرائیوں سے ایک چیخ بن کر نکلا تھا۔

اس زمانے میں حضرت صفی لکھنوی علی گڑھ تشریف لائے اور اس مشاعرے کی ایک مجلس میں شریک ہوئے۔ اس میں انھوں نے اپنی وہ مشہور غزل پڑھی جو حقیقت میں غزل نہ تھی بلکہ اسلامی روح کا ترجمان ایک رجز تھا جس کے اس ایک شعر کو کالج کے طلبا ایک عرصے تک پڑھ پڑھ کر ہر اُس طاقت کو جو ملتِ اسلامیہ سے متصادم ہونے کا عزم رکھتی تھی، ایک چیلنج دیتے رہے :-

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

غرض میری طبیعت میں شعر و سخن کے جس ذوق کی آبیاری اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں مولوی سید احمد کبیر جیسے استاد نے کی تھی وہ اب پھول پھل لانے لگا۔ شعر تو میں اسکول کے

زمانے ہی میں کبھی کبھی کہہ لیتا تھا مگر جب اردو زبان کی قدرتِ اظہار کو ان غزل سرا ساحروں کے اشعار میں ایک جادو اور اعجاز کی صورت میں ڈھلتے دیکھا، تو میرے دل میں بھی غزل لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

اس زمانے میں دہلی کے ایک مشہور رئیس نواب غلام محمد حسن خان کے صاحب زادے ممتاز حسن خان سرسید کورٹ میں میرے ہی کمرے میں رہتے تھے۔ میں جب کبھی علی گڑھ سے لاہور آتا تو وہ میرے ساتھ آتے اور مجھے ضرور ایک دو روز کے لیے دہلی میں اپنے دولت کدے پر ٹھہرا لیتے۔ اُن کا مکان مٹیا محل میں تھا۔ اور صدر الصدور کی حویلی کہلاتا تھا۔ غدر کے زمانے میں یہ حویلی قاضی القضاۃِ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ کی اقامت گاہ تھی۔ میں ممتاز حسن کے مکان میں اس لیے بھی بڑے شوق سے ٹھہرا کرتا تھا کہ جو کمرہ انھوں نے میرے رہنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، اس میں کبھی مرزا غالب رہا کرتے تھے۔ ممتاز حسن کے والد نواب غلام محمد حسن خان شاہ عالم ثانی شہنشاہ ہند کے دربار کے ایک معزز منصب دار، نواب رکن الدولہ کے پوتے اور مرزا غالب کے مشہور ہم عصر نواب مصطفےٰ خان شیفتہ والیے جہانگیر آباد کے داماد تھے۔ ان کے اوضاع و اطوار میں پرانی وضع داری تھی اور رہنے سہنے کے طریق میں نئے تمدن کا رنگ۔ مزاج میں سادگی تھی مگر گھر میں نوابی کے ٹھاٹھ تھے۔ اپنی پیرانہ سالی اور میری کم عمری کے باوجود مجھے "حکیم صاحب" ہی کہتے تھے۔ یہی وہ پاسِ وضع اور کلچر تھا جس کا ماتم آج دِلّی کے گھر گھر میں ہو رہا ہے۔

ہم جب کبھی دِلّی آتے تو ہمارے ایک بہت ہی عزیز دوست مولانا سُہا بھی ہمارے ساتھ آجاتے۔ ان کی عمر تو کچھ ایسی نہ تھی مگر علم و فضل کی بزرگی ان کے قدم چومتی تھی اور تقریر و تحریر میں ان کو وہ مہارت حاصل تھی کہ بڑے بڑے کُہنہ مشق ادیب ان کے سامنے طفلِ نوآموز نظر آتے تھے۔ وہ بہت پست قامت، لاغر اور نحیف البدن تھے مگر خدا نے تمام جواہرِ کمال ان میں کُوٹ کُوٹ کر بھر دیے تھے۔ اکثر لوگ انھیں دیکھ کر ایک طفلِ صغیر سن کا دھوکا کھا جاتے تھے۔ مگر جب ان کے چہرے کی متانت اور آنکھوں کی فراست پر نظر جا پڑتی اور پھر جب تفکر و تدبر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور غور و خوض کی کٹھالی میں نکھرے ہوئے وہ الفاظ سنائی دیتے جو کبھی رُک رُک کر اور کبھی ایک بلا خیز روانی کے ساتھ اُن کے منہ سے نکلتے تھے، تو دیکھنے اور سُننے والے اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین کرنے میں متامل نظر آتے تھے۔ غزل میں ان کا مسلک غالب سے ملتا جلتا تھا اور نثر

میں اُن کے اُسلوبِ نگارش میں ابوالکلام آزاد کی تحریر کے رنگ ڈھنگ کا پرتو نظر آتا تھا۔ اُن کی سُخن طرازی کی عظمت کا اندازہ اُن کے اِن دو چار اشعار سے ہو سکتا ہے:۔

رہ گئے ہم آخر کو، سادگی اُمیدوں کی!
اِس قدر بھی اے ہمت حوصلہ نہیں کرتے

جو نظر اُٹھاؤ تو سامنے وہی ایک پیکرِ ناز ہے
یہ طلسمِ حُسنِ خیال ہے کہ درِ صنم کدہ باز ہے
مجھے ہاں جنوں ہے، مگر ذرا سرِ بزمِ عام نہ چھیڑنا
کہیں لوگ یہ نہ گماں کریں کہ تری ہنسی کوئی راز ہے

آرزو کے کھیل میں دل خراب ہو گیا
جذبۂ سرورِ جاں اضطراب ہو گیا
ان کی مہربانیاں شب کا خواب ہو گئیں
روز رات کاٹنا اِک عذاب ہو گیا

رفتہ رفتہ میرے مراسم دوستی دہلی کے کئی گھرانوں سے ہو گئے، مگر ان میں تین گھرانے ایسے تھے جن کے دروازے میرے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ مٹیا محل میں ممتاز حسن کا گھر۔ چوڑی والوں میں ظہیر شمس کا گھر اور پنڈت کے کوچے میں مشتاق احمد زاہدی کا گھر، مشتاق احمد زاہدی کے بڑے بھائی منشی نثار احمد بہت دنوں تک پنجاب میں منصفی کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اس لیے عام وخاص میں منصف صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ فہم ان کی محبت بے پایاں کے ادراک سے قاصر اور قلم اس مخزنِ احسان و مروّت کے مکارم بیان کرنے سے عاجز ہے۔ راگ رنگ کے شیدائی، اللہ والوں کے نیازمند، دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے۔ پنشن اور جائیداد کا کرایہ اور وہ سب کچھ جو انھیں کسی طرح بھی میسر آ سکتا تھا دوستوں کی خاطر مدارات میں اڑا دیتے تھے اور خاطر مدارات بھی ایسی نہیں کہ جو ان کا جی چاہے مہمان کو کھلائیں بلکہ جو کچھ مہمان کھانا چاہے وہی بہم پہنچایا جاتا تھا۔ خود کرایہ خرچ کر کے ادیبوں اور شاعروں کو دُور دُور سے بلوالیا کرتے تھے اور اس وقت تک دلّی سے واپس نہ جانے دیتے تھے جب تک یہ سب لوگ یکے بعد دیگرے ان کی آنکھ بچا کر یا کسی نہ کسی ناگزیر ضرورت کا بہانہ کر کے نہ چلے جاتے۔ افسوس! آج نہ تو وہ خود زندہ ہیں نہ مشتاق احمد زاہدی ہی اس دنیا میں موجود ہیں۔ اور انھیں پر کیا موقوف ہے پنڈت کا کوچہ ہی اجڑ گیا اور جس دہلی کا میں رونا

رو رہا ہوں وہ دہلی ہی برباد ہوگئی۔

انھیں منصف نثار احمد کی وساطت سے مجھے دودمانِ شریف خانی کے وارث اکبر اور کوکب اقبال حضرت مسیح الملک حکیم اجمل خان کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور انھیں کی بدولت میری رسائی ان لوگوں تک ہوئی جو دلی کی پرانی عظمت کی یادگار تھے اور جن میں سے اکثر تنگ دستی اور نامساعداتِ روزگار کے باوجود اپنی پرانی وضع داری کو نبھائے چلے جا رہے تھے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

ذوقِ تماشا نے ان لوگوں کی محفلوں میں نظارۂ جمال اور سرورِ نغمہ سے وہ کیف حاصل کیے کہ اب تک یہ پتہ نہیں چلا کر آیا جوانی سے رنگی ہوئی نگاہ میں اتنا حسن تھا کہ اسے ہر چیز خوب صورت نظر آتی تھی یا وہ مناظر ہی اتنے دل فریب تھے کہ انھوں نے اپنا حسن، نظر کو مستعار دے دیا تھا۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کے احباب میں خواجہ غلام نصیر الدین ایک با ارادت اور صفاکیش رئیس تھے۔ وہ نواب بڈھن نظامی کے لقب سے مشہور تھے اور چتلی قبر کے سامنے رہتے تھے۔ ان کا مکان اب تک نواب بڈھن کا کمرہ کہلاتا ہے۔ ان سے میرا تعارف خواجہ حسن نظامی ہی نے کیا اور پھر ان کی معرفت مجھے نواب شجاع الدین خان تاباں اور ان کے چھوٹے بھائی نواب سراج الدین خان سائل کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔

نواب غلام محمد حسن خان کے ملنے والوں میں نواب فیض احمد خان پرانی وضع کے ایک کہنہ سال اور شریف و نجیب بزرگ تھے۔ ان سے اور حضرت بیخود سے میری ملاقات نواب صاحب ہی کے دولت کدے پر ہوئی۔ ان تمام مراسمِ عقیدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلی میرا دوسرا وطن بن گئی اور میں جن صحبتوں کی تلاش میں تھا مجھے میسّر آگئیں۔

اللہ اللہ! یہ کیسے لوگ تھے۔ غریب پروری ان کی کنیز اور دوست نوازی ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ ان کی دولت صرف اس لیے تھی کہ غریبوں کو امیر بنائے اور ان کی شان و شوکت صرف اس لیے تھی کہ فقیروں کا رتبہ بڑھائے۔ ان کی چشمِ التفات ہر کس و ناکس کے لیے وقف اور ان کا دل ہر دردمند کے درد کے لیے درماں بکف تھا۔ ان کا خوانِ نعمت دن رات مہمانوں کے انتظار میں چشم براہ رہتا تھا۔ فراوانیٔ دولت نے انھیں مائلِ تکبر نہ کیا۔ ازدیادِ جاہ و حشم کے ساتھ ساتھ ان کی گردن کا خم اور بڑھتا چلا گیا۔ چھوٹوں پر اتنی شفقت کہ ادب کا دھوکا ہونے لگے، بڑوں کی اتنی عزت کہ نمائش کا گمان ہو۔ گفتار میں ایسی شیرینی کہ سننے والوں کے کان کانِ حلاوت

بن جائیں۔ رفتار میں ایسی نرمی کہ زمین پر پاؤں کا نقش نہ جمے۔ آنکھوں میں آنسو، آواز میں رقّت، کمر میں خم، مگر بات کے پکے، ارادے کے دھنی اور قول و قرار میں چٹان سے زیادہ استوار۔ پرانی تہذیب کے ان پرستاروں کی کس کس خوبی کا ماتم کیا جائے اور شرافت اور عظمت کے ان نایاب خزانوں کو اب کس کھنڈر میں تلاش کیا جائے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

غرض اب میں کبھی تو نواب بدھن نظامی کی مجلس میں تصوف اور ملفوظاتِ خواجگان چشت کے معارف سنتا، کبھی حضرت مسیح الملک کے دولت کدے پر حضرت تاباںؔ، حضرت سائلؔ اور حضرت بیخودؔ کے کلام سے ذوقِ سخن کی تشنگی بجھاتا، کبھی نواب غلام محمد حسن خان کے دیوان خانے میں نواب فیض احمد خان، میر باقر علی داستان گو اور ان کے دوسرے کہنہ سال دوستوں سے اس اجڑے دیار کی بربادی کے افسانوں کو چشمِ عبرت کا سُرمہ بناتا جس کا ماتم میرؔ نے ان تین اشعار میں کیا تھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
بستے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

جب ان سنجیدہ محفلوں سے طبیعت اُکتا جاتی تو میں اُنھیں منصف نثار احمد صاحب کے گھر جاکر ابو محمد، مشتاق احمد زاہدی، حضرت بیدلؔ اور ڈاکٹر سید محمد جیسے بے تکلف دوستوں کی تصنّع سے بری اور ریا سے پاک صحبتوں سے لطف اٹھاتا اور کبھی سلطان جی کی درگاہ پر حاضر ہو کر خواجہ حسن نظامی کے رین بسیرے کی محافلِ سماع میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے حضرت مسیح الملک کے دولت کدے پر حضرت تاباںؔ حضرت سائلؔ اور حضرت بیخودؔ تشریف رکھتے تھے۔ میں بھی اس مجلس میں حاضر تھا۔ یہ مشاعرے کی سی ایک مختصر بزم تھی۔ سب نے ایک مصرعِ طرح پر اپنی اپنی غزل پڑھی۔ حضرت سائلؔ کا یہ مشہور شعر ان کی اسی غزل کا مقطع ہے:۔

ارادہ تھا کہیں پردیس میں کچھ مانگ کھائیں گے — مگر قسمت میں تھے سائلؔ جہان آباد کے ٹکڑے

حضرت تاباں کا اسی زمین میں یہ شعر مجھے اب تک یاد ہے:۔

برُی ہوتی ہے کیفِ بادہ کی لکنت کہ ہوتے ہیں
زباں سے تا بہ لب آتی ہوئی فریاد کے ٹکڑے

اس مصرعِ طرح پر میں نے بھی ایک غزل کہی تھی جس کے یہ دو اشعار سب کو پسند آئے:۔

خطا کی ان کو چاہا ہاں نہ یہ جانا کہ ہوتے ہیں
یہ ظالم حُسن والے سنگدل فولاد کے ٹکڑے

سزا یہ دی دلِ ناشاد کو جُرمِ محبّت کی
ملائے خاک میں اس خانماں برباد کے ٹکڑے

"فولاد کے ٹکڑے" کی بندش کی حضرت تاباں نے بڑی داد دی اور کہا کہ تم ضرور غزل لکھا کرو اور مجھ سے اصلاح لیا کرو۔ یہ سعادت مجھے نصیب تو ہوئی مگر اتنی نہیں جس قدر وہ چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری طبیعت کو محض قافیہ پیمائی اور ردیف آرائی سے کچھ ایسی مناسبت ہی نہ تھی۔

اس مقام پر یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ جب حضرت مسیح الملک کے دولت کدے پر یہ مجلس مشاعرہ ان کے ان احباب تک محدود نہ رہتی جنھیں ان سے بہت ہی قرب کا تعلق تھا تو وہ کبھی اپنا کہا ہوا کوئی شعر نہ سناتے۔ ویسے بھی وہ بہت متین اور کم گفتار تھے اور وضع داری کا رکھ رکھاؤ ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ مطب میں بھی جب وہ اپنے شاگردوں سے کوئی نسخہ لکھواتے تو کوئی دوسرا شخص ان کی آواز نہ سن سکتا تھا۔ اس طرح جب وہ کوئی شعر یا غزل پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے لوگوں کو سنانے کے لیے نہیں پڑھتے بلکہ اپنے کسی تصوّر کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ نہ تو وہ خود کسی کے شعر کی داد دیتے اور نہ کسی کی داد یا تعریف کے طلب گار نظر آتے۔ بایں ہمہ ان کے شعر کا معیار بہت بلند اور ان کے تخیل میں ایک ایسی ندرت تھی جو ان شاعروں کے کلام میں اکثر مفقود ہوتی ہے جو شعر گوئی کو روزمرہ کا معمول بنا لیتے ہیں۔ میں نے سیاسی مجلسوں میں بھی انھیں تقریر کرتے سنا۔ جو بات بھی کرتے بہت مختصر مگر بہت جامع۔ ان کی طبیعت ایک ایسا قلزم ذخار تھی جس کی تہ میں طوفان اٹھتے تھے مگر سطح پر سکون طاری رہتا تھا۔ وہ شیدا تخلص فرماتے تھے اور ان کا اسلوبِ اظہار اردو زبان کے اشعار میں اُردو زبان کے پرانے اساتذہ اور فارسی زبان کے اشعار میں ایران کے پرانے اساتذہ کا تھا۔ ان اشعار سے ان کے اندازِ فکر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اب کہاں وہ میکدے میں شب کی بزم آرائیاں
اک سبو باقی رہا ہے وہ بھی کچھ ٹوٹا ہوا

مے کدے میں شیخ کو دیکھا مگر
میں گیا اندر تو وہ باہر چلے

چارہ گر پھر لخت ہائے دل بہم کرنے کو ہے
وہ ستم ایجاد شاید پھر ستم کرنے کو ہے

نہاں در سینہ دارم آفتابِ داغِ سوزاں را
بیا اے شعلہ رو بنگر چراغ زیرِ داماں را

اے خوشا وقتے کہ من از بہرِ تقدیم نیاز
ہم جبینے داشتم ہم آستانے داشتم

امیدم در دل و دل در برم مستانہ می رقصد
مگر مے در خم و خم در برِ مے خانہ می رقصد

یہ بڑی نا احسان مندی ہوگی اگر میں یہاں اس دودمان عالی کے ایک دوسرے رکن رکین حاذق الملک حکیم محمد احمد خان کا ذکر نہ کروں جن کے دولت کدے کی بالائی منزل پر اوقات مطب کے بعد ادیبوں، شاعروں اور بڑے بڑے علما کا جمگھٹا رہتا تھا۔ میں کئی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہمیشہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ نسخہ لکھتے وقت کسی مریض کے علاج ہی کو مدِ نظر نہیں رکھتے بلکہ اس کے مرض کے کم و کیف پر تبصرہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ انھیں طب کے علاوہ دینی اور دنیاوی علوم میں ایسا تبحر حاصل تھا کہ کوئی شخص فراوانی علم کے باوجود ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔ گرمی کا موسم ہو یا سردی کا موسم، صبح کا وقت ہو یا شام کا وقت، میں نے حکیم محمد احمد خان کو کبھی کمرے میں بیٹھے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے مکان کی بالائی منزل کے صحن میں ایک تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ وہیں مریضوں کو دیکھتے تھے اور وہیں اپنے ادبی مشاغل کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ ہاں ان کی مجالس میں شعر و شاعری کو باریابی حاصل نہ تھی۔ زیادہ تو دینی مسائل پر گفتگو ہوتی یا صرف و نحو کے عقدے حل کیے جاتے۔ اگر اس مجلس میں کوئی شعر پڑھا بھی جاتا تو محض اس مقصد کے لیے کہ اردو زبان کے کسی محاورے کی تحقیق یا اس کے جائز استعمال کی تصدیق ہو سکے۔ یہ صحبتیں تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کے لیے کوثر و سلسبیل کا کام دیتیں۔ اللہ اللہ عقل و دانش کے کیا کیا بے بہا موتی تھے جو ان صحبتوں میں لٹائے اور رولے جاتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت ابوالکلام آزاد بغرض علاج حکیم صاحب کے پاس تشریف لائے۔ اس زمانے میں انھیں سوءِ ہضم کی شکایت تھی۔ حضرت حاذق الملک نے تشخیص کے بعد ان کے مرض کو اسہال کبدی سے تعبیر کیا۔ اتنے میں کسی والیٔ ریاست کے ایک معتبر مصاحب بھی آگئے اور انھوں نے کہا، ”بیگم صاحبہ کو درد شقیقہ کی شدت کے باعث رات بھر نیند نہیں آئی۔“ درد کا قصہ تو رہا ایک طرف مولانا ابوالکلام آزاد معاً بول اُٹھے، ”بیگم کے ساتھ صاحبہ کا استعمال غلط ہے۔ بیگم صاحب کہیے۔ لقب میں تذکیر و تانیث کی تمیز جائز نہیں۔“ اس پر بحث چھڑ گئی تو ابوالکلام آزاد نے مسکراتے ہوئے کہا، ”تو جناب بیگم صاحبہ فرمایئے۔“ سب لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اس پر حکیم صاحب نے جو ابھی تک چپ چاپ بیٹھے تھے اپنا قطعی فیصلہ صادر فرمایا کہ ”مولانا درست فرماتے ہیں۔ خطاب اور لقب میں تذکیر و تانیث کی تمیز روا نہیں۔ آپ نے نواب شاہ جہاں بیگم حکمران بھوپال کے القاب ملاحظہ نہیں فرمائے؟ بیگم صاحب ہی کہنا چاہیے۔“ یہ بحث اس گرما گرمی سے ہوتی رہی کہ مولانا سوءِ ہضم کی شکایت بھول گئے اور حکیم صاحب اسہال کبدی کی تشخیص، نواب صاحب کا وہ بے چارہ مصاحب جو بیگم صاحب کے درد کی درماں طلبی کے لیے آیا تھا سوچتا ہوگا کہ وہ اس تذکیر و تانیث کے کس مرض میں مبتلا ہو گیا۔ آخر کار وہ چلّا اٹھا ”حضور! بیگم صاحب کو رات بھر نیند نہیں آئی۔“ سچ ہے علم و فضل کی دوکانیں تو سب ہی دانش فروش سجا لیتے ہیں مگر علم کی باریکیوں کا فہم کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

منصف صاحب کے مکان پر بھی کبھی کبھی شعر و سخن کی محفل جم جاتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے ہاں کلکتے کے ایک شاعر تشریف لائے۔ صولت تخلص کرتے تھے۔ ان کا سلسلۂ حسب و نسب مرشد آباد کے شاہی خاندان سے اور سلسلۂ تلمذ حضرت میر انیس کے تلامذہ سے جا ملتا تھا۔ وہ آئے تو منصف صاحب کے مکان پر شاعروں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ ایک دن حضرت صولت نے اپنی ایک غزل پڑھی جس میں ”اکثر“ قافیہ اور ”ٹانکے“ ردیف تھی۔ سب سے اس طرح پر غزل لکھنے کو کہا۔ میں نے بھی ایک غزل لکھی جس کے مقطع کا یہ شعر انھیں بہت پسند آیا:

فرقتِ یار میں رو رو کے بہت دن ساحر
ہم نے دامانِ شبِ تار پہ گوہر ٹانکے

یہ سن کر ایک صاحب نے فرمایا کہ میاں دن میں "شب تار" کہاں ہوتی ہے؟ حضرت صولت نے کسی قدر خشمگیں انداز سے جواب دیا "اب دلی والے بھی اُردو بھول گئے؟ لڑکا ٹھیٹھ اُردو زبان لکھ گیا ہے۔"

اسی طرح ایک دن نواب بدرالدین کے دولت کدے پر کچھ باخدا لوگوں کی محفل گرم تھی اور گناہ و ثواب کا ذکر ہو رہا تھا۔ سوال یہ درپیش تھا کہ آمرزشِ گناہ کے لیے کون سا وظیفہ کارآمد ہے۔ ایک بزرگ نے جن کی آواز میں بڑی رقت تھی فرمایا "آنسو"۔ میں نے یہ نکتہ اس وقت اس شعر میں موزوں کر کے پیش کیا:۔

پروئے آنسوؤں کے چند دانے تارِ مژگاں میں
اسی تسبیح پر دن رات استغفار پڑھتا ہوں

سب خوش ہوئے اور وہ بزرگ غالباً میری کم عمری کے پیشِ نظر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ چند خوش مذاق لوگ نواب غلام محمد حسن خان کی حویلی کے اُس کمرے میں جمع ہو گئے جس میں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میر باقر علی داستان گو نے ایک شعر پڑھا جس کا قافیہ "رہزن" تھا اور ردیف "دوست" تھی۔ پھر فرمایا "کسی زمانے میں دلی والے ایسے شعر کہا کرتے تھے۔" میں نے کہا "اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کر دوں!" نواب فیض احمد خاں نے فرمایا "کہیے۔" میں نے برجستہ یہ شعر کہا۔

میرے سینے میں ہے دل یا کوئی مارِ آستیں
رہ کے پہلو میں میرا دشمن ہے اور دشمن کا دوست

سب نے بہت تعریف کی۔ میر باقر علی نے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ میرزا غالبؔ کا فیض ہے"

اس زمانے میں طبیعت اس قدر موزوں تھی کہ جو بات بھی مُنھ سے نکلتی تھی شعر بن جاتی تھی یا یوں کہیے کہ طبیعت شعر کی سرزمین میں نئی نئی راہیں نکال رہی تھی۔ مگر ابھی تک مذاق کی شستگی سے محروم تھی۔ یہ انھیں بزرگوں کا فیض ہے جن کا ذکر عنوان بیان ہے کہ ہر چند میں ان کا ہم پلہ یا ہم عمر نہ تھا انھوں نے محض نیاز مند نوازی کو ملحوظ خاطر رکھ کر مجھے اپنی مجلسوں میں جگہ دی اور جب میں نے کوئی غزل پڑھی تو میری حوصلہ افزائی فرمائی اور میرے اشعار کی داد دی۔ ان بزرگوں کے اشعار کے ساتھ ساتھ میں جو اپنے اشعار سنا رہا ہوں اس کا مقصد نہ تو تعلی ہے نہ اُن "حریفانِ مئے مرد افگن شعر و سخن" کی برابری کا دعوےٰ۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ہیروں کے بینا بازار میں کنکر سجائے۔

دہلی آنے جانے کا سلسلہ جو ۱۹۱۲ء سے شروع ہوا تھا ۱۹۴۵ء تک برابر جاری رہا اور اس عرصے میں دہلی کی ادبی صحبتوں کے میں نے کئی دور دیکھے۔ ایک دور تو وہ تھا جب مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ سے دہلی آکر اپنا مشہور اخبار "کامریڈ" جاری کیا اور کوچہ چیلاں میں ڈیرے جما دیئے۔ اس اخبار کی اشاعت تو ان کا ایک سیاسی مشغلہ تھا مگر ان کی یہ مصروفیت ان کے ادبی مشاغل میں کبھی حائل نہ ہوئی۔ ان کے وسیع کمرے میں جسے انھوں نے اپنے شائستہ مذاق کے مطابق خالص مشرقی طرز میں سجا رکھا تھا ادبی محفلوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ آصف علی مرحوم جو کوچہ چیلاں ہی میں رہتے تھے اور جنھیں مولانا محمد علی سے دلی وابستگی تھی ان محفلوں کی روح رواں تھے۔ ہر لحاظ سے ان کا مذاق بہت شستہ تھا اور جب کبھی وہ شعر کہتے تو اپنے اشعار میں ہندی الفاظ کے نگینے اس طرح جڑتے جیسے منبت کاری کا کوئی ماہر فن بے جان پتھر کی زمین میں جواہر ریزوں سے ایک گلشن نوبہار کی داغ بیل ڈال رہا ہو۔ ان کے تخیل پر مغربی تصورات کا اثر غالب تھا مگر انداز بیان میں مشرقی پرکاری صاف جھلکتی تھی۔ ان کا ایک شعر اس وقت یاد آگیا ہے جو انھوں نے کسی حسین دوشیزہ کو ریل میں سفر کرتے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا تھا:-

ماتھے پہ بندی آنکھوں میں کاجل
ریل میں آیا کہاں سے آہو!

مرزا محمد سعید انگریزی لٹریچر کے مشہور پروفیسر جوان دنوں طویل رخصت پر دلی آئے ہوئے تھے اور کوچہ چیلاں ہی میں رہتے تھے وہ بھی ان محفلوں میں شرکت فرماتے۔ میں بھی جب کبھی دلی آتا تو اس بارگاہِ علم و ادب میں ضرور حاضری دیتا اور اپنے ذوق ادب کو سان پر چڑھاتا۔ قاضی عبدالغفار، مولانا راشد الخیری، شیخ محمد اکرام جنھوں نے سر عبدالقادر کے بعد "مخزن" کی عنان ادارت سنبھالی تھی اور اس وقت اپنے رسالے "عصمت" کی اشاعت کے سلسلے میں دلی میں مقیم ہو گئے تھے، راجہ غلام حسین جنھیں "کامریڈ" کی ترتیب و تدوین میں مولانا محمد علی جوہر کے دستِ راست ہونے کا شرف حاصل تھا اور محمد شعیب قریشی جن کا دنیا بھر میں محمد علی جوہر کے سوا کوئی آئیڈیل نہ تھا۔ جب کبھی اس محفل علم و ادب میں مل بیٹھتے تو علم و ادب کی کوئی صنف ایسی نہ تھی جس کو وہ اپنے رشحات فکر و قلم کی گل کاریوں سے باغ و بہار نہ کر دیتے۔

دوسرا دور وہ تھا جب حضرت خواجہ حسن نظامی نے حلقہ نظام المشائخ قائم کیا اور غالباً ان کے ایما پر ملا واحدی صاحب نے جن کو حضرت خواجہ حسن نظامی سے بڑی ارادت تھی، اپنا مشہور رسالہ "نظام المشائخ" جاری کیا۔ اس زمانے میں حضرت خواجہ حسن نظامی دن رات اسی سعی پیہم میں مصروف رہتے تھے کہ ملک بھر کے تمام مشائخ کو ایک مرکز پر لے آئیں تاکہ

تصوّف کے وہ انوار جو مغربی تصورات کی سیاہ گھٹاؤں میں دھندلے پڑ گئے تھے پھر اپنی نور افشانی سے نہ صرف اہلِ تصوّف کے قلب ہی کو منوّر کر دیں بلکہ اپنی برق پاشی سے مادیت کے اس سحر باطل کو زائل کر دیں جس نے انسان کی روحانیت اور روح کی انسانیت کو بہیمیت کے ڈگر پر چلا رکھا تھا۔

اب حضرت خواجہ حسن نظامی کے رین بسیرے میں مشائخ اور علمائے دین کا اجتماع رہتا۔ اگرچہ ان کے مباحث کا موضوع زیادہ تر دینی افکار اور روحانی تصرفات ہی تک محدود ہوتا مگر دورانِ گفتگو میں ایسے ایسے علمی اور ادبی نکات سننے میں آتے جو جہاں ان لوگوں کے علم و فضل پر دلالت کرتے وہاں سننے والوں کے لیے بھی فردوسِ گوش بن جاتے۔

میں اس سلسلے میں کئی بار حضرت خواجہ حسن نظامی کے ساتھ ملّا واحدی صاحب کے ہاں بھی حاضر ہوا وہاں بھی وہی رین بسیرے کا سا سماں ہوتا اور علمائے دین اور مشائخ رسالۂ نظام المشائخ کو کامیاب اور مقبول عام بنانے کے لیے طرح طرح کے ادبی اور علمی مضامین پر جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ تصوّف سے ہوتا اپنے تاثرات بیان کرتے نظر آتے۔

میں نے ان دو مجالس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ بھی حقیقت میں ادبی صحبتیں ہی تھیں۔ اس لیے کہ ادب کی سحر کاریاں ہی انسان کے افکار کے اظہار کا خواہ ان کا تعلق دینی علوم سے ہو یا دنیاوی علوم سے ایک موثر وسیلہ ہوتی ہیں۔

ان ادبی صحبتوں کا تذکرہ تشنۂ تکمیل رہے گا اگر میں اس نامور بزرگ کا ذکر نہ کروں جن کے دم قدم سے ہر ادبی محفل کی رونق تھی۔ مسجد شاہ جہاں کے خطیب اور مہتمم حضرت سید احمد صاحب جو امام صاحب کے بلند مرتبت لقب سے معروف تھے، ایک ایسے سرچشمۂ علم و فضل تھے جس کی آبیاری سے ہر محفل علم و ادب سیراب تھی۔ ہر خاص و عام کے دل میں ان کی وقعت تھی اور عمائد حکومت کی نگاہوں میں بھی انھیں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ تقرر وقت کے بغیر والسرائے سے ملاقات کرنے کا اعزاز ملک بھر میں صرف انھیں کو حاصل تھا اور شاید ہی کوئی ایسا حاجت مند ہو جس کی حاجت روائی اس مصدر فیض اور منبع کرم نے اس رسوخ اور اثر کی بدولت نہ کی ہو جو اس اعزاز کی بدولت انھیں حاصل تھا۔

میں نے بزرگوں کی چند صحبتوں کا ذکر کیا ہے۔ مناسب ہے کہ اب دو ایک ایسے ہنگاموں کا بھی ذکر ہو جائے جن پر زندگی کی رونق موقوف تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے نواب مصطفےٰ خان بہادر شیفتہ کے صاحب زادے نواب محمد اسحاق خان میرٹھ سے دلّی تشریف لائے اور نواب غلام محمد حسن خان کے مہمان ہوئے۔ نواب محمد اسحاق خان کی خدمت میں مجھے مدت سے نیاز حاصل تھا۔

وہ مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ بڑے خوش پوش اور خوش گفتار تھے۔ آنکھوں میں رعب داب اور میل جول میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ شعر و سخن کا ذوق ورثے میں پایا تھا اور خود بھی علم و ادب کے شائق اور قدر شناس تھے۔ جب وہ دہلی آئے تو سبھی قسم کے لوگ ان سے ملنے کو آئے ان میں شاعر بھی تھے ادیب بھی اور پرانے زمانے کے کچھ ایسے بزرگ بھی جن کے دل میں ان کے بزرگوں کی فیاضی اور سرپرستی کی یاد اب تک تازہ تھی۔ ایک دن اتفاق سے ایک ایسے بزرگ آنکلے جو اپنے آپ کو بہت بڑا قوم پرست اور مسلمانوں کا بہی خواہ سمجھتے تھے۔ سلسلۂ کلام چلتے چلتے اس طرف کو جانکلا کہ مسلمانوں کی ترقی اور بہبود کا کوئی سامان اس تہذیب میں نہیں جسے پرانے زمانے کے لوگ اسلامی تہذیب کے نام سے پکارتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ اگر ہم لوگ مسلمانوں کی کشتی کو بھنور سے نہ نکالتے تو وہ کب کے ڈوب گئے ہوتے۔ نواب صاحب کو مسلمانوں کی پرانی تہذیب سے بڑی محبت تھی اور علماءِ اسلام سے ایسی عقیدت جو آج اُمراء میں مفقود ہے۔ سننے کو تو وہ یہ باتیں سنا کیے مگر صاف نظر آتا تھا کہ ان کی طبیعت شگفتہ نہیں ہے۔ میری جرأت کی شوخی مجھے بار بار مجبور کرتی تھی کہ میں کچھ کہوں مگر نواب صاحب کو خاموش دیکھ کر دم بخود تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے اسی وقت برجستہ ایک شعر کہہ دیا جسے سن کر وہ بزرگ کچھ جھینپ سے گئے اور نواب صاحب کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔

اسلام کے ہمدرد مسلمانوں کے مصلح
سب کچھ ہیں مگر آپ مسلمان نہیں ہیں

جب یہ حضرت چلے گئے تو نواب صاحب نے فرمایا، "بھئی حکیم صاحب! اس سارے واقعے کو ایک قطعہ میں لکھ ڈالو تو جانیں" حسبِ ارشاد میں نے اس واقعے کے بیان میں ایک قطعہ موزوں کر ڈالا اور دوسرے ہی دن اسے لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ مدت تک یہ کیفیت رہی کہ میں جب کبھی میرٹھ جاتا اور ان کے ہاں حاضر ہوتا تو وہ مجھ سے یہ قطعہ پڑھنے کو ارشاد فرماتے اور جب میں اس کے آخری شعر پر پہنچتا تو کھِل کھِلا کر ہنس پڑتے۔

کل مجھ سے یہ کہنے لگے اِک مردِ مشخص
آداب سے واقف یہ مسلمان نہیں ہیں
کیا دیدہ دلیری ہے سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ
بے دین ہیں اور صاحبِ ایمان نہیں ہیں

ہیں آپ صفا کیش ذرا کیجیے انصاف
اسلام پہ کیا اپنے یہ بہتان نہیں ہیں
کیا اپنے مکانوں میں بھی قرآن نہیں موجود
اور اس کے لیے ریشمی جز دان نہیں ہیں
وہ دیکھیے کونے میں ہے تسبیح و مصلّے
کیا خانۂ مسلم کے یہ سامان نہیں ہیں!
یہ سچ ہے کہ قائل نہیں ہم لوگ خدا کے
پر اس کے لیے کیا کوئی بُرہان نہیں ہیں؟
یہ جنت و دوزخ یہ سزا اور جزا - کیا
اسلاف کے افکار پریشان نہیں ہیں
اس دور میں اس دین کو کیا کیجیے جس میں
شربِ مئے گلفام کے امکان نہیں ہیں
امداد بتامیٰ کے لیے روز کے چندے
انسان پہ کیا مفت کے تاوان نہیں ہیں؟
ہیں آج مسلمان بھی زمانے میں معزّز!
یہ آپ کی تہذیب کے احسان نہیں ہیں!
جن لوگوں نے یہ بگڑی ہوئی بات بنا دی
مردانِ حق اندیش ہیں نادان نہیں ہیں
لاریب ہمیں سے ہے اب اسلام کی رونق
بے از عنہ .بوذر و سلمان نہیں ہیں
کی عرض کہ اے قبلہ قسم آپ کے سر کی
بے جا و غلط آپ کے فرمان نہیں ہیں
پر کیجیے گر غور تو یہ آپ کے اطوار
اسلام کے اخلاق کے ارکان نہیں ہیں
اسلام کے ہمدرد مسلمانوں کے مصلح
سب کچھ ہیں مگر آپ مسلمان نہیں ہیں

دہلی کا داشی - ایم - سی - اے ہال بھی ایک مدت تک علم و ادب کا مرکز رہا - وہاں

ہر ہفتے کسی نہ کسی علمی ادبی یا معاشرتی موضوع پر مباحثے ہوتے رہتے تھے جن میں دہلی کے امراء مشاہیر اور ادیب شریک ہوا کرتے تھے اور کبھی کبھی دوسرے شہروں کے نامور لوگ بھی حصّہ لیتے تھے۔
ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب سر امیرالدین احمد خان رئیس لوہارو دہلی تشریف لائے اور ان کی زیرِ صدارت وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک مباحثہ ہوا۔ اس مباحثے کا موضوع یہ تھا کہ "آیا اگلے وقتوں کی بیبیاں معاشرتی افادیت کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتی تھیں یا موجودہ زمانے کی پڑھی لکھی عورتیں"۔ اس مباحثے میں کالجوں کی کچھ لڑکیوں نے بھی حصّہ لیا۔ آخر کار اس بحث کا رخ اس طرف کو ہو گیا کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح آزادی کا حق حاصل ہے۔ میں بھی اس موضوع پر چند اشعار لکھ کر لایا تھا۔ جب اس مباحثے کی گرما گرمی اس نوبت تک جا پہنچی کہ کالج کی لڑکیوں کا پلّہ بھاری نظر آنے لگا تو صاحبِ صدر کی اجازت سے میں نے اپنے یہ اشعار پڑھے۔

عہدِ حاضر کی لڑکیوں سے کہو
تم سے پہلے بھی لڑکیاں تھیں بہت
نازنیں حور وش پری پیکر
حُسن میں ان کے شوخیاں تھیں بہت
ان کی آغوش میں پلے وہ جواں
خون میں جن کے گرمیاں تھیں بہت
عِصمت و عِفت و حیا و وفا
ان کے گھر کی یہ لونڈیاں تھیں بہت
تیغ زن صف شکن عدو افگن
دیس کی اپنے بیٹیاں تھیں بہت
ہاں! تمھاری نظر سے گر دیکھیں
اگلے وقتوں میں سختیاں تھیں بہت
تم کو آزادیاں میسّر ہیں
پاؤں میں ان کے بیڑیاں تھیں بہت
پر کبھی تم نے اس پہ غور کیا
گرچہ جاہل یہ بیبیاں تھیں بہت

تم سے آباد ایک گھر نہ ہُوا
ان سے آباد بستیاں تھیں بہت

ہال قہقہوں سے گونج اٹھا اور نواب سر امیر الدین احمد خان نے مجھے مخاطب کر کے بڑی شفقت سے فرمایا، "بھئی حکیم صاحب! آپ نے مجھے تقریر کی زحمت سے بچالیا۔

اب جو اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ ان بزرگوں اور دوستوں کی نظر میں جس مقبولیت کی سعادت اور عزت مجھے حاصل ہوئی اس میں میری طبیعت کی شوخی نے کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ یہ صحبتیں یاد آتی ہیں تو دل پر ایک سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ مگر سانپ نکل گیا ہے اب لکیر کیا پیٹا کروں۔ وہ نادان شباب ہی نہ رہا جو تعریف و تحسین کے کھلونوں سے کھیلتا تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں کی خود افروز صحبتوں کے ساتھ ساتھ جوانی کے ناعاقبت اندیش ہنگامے بھی برابر جاری رہے۔ میں دلّی کی گلیوں کو زندگی کی دل فریب وادیاں سمجھ کر ان میں برسوں گرم سیر رہا۔ کبھی یہ وادیاں سرسبز و شاداب میدانوں میں جانکلیں اور کبھی خم در خم اور دشوار گزار گھاٹیوں نے خیر مقدم کیا۔ قدم قدم پر پاؤں پھسلے اور سنبھلے۔ اُمیدوں سے بے نیاز اور مایوسیوں سے بے پروا ماضی کی یاد کو حال کا سُرور بنائے اور حال کے سُرور میں مستقبل کے خمار کو بھلائے میں زندگی کے اس زمانے کو جسے شباب کہتے ہیں یا شباب کو جو زندگی کا دوسرا نام ہے گزارتا چلا گیا۔ زندگی کے کچھ نشیب و فراز اس وقت دیکھ لیے اور کچھ آنے والے زمانے کے لیے اٹھا رکھے۔

خلیدن ہائے منقارِ ہما بر استخواں غالب
پس از مدت بیادم داد کاوشہائے مژگاں را

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۴ر مارچ ۱۹۶۵ ش

سیّد عابد علی عابدؔ

اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری شعری روایات کی اہمیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ان پر فنی اعتبار سے ریسرچ کی جائے اور انھیں ادبی کسوٹی پر پرکھا جائے، تاکہ نہ صرف ہماری شاعری کے کمالات منظرِ عام پر آجائیں بلکہ اُن اُستادانِ شعر و سخن کا کمالِ فن بھی ظاہر ہو جائے جنھوں نے اپنی زندگی بھر کی کوششوں اور کاوشوں سے ادب کی اس ممتاز صنف کو بامِ عروج تک پہنچایا۔

سیّد عابد علی عابد صاحب کی شخصیت اور ادبی شہرت محتاجِ تعارف نہیں تاہم ان کے کمالاتِ فن کا مختصر ذکر بے محل نہ ہوگا جو انھوں نے مختلف اصنافِ ادب میں حاصل کی ہیں۔

سیّد صاحب ۱۹۰۶ء میں پنجاب کے دل لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد جناب سید غلام عباس صاحب صغیرؔ تخلص فرماتے تھے۔ جدِ امجد خان بہادر سید رجب علی شاہ ارسطو جاہ تھے جن کا ذکر بعض ادبی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم رنگ محل مشن ہائی سکول میں پائی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۳ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ لیکن اس درمیانی وقفے میں انھیں چوں کہ شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا آپ "دل کش" اور "ہزار داستان" رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب آپ نے ایک شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے خاص شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس سلسلے میں ان کی تحریر کا یہ اقتباس جہاں ان کی اپنی شرافتِ نفس کی دلیل ہے وہاں ہمارے محترم بزرگ جناب حکیم احمد شجاع صاحب کے اس ذوقِ علم و ادب پر بھی روشنی ڈالتا ہے جن کے زیرِ سایہ عہدِ حاضر کے کئی ادیبوں اور سخن وروں نے تربیت پائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"میرے ادبی کام کی ابتدا جناب حکیم احمد شجاع صاحب کے رسالے ہزار داستان میں ایک غزل کی اشاعت سے ہوئی۔ ان کی ذہنی تربیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔" علاوہ ازیں سر محمد ظفر اللہ خان

جسٹس محمد منیر، شاداں بلگرامی اور حافظ محمود شیرانی جیسے اساتذہ کی شاگردی کا شرف انھیں حاصل ہوا۔

۱۹۲۷ئ میں انھوں نے گجرات میں وکالت شروع کی لیکن یہ مشغلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا تھا کہ علمی وادبی ذوق آپ کو پھر لاہور کھینچ لایا۔ لاہور آ کر آپ کے مطالعے کا دور پھر شروع ہوا اور آپ نے انگریزی اور عربی کے تنقیدی ادب کا مطالعہ کیا۔ فارسی کا ذوق جیسے گھٹی میں تھا۔ اسی مناسبت سے انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کیا اور اس کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اس جگہ چار سال تک کام کر کے ایف۔ سی کالج لاہور چلے گئے جہاں انھیں السنۂ شرقیہ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔

۱۹۴۲ئ سے عابد صاحب دوبارہ دیال سنگھ کالج سے منسلک ہو گئے اور قیامِ پاکستان تک وہ کالج میں فارسی کے پروفیسر رہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد آپ کالج کے پرنسپل ہو گئے جس کا سلسلہ ۱۹۵۴ئ تک جاری رہا اب کم و بیش دس سال سے مجلس ترقیِ ادب لاہور سے منسلک ہیں اور سہ ماہی "صحیفہ" کی ادارت اِن کے سپرد ہے۔

آپ ایک خوش فکر اور مشاق سخن ور ہیں۔ نقاد بھی اور ڈرامہ نگار بھی۔ تصانیف اور تالیف میں شعرِ اقبال، تلمیحاتِ اقبال، اصولِ انتقادِ ادبیات، ڈراموں کا مجموعہ یدِ بیضا، افسانوں کا مجموعہ طلسمات، چاندنی اور دکھ سکھ دو ناول شامل ہیں۔ تراجم میں داستانِ فلسفہ، میراثِ ایران منظومات میں پہلا دیوان "شب نگار بنداں" شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا "دردِ تہ جام" چھپ رہا ہے۔

حکیم محمد سعید

ہماری شعری روایات

جناب عابد علی عابدؔ

ممکن ہے آپ کو یہ گمان گزرے کہ میں اپنے موضوع کے متعلق باتیں کرتے وقت ایسے مسائل شروع کر دوں گا جو نہایت دقیق ہوں گے، اور جہاں کوئی دعویٰ کروں گا وہاں اسے ثابت کرنے کے لیے بہت مستند، قدیم اور ٹھوس کتابوں کے حوالے دوں گا۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میرا ہرگز ایسا کوئی ارادہ نہیں ہیں اس بحث میں نہیں الجھوں گا کہ شعر کسے کہتے ہیں۔ شعر اور ناشعر میں کیا فرق ہے۔ اچھے اور بُرے شعر کی کیا پہچان ہے۔ روایت کی تعریف کیا ہے۔ روایت سے انحراف کرنے کا کیا مطلب ہے۔ روایت اور ادبی بغاوت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ یہ تو میں فرض ہی کر لوں گا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ شعر کیا ہوتا ہے، اچھے شعر کی داد دے سکتے ہیں، صاحبِ ذوق اور سخن شناس۔ البتہ اپنے موضوع کو محدود کرنے کے لیے اور غیر متعلقہ باتوں سے بچنے کے لیے شروع میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ ہماری شعری روایات سے میرا مطلب یہ ہے کہ فنِ شعر کے ماہروں کے خیال میں اُردو شعر کے اساتذہ نے شعر کہنے میں، پڑھنے میں اور شعر کا مطلب سمجھنے میں کن آداب سے کام لیا ہے۔ کن باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ مختصراً یوں کہہ لیجیے کہ میں جزواً شعر گوئی، شعر خوانی اور شعر فہمی کے سلیقے سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ ان ہی تینوں چیزوں کا سلیقہ مل کر اُردو کی شعری روایات کہلاتا ہے۔ مجھے غیر زبانوں سے کوئی بیر نہیں۔ فارسی نہ صرف یہ کہ بہت میٹھی زبان ہے بلکہ مجھے پیاری بھی بہت ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ ان آداب اور اس سلیقے سے بحث کرتے

ہوئے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے حوالہ بھی دوں تو ان ہی لوگوں کا دوں جو بنیادی طور پر اُردو اور خاص طور پر اردو شعر میں مہارت رکھتے تھے۔

ممکن ہے آپ میں سے بعض لوگوں کو اعتراض ہو کہ میں نے بہت ڈھیر سی باتیں فرض کر لی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ سب سخن سنج اور سخن فہم ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ شعر کیا ہوتا ہے اور خاص طور پر اچھا شعر کیا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ اعتراض کرنے والے آج کے ادا شناسوں میں اپنے آپ کو اکثریت میں نہیں پائیں گے، اس لیے اگر گنتی کے کچھ لوگ ایسے موجود بھی ہوئے جو یہ فرض کر لینے پر معترض ہوں کہ ہم شعر کو خوب سمجھتے ہیں تو وہ میرا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے اور نہ میں اُن کا کچھ بگاڑ سکوں گا۔

صاحبو! بچپن سے سنتا آیا ہوں کہ اردو شاعری نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے، اور اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، تو یہ تسلیم کرکے چلنا پڑے گا کہ فارسی شعر کی بہت سی روایات تلمیحات، استعارات، تشبیہات اور کنایات اُردو میں گھل مل کر اس طرح شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ اب انھیں علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کی صراحت میں نے اس لیے کر دی کہ میں نے اپنے آپ سے اور آپ لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ اردو کی شعری روایات کی باتیں اردو ہی کے ماہروں کے حوالوں سے کروں گا۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اردو کی شعری روایات کی مہارت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک فارسی سے آنکھیں نہ لڑائی جائیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اردو کی شعری روایات میں، جو عبارت ہیں سخن گوئی، سخن فہمی اور سخن سنجی کے سلیقے سے، فارسی کی روایتیں بھی ایسی گھلی ملی ہوئی ہیں کہ کیا کہیے۔ آج سے ہزار سال پہلے فارسی کے ایک ادیب، انشاپرداز اور دانش ور نے سخن گوئی کے متعلق بات کرتے ہوئے شاعر کے لیے ایسی ایسی صفات اور خصوصیتیں لازم قرار دی تھیں کہ اگر واقعی انسان ان پر عبور حاصل کرے تو سقراط کا ثانی اور افلاطون کا ہمسر بن جائے۔ جس شخص کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ احمد بن علی نظامی عروضی سمرقندی ہے۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف چہار مقالہ میں فن دبیری سے، یعنی وہ کام جو آج کل کسی حکومت میں سیکرٹری کرتا ہے، شعر سے، طب سے اور نجوم سے بحث کی ہے۔ تو روایت کے سلسلے میں پہلا جز یعنی سخن گوئی سمرقندی کو یوں نظر آیا ہے۔ میں اس کے مندرجات کا خلاصہ بیان کر رہا ہوں اور وہ بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں ورنہ اس نے جو فارسی لکھی ہے اس کا جواب آج تک کوئی نہ لکھ سکا۔ یہاں تک کہ بعض نقاد سعدی کی گلستان کو بھی اس کے مقابلے میں ہیچ گردانتے ہیں۔ اس کے خیال میں سخن گوئی کی شرائط یہ ہیں کہ شاعر

ذوقِ سلیم رکھتا ہو، فکرِ عظیم رکھتا ہو، مشاہدہ تیز ہو، ہر قول عبرت انگیز ہو۔ محفل میں سخن سازی اور نکتہ طرازی کرے تو اہلِ محفل پر چھا جائے۔ آدابِ ندیمی اور دوستی کا سلیقہ خوب جانتا ہو۔ پرانے اشعار خوب یاد ہوں۔ میں تعداد بتاتے ہوئے ذرا جھجکتا ہوں۔ لیکن خیر اتنی باتیں ہو چکیں تو اس میں بھی کیا حرج ہے: بیس ہزار قدیم اشعار اُسے یاد ہوں۔ یہ تو پرانے اشعار کی کیفیت ہے یعنی متقدمین کی۔ معاصروں اور متاخرین کے دس ہزار شعر ذہن میں محفوظ رکھتا ہو۔ ہر وقت مطالعے میں غرق رہے۔ بات کہنے کے ڈھنگ کیا ہیں اور بات کرنے کے اُسلوب کیا ہیں ان تمام طریقوں سے واقف ہو۔ عروض جانتا ہو۔ قافیے پر عبور ہو۔ تنقید پر قدرت ہو۔ یہ پہچان سکتا ہو کہ فلاں جگہ شاعر نے چوری سے کام لیا ہے اور فلاں جگہ مضمون اتفاق سے یکساں ہو گیا ہے۔ اب آپ خود ہی غور فرمایئے کہ ہمارے ہاں سخن گوئی کی روایت کا کیا مقام تھا۔ شعر کہنے کے لیے کتنی ریاضت کروائی جاتی تھی۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ پوچھ بیٹھیں کہ شاعر کے لیے اتنی باتوں پر عبور حاصل کرنا کیوں لازم ہے۔ اس کا جواب سمرقندی خود دیتا ہے۔ اور ایسا جواب دیتا ہے کہ مجھے بھولتا نہیں۔ کہتا ہے۔ جس طرح شعر میں ہر علم کام آتا ہے اسی طرح علم میں شعر بھی کام آتا ہے۔ مراد یہ کہ شاعر کی استعداد جتنی زیادہ ہو گی معانی اتنے ہی بلند اور مطالب اتنے ہی ارجمند ہوں گے۔ پھر یہ کہ جسے پچاس ہزار اشعار یاد ہوں گے وہ اپنے گریبان میں منھ ڈال کر یہ تو کہہ سکے گا کہ میں نے کوئی نئی بات کہی، کوئی بات کہنے کا نیا ڈھب نکالا، یا وہی پرانی باتیں میرے شعروں میں بھی دہرائی جا رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ شعر اور علومِ شعری پر عبور حاصل کرنے کے بعد شاعر کو معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو وہ نئی سمجھ رہا ہے وہ نئی ہے بھی یا نہیں۔ جس چیز کو وہ روایت سے بغاوت کہہ رہا ہے وہ روایت سے بغاوت ہے بھی یا نہیں۔ آج کل کی طرح نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی۔ کوئی عیب نکل آیا تو کہہ دیا کہ ہم پرانی روایت سے بغاوت کر رہے ہیں۔ صاحبو! پرانی روایت سے ضرور بغاوت کرو، اور اپنے جدید خیالوں سے ہمیں ضرور مستفید کرو، لیکن یہ جان تو لو کہ روایت ہے کیا؟ یہ دریافت تو کر لو کہ جس چیز کے خلاف تم بغاوت کر رہے ہو اس کے الٹ پھیر، نشیب و فراز، کیف و کم اور اونچ نیچ سے آگاہ بھی ہو کہ نہیں۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ صرف اتنی ہے کہ آپ جدید بات تبھی کر سکتے ہیں جب قدیم سے آپ کو واقفیت ہو۔ دراصل ماضی ہی وہ چراغ ہے جسے فن کار ہاتھ میں لے کر حاضر کے راستے سے گزرتا ہے اور اسی چراغ کی مدھم روشنی میں اسے جدید مستقبل کے بے شمار امکانات نظر آتے ہیں۔

سخن گوئی میں کتنی مشکلات ہیں، ان ہی کو مدِ نظر رکھ کر اردو شعر کے اساتذہ عالم اور

فاضل استادوں سے رجوع کرتے تھے۔ مولوی قادر بخش صابر نے، کہ شہزادگان دہلی سے متعلق تھے، جب سخن گوئی کا ارادہ کیا اور اچھی طرح اس بات کو اپنے دل میں پرکھ لیا کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں، تو استاد کامل کی جستجو میں نکلے۔ باوجود اس کے کہ عالم اور فاضل تھے۔ اپنی تصنیف "گلستان سخن" میں لکھتے ہیں: "راہنما کی تلاش ہوئی اور اس تلاش میں کیا کیا جان و دل کو خراش ہوئی کہ غیرت نے یہ سمجھایا کہ ایسے کی شاگردی کا حلقہ اپنے کان میں ڈالیے اور ایسے یگانۂ روزگار کی استادی کا نام زبان سے نکالیے کہ اس کی جامعیت میں کسی کو کلام نہ ہو" انھوں نے پہلے حافظ عبدالرحمان خان احسان سے اصلاح لی اور پھر تکمیلِ سخن میں مولوی امام بخش صہبائی سے مدد لی جو علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے اور جن کی تعریف میں غالب جیسا نازک دماغ شاعر بے تکلف مبالغہ آمیز کلمات لکھتا ہے۔ پھر یہ بات بھی واضح رہے کہ مولوی امام بخش صہبائی دراصل علوم و فنون میں ماہر تھے، شعر تو ضمناً کہتے تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ استاد سخن گوئی کے سلسلے میں اپنے شاگردوں کی رہنمائی کس طرح کرتے تھے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اکثر استاد، جن سے مختلف دبستان منسوب ہیں، اونچے پائے کے عالم تھے۔ مثلاً شروع ہی سے لے لیجیے۔ درد، انشا، نصیر، مومن، غالب، شیفتہ، یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر شعر نہ کہتے تو بھی اپنی جودت طبع اور علم و فضل کے اعتبار سے مشہور زمانہ ہوتے۔ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ یعنی اساتذہ اپنے شاگردوں کی رہنمائی کس طرح کرتے تھے۔ اس سوال کے جواب کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ استاد عمل تخلیق میں، شعر کہنے کے فن میں، انتخاب الفاظ میں شاگرد کی رہبری کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اکثر استاد تذکرے لکھتے تھے۔ مختلف شعرا نے جو تذکرے لکھے ہیں۔ ان کے متعلق یہ بدگمانی اب تک پائی جاتی ہے کہ ان میں سوائے موٹی موٹی تراکیب کے اور دقیق الفاظ کے کچھ نہیں۔ تنقید تو سرے ہی سے مفقود ہے۔ آج اس بات کا موقع نہیں کہ میں قدیم تذکروں کی انتقادی اہمیت پر بحث کروں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ہم لوگوں نے اپنی پرانی تنقیدی اصطلاحات اور ان میں جو رموز و اسرار پوشیدہ تھے انھیں فراموش کر دیا۔ آج ہم بالکل صحیح طور پر اس بات کا مطلب نہیں جانتے (میری مراد اردو کے اکثر طلبہ سے ہے)۔

ہمارے خیال میں قدرت کلام، معاملہ بندی، الفاظ کی چاشنی، کلام کا نمک، لہجے کی خوش مزگی بے معنی اصطلاحات ہیں۔ اور اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہم اپنے معانی، بیان اور بدیع کے پرانے نظاموں کو بالکل فراموش کر دیں گے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ استاد شاگرد کی دو طرح رہنمائی کرتے تھے:۔ ایک تو شعر میں اصلاح کرتے تھے اور اس سلسلے میں بہت سے علوم و فنون اور علوم شعریہ کے بہت سے بھید اپنے شاگردوں کو بتا دیتے تھے۔ دوسرے

یہ کہ تذکرے لکھ کر انتخاب سخن کے ذریعے وہ عملاً شاگردوں کو بتاتے تھے کہ ہمارے خیال میں فلاں شاعر کا وہ شعر اچھا ہے اور یہ نہیں۔ یعنی اچھے اشعار انتخاب میں شامل ہوتے تھے اور گھٹیا اشعار قلم زد کر دیے جاتے تھے۔ یوں مختلف شعری دبستان پیدا ہوتے تھے۔ ذوق سخن کی تربیت ہوتی تھی۔ شاگردوں کو معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اُستاد نے اپنے تذکرے میں فلاں شعر قلم بند نہیں کیا لیکن فلاں استاد نے کیا ہے۔ اس سے ایک تو مذاق سخن کے تنوع کا اندازہ ہوتا تھا۔ دوسرے شاگردوں کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ اگرچہ تمام اچھے شاعروں میں اور سخن فہموں میں ذوق سلیم قدرِ مشترک ہے لیکن اس ذوق سلیم کے کئی روپ ہیں۔ بعض استاد کسی شاعر کا ایک رنگ پسند کرتے ہیں اور بعض دوسرا۔ اس رنگا رنگی سے شاگردوں کے ذوقِ سلیم کی نہ صرف تربیت ہوتی تھی بلکہ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے استاد کے دبستان میں اور دوسرے استادوں کے دبستان میں سخن فہمی کی کون کون سی صورتوں میں اختلاف ہے۔ میں ابھی دو تین مثالیں دے کر اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ پہلے آپ کو کچھ واقعات اصلاح کے سُناؤں جن سے معلوم ہو کہ استاد نے شعر میں ایک لفظ بدل کر یا محض الفاظ کی ترتیب بدل کر شعر کی کیا صورت پیدا کر دی۔ اکثر استاد تو کہتے تھے کہ غزل اچھی نہیں۔ طبیعت پر زور دے کر پھر کہو۔ لیکن جہاں اصلاح دیتے تھے وہاں شاگرد کو کوئی نیا مضمون نہیں بخش دیتے تھے بلکہ صرف معمولی سے تصرف سے شعر میں جان ڈال دیتے تھے۔ وزیر لکھنوی اگرچہ ان مشاہیر میں شامل نہیں جن کے اشعار صفِ اوّل میں رکھے جائیں لیکن ان کی ایک اصلاح انھیں استادوں میں بڑا اونچا مقام عطا کرتی ہے۔ ان کے ایک شاگرد غزل لائے۔ تر ہو گیا۔ بسر ہو گیا۔ اور اس میں یہ شعر کہا۔

غضب ہیں تری شوخیاں اے فلک
کلیجہ گلِ نیلو فر ہو گیا

استاد نے کہا برخوردار، کلیجے کے گلِ نیلوفر ہونے کا شاعرانہ ثبوت شعر میں موجود نہیں۔ شاگرد نے کہا تو یہ ثبوت کس طرح مہیا ہو۔ وزیر نے کہا شعر کو یوں پڑھو:

غضب ہیں تری چٹکیاں اے فلک
کلیجہ گلِ نیلو فر ہو گیا

حالی اور غالب کے متعلق میں نے ایک روایت پڑھی ہے کہ جب حالی نے اپنی مشہور غزل سے

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا میری رسوائی کا

غالب کے سامنے اصلاح کے لیے پیش کی تو یہ شعر بھی پڑھا:-

عمر شاید نہ کرے آج وفا
سامنا ہے شبِ تنہائی کا

غالب نے شعر میں ایک لفظ بدل کر اس کی یہ شکل بنا دی۔

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

اب ملاحظہ فرمایئے کہ شعر میں معانی کی کون کون سی سطحیں تھیں جو مخفی تھیں اور اب نمایاں ہوگئیں۔ مثال کے طور پر اب سننے والے کو یہ بات واضح معلوم ہوتی ہے کہ شبِ تنہائی کی یہ صورت ہے کہ عمر کٹ جائے گی لیکن یہ نہ کٹے گی۔ اور اس سے ضمناً یہ بھی پہلو نکلا کہ اب شبِ ہجر کا دامن شبِ محشر سے بندھا ہوا ہے۔ یہیں ایک اور شعر بھی یاد آگیا کہ حالی کے شعر سے کچھ مشابہ ہے۔

شامِ فراقِ یار کی صبح نہ ہو گی حشر تک
آج ہے دامنِ سحر دستِ شبِ دراز میں

اور خود غالب کہتا ہے:۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

میرے خاندان میں یہ روایت چلی آتی ہے اور خود میرے لیے اس کے ناقل میرے دادا سید حسن علی ہیں جنھوں نے یہ واقعہ اپنے والد سید رجب علی شاہ سے سُنا تھا کہ میر مونس ہمیشہ مرثیہ کہنے کے بعد اپنے بھائی انیس کو دکھا دیتے تھے کہ کوئی سقم ہو تو رفع ہو جائے۔ جوانی کے دن، استعدادِ فطری، طبیعت جوش پر، داد دینے والوں کا ہجوم، ہر طرف خاندانِ انیس کی دھوم، ایک بار لوگوں نے مونس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ دو تین دن کے بعد ایک خاص مجلس میں دو تصنیف کردہ مرثیے پڑھیں گے۔ ظاہر ہے کہ انیس اگرچہ مونس کے بھائی تھے لیکن شاعر تھے اور نازک مزاج۔ اس لیے اصلاح تب دیتے تھے کہ انھیں سہولت ہو اور فرصت میسر۔ مونس نے مرثیہ لکھا۔ بہت کاوش سے کام لیا۔ دو تین بار بھائی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اصلاح کا موقع نہ ملا۔ مونس نے بغیر انیس کو دکھائے مجلس میں مرثیہ پڑھ دیا۔ اس کے بعد روایت کی جزئیات میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ انیس نے مونس سے کہا بھائی اب تو ماشاءاللہ تم اصلاح کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے۔ ہمیں بھی تو مرثیہ دکھاؤ اور مونس نے وہی مرثیہ انیس کے سامنے پڑھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مونس نے جوانی کے جوش میں کوئی ایسی بات کہی جو انیس کو ناگوار گزری۔ انیس نے کہا بھائی اب بھی تمھارے مرثیے عیب سے خالی

نہیں ہوتے۔ اگر اتنا ہی دعویٰ ہے تو جاؤ مرثیہ کہہ لاؤ اگر کسی جگہ ہم اصلاح دیں اور تم تسلیم کر لو تو مرثیہ ہمارا ہوگیا۔ تب مونس نے وہ مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے:۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخگری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

انیس سنتے گئے۔ جب مونس چھٹے بند پر پہنچے یعنی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی دیکھ کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

یہاں میر انیس نے مونس کو روک دیا، اور کہا بھائی ہوا کی آنکھیں تو نہیں ہوتیں پھر یہ کیا بات ہوئی کہ ؎

رکھتی تھی دیکھ کر قدم اپنا ہوائے سرد

اور اشعار میں یہ عیب کیوں پیدا ہوا۔ مونس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو اور مصرعے کی کیا شکل ہونی چاہیے۔ انیس نے فوراً کہا بھائی یوں پڑھو:۔

رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد

حسبِ وعدہ مونس نے مرثیہ نذر کیا اور اب وہ انیس کے نام سے نول کشور ایڈیشن ۱۸۹۶ء کی جلد دوم کے صفحہ ۲۹۱ پر چھپا ہوا ملتا ہے۔ یہ گمان نہ کیجیے گا کہ انیس اور مونس کے کلام میں اتنی مشابہت نہیں ہو سکتی۔ میں نے واقعتاً ان دونوں مرثیہ نگاروں کے تمام اشعار جو چھپ یا ہو سکتے تھے پڑھے ہیں، اور میرا دعویٰ ہے کہ میر مونس کے مرثیوں میں سے آپ بند کے بند انیس کے مرثیوں میں ملا دیں یہ پہچاننا ناممکن ہو جائے گا کہ انیس کا کلام کون سا ہے اور مونس

کا کون سا۔ یہ موقع نہیں کہ میں میر مونس کے بند آپ کو پڑھ کر سناؤں لیکن جن لوگوں کو اشتیاق ہو وہ مونس کے مرثیے دیکھیں، انشاء اللہ میری بات کی تائید کریں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اردو کے بڑے بڑے استاد تذکرے لکھ کر اپنا ذوقِ سخن دکھاتے تھے۔ اور ذوق سلیم کے مختلف رویوں کا اظہار کر کے شاگردوں کو بتاتے تھے کہ شعر میں ذاتی پسند کا معاملہ بہت اہم ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان تذکروں میں نہایت اچھی تنقید ملتی ہے بعض تذکرے تو انتخاب اشعار کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ یہ دکھانے کے لیے کہ مختلف دبستان مختلف شعراء کی شعر گوئی کے کس رنگ کو پسند کرتے تھے میں ایک ہی شاعر کے متعلق مختلف تذکروں سے کچھ انتخابات پیش کرتا ہوں کہ ذوق سلیم کا تنوع بھی ظاہر ہو اور یہ بات بھی روشن ہو کہ علاحدہ علاحدہ دبستانوں میں شعر کی اچھائی اور برائی کے معیار کیا تھے۔ آرزو ہی کو لیجیے کہ امام فن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو ان کے ذوقِ سلیم کا ہر تذکرہ نگار معترف ہے، دوسرے ان کے اشعار بکھرے ہوئے ہی ملتے ہیں۔ یہ شعر تو اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیے ہیں۔

رکھے سیپارہ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

آتا ہے صبح اٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

مرزا علی لطف نے اس غزل میں یہ شعر بھی نقل کیا ہے:۔

اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

گلِ عجائب میں آرزو کا ایک نہایت نفیس شعر نقل ہوا ہے جو اکثر تذکروں میں نہیں ملتا۔

کس پری رو سے ہوئی شب کو مری چشم دوچار
کہ میں دیوانہ اٹھا خواب سے سوتے سوتے

میر نے ان دو مشہور شعروں کے علاوہ یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

جان کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

سخن شعرا میں یہ شعر نقل ہوا ہے:۔

کرے ہے پند ہمیں پند گو خدا کی شان
کہاں کا آج ہمارا یہ غم گسار آیا

خم خانہ جاوید میں یہ مطلع بھی اچھا نقل ہوا ہے :-

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

لیکن آرزو کا بہترین انتخاب گلستان سخن میں ملے گا۔ قادر بخش صابر نے آرزو کے وہ شعر نقل کیے ہیں جنھیں پڑھ کر افقِ ذہن پر بعد کے شاعروں کے اشعار ابھرتے ہیں۔ مثلاً

ہے وہ ہی غفلت اور وہی بے نیازیاں
احوالِ دل گر اُس کو سنایا تو کیا ہوا

آرزو مے کی مجھے کیا ہے کہ ساقی ہر دم
ان نگاہوں سے ہی سرشار ہوا جاتا ہوں

شاد کے شعر پر آرزو کا فیضان بالکل واضح ہے۔

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

میں نے عرض کیا تھا کہ اساتذہ یقیناً شاگردوں سے تذکروں کی ترتیب میں مدد لیتے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ شاگردوں کو اس سے متعدد فائدے پہنچتے ہوں گے۔ پہلے جو مضمون بندھ چکے ہیں ان کا علم ہوتا ہوگا مضمون نے جو جو روپ بدلے ہیں ان سے آگاہی حاصل ہوتی ہوگی۔ بات کرنے کے نئے ڈھب معلوم ہوتے ہوں گے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ہماری شعری روایات میں سخن گوئی ایک جزو ہے۔ اس کے کچھ پہلو آپ نے دیکھے۔ اب ذرا سخن فہمی کی طرف بھی آئیے، کیوں کہ یہاں تو وہ معاملہ ہے کہ پیر شو بیا موز۔ مجھے یاد ہے کہ رنگ محل مشن ہائی سکول میں فارسی اور اُردو کے استاد مولوی خورشید احمد مرحوم تھے۔ ہادی حسین صاحب جو بعد میں سی ایس پی ہوئے میری طرح مولوی صاحب کے بہت معتقد اور مداح تھے۔ دسویں جماعت کے طالب علم کی بساط ہی کیا ہوتی ہے۔ لیکن یقین فرمائیے کہ مولوی خورشید احمد مرحوم کو سخن سنجی اور سخن فہمی میں اتنا انہماک تھا کہ ہم دونوں میں جو انھوں نے ذرا سا جوہر دیکھا تو اسے چمکانے کی کوشش کی۔ ان کے طریقۂ تعلیم نے پہلی بار مجھ پر یہ بات روشن کی کہ واقعی چہار مقالہ کا مصنف سچ کہتا ہے۔ ہر قسم کی معلومات سخن فہمی اور سخن سنجی میں کام آتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہادی کہیں سے شعر پڑھ کے آئے۔

اے نامہ جبیں خاک بہ ہل بیجو ادب سے جائے جو کبھی خدمت عالی میں کسی کی

میں نے بھی شعر کی داد دی لیکن مولوی صاحب مرحوم نے تو ران پہ ہاتھ مارا اور کہا بیوقوف سمجھنے بھی ہو

کہ شاعر نے کیا کہا۔ غالباً ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا ہوگا کہ مولوی صاحب ہماری نادانی پر مطلع ہو گئے۔ فرمایا بدبختو یہ بلاٹنگ پیپر اور سیاہی چوس وغیرہ تو آج کل کی ایجاد ہے پہلے جب خط لکھتے تھے تو سیاہی خشک کرنے کے لیے روشنائی پر ریت یا مٹی چھڑک دیتے تھے۔ اب سمجھے کیا مطلب ہے اس مصرعے کا

"اے نامہ جبین خاک پہ مل لیجو ادب سے"

اساتذہ نے سخن فہمی اور سخن سنجی کی سخن گوئی سے بھی زیادہ تعریف کی ہے کہ ان کی نظر میں شعر کہنا آسان تھا اور تمام نزاکتوں اور باریکیوں کے ساتھ شعر کا سمجھ میں آنا مشکل تھا۔ مجھے شروع ہی سے غالب کے اشعار سے شغف رہا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ از روئے کمالِ حماقت جوانی میں یہ دعوٰی بھی تھا کہ میں غالب کا کلام بخوبی سمجھتا ہوں۔ اس معاملے میں اپنی نالائقی اور نارواغرور کا سال تب کھلا کہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں جموں میں ایک مشاعرہ ہوا۔ نور الٰہی محمد عمر مرحوم مہتمم تھے۔ بڑے بڑے جغادری شاعر جمع ہو گئے تھے۔ پنجاب سے حفیظ جالندھری، تاثیر، جلال الدین، اکبر، ہری چند اختر، اختر شیرانی، تاجور نجیب آبادی، خاکسار یعنی میں خود اور اُدھر سے سیماب مرحوم اور محبّی ساغر صدیقی تشریف لائے تھے۔ طرح تھی: "کوئی صورت نظر نہیں آتی" اور شاید "دیوانہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہیے"۔ ہماری شعری روایات میں مشاعرے کے آداب، نشست و برخواست کا سلیقہ، داد دینے میں حفظِ مراتب کا خیال اور متانت بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ صدر رام رچپال سنگھ شیدا دہلوی تھے۔ حفیظ اور تاثیر نے دیوانہ چاہیے، پروانہ چاہیے، اچھی غزلیں پڑھیں۔ تاثیر کا یہ شعر اب تک مجھے یاد ہے:

اُف وادیٔ جنوں کے وہ پرپیچ راستے
دیوانگی کو بھی کوئی فرزانہ چاہیے

سیماب نے یہ شعر پڑھ کے مشاعرہ لوٹ لیا تھا:

اے دل یہ پچھلی رات یہ تسکین کائنات
اس وقت کوئی نعرۂ مستانہ چاہیے

اللہ یار خاں جوگی ان دنوں بقید حیات تھے، وہ بھی شریک تھے۔ انھوں نے داغ کے انداز میں دو شعر بہت اچھے پڑھے۔

ہنسی ہنسی میں نہ کوئی فساد ہو جائے
کہو عدو سے زبان کو سنبھال کر بیٹھے

گزرتے بچ کے ہیں جوگی سے ہے خیال انہیں
گدائے حُسن ہے شاید سوال کر بیٹھے

طرح میں ان کا مقطع بھی شنیدنی ہے:۔

کیا طبیعت ہے میری جوگی جی
بن پئے رنگ پر نہیں آتی

میں صرف مطلب کی طرف آتا ہوں۔ مشاعرہ ختم ہُوا۔ سب شعرا ایک ہی جگہ مقیم تھے، پڑکے سورہے۔ دوسرے دن صبح رام رچپال سنگھ شیدا پہنچے۔ غالب کے اشعار پہ بحث چل نکلی۔ شعر پڑھے گئے۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

شیدا نے کہا کہ کوئی صاحب ان اشعار کی تشریح تو فرمائیں۔ ان دنوں طبا طبائی یعنی نظم طباطبائی شارح دیوان غالب مجھے گویا حفظ تھا۔ میں نے شعر کا صحیح مطلب بیان کیا کہ موت کا تو ایک دن مقرر ہے آگے پیچھے نہیں آئے گی اسی وقت آئے گی جب اسے آنا ہے۔ نیند کیوں رات رات بھر نہیں آتی یہ بھی کوئی موت ہوگئی کہ صرف وقت معیّنہ پر آئے گی۔ شیدا اپنی کھچڑی مونچھوں میں مسکرائے۔ کہا نظم طباطبائی نے اس شعر کے مطلب کی طرف اشارہ کر دیا ہے اب دوسرے شعر کا مطلب ارشاد ہو۔ یعنی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

قریباً سارے شعراء موجود تھے۔ سب زور لگایا کیے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بہت زور کی رسّہ کشی ہوئی۔ شیدا نے سیماب کو بھی بحث میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ یہ سب لوگ تھک گئے تو شیدا نے کہا کہ بھئی تم پڑھے لکھے لوگ ہو۔ غالب کے ہاں فلسفہ اور فکر اور ذکر اور خدا جانے کیا کیا ڈھونڈتے ہو۔ حالاں کہ قصّہ فقط اتنا ہے کہ تم شعر کو ٹھیک پڑھتے نہیں۔ اگر تم کو سخن خوانی کے طریقے سے آگاہی ہوتی تو شعر کا مطلب صاف تھا۔ غالب نے شعر پڑھا ہوگا تو

مطلب واضح ہو گیا ہوگا۔ اب انھوں نے ہماری درخواست پر شعر پڑھ کے سنایا اور مطلب واضح ہوا کہ دیوانگی تو پہلے بھی تھی کہ اپنے آپ پر خود ہی ہنس لیا کرتے تھے۔ لیکن بہرحال ہنسنے کی کوئی وجہ تو ہوتی تھی۔ اب یوں ہی بیٹھے بیٹھے ہنس دیتے ہیں یعنی ہنسی کسی بات پر نہیں آتی بغیر کسی بات کے۔ بلا وجہ اور بے سبب بھی آجاتی ہے اگر میں یہ کہوں کہ ہم لوگ کہتے کہتے رہ گئے تو غلط نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیدا نے ایسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ان کو غالب کا کلام پڑھتے سنا تھا۔ مقطع کا ذکر چلا تو انھوں نے یہ تشریح فرمائی کہ مسجد نبوی یا آستانہ قدس کی یہ کیفیت ہے کہ وہاں منافق آستینوں میں بت لے جایا کرتے تھے۔ اس پر انھیں تنبیہ کیا گیا کہ خانہ خدا میں بتوں کا کیا کام ہے اور یہاں تو یہ حال ہے کہ غالب آستین کی بجائے حرم دل کے اندر ایک بت کو بٹھائے لیا جا رہا ہے۔ اب واضح ہو گیا کہ غالب نے یہ کیوں کہا تھا کہ کعبے کس منھ سے جاؤ گے غالب ورنہ جو مطلب عام طور پر بیان کیا جاتا ہے وہ غالب کی شان کے شایان نہیں ہے۔

میں نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ ہماری روایت شعری جس سلیقے سے عبارت ہے وہ سخن گوئی، سخن خوانی اور سخن سنجی کا دوسرا نام ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو روایت شعری بنتی ہی سخن خوانی اور سخن فہمی سے ہے۔ شعر کا مطلب ہی واضح نہ ہوگا تو سننے والے کیا مستفید ہوں گے اور بات آگے کیسے چلے گی؟ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی تحقیق کے میدان کے مرد تھے۔ یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ سخن فہمی اور سخن سنجی میں ان کا حریف کم نکلے گا۔ پرانے بزرگوں میں جنھوں نے واقعی اساتذہ کی آنکھیں دیکھی تھیں میں نے یا تو سہا مجددی بھوپالی کو بہت بالبصیرت پایا یا حافظ محمود شیرانی کو۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو ذوق سلیم تو عطا ہوا تھا، لیکن سخن سنجی اور سخن فہمی مطالعہ اور بصیرت کے ارتقاء پر مبنی تھی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ حافظ صاحب محض فارسی ہی کے معاملے میں بصیرت افروز تھے ان کا شعری ذوق زبانوں سے ماوراء اور بلند تھا۔

اب حافظ صاحب کا ذکر ہے۔ ان کا بھانجا جو ایف سی کالج میں پڑھتا تھا اور ان ہی کے ساتھ رہتا تھا نہایت اعلا درجے کا ناقد تھا۔ میں ان دنوں ایف سی کالج میں شعبۂ فارسی کا صدر تھا۔ لیکن اردو اختیاری کے بھی کچھ پیریڈ پڑھانے پر مامور تھا۔ اتفاق کی بات ہے کسی نے جماعت میں ذوق کا مطلع پڑھا۔

خط بڑھا۔ کاکل بڑھے۔ زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

شعر کے متعلق تو خیر بات ہو گئی۔ میں نے ناقد سے کہا شیرانی صاحب سے پوچھنا کہ خط، کاکل،

زلف اور گیسو کے فرق کے متعلق کوئی مستند کتاب بتائیے۔ شیرانی صاحب نے بہارِ عجم کا حوالہ دیا اور مطالعے کے بعد واضح ہو گیا کہ ان چاروں چیزوں سے کیا مراد ہے۔ میرے لیے ان چاروں الفاظ کے اختلاف کا علم اسی لیے بھی بصیرت افروز تھا کہ ایک مشہور غزل کے اشعار کا مطلب یہ اختلاف جانے بغیر ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا۔ منشی ٹیک چند نے جو فارسی محاورے میں اب عملاً سند کی حیثیت رکھتے ہیں لکھا ہے خط رُواں کہ پہلے ہونٹوں پر آتا ہے اور پھر گالوں پر غور کیجیے گا تو معلوم ہو گا کہ جن اُردو اشعار میں خط آیا ہے وہاں لازماً اس کے معانی مونچھ کے ہی نہیں ہیں ہلکا ہلکا رواں صنفِ کرخت ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ زلف ان بالوں کو کہتے ہیں جو کانوں کے قریب اُگتے ہیں اور محبوبوں سے مخصوص ہیں۔ کاکل سر کے وہ بال ہیں جو کندھوں تک آجائیں اور زلف کی جگہ اسے برتنا غلط ہے۔ گیسو سر کے دونوں طرف جو لمبے بال ہوں یعنی چوٹیاں جو گالوں پر لٹکتی رہیں۔ (بظاہر صاحب بہارِ عجم کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر خط نہ ہوا یا جائے اور بال گالوں تک آجائیں تو وہ بھی گیسو ہی کہلائیں گے۔)

میں نے عرض کیا تھا کہ جب تک اس اختلاف کی رمز نہ کھلے ایک غزل کے شعروں کا لطف پھیکا پھیکا سا رہتا ہے وہ شعر یہ ہیں۔

قمریاں بولیں پپیہے کو کیں
کان کی بات، مری عل ٹھہرے
ہم جو چپ، ہوں تو سڑی کہلائیں
آپ چپ ہوں تو تغافل ٹھہرے
تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر
ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھہرے

میرا خیال ہے کہ میں آپ کو کافی اکتا چکا ہوں۔ روایاتِ شعری کی داستان دراز ہے۔ ابھی تو اوصافِ دلبری کے معانی کے اختلاف ہی میں ایک پوری نشست صرف ہو سکتی ہے۔ مثلاً ادا، غمزہ، کرشمہ، عشوہ، ناز، انداز، ان میں سے ہر لفظ دوسرے سے بالکل مختلف معانی رکھتا ہے۔ بار زندہ صحبت باقی۔ کبھی پھر موقع ملا تو ان کی بھی بات ہو جائے گی کہ یہ بھی ہماری روایاتِ شعری کے بھید اور بھاؤ ہیں۔

شامِ ہمدرد۔ لاہور
اپریل ۱۹۶۵ ش

چوہدری نذیر احمد خاں

جناب محترم چوہدری نذیر احمد خان صاحب ہمارے ملک ہی کے نہیں دنیا کے ممتاز ماہرینِ قانون میں سے ہیں اور اپنی مختلف التنوّع خدمات کی بنا پر پاکستان کی اجتماعی زندگی میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

جناب چوہدری صاحب ۱۳ ستمبر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی اور ایل۔ ایل۔ بی کی اسناد حاصل کیں اور ۱۹۲۱ء سے منٹگمری میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۴۲ء میں حکومت پنجاب کے وفد برائے فوجی مراکزِ ہند کے رکن بنے۔ آل انڈیا مسلم کونسل اور ہندستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ آپ نے جنگِ آزادی کے دوران میں انگریزی حکومت کی جانب سے ملے ہوئے تمام خطابات واعزازات واپس کر دیے۔ تحریکِ آزادی میں حصّہ لینے کے جرم میں حکومت نے چوہدری صاحب کی زمینیں ضبط کر لیں اور آپ کو جیل بھیج دیا لیکن رہائی کے بعد آپ نے اور بھی سرگرمی اور تن دہی کے ساتھ مسلم لیگ کی قیادت میں آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ آپ کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی مجلس منتظمہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۴۷ء میں ریزرو بینک آف انڈیا کے ڈائریکٹر مقرر کیے گئے۔

آزادی کے بعد آپ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن نامزد کیے گئے۔ ۴۸ء میں پاکستان اسٹرلنگ بیلنس ڈیلیگیشن اور پاکستان کامن ویلتھ پارلیمنٹری وفد کے رکن کی حیثیت سے لندن گئے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے وزیرِ صنعت بنائے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں آسٹریلیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر نامزد کیے گئے لیکن آپ نے اندرونِ ملک رہ کر ہی خدمت کو ترجیح دی اور اعلا عدالتوں میں وکالت فرمانے لگے۔ ۵۸ء میں آپ پنجاب ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر، نیز پاکستان

بار ایسوسی ایشن کے بانی صدر منتخب ہوئے۔ جولائی ۱۹۵۹ء سے اکتوبر ۱۹۶۱ء تک آپ نے اٹارنی جنرل پاکستان کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں "عالمی امن بذریعہ قانون کانفرنس" (واشنگٹن) نے چوہدری صاحب کو دنیا کا ممتاز قانون دان قرار دیا۔ آج کل آپ "محبانِ عالم اسلامی" کے بانی صدر ہیں اور اسلامی ممالک کے اتحاد کے لیے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حکیم محمد سعید

اکبر الہ آبادیؒ کا پیغام

جناب چودھری نذیر احمد خاں
صدر بزمِ اکبر، پاکستان

اکبرؒ کا اپنا شعر ہے :۔

جنابِ اکبر سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں، یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

ان کی دُور بیں نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ جس ماحول میں وہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اور جن اقدار کو وہ صحیح سمجھتے تھے وہ تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ ان کے ہم خیال اور ہم نوا کم اور معترضین بلکہ مخالفین زیادہ ہو رہے ہیں۔ رنگِ محفل بگڑ رہا ہے۔ خیالات اور عقیدوں میں بسرعت انقلاب آ رہا ہے۔ غرضکہ اب ان کی انجمن وہ انجمن ہی نہیں رہی تھی جس سے وہ آشنا تھے یا جو اُن سے آشنا تھی۔

اکبر جیسا زیرک انسان اس کلیہ سے ناواقف نہ تھا کہ زندگی جامد نہیں ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ :

"جاوداں ہر دم رواں ہر دم جواں ہے زندگی"

وہ اس فطری حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ :۔

"ثبات اک تغیّر کو ہے زمانے میں"

لہٰذا تغیّر ان کے لیے کوئی غیر متوقع حادثہ نہ تھا، وہ اس کے لیے تیار تھے۔ البتہ جس

بات کا غم ان کو کھائے جاتا تھا وہ بقول ان کے یہ تھی :-

گرے جاتے ہیں خود ہم اپنی نظروں سے ستم یہ ہے
بدل جاتے تو کچھ رہتے مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

اس "مٹنے" کے خلاف انھوں نے مسلسل جہاد جاری رکھا اور ان کے پیغام کا زیادہ حصہ اسی سے متعلق ہے۔

وہ کبھی مرغِ باد نما نہ بنے بلکہ شبیر کی طرح دھارے کے خلاف چل کر بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ گو وہ دیکھ رہے تھے کہ میدان ان کے ہاتھ سے جا رہا ہے تاہم انھیں یک گونہ تسلی تھی کہ وہ تو اپنا فرض بجا لاتے رہے۔ فرماتے ہیں :-

گو اپنے ساتھ آپ کا ہُرّا[1] نہ لے گیا
اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا

اگرچہ بعض اوقات وہ بہ تقاضائے بشریت یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے :-

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

تاہم ان کی پسپائی میں بھی ایک شان خودداری تھی۔ ایک انانیت تھی۔ ایک وقار تھا۔ فرماتے ہیں :-

ہر گام ہر چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس[2] طلب
اس پارک میں آخر اے اکبرؔ ہم نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

جس بدلی ہوئی انجمن کی طرف اکبر نے اشارہ کیا تھا وہ آج سے پچاس ساٹھ سال اُدھر کی انجمن تھی۔ اہلِ دل خود انصاف سے کہہ دیں کہ اب حالات کیا ہیں۔ سُدھر گئے یا اور بگڑ گئے؟ ہمیں کدھر جانا چاہیے تھا اور ہم کدھر جا رہے ہیں؟ خدا نے ہمیں پاکستان جیسی نعمتِ عظمیٰ عطا فرمائی، ہم نے اپنے تمام دعووں اور وعدوں کو جھٹلا کر اس کا بھی حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔

اکبر اس زمانے میں پیدا ہوئے جب فرنگی اقتدار اپنے عروج پر تھا۔ انگریزی فوج کا ہر گورا اپنے آپ کو ہندستان کا حاکم سمجھتا تھا۔ اکبر کو طنزاً کہنا پڑا :-

عہدِ انگلش کو وہی سب سے بہتر سمجھا جو ہر اک گورے کو لفٹیننٹ گورنر سمجھا

---

1. Hurrah 2. Licence

یہ وہ وقت تھا جب انگریز سے وفاداری کے فتوے جاری ہوتے تھے اور ان کے کاسہ لیسان کی فوج ظفر موج برٹش راج کی برکات گنوا کر نہ تھکتی تھی۔

مجھے خود یاد ہے کہ جب میں سن ۱۱-۱۹۱۰ء میں قصور میونسپل اسکول میں پڑھتا تھا تو صبح صبح ہیڈ ماسٹر صاحب سارے اسکول کو اکٹھا کر کے یہ نظم ہم سے پڑھوایا کرتے تھے:-

اقبال و بخت ہے بڑا برطانیہ ترا
جھنڈا جہاں میں ہے گڑا برطانیہ ترا
پیتے ہیں گھونٹ زہر کے دشمن ترے سبھی
لبریز جام شربت ہے برطانیہ ترا

اور اسی قسم کی دیگر خرافات ـــــ عین اسی وقت اکبرؔ یہ کہہ رہے تھے:-

قدم انگریز کلکتہ سے جو دہلی میں دھرتے ہیں
تجارت خوب کی، اب دیکھیں شاہی کیسے کرتے ہیں

کس خوب صورتی سے برٹش راج کی قلعی کھولی ہے۔ داد طلب شعر ہے۔

انگریز کے سایۂ عاطفت میں مغربی تہذیب کا بے پناہ سیلاب خصوصاً ہندستانی مسلمان کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا، کیوں کہ ابھی تک:-

"بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"

جسموں پر تو فرنگی کی حکمرانی مسلّم تھی، کوئی میلی آنکھ سے انگریز کو دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ طرح طرح کے کالے قوانین قید و بند کا اہتمام کیے تیار رہتے تھے۔

اس زمانے میں اکبر کا یہ نعرہ جرأتِ رندانہ سے کم نہیں ہے:-

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ضمناً عرض کر دوں کہ اُس وقت کی سیاسی زندگی میں اس شعر کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ پرستارانِ حریت اکثر پبلک جلسوں میں اس کا ورد کیا کرتے تھے۔

ہمیں انگریز اپنی عسکریت کے دبدبے سے مغلوب و مفلوج کر چکا تو اس نے طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے ہماری مشرقی اخلاقی اقدار بلکہ مذہبی عقائد پر بھی ڈاکے مارنے شروع کر دیے۔

اب ذہنوں کی تعمیر کی مہم درپیش تھی جسے "برین واشنگ" کہا جاتا ہے۔ مغربی تعلیم کے اچھے نتائج کے ساتھ ہی ساتھ ہماری اپنی تہذیب کی تخریب بھی مطلوب

تھی۔ اکبر کس خوب صورتی سے اس مضمون کو ادا کرتے ہیں :۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
پہلے رندا تھا اب بسولا ہے

غرض کہ توپ کی جگہ اب کالج نے لے لی۔ توپ نے جسم ختم کیا کالج نے روح۔
ذرا اس رباعی کے عمیق معانی پر غور فرمائیے :۔

سر تراشا ان کا کاٹا ان کا پاؤں
وہ ہوئے ٹھنڈے گئے یہ بھی پگھل
شیخ کو یخ کر دیا مومن کو موم
دونوں کی حالت گئی آخر بدل

یہ تبدیلی تھی جس کے خلاف اکبر لڑتے رہے۔ جل کر فرماتے ہیں :۔

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

اس تبدیلی کے خلاف جب اکبر رزم آرا ہوئے تو مغرب زدگاں کی صفوں سے "قدامت پسند"، "رجعت پسند"، دقیانوسی اور نہ جانے کیا کیا پھبتیاں نہ اڑائی جاتیں۔ لیکن یہ اللہ کا بندہ، جو سرکاری ملازمت کی جکڑ بندیوں کے باوجود "قلب مومن" و "نظر مسلم" رکھتا تھا جس کا فکر اسلام کا پیغامبر تھا، جس کا دماغ اللہ تعالیٰ نے "عشق و مستی" سے گرمایا تھا، تن تنہا اپنی روش پر قائم رہا۔ لڑتا رہا ہتھیار نہیں ڈالے، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ تہذیب نو کا یہ طوفانِ بدتمیزی در اصل ہمیں ختم کرنے کے لیے ہماری طرف بڑھ رہا ہے اور اس کا پہلا بھرپور حملہ ہمارے مذہب پر ہو رہا ہے۔

تماشا دیکھیے بجلی کا مغرب اور مشرق میں
کلوں[۱] میں ہے وہاں داخل یہاں مذہب پہ گرتی ہے

ہر حکومت صحافیوں، خطیبوں اور مقرروں کو خریدنے کی کوشش میں رہی ہے۔ خیر انگریز کے تو اپنے انگریزی اخبار اس طمطراق کے تھے کہ جس کو وہ چاہیں بنائیں، جس کو چاہیں بگاڑ دیں۔ البتہ جی حضوریوں کی بھرتی جاری رہتی تھی جو ان انگریزی اخبارات میں قوم پرستوں اور آزادی کے طلبگاروں کے خلاف مضامین لکھتے اور یہ مضامین انگریزی اخباروں کے صفحۂ اول پر جلی سرخیوں کے ساتھ بہ اہتمام شائع کیے جاتے۔ بعینہ جیسے آجکل بھی بعض مضامین بعض اخبارات کے صفحات اول پر بڑی شدومد سے شائع

۱۔ کل بہ معنی مشین

کیے جاتے ہیں) اور اس کے عوض وہ ساری عمر سرکار کے گن گاتے رہتے۔

الہ آباد کا روزنامہ پائنیر (PIONEER) انگریز پرستی میں سب سے آگے تھا۔ (اکبر خود بھی الہ آباد کے رہنے والے تھے) وہ جس ہندستانی کو چاہتا بگاڑتا اور جس کو چاہتا اچھالتا۔ اس پر فرماتے ہیں :۔

پائنیر کے صفحۂ اوّل پہ جس کا ذکر ہو
میں ولی سمجھوں جو اس کو عاقبت کی فکر ہو

اور پائنیر کی "صدق بیانی" پر کیا لطیف چوٹ کی ہے :۔

گھر سے خط آیا ہے کل ہو گیا چہلم اس کا
پائنیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

غرض ان کا مقصد یہ تھا کہ فرنگیت کے ڈھول کا پول کھولا جائے۔ اس سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی حقیقت کو سمجھ کر اس کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تلقین ان کے کلام اور پیغام کا ایک خاص اور ضروری جزو ہے۔ دلوں اور دماغوں سے فرنگی اقتدار اور مغربی تہذیب کا رعب ہٹانے کے واسطے اکبر نے ایک ایسا اچھوتا مگر مؤثر اسلوب اختیار کیا جو ان ہی کا حصّہ ہے۔ سیاسی طنز اور مزاح کے نہ صرف اکبر موجد بلکہ اس اقلیم سخن کے مسلّمہ بادشاہ بھی ہیں۔ ان کو ملک نے "لسان العصر" کے خطاب سے نوازا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کے واقعات کا مرقع دیکھنا ہو تو اکبر کی روزمرّہ تنقید سے بہتر مواد مشکل سے مل سکے گا۔

وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے وہ تن تنہا حق گوئی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کو اچھی طرح علم تھا کہ اگر ان کی زبان بندی کر دی گئی تو ان کے کام کو جاری رکھنے والا اور کوئی نہ ہوگا۔ اس واسطے مغربیت کے خلاف جنگ اشکوں اور قہقہوں کے درمیان لڑی۔ Between tears and laughter لیکن اس رنگ میں جو کچھ بھی وہ کہتے تھے اس کا مقصد ایک ہی ہوتا، ان کا پیغام ایک ہی سمت لے جانے کی رہبری کرتا تھا، اور وہ سمت تھی آزادی کی دنیا۔

جو بات بڑے بڑے جیّد، حریت پسند اور جغادری سیاست داں ٹھوس، وزنی اور مدلّل الفاظ میں بھی کہنے سے حمکتے تھے اکبر مذاق مذاق میں کہہ جاتے تھے۔ چناں چہ ایک دن ہنسی ہنسی میں کہہ دیا :۔ "الٰہی خانۂ انگریز گرجا"

انگریز بہادر کے ہاں طلبی ہوئی۔ کمشنر صاحب نے پوچھا، آپ نے یہ کیا لکھ دیا؟ فرمانے لگے۔ اس میں کیا قابلِ اعتراض بات ہے۔ مسلمان کا الٰہی خانہ مسجد ہوتا ہے۔ کیا آپ اپنے الٰہی خانہ کو گرجا نہیں کہتے؟ بات آئی گئی ہوگئی۔ اکبرؔ اسی طرح استعاروں میں فرنگی کے اقتدار اور اس کی تہذیب کے مضر اثرات کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے۔

اس ضمن میں ان کی ہر بات میں چٹکی، ان کے ہر شعر میں چھپے ہوئے تیر و نشتر ہوتے تھے۔ دال میں کالا تو آپ نے سنا ہوگا۔ اس کی نئی تشریح سن لیجیے:۔

نیٹو[1] کی گذر ہے دال ہی پر
کالا اسی طرح دال میں ہے

یہ بلا قافیہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

خود فن حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر
میرے لیے چمن میں شٹل[2] کاک کا ہے کھیل
ہوتا ہوں معترض تو وہ فرماتے ہیں کہ دیکھ
تیرا ہی مشغلہ ہے لطیف اور بے ضرر

بڑے بڑے ماہرینِ اقتصادیات اب اس نکتے سے واقف ہوئے ہیں جو اکبرؔ نے پچھلی صدی کے آخر میں بیان کر دیا تھا:۔

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند
اور یہ بھی غلط کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و فرماں بردارِ انگلش
یورپ کے لیے بس اک گودام ہے ہند

وہ پہلو بچا کر وار کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ضرورتاً ظرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا جس پر لوگ ان کو ظریف شاعر کہنے لگے تھے۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اکبرؔ کی ظرافت میں بھی سنجیدگی اور عبرت کے رموز و معانی پنہاں تھے۔ وہ بلا وجہ چٹکیاں نہ لیتے تھے۔ ان کی چھیڑ کا ہمیشہ وہی خاص مقصد ہوتا تھا جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

ہم تو انساں سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور
آپ خوش قسمت تھے جو بندر سے انسان ہوگئے

---

1. Native 2. Shuttle Cock

یہ بھی ملاحظہ ہو :۔

سرافرازی ہو اونٹوں کی تو گردن ماریے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہیے

ایک دفعہ میں نے عرض کیا آپ جو کچھ چاہتے ہیں کھلم کھلا کیوں نہیں کہتے۔ اپنے خط مؤرخہ ۹ مارچ ۱۹۲۰ء میں اس کا جواب عنایت فرماتے ہیں :۔

"میرے ظریفانہ اشعار میں بھی ایک حکمت ہے۔ دوسرے تقاضائے مصلحت بھی اس زمانے میں تھا"

بزرگیوں پر فلک کے برچھے ہر ایک جانب تنے ہوئے ہیں
یہی سبب ہے جنابِ اکبر جو طفلِ ناداں بنے ہوئے ہیں

پہلے دلّی دربار (لارڈ کرزن والے) کے متعلق فرماتے ہیں :۔

اَوجِ بخت ملاقی ان کا چرخِ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا آنکھیں میری باقی ان کا

دوسرے دلّی دربار (۱۹۱۱ء کے جارج پنجم والے) کا تلخ سبق ان کی زبان سے سُنیے :۔

مشرقی پُتلوں میں تھی خدمت گذاری کی اُمنگ
مغربی شکلوں سے شانِ خود پسندی آشکار
انقلابِ دہر کے رنگین نقشے پیش تھے
تھی پئے اہلِ بصیرت باغِ عبرت میں بہار
ذرّے ویرانوں سے اُٹھے تھے تماشا دیکھنے
چشمِ حیرت بن گئی تھی گردشِ لیل و نہار

مسلمانوں کی دلّی پر عیسائی فرنگی کی حکمرانی کو جس طرح اکبر کی حسّاس طبع نے محسوس کیا تھا کاش کہ یہ جذبہ آج بھی ہم میں پیدا ہو جائے اور بے عزّتی اور بے غیرتی کو ہم اپنا قومی شعار بنانا ترک کر دیں۔

ملکی اور سیاسی معاملات میں اکبر کا نظریہ وہی تھا جو سرسید کا تھا۔ یعنی "ہندو اور مسلم دو الگ قومیں ہیں" یہی علامہ اقبال کا نظریہ تھا اور یہی مسٹر محمد علی جناح کا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا یہ نظریہ تھا۔

اس ضمن میں ان کا خطاب زیادہ تر ہندستانی مسلمان سے ہوتا تھا۔ وہ اسے

یہی تعلیم دیتے رہے کہ تو ایک خاص ملّت کا جزو ہے۔ تیرا مقام علاحدہ ہے۔ ہندو سے تیری ملکی معاملات میں نہیں نبھ سکے گی :۔

امورِ ملکی کی بحث میں تم ہوئے اگر ہندوؤں کے ساتھی
نہ لاٹ صاحب خطاب دیں گے نہ راجہ جی سے ملے گا ہاتھی

..یہی وہ پیغام تھا جو آخر میں پاکستان کی شکل میں رونما ہوا۔ عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ایک سرزمین حاصل کرنے کی خواہش جس میں ہم وسیع معنوں میں اسلامی زندگی بسر کر سکیں ۔ یہ تھا وہ جذبہ جو پاکستان کی تخلیق کا باعث ہوا۔ مقامِ عبرت ہے کہ آج اسی پاک سرزمین کے رہنے والے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان محض ایک اخلاقی جذبے کی تخلیق ہے۔ گویا کہ ان حساب دانوں کے مطابق مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ کے تلخ اسباق اور جنگِ آزادی میں ہمارے مجاہدین، حسرت موہانی، مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں اور شمع آزادی کے دیگر ہزارہا پروانوں کی قربانیاں، تقسیم ملک کے قریب لاکھوں شہیدوں کا خون، بے شمار عصمتوں کی بربادی، ہزاروں خاندانوں اور کروڑوں، اربوں کی املاک کی تباہی، اس قیامتِ صغریٰ کے واقعات یہ سب رُپے، آنے، پائی کی صورت میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں! "ڈالر" کے ان پرستاروں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اب بھی خدا کے فضل سے پاکستان میں عظیم اکثریت ان کی ہے جن کا ایمان ہے کہ یہ مملکت اسلام کے فروغ کے واسطے بنی تھی اور انشاء اللہ پاکستان اسلامی ریاست بن کر رہے گا۔

نورِ خدا ہے کُفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اکبرؒ کا پیغام مسلمانوں کو سیاسی اور ملکی نجات کی طرف لے جانے میں بہت کارآمد ثابت ہُوا۔ اُن کی اور حالی و شبلی و حسرت کی تعلیمات نے بل ڈوزر کا کام کیا۔ جب تک یہ لوگ زمین ہموار نہ کرتے اقبال اس میں اپنے اعجازِ کلام سے گل کاری نہ کر سکتے تھے۔ اور قائدِ اعظم کے واسطے پاکستان کی روش ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ اس صورت میں اکبر کا مقام مسلمانوں کے بہت بڑے محسنین میں ہے۔ افسوس کہ اس قوم نے اپنی بے حسی اور تغافل سے اپنے ایک ایک محسن کی تعلیم سے روگردانی کی۔ لیکن جب ہم اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم کو پسِ پشت ڈال سکتے ہیں تو اکبر و اقبال، شبلی و حالی کون سے شمار و قطار میں ہیں۔

اکبرؔ کا شعر Topical یعنی حسبِ حال ہوتا تھا، روزمرّہ کے واقعات سے تعلق رکھتا تھا اور وقت کی آواز ہوتا تھا۔ اس خصوصیت نے انھیں لسان العصر کہلوایا۔ اور افسوس ہے کہ یہی بات ان کے کلام کے اس بڑے حصّے کو اس وقت تک قابلِ فہم نہیں بنا سکتی جب تک ہمیں اس کی شانِ نزول، اس کے سیاق وسباق اور ان واقعات سے واقفیت نہ رکھتے ہوں جن کے ماتحت اس قسم کے مخصوص اشعار کہے گئے تھے۔ مجھے ڈر ہے کہ ان کے اشعار کا یہ حصّہ اب عام پڑھے لکھّے لوگوں کو یاد نہیں رہے گا۔ محقّقین کے لیے دل چسپی کا باعث رہ جائے تو ممکن ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آدمی محض گزشتہ واقعات کی بھول بھلّیوں میں ہی چکّر کاٹتا رہے۔ امروز و فردا کا بھی خیال رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عرض بھی قابلِ غور ہے کہ کہاں سے چلے تھے، کیوں چلے تھے، کدھر جانا ہے؟ یہ شکلی مضامین بھی مدّنظر رکھنا ضروری ہیں۔ ورنہ آسان زندگی کی راہ تو کھلی ہے جس کی طرف اکبرؔ نے طنزاً اشارہ کیا ہے:-

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر، اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

یا اس سے بڑھ کر ہم یہ تیر مار سکتے ہیں:

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔ اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

سیاق وسباق کے ساتھ ساتھ اکبرؔ کی مخصوص اصطلاحوں سے واقفیت بھی لازم ہے۔ اس کے بغیر بھی ان کے کلام کے بعض حصّوں کی سمجھ ادھوری رہ جاتی ہے اور پورے معانی ظاہر نہیں ہوتے۔ اونٹ سے مراد تہذیبِ حجازی، گنگا سے مراد ہندو ماحول اور ہندو کا پھندا:-

اونٹ گنگا میں بہہ گیا افسوس
ہند میں شیخ رہ گیا افسوس
سبزہ پا کر کر گئیں گائیں کلیل
اونٹ کانٹوں پر پٹکتے ہی رہے

گائے سے مراد ہندو، بندر سے مراد فرنگی، انجن سے مراد مغربی میکانکی تہذیب

مجوّزہ حجاز ریلوے کے متعلق فرمایا :-

مکّہ تک ریل کا سامان ہُوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہُوا چاہتا ہے

اکبرؔ کے کلام کا یہ حصّہ باوجود اپنی بوقلمونیوں کے شاید زندہ جاوید نہ رہ سکے لیکن اکبر کا وہ بیشتر حصّۂ کلام جو :

انسان کو اپنے فطری ماحول سے وابستہ رہنے کی تلقین کرتا ہے ،
اس کو اپنی اصلیت سے آگاہ رہنے کی تعلیم دیتا ہے ،
جو اخلاقیات کا درس دیتا ہے ،
عزّتِ نفس اور خودداری کی تاکید کرتا ہے ،
جو عبرت آموز نصیحت کا نچوڑ ہے ،
فطرت کے مطالعہ پر زور دیتا ہے ،
الٰہیات و عرفان کا سبق دیتا ہے ،
تصوّف و عارفانہ رنگ سے لبریز ہے ،
جس میں حکیمانہ بذلہ سنجیاں بھی ہیں ،
تہذیبِ حاضر کی ظاہری چمک اور کھوکھلے پن کا راز فاش کرتا ہے ،
اپنی عظمتِ رفتہ حاصل کرنے کا شوق بھی دلاتا ہے ۔
علم مجلس سکھاتا ہے ۔

غرض وہ سب کلام جو آدمی کو انسان بناتا ہے وہ پائیدار اور مستقل ہے اور اس کا گہرا مطالعہ یقیناً ہمیشہ جاری رہنا چاہیے ، اس بلند اور پاکیزہ کلام کے چند نمونے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔

فطری ماحول سے وابستہ رہنے کے متعلق فرماتے ہیں :-

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمھیں
اچھا جوابِ خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

ایک اور شعر ہے :

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ مذہب میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

نقالی کے خلاف کس لطیف پیرائے میں نصیحت فرمائی ہے! یہ اشعار بھی خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہیں:-

تو وضع پہ اپنی قائم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر
گو تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے
رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ درِ تاثیر نہ کر

اپنی اصلیت سے آگاہی کا درس ملاحظہ ہو:-

جو ایئرشپ پہ چڑھے تو ایسے کہ جیسے کوئی خدا نہیں ہے
جو ایئرشپ سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتا نہیں ہے

اخلاقیات کی تعلیم کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:-

ایک بوڑھا نحیف و خستہ و زار
اک ضرورت سے جاتا تھا بازار
ضعفِ پیری سے خم ہوئی تھی کمر
راہ بے چارہ چلتا تھا جھک کر
چند لڑکوں کو اس پہ آئی ہنسی
قد پہ پھبتی کمان کی سوجھی
کہا اک لڑکے نے یہ اس سے کہ بول
کتنے کو لی کمان تو نے مول
پیر مرد لطیف و دانش مند
ہنس کے کہنے لگا کہ اے فرزند
پہنچو گے عمر کو مری جس آن
مفت مل جائے گی تمھیں یہ کمان

بزرگی اور عمر کے احترام کا سبق کس دل کش اور موثر پیرایے میں ذہن نشین کرایا ہے۔

اسی مضمون کی ایک اور رباعی پیش کرتا ہوں۔ موجودہ دور کی بد اخلاقی پر چبھتا طنز ہے:-

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی
من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

لیکن اخلاقی نظریں اس سے تو بہتر ہے یہ
من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو

اپنے صاحبزادے کو لکھتے ہیں :-

تحقیقِ علوم کر کہ دولت ہے یہی
اخلاق درست کر کہ امنیت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت
محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی

الہ آباد یونیورسٹی کی ٹکسٹ بک کمیٹی کا جلسہ تھا ۔ درسی کتب کے انتخاب کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اکبر کمیٹی کے ممبر تھے لیکن ناسازی طبع کی وجہ سے شریک جلسہ نہ ہو سکے۔ البتہ اپنی رائے ایک شعر کے ذریعے کمیٹی کو بھیج دی :

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

علم مجلس ہمارے ہاں کبھی تعلیم کا ایک ضروری جزو تھا اور اب وہ مفقود ہوتا جاتا ہے ۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ اُٹھ گیا ہے ۔ بے رہ روی اور بے جا آزادی نے اپنا سکہ جما رکھا ہے۔ آدابِ محفل کا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔ اس ضمن میں اکبر کی نصیحت ملاحظہ ہو :

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے
مشکل ہے اثر مگر پرائے دل میں
ایسا سنیے کہ کہنے والا اُبھرے
ایسی کہیے کہ بیٹھ جائے دل میں

ہماری مشرقی تہذیب کی اقدار یقیناً ایسی ہیں کہ ان کو قائم رکھنا ضروری ہے ۔ اکبر کی ساری عمر اسی کوشش میں گزری کہ ہم کچھ بھی کریں مشرق کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو پسِ پشت نہ ڈال دیں۔

عزتِ نفس اور خود داری کی تلقین اکبر کے کلام کا ایک خاص حصہ ہے جو شاید اس لیے اتنا مقبولِ عام نہ ہو کہ وہ مشکلات میں زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے ۔

پاسِ وضعداری کا سبق سنیے :-

وہ چاہتے اس کو دم دے کے میں بلاؤں
یاں دل میں یہ ٹھنی ہے مر جاؤں اور نہ جاؤں

اس طرز کو بھی ملاحظہ فرمایئے :-

ناک رگڑی برسوں اِس ارمان میں
سُن لیں میری بات اک دن کان میں

اسی رنگ میں ایک اور شعر حاضر ہے :-

کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پروا
تھینک یو دیر میں سننے کے لیے کان تو ہیں

یہ اشعار (جو معانی سے لبریز ہیں) قابلِ ملاحظہ ہیں :-

ہوں میں پروانہ مگر شمع تو ہو رات تو ہو
جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو
دل بھی حاضر سرِ تسلیم بھی خم کو موجود
کوئی مرکز ہو کوئی قبلۂ حاجات تو ہو

اور مجھے تو یہ شعر اس ضمن میں بہت ہی پیارا لگتا ہے :-

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

درحقیقت مومن کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔

اظہارِ حق اور آزادیٔ گفتار سے محروم لوگوں کو زندہ قوموں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اکبرؒ شدت سے انگریز کے زمانے کی پابندیوں کو محسوس کرتے تھے۔

عبرت اور نصیحت بھی اس پیرائے میں کی ہے کہ اپنے عظیم مقاصد کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ایک غیر قوم، ایک غیر مذہب اور ایک غیر تہذیب کے تسلط کو وہ ہمیشہ ایک لعنت قرار دیتے رہے۔

ملاحظہ فرمایئے :-

جو دیکھی ہسٹری اس بات کا کامل یقین آیا
جسے مرنا نہیں آیا اُسے جینا نہیں آیا

فطرت کا مطالعہ انسانی صفات پیدا کرتا ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی ان صفات کو جِلا دیتی ہے۔ خود مغرب والے اپنی زندگی کے بڑھتے ہوئے مصنوعی ماحول سے

بے زار ہو رہے ہیں۔ سَو سَو منزلہ عمارتوں میں رہنے والے جنگل اور صحرا، کوہ و بیاباں کے سفر کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ آدمی اس وقت تک انسانیت کے اوصاف سے مزین نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ فطرت کا ہم نوا نہ ہو۔

بقول اقبالؔ :-

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اکبرؔ کی فطرتِ پرستی کی ترنگ ملاحظہ ہو:-

مست کر دیتی ہے مجھ کو فصلِ گل میں بوئے گل
وجد میں لاتی ہے حالت سبزہ و اشجار کی
بھینی بھینی ہائے وہ نارنج کے پھولوں کی بُو
جس پہ سو جانیں فدا ہوں طبلہ و عطّار کی
قطرہ ہائے شبنمِ پاکیزہ پتّوں پر نہیں
سبز پریوں پر چمک ہے موتیوں کے ہار کی
ناچتا ہوں صحنِ گلشن میں ہوا کے ساتھ ساتھ
ہم نوائی چاہتا ہوں بُلبُلِ گلزار کی
مجھ کو دیوانہ بنا دیتا ہے فطرت کا جمال
عارضِ گل سے خبر ملتی ہے روئے یار کی

ع عارضِ گل سے خبر ملتی ہے روئے یار کی۔ سبحان اللہ! اسی رنگ میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

تمھیں دیکھ حُسن کے فطرت نے یہ نقش کھینچے ورنہ
نہ یہ چشمِ نرگس ہوتی نہ یہ گل کا گوش ہوتا

اور یہ رباعی بھی قابلِ ملاحظہ ہے:-

غنچہ رہتا ہے دِل گرفتہ پہلے
رنگِ چمنِ فنا سے گھبراتا ہے
کہتی ہے نسیم آ کے رازِ فطرت
سنتے ہی پیامِ دوست کِھل جاتا ہے

اکبرؔ کی بیشتر رباعیاں الٰہیات، عرفان اور توحید پرستی سے متعلق ہیں۔ اہلِ ذوق

ان کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ اس محدود وقت میں ان کے اشعار کے صرف چند نمونے پیش کر سکتا ہوں :۔

اللہ کو جگہ دے تو اپنے دل میں اکبرؔ
اللہ خود ہی دے گا تجھ کو جگہ دلوں میں

اللہ ہی کو سمجھو مقصودِ علم و دانش
اللہ ہی کو چاہو ہستی کی منزلوں میں

فرماتے ہیں :۔

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے
خدا کیا ہے۔ خدا ہے اور کیا ہے

حق الیقین کی اس منزل پر پہنچنا کسی معمولی انسان کا کام نہیں ہے۔

اس مضمون پر غور فرمایئے گا :۔

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

میں تو کوئی عالمِ دین یا صوفی یا عارف نہیں ہوں لیکن اتنی بات تو میری بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر خدا کا تصور ہم نے اپنی محدود عقل اور محدود ذہن کے مطابق کیا تو پھر وہ خالق تو نہ رہا ہماری تخلیق ہو گیا۔ نعوذ باللہ! خدا کی ہستی پر ایمان اعتقاد پر مبنی ہے، وہ خشک بحثوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ فرماتے ہیں :۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اور ہم محض پڑھے لکھے کیا کر رہے ہیں :۔

توحید ان کے دلوں میں محفوظ نہیں
اللہ کے ذکر سے یہ محظوظ نہیں

اس فرقۂ نو میں نے دیکھا اکبرؔ
اسلام ان کی نظر میں ملحوظ نہیں

ایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے :۔

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

پایا اگر فروغ تو صرف ان نفوس نے
وہ جن کی خضرِ راہ فقط شمعِ دین رہی

بے ثباتیٔ دنیا پر یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

دنیا ابھارتی ہے آج اپنے عاشقوں کو
مرجائیں گے تو ان کا کل نام بھی نہ لے گی

اہلِ دِل حضرات اس شعر کو سُن کر سر دھنیں گے:۔

طوفانِ جوشِ دِل کی آنسو میں اک جھلک ہے
موتی میں کیا دھرا ہے بس ایک بوند پانی

ایک روزمرہ مشاہدے سے کیا سبق لیا ہے۔ کسی انسان کی عظمت ہی یہ ہے کہ روزمرہ کے واقعات اور مضامین سے بڑے بڑے اسباق اور نتائج مرتب کرسکے۔

عرفان کی تعلیم کا کیا اچھوتا طریقہ اختیار کیا ہے:۔

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں
اک آن میں سو طرف کو مُڑتی دیکھیں
بھولی، خوش رنگ، چست، نازک، پیاری
پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم
وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم
کِس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں
پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں
ان جانوروں میں گر اسکول کہاں
فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
اِس سمت اگر خیالِ انسان بڑھ جائے
دامانِ نظر پہ رنگِ عرفان چڑھ جائے

میں عرض کرچکا ہوں کہ مغرب اپنی بڑھتی ہوئی مصنوعی زندگی کے مضر اثرات سے ڈرتا ہے لیکن اس کے پھندے سے نہیں نکل سکتا۔ آپ ان کے کسی بڑے اور جدید ہوٹل میں چلے جائیں، دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی آپ ایک نئی لیکن بالکل غیر فطری اور مصنوعی دنیا میں داخل ہوجائیں گے۔ سب سے اوّل تو آپ کو ایرکنڈیشنڈ ہوا میں

سانس لینا ہوگا۔ گویا کہ سانس بھی آپ قدرتی فضا میں نہیں لے سکتے۔ پھول پتّے سب مصنوعی پلاسٹک کے۔ نہ ان میں خوش بُو نہ ان میں جاذبیت۔ خوراک وہ جو مہینوں نہیں تو ہفتوں تو یقیناً برفانی گوداموں میں گزار کر اپنی اصلیت کھو چکی ہے۔ اور تو اور سب مکینوں کی گفتگو ایسی ہوتی ہے جس کو اکبرؒ کے اس شعر سے واضح کیا جا سکتا ہے:۔

جو ہے زباں پہ دل سے نہیں اس کو واسطہ
جو دِل میں ہے وہ لا نہیں سکتے زبان پر

موجودہ تہذیب کو بے حقیقت اور اس کے بودے پن کو اُجاگر کرنے میں اکبرؒ نے خاصا وقت گزارا اور ان کے بہت سے اشعار اس مضمون سے متعلق ہیں۔ صرف دو شعر پیش کرتا ہوں:۔

یہ جگنو بھی نئی ہی روشنی سے ملتے جُلتے ہیں
اندھیرا ہی رہا جنگل میں گو یہ جابجا چمکے

اور یہ شعر تو بہت بلیغ ہے۔ بار بار غور کرنا ضروری ہے:۔

سطحِ زمین سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو
نظروں میں پھلجھڑی سے گو پھول جھڑ رہے ہیں

حکیمانہ بذلہ سنجیاں اکبرؒ کے پیغام کا ایک خاص جزو ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

الا یا ایہا الطفلک بجو را بین، بہ ناولہا
کہ قرآں سہل بود اوّل۔ ولے افتاد مشکلہا
بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلوں
کہ سر سیّد خبر دارد زراہ و رسم و منزلہا۔

اس زمانے میں ڈاسن کا بوٹ بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اس کے متعلق اکبرؒ نے ایک اور جگہ کہا ہے:۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جُوتا چل گیا

ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

دیکھیے قوال بے چارے کا اب کیا حشر ہو
شیخ صاحب کو تو لکچر پر بھی وجد آنے لگا

DAWSON[1]

کیوں کرے گا پیش ہم پر جلوۂ حورِ بہشت
جب تھیٹر کا سماں واعظ کو تڑپانے لگا

اور اس شعر کا لطف اُٹھا ہے۔ بعض صورتوں میں حسبِ حال ہے:۔

ایسا شوق نہ کرنا اکبرؔ گورے کو نہ بنانا سالا
بھائی رنگ یہی ہے اچھا ہم بھی کالے یار بھی کالا

ایک بڑے جھوٹے الزام کو کس طرح چٹکیوں میں اڑایا ہے:۔

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزورِ تیغ
یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزورِ موت

مومن کے شعر کو حسبِ حال کیا ہے۔ کیسے معانی پیدا کیے ہیں:۔

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی
نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

ہماری پائے مردی پر کیا خوب صورت چوٹ کی ہے:۔

اُٹھے تو تھے ولولہ یہ لے کر کہ صرف یادِ خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

انسان کی حقیقت پر اکبرؔ کی ایک بلا قافیہ نظم ہے۔ چوں کہ میں اس سے بہت متاثر ہوتا ہوں اس لیے آپ کی خدمت میں بھی پیش کرتا ہوں:۔

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا قصدِ ضرر اس کو ہٹایا میں نے انگلی سے
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا
ابھی وہ روشنی میں شمع کی کاغذ پہ پھرتا تھا
ابھی یوں مٹ گیا وہ جنبشِ انگشتِ انساں سے
لیا میرے سوا نوٹس ہی کس نے اس کا دنیا میں
نہ تھی فطرت کی کیا کاری گری اس کے بنانے میں

نسب نامہ بھی اُس کا عالمِ ذرّات میں ہو گا
یہی تھی اس کی ہستی اور اس میں اس کی مستی تھی
نہ ماتم کرنے والا ہے نہ لائف لکھنے والا ہے
وہ دھبّا درسِ عبرت دے رہا ہے مجھ کو اے اکبرؔ
معاذاللہ کیا سمجھا ہے تو نے اپنی وقعت کو
تجھے بھی صفحۂ روئے زمیں سے ایک دن آخر
مٹا دے گی کوئی تحریکِ فطرت حکمِ باری سے
عجب حسرت سے میں یوں دیکھتا ہوں داغ کاغذ کو
میری نظروں میں تو نقشہ یہ ہے دنیائے فانی کا
صریحاً جسم تھا۔ اک جان تھی۔ احساس تھا اس میں
اور اب دھبّا سا ہے کیا جانے کوئی کیسا دھبّا ہے
عجب کیا ہے جو سمجھے کوئی پنسل کی لکیر اس کو
معاذاللہ معاذاللہ سنّاٹے کا عالم ہے
بہت جی چاہتا ہے روؤں اس ہستی کے دھبّے پر

سادہ الفاظ میں اور ایسے دل نشین اور موثر پیرائے میں ہستی کی حقیقت کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اہلِ دل یقیناً اس کی داد دیں گے۔ ایسا تاثر صرف اہلِ ایمان ہی پیدا کر سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت عطا فرمائی ہے۔

اتنے عظیم شاعر اور اتنے بڑے پیامی کی تعلیمات کو اگر چند لفظوں میں بیان کرنا ہو (اور میرے لیے تو یقیناً ممکن نہیں۔ تاہم ایک ناکام کوشش سی کرتا ہوں) تو میں کہوں گا کہ اکبرؔ کا پیغام یہ تھا! "انسان بنو اور مسلمان بنو"، کہ میری رائے میں مسلمان بننا انسانیت کی معراج ہے۔

اکبرؔ نے اس پیغام کو کس کامیابی سے ملّتِ اسلامیہ تک پہنچایا اور ان کے پیغام کا کیا بلند درجہ تھا اس کا جائزہ مجھ جیسے عامی پر نہ چھوڑیے۔ اس کی زبان سے سنیے جسے آپ ترجمانِ حقیقت کہتے ہیں۔

اکبرؔ کی وفات پر جو کچھ اقبالؔ نے کہا وہ کم از کم میرے لیے تو سند ہے:-

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبرؔ
حیاتش بحق بود روشن دلیلے
سرِ ذرّہ طورِ معنےٰ کلیمے
بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
ز دلہا ربائندہ لات و عزیٰ
بہ جانہا کشائندہ سلسبیلے
گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے
گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے
دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۲۰ جون ۱۹۶۵ء

مُلّا واحدی صاحب

کسی اہلِ فکر و نظر کے ساتھ ایک شام مل بیٹھنے اور اس صحبت سے استفادے کا سلسلہ کراچی سے شروع ہوا اور سلسلہ دراز ہو کر لاہور تک جا پہنچا۔ کراچی کی صحبتیں زیادہ تر سائنسی رہیں، مگر لاہور جا کر انھوں نے زیادہ تر ادبی رنگ اختیار کر لیا اور پابندی اس طرح ہوئی کہ گزشتہ ڈھائی سال سے ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کی شام کو یہ مجلس بڑی پابندی سے ہو رہی ہے۔ لاہور کی ایک شام میں جناب جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان، کرنل مجید ملک صاحب، اور خان بہادر حکیم احمد شجاع صاحب جیسے دوستوں اور بزرگوں نے اس مجلس کا نام "شامِ ہمدرد" رکھ دیا۔ آپ کی خدمت میں جو دعوت نامہ آج کی مجلس کے لیے پہنچا ہے، اس پر "شامِ ہمدرد" اسی مناسبت سے چھاپا گیا ہے۔

مہمانِ معزز کے بارے میں چند کلمات ادا کرنے کا فخر ہمیشہ مجھے ہی حاصل ہوتا ہے، مگر آج کے مہمان مقرر جناب محترم مُلّا واحدی صاحب کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ بڑے شوق و اشتیاق کے ساتھ میرے ایک صادق القول دوست نے کیا تھا۔ گفتنی ناگفتنی وہ ایسے حالات سے دوچار ہوئے کہ ایسا نہ کر سکے۔ آج ہی دوپہر کو میں نے اُن کو پکڑا اور چاہا کہ ان کو ایک کمرے میں بند کر دوں اور اندر ساتھ قلم کاغذ رکھ دوں، مگر حادثہ ایسا پیش آیا کہ جس کمرے میں مَیں ان کو بند کر کے لکھوانا چاہتا تھا اسی کمرے میں وہ مجھے بند کر کے اپنے کسی مؤکل کے پاس چلتے ہوئے اور مجھ سے کہہ گئے کہ میں روایت برقرار رکھوں۔

سو خواتین و حضرات، میں نے آج کے مہمان مقرر اور اپنے بزرگ جناب مُلّا واحدی صاحب کے بارے میں چند کلمات لکھ لیے ہیں، جو مَیں آپ کے سامنے کہنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

مُلّا واحدی صاحب

دہلی کے قدیم ادیب وصحافی جناب واحدی صاحب کے بزرگوں نے اِن کا نام محمد ارتضٰے رکھا تھا مگر مصوّرِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے اِن چہیتے دوست، مُرید اور رفیق کو 'واحدی' کا خطاب دیا اور اس خطاب کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اصل نام خطاب کے حجاب میں پوشیدہ ہو گیا۔ ان کے عالی نسب ہونے کا اندازہ اس تاریخی واقعہ سے لگایئے کہ شاہ جہاں نے جب دلّی بسائی، جامع مسجد اور لال قلعہ بنوایا تو بخارا سے تین صحیح النسب سیّد بلوائے۔ ایک جامع مسجد کی امامت کے لیے، دوسرا نمازِ عیدین عیدگاہ میں پڑھانے کے واسطے، تیسرا ہاتھی پر اپنے اور مہاوت کے درمیان بیٹھنے کی غرض سے۔ سیّد کے سِوا کِس کی مجال تھی کہ نماز میں بھی بادشاہ کی طرف پشت کر سکتا۔ ہاتھی پر مہاوت اور بادشاہ کے درمیان جو سیّد بیٹھتے تھے، ان کی پشت مہاوت کی طرف رہتی تھی اور مُنھ بادشاہ کی جانب ہوتا تھا۔ اس عہدے دار کا خطاب فوج دار خاں تھا۔ آخری فوج دار خاں میر نجف علی صاحب کی بیٹی واحدی صاحب کی پردادی تھیں، جن کی وجہ سے واحدی صاحب کا خاندان فوج دار خانی کہلاتا ہے۔

واحدی صاحب کے پردادا جناب میر محمد اکبر معروف بہ حکیم شاہ ارزانی کی اولاد تھے۔ حکیم شاہ ارزانی وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے طِبِّ یونانی کی کتابوں کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور اس ترجمے کی سہولت نے طِبّ کو عام اور ارزاں کر دیا تھا۔ اسی نسبت سے حکیم ارزانی مشہور ہوئے۔

واحدی صاحب ۱۷ مئی ۱۸۸۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم پائی۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں والدِ بزرگوار کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اس لیے مالی پریشانی نہیں اُٹھانی پڑی۔ قدرت نے واحدی صاحب کو ایسی سیر چشمی عنایت فرمائی تھی کہ انھوں نے کبھی دولت جمع کرنے کی ہوس نہیں کی۔ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے تعلقات اور اثرات سے لوگوں نے بہت کچھ فائدے اُٹھائے، مگر باوجود ان کے اس قدر مقرب ہونے کے واحدی صاحب نے ہمیشہ اپنے وقار اور خودداری کو قائم رکھا۔ مسٹر آصف علی بیرسٹر واحدی صاحب کے ہم محلّہ، ہم جماعت اور تقریباً ہم عمر تھے۔ ایک موقع پر واحدی صاحب نے اُن سے اپنا تقابل کرتے ہوئے فرمایا، "آصف علی بچپن میں میرے ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھے۔ انھوں نے انگلستان جانے کی ٹھانی، میں سُلطان جی کی طرف چل پڑا۔ وہ بیرسٹر ہو گئے، مَیں نے ملّائیت اختیار کر لی۔ وہ وزیر بنے، سفیر رہے، گورنر رہے، میرے حال پر بھی اللہ کا کرم ہے۔"

طالبِ علمی کے زمانے میں مُلّا واحدی صاحب کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے مضامین

پڑھ کر اُن سے ملاقات کا اشتیاق ہُوا، لیکن ملاقات ایک عجیب طریقے سے ہوئی۔ واحدی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ مکان کے صحن میں لیٹا ہوں، رات کا وقت ہے۔ یکایک چاند کے اندر سمندر نظر آنے لگا اور سمندر میں سے کوئی غوطہ خور سمندر کی چیزیں نکال کر زمین کی سمت چلا اور دیکھتے دیکھتے میرے گھر میں اُتر آیا۔ چند روز بعد واحدی صاحب کو چاندنی چوک میں اپنے محلّے کے ایک شاعر محمد مرزا صاحب کی دکان پر جانے کا اتفاق ہُوا کہ اتنے میں برابر کی دکان سے ایک صاحب اُٹھے اور مرزا صاحب کے پاس تشریف لائے۔ واحدی صاحب نے غور جو کیا تو ہو بہو وہی "غوطہ خور" نکلے! مرزا صاحب نے تعارف کرایا کہ آپ خواجہ حسن نظامی صاحب ہیں اور خواجہ صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں واحدی صاحب کو کچھ ایسا مسحور کیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُن ہی کے ہو گئے۔

واحدی صاحب کا خیال تھا کہ اپنے دوست آصف علی صاحب کی طرح بیرسٹر بنیں، لیکن جب خواجہ صاحب کو اس کا علم ہُوا تو انھوں نے کہا، "بیرسٹر مشو چیزے دیگر شو" اور کچھ ایسی دل نشین باتیں کیں کہ واحدی صاحب مطمئن ہو گئے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کو واحدی صاحب جیسے مخلص، قابل اور منتظم رفیق مل جانے کے بعد انھیں یہ ضرورت نہ رہی تھی کہ وہ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرگرداں ہوتے۔ زندگی کے ابتدائی دَور میں واحدی صاحب ہی نے اُن کو یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اِنتظامی معاملات کے تفکّرات سے بے فکر ہو کر تصوف اسلام کو نئے تقاضوں کے مُطابق مسلمانوں کے لیے پیش کر سکیں۔

۱۹۰۸ء میں خواجہ صاحب نے حلقہ نظام المشائخ کے مقاصد کی تبلیغ کے لیے رسالہ "نظام المشائخ" جاری کیا۔ خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور واحدی صاحب نائب۔ بعد ازاں ۱۹۱۲ء میں خواجہ صاحب "نظام المشائخ" کی ملکیت سے دست بردار ہو گئے تو واحدی صاحب نے نظام المشائخ کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا کام بھی شروع کیا۔ چھاپہ خانہ کھولا۔ مصورِ غم مولانا راشد الخیری اور دوسرے مصنفوں سے کتابیں لکھوائیں اور چھاپے خانے میں چھپوائیں اور اپنے کاروبار کو وسعت دی۔ واحدی صاحب نے علاّمہ راشد الخیری سے "صبحِ زندگی" کے دوسرے حصّے "شامِ زندگی" کو جس طرح لکھوایا وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہُوا یوں کہ حسبِ معمول ایک دِن جو مولانا راشد الخیری واحدی صاحب کے ہاں تشریف لائے تو واحدی صاحب نے عارف ہسومی کے ساتھ مل کر یہ سازش کی کہ مولانا راشد الخیری کو ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس کمرے میں میز کرسی اور لکھنے کا سارا سامان تھا۔ مولانا سے کہہ دیا گیا تھا کہ لکھیے یا نہ لکھیے، کمرہ دو گھنٹے سے پہلے نہیں کھلے گا۔ دو گھنٹے کے بعد مولانا برآمد ہوئے۔ پسینے میں شرابور، مگر بہت شگفتہ۔ کہا سُنایئے کیا لکھا؟ مولانا نے جو لکھا تھا، سُنایا۔

غرض مولانا روزانہ اسی طرح کمرے میں بند کر دیے جاتے اور دو گھنٹے بعد مسکراتے ہوئے برآمد ہوتے اور لکھا ہوا سُناتے۔ "شامِ زندگی" اس طرح بائیس دن میں لکھی گئی تھی۔

نظام المشائخ کے علاوہ واحدی صاحب نے کئی ادبی ماہ ناموں اور ہفتہ وار اخبارات کی ادارت بھی کی۔ اپنے پرچوں کے علاوہ ملک کے دوسرے اخبارات ورسائل میں مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ واحدی صاحب ۱۹۱۲ء سے تقریباً روزانہ مسیح الملک جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب سے ملتے رہے۔ حکیم صاحب نے آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبّی کانفرنس کے آرگن ہفت روزہ "طبیب" نکالنے کے لیے واحدی صاحب کو منتخب فرمایا۔ چناں چہ ایک سال تک "طبیب" واحدی صاحب کی ادارت میں نکلتا رہا۔ حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے میں واحدی صاحب نے ہندستان کی چوٹی کی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ اسی طرح خواجہ صاحب کے ساتھ بڑے بڑے لوگوں سے ملے۔

واحدی صاحب اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب دہلی کی سُنّی مجلسِ اوقاف میں ڈھائی برس تک ساتھ رہے۔ واحدی صاحب مجلس کے رُکن تھے اور نواب زادہ صاحب صدر۔ واحدی صاحب تیرہ ۱۳ سال دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر رہے اور شہر دہلی کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ جس گلی میں دہلی کے مشہور شاعر حکیم مومن خاں مومنؔ رہتے تھے، اس گلی کا نام "گلی حکیم مومن خاں" رکھوایا۔ جس سڑک پر سرسیّد صاحب کا مکان تھا، اس سڑک کا نام "سرسیّد روڈ" رکھوایا۔

اگرچہ اب واحدی صاحب کا شمار بھی اگلے وقتوں کے لوگوں میں ہوتا ہے، لیکن انھوں نے اپنے زمانے میں اُن لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا، جن پر اگلے لوگوں کا اطلاق ہوتا تھا۔ واحدی صاحب نے مولانا محمد حسین آزاد کو اُس دن دیکھا، جس دن مولانا عالمِ وارفتگی میں لاہور سے دِلّی پہنچے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر مولانا کے پڑوس میں رہا کرتے تھے اور واحدی صاحب پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ اُن کا ایک عرصے تک یہ معمول رہا کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر واحدی صاحب کے ہاں تشریف لے آتے تھے اور مغرب کے بعد تک ٹھیرتے تھے۔ مغرب کے بعد اپنے گھر سے کھانا منگاتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔

۱۹۱۴ء میں علامہ نیاز فتح پوری بغرضِ ملازمت دِلّی تشریف لائے تو واحدی صاحب نے انھیں اپنا مہمان بنایا۔ اسی طرح مولانا عارف ہسوی بھی کافی عرصے تک واحدی صاحب کے ہاں مہمان رہے۔

واحدی صاحب نے پاکستان آنے کے بعد تین قابلِ قدر کتابیں لکھیں (۱) حیاتِ سرورِ کائنات (۲) سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامی (۳) میرے زمانے کی دلّی۔

کراچی میں حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اور جناب ملّا واحدی صاحب کی ہستیاں مغتنمات میں سے ہیں، جن کی منفرد صحبتوں میں بیٹھ کر دلّی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور قلبی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

حکیم محمد سعید

اگلے وقتوں کے لوگ

جناب مُلّا واحدی

گھر گھُسنا ہونے اور الگ الگ رہنے کی وجہ سے میری معلومات محدود ہے۔ باسٹھ سال کی عمر تک دلّی سے باہر کہیں آٹھ دس دن سے زیادہ نہیں ٹکا۔ اب اٹھارہ برس سے کراچی میں قطب بنا بیٹھا ہوں۔ قطب از جا نمی جنبد۔ معلومات ہوں تو کیسے ہوں، مگر پھر بھی دنیا میں طویل زمانہ گزارا ہے۔ کچھ نہ کچھ آنکھوں نے دیکھ لیا ہے اور کچھ نہ کچھ کانوں نے سُن لیا ہے۔ کچھ آنکھوں دیکھا کہوں گا، کچھ سُنا سُنایا۔

دو صاحبان ابھی ایسے زندہ ہیں، جو مجھ سے زیادہ معمّر ہیں اور اس کام میں مدد دینے کے اہل ہیں۔ ایک مولانا عبدالغفّار خیری، علامہ راشد الخیری کے چچازاد بھائی اور دوسرے خواجہ فضل احمد خاں شیدا، میرے چچا۔ خیری صاحب کراچی میں ہیں، شیدا صاحب لاہور میں۔

دلّی کے مسلمانوں میں اتنی عمر کا ایسا کوئی نہیں رہا کہ پرانے لوگوں کا حال بتا سکے۔ ہندوؤں میں پنڈت نارائن پرشاد اور لالہ شمبو ناتھ دلی پرنٹنگ ورکس والے اور دو چار بے شک ہیں۔

بسم اللہ ایک بہت ہی پاکیزہ واقعے سے کرتا ہوں۔ یہ واقعہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے سُنایا تھا:۔

ہز اکزالٹڈ ہائی نس نظامِ دکن میر عثمان علی خاں مصاحبوں کی جلو میں نماز ادا کرنے مکہ مسجد تشریف لے گئے۔ بادشاہ دکن کے لیے بیٹھنے کا خاص انتظام نہیں ہوتا تھا، جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے۔ ان سے اگلی صف میں کوئی صاحب قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔ بادشاہ نے بیٹھتے ہی مصاحبوں سے گفتگو شروع کر دی۔ اُن صاحب نے قرآن مجید پڑھتے پڑھتے کہا، "ہوں" بادشاہ نے توجہ نہیں کی۔ اُن صاحب نے تھوڑی دیر بعد پھر "ہوں" کہا اور بلند آواز

سے کہا۔ بادشاہ نے دوسری دفعہ بھی اعتنا نہیں کیا۔ تیسری دفعہ وہ صاحب قرآن مجید بند کر کے پیچھے مڑے اور بولے، "اعلاحضرت! قرآن میں ہے، وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ جب قرآن پڑھا جائے تو اُسے (کان لگا کر) سُنو اور خاموش رہو، تاکہ تم (اللہ کے) رحم سے نوازے جاؤ۔ (سورۃ ۸۔ آیت ۲۰۴) اس پر بادشاہ کو سانپ سونگھ گیا۔ بادشاہ کے مُنھ کو مہر لگ گئی اور اُن صاحب نے اطمینان سے تلاوت جاری رکھی۔

نماز ہو چکی تو بادشاہ باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر اُن صاحب کو طلب فرمایا۔ نگرانوں کی نگاہ میں تھے، فوراً حاضر کر دیے گئے۔ بادشاہ نے کہا "ہم تمھاری جرأت سے خوش ہوئے۔" اُنھوں نے گردن جھکالی۔ بادشاہ نے پوچھا "شغل کیا ہے؟" جواب دیا، "ریاست کے فلاں محکمے میں کلرک ہوں۔" پوچھا "کیا تنخواہ ہے؟" عرض کیا، "پچاس رُپے۔" فرمایا، "ہم ایک صفر بڑھاتے ہیں، آئندہ سے پانچ سو ملیں گے۔" عرض کیا، "نہیں حضور، میں اپنی جرأت کا معاوضہ آپ سے نہیں لوں گا۔ اللہ سے لوں گا۔"

میر عثمان علی خاں کے والد میر محبوب علی خاں بالکل کم سنی میں تخت نشین ہو گئے تھے۔ کم سنی میں حکومت وہ کیا کرتے، حکومت سر سالار جنگ اول مدارالمہام کی تھی۔ سالار جنگ بہادر دلّی آئے۔ نواب عبدالرحمٰن خاں دلّی کے ایک رئیس تھے، جن کی بیوی غنی بیگم سر سیّد احمد خاں کے ماموں کی پوتی اور قاضی فیض اللہ کی نواسی تھیں۔ قاضی فیض اللہ، جن کے نام سے دلّی کا فیض بازار منسوب ہے۔ نواب عبدالرحمٰن خاں حکیم اجمل خاں کے ممیا سُسر تھے اور میرے عزیز خواجہ فضل احمد خاں شیدا کی والدہ کے ماموں زاد بھائی، خواجہ فضل احمد اس واقعے کے راوی ہیں، جو میں آگے لکھتا ہوں۔ خواجہ فضل احمد ویسے تو میرے دوست ہیں، علامہ راشدالخیری اور مولانا عارف ہسوی والے گروپ کے ساتھی، لیکن حقیقتاً چچا ہیں۔ میری دادی خواجہ فضل احمد کی والدہ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔

نواب عبدالرحمٰن کا مقدر بگڑ چکا تھا، لیکن حویلی، جس میں وہ رہتے تھے، اب بھی اِتنی شان دار تھی کہ سالار جنگ کے میزبانوں نے سالار جنگ کو اس میں ٹھیرایا۔ نواب صاحب اُوپر کی منزل میں چلے گئے، نیچے کی منزل سالار جنگ کو دے دی، لیکن سالار جنگ سے ملے نہیں۔ میزبانوں نے مکان مانگا، نواب صاحب نے دے دیا۔ سالار جنگ کافی عرصے اس میں مقیم رہے۔ لوگوں نے کہا بھی کہ گھر میں پارس آگیا ہے، چھو جاؤ گے تو دلدّر دُور ہو جائیں گے،

مگر نواب صاحب نے کہا، "وہ باہر سے تشریف لائے ہیں، پہل انھیں کرنی چاہیئے"۔ عظیم المرتبہ مہمان کو دلّی کے بر آداب کون سمجھا سکتا تھا۔ آخر سالار جنگ رخصت ہوئے۔ نواب صاحب سالار جنگ کی موجودگی میں اُوپر سے نیچے نہیں اُترے۔

سر سید احمد خاں سفارش کرنے سے گھبراتے تھے۔ اور رشتے داروں کی سفارش تو قطعی نہیں کرتے تھے۔

میر فیض الحسن عطّار اور شیخ جمال الدین عطّار کی دکانیں بوڑھے دلّی والوں کو یاد ہوں گی۔ ہندستانی دواخانے کے قیام سے قبل شریف خانی اطبّا کے نسخے اُن ہی دکانوں میں بندھتے تھے۔ دونوں پر ہُن برستا تھا۔

میر فیض الحسن سر سید احمد خاں کے قریبی عزیز تھے۔ سر سید نے سفارش کر کے انھیں نوکر نہ رکھوایا۔ اُنھوں نے چل کر عطّاری کی دکان کر لی، گویا سر سیّد کی ناک کاٹ دی۔ اس زمانے کے شرفا ملازمت کو خوبی سمجھتے تھے اور تجارت کو معیوب جانتے تھے۔

میری مرحوم بیوی کے چچازاد بھائی سیّد محمد علی، سر سید احمد خاں کے برادرِ اکبر، سیّد محمد خاں کے نواسے تھے۔ سر سید نے انھیں علی گڑھ میں اپنے پاس رکھ کر پڑھوایا لکھوایا اور بی۔ اے کرایا، لیکن نوکری کے لیے سفارش نہیں کی۔ یو۔ پی کا لیفٹیننٹ گورنر سر سید کا دوست تھا۔ اس نے خود سیّد محمد علی کو جوائنٹ مجسٹریٹ مقرر کر دیا۔ پھر مدتوں سشن جج رہے۔ جوڈیشنل کمشنر ہی سے پنشن لی اور علی گڑھ کالج کے سیکریٹری منتخب کیے گئے۔ سرکار انگریزی نے نواب کا خطاب دیا۔

خیر تو سر سیّد سفارش نہیں کیا کرتے تھے، مگر ایک سفارش انھوں نے کی اور شایانِ شان کی۔ اللہ کے کسی بندے کو اللہ جانے کیا سوجھی، جان نہ پہچان ملازمت کی درخواست میں لکھ مارا کہ میں سر سید احمد خاں کا داماد ہوں۔

جس حاکم کے سامنے درخواست پیش ہوئی، وہ واقف تھا کہ سر سید دو بیٹوں کے باپ ضرور ہیں، بیٹی کے باپ ہرگز نہیں ہیں۔ تاہم احتیاطاً اس حاکم نے سر سیّد سے بہ ذریعے خط دریافت کیا۔ سر سیّد نے جواب دیا، ہاں، درخواست دہندہ کی بیوی میری بیٹی ہے اور فوراً درخواست دہندہ اور اس کی بیوی کو اپنے پاس بلایا اور ان سے داماد اور بیٹی کا برتاؤ اور تا دمِ آخر وہی برتاؤ برتتے رہے۔

علّامہ راشد الخیری کے داماد مولوی عبد الخالق نہایت ممتاز عالمِ دین تھے۔ مولانا عبد الغفار خیری کا بیان ہے کہ ایک روز مولوی عبد الخالق کی اہلیہ محترمہ نے مولوی صاحب سے کہا "بیٹی شادی کے قابل ہو گئی، تمھیں مطلق فکر نہیں ہے"۔ فرمایا، اچھا فکر کروں گا۔ شام کو درس و تدریس سے

فراغت پاکر مفتی صدرالدین کے گھر پہنچے اور کہا "میری بیوی نے آج خبر دی ہے کہ بیٹی شادی کے قابل ہوگئی ہے۔ آپ مشورہ دیجیے، کیا کیا جائے۔ مفتی صاحب نے فرمایا "بغل میں بچہ، شہر میں ڈھنڈورا۔ آپ کے مدرسے میں طالب علم سید نذیر حسین صالح ہونہار اور نجیب الطرفین موجود ہے۔ اِدھر اُدھر تلاش کی کیا ضرورت ہے۔" فرمایا، ہاں ہے تو، مگر بات کس طرح طے کروں؟ مفتی صاحب بولے، یہ مجھ پر چھوڑیے۔ مولوی عبدالخالق صاحب گھر آگئے۔

چند دن بعد مفتی صاحب تشریف لائے اور مطلع کیا کہ معاملہ طے پا گیا ہے۔ میں نے لڑکے کی رضامندی لے لی ہے اور پٹنے سے بھی اجازت منگالی ہے۔ اب تاریخ مقرر کرو اور کارِ خیر کو انجام دو۔ حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کا اصلی وطن پٹنہ تھا۔

تاریخ اور یوم مقررہ پر مولوی عبدالخالق صاحب نے اہلیہ سے کہا "آج لڑکی کو نہلوا کر اچھے کپڑے پہنا دینا۔" اہلیہ سمجھیں کہ شاید سسرال سے عورتیں لڑکی دیکھنے آئیں گی۔ نہلا دھلا اور کپڑے پہنا دلہن بنا دیا۔

مابین عصر مغرب مفتی صاحب حضرت میاں نذیر حسین کی بارات لے کر پہنچ گئے۔ بارات مسجد میں بیٹھ گئی۔ دلہن کے گھر میں بس دُلہن تھیں اور دُلہن کی اماں اور دلہن کی چھوٹی بہن۔ دلہن کی اماں کا پارہ چڑھ گیا۔ کہنے لگیں، نہ عزیزوں کو پوچھا، نہ احباب کو، سب کو زندہ دفن کر دیا۔ یہ شادی کرنے اُٹھے ہیں۔ اتنا کہہ کر عالمِ وارفتگی میں قبلہ مولوی صاحب کے دو ہتڑ رسید کیا۔ حضرت مولوی صاحب نے فرمایا "اچھا اچھا لڑکی واپس آئے گی تو سب کو کھلا پلا دینا۔ اب اس وقت رخصت کرو۔ ڈولی تیار ہے اور انتظار ہو رہا ہے۔" غرض کہ لڑکی رخصت ہوئی اور مفتی صدرالدین صاحب بہ حیثیت پدر وکیل بہو کو وداع کرا کر اپنے ہاں لے گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی شادی کی داستان علامہ راشد الخیری کی زبان سے سنیے:۔

پنجابی کٹرہ، جو دلی نے ریلوے اسٹیشن پر اس طرح قربان کیا کہ آج اس کا نشان تک باقی نہیں ہے، میرے آبا و اجداد کا مسکن تھا اور پنجابی کٹرے کی وہ مسجد، جس میں میرے جدِ امجد مولوی عبدالخالق صاحب حدیث کا درس دیتے تھے، طلبہ کا دارالقیام تھی۔ ۱۸۴۵ء اشن ہیں، یا اس کے لگ بھگ علامہ موصوف یعنی شمس العلماء خان بہادر ڈاکٹر نذیر احمد ایل۔ ایل۔ ڈی تحصیل علوم کی غرض سے اس مسجد یا مدرسے میں داخل ہوئے۔ پڑھ رہے تھے کہ میری پھوپھی کے عقد کا سوال اٹھا۔ بڑے بڑے لوگوں کو ارمان تھا کہ مولوی عبدالقادر کی بیٹی کی پالکی اپنے دروازے پر اتروائیں۔ نذیر احمد طالبِ علم کی طرف، کیا عزیز و اقارب اور کیا دوست احباب، کسی کا وہم و گمان بھی نہ

تھا۔ مختصر یہ کہ لڑکی کے دادا مولوی عبدالخالق کی خدمت میں تمام نام پیش کیے گئے۔ اللہ غنی، کس دل گردے کے لوگ تھے۔ ان کی باتیں اُن ہی کو سزاوار تھیں۔ فرمایا، جس میں یہ تین وصف ہوں، اُسے منظور کر لو۔ ایک نماز کا پابند، دوسرے معاملے کا اچھا، تیسرے زبان کا سچا۔ امیدواروں میں کوئی اس کسوٹی پر پورا نہ اُترا۔ تلاش کرتے کرتے نگاہ نذیر احمد طالب علم پر پڑی۔ مولوی عبدالخالق کی پوتی اور مولوی عبدالقادر کی بیٹی کو بیاہ لے جانا، جس کے بیاہ کی شرطیں بہت سادہ، مگر بہت کڑی تھیں۔ مولانا نذیر احمد ہی کا حصہ تھا۔ خدا غریقِ رحمت کرے میری بڑی پھوپھی اپنی شادی کا ذکر کیا کرتی تھیں کہ جب مسجد میں نکاح ہو چکا تو دولہا کو ہم سب نے دیکھا۔ کرتہ پاجامہ سفید اور اجلا تھا، ٹوپی بھی خاصی تھی، لیکن جوتی کے کنتے نکل رہے تھے۔ اماں نے کسی عورت کے ہاتھ ایک روپیہ بھیجا کہ جوتی نئی خرید لو۔ تھوڑی دیر بعد وہی عورت پونے چار آنے واپس دے گئی کہ جوتی سوا بارہ آنے کی آئی ہے۔

شاہ جہاں کی دلّی شاہ عالم کے عہد سے اجڑنی شروع ہو گئی تھی، جو تھا لکھنؤ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ دلّی کا زوال تھا، لکھنؤ کا عروج۔ لکھنؤ والے دلّی والوں کی قدر کرتے تھے۔ کہتا یہ ہے کہ قدیم اور خالص دلّی والوں سے دلّی کبھی کی خالی ہو چکی تھی۔ اُمرا اور وزرا، جنھوں نے ہندستان پر حکومت کی تھی، ان میں سے نامی گرامی آدمی پچاس پچاس برس سے دلّی میں موجود نہیں تھے۔ شاہ عالم جتنے عرصے مرہٹوں کے قبضے میں رہے، اتنے عرصے میں جھاڑو پھر گئی تھی ؎

حکومت شاہ عالم، از دلّی تا پالم

مگر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے بالکل ہی صفایا کر دیا تھا۔ شریف صورت اور اُجلے پوش ہونا غضب تھا۔ ایں ہم بچہ شتر است کہہ کر اسے دار پر کھنچوا دیا جاتا تھا۔ مٹکاف کوتوالی کے باہر کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا اور ڈھنڈوا ڈھنڈوا کر دکھاؤ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ روزانہ سلیم شاہی جوتیوں کے انبار لگ جاتے تھے۔ اس پکڑ دھکڑ نے اور بھگدڑ مچا دی۔

خواجہ فضل احمد صاحب اپنی نانی کے حقیقی بھائیوں غلام نبی اور غلام علی خاں کا قصہ اکثر دہرایا کرتے ہیں۔

غلام نبی خاں نواب جھجر کے مصاحب تھے اور دربارِ دہلی میں ریاست جھجر کے نمائندے۔ نواب جھجر نے جن مشیروں کے کہنے سے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مدد نہیں کی تھی، اُن میں غلام نبی خاں پیش پیش تھے۔ نواب جھجر نے پھانسی پائی اور غلام نبی خاں تمام خاندان سمیت الور جا چھپے۔ الور میں مہاراج شیودان سنگھ اور جے پور میں مہاراج رام سنگھ حکمران تھے۔ ان دونوں نے انقلاب کے ستائے ہوؤں کی بے حد دلجوئی کی اور انھیں پناہ دی، لیکن

انگریزی جاسوس تاک لگا رہے تھے۔ اسی ہولا جولی میں برسات کا موسم آگیا۔ اب ذرا ملاحظہ فرمائیے، گئی گزری حالت میں بھی ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ دلّی کے اندر کس قسم کی مخلوق آباد تھی۔ دِلّی اینٹ پتھر کے تودوں کا نام نہیں تھا، دِلّی عبارت اِن لوگوں سے تھی۔ خیر تو برسات کا موسم آگیا۔ ساون کے مہینے میں ایک دن، جب کہ گھنگور گھٹا چھا رہی تھی، دونوں وقت ملا چاہتے تھے، غلام نبی خاں کے چھوٹے بھائی غلام علی خاں کی طبیعت لہرائی اور وہ باہر کی کیفیت دیکھنے گھر کے دروازے کی سمت بڑھے۔ گھر والوں نے ٹوکا۔ غلام علی خاں بولے، دُور نہیں جاؤں گا۔

انقلاب کے اثرات آس پاس کے کل علاقوں پر تھے۔ الور کے بازار بھی جھٹ پٹا ہوتے ہی بند ہو جاتے تھے۔ چناں چہ ہر طرف ہُو کا عالم تھا، البتہ کوئی من چلا دلّی والا دکان کے پٹڑوں پر بیٹھا دِلّی کا یہ برساتی گیت گا رہا تھا:۔

"ہیرا رے ہزاری گجرا گندھ لاؤ"

غلام علی خاں اس شخص کے پاس سے گزرے تو اس نے بھی سمجھایا "میاں تم کہاں جا رہے ہو، زمانہ خراب ہے، جاؤ گھر جاؤ۔" مگر غلام علی خاں بڑھتے ہی چلے گئے۔ کچھ دُور آگے دو آدمی سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ اُنھوں نے غلام علی خاں پر سر سے پاؤں تک نظر دوڑائی، جیب سے کاغذ نکالا، اُسے دیکھا اور پھر خاں صاحب کو دیکھا۔ غلام علی خاں، غلام نبی خاں سے اس درجے مشابہ تھے کہ فرق کرنا دشوار تھا۔ ان دونوں آدمیوں نے غلام علی خاں کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "تم غلام نبی خاں ہو۔ یہ تمھارا حلیہ ہے اور یہ وارنٹ گرفتاری۔" غلام علی خاں لاکھ چیخے چلائے لیکن ان آدمیوں نے انھیں نہیں چھوڑا۔

غلام علی خاں گھر نہ پہنچے تو تلاتو پڑی، ڈھنڈیا مچی پتا لگا کہ گرفتار ہیں۔ غلام نبی خاں کسی نہ کسی طرح جا کر ملے اور کہا "تم نہ انگریز کے باغی اور نہ تمھارا وارنٹ۔ مَیں کل اپنے آپ کو پیش کر دوں گا۔ میں تم سے کہیں بڑا ہوں۔ آج نہیں تو کل مر جاؤں گا۔ تم جوان ہو، تمھیں زندہ رہنا چاہیے۔" غلام علی خاں نے جواب دیا "سُنیے بھائی جان! ہم میں سے ایک کو اس وقت ضرور مرنا ہے۔ میری سعادت اسی میں ہے کہ مَیں آپ پر قربان ہو جاؤں۔ میرے جذبے کو پامال مت کیجیے اور مجھے قربان ہو جانے دیجیے۔ علاوہ ازیں آپ خاندان کی سرپرستی اور سربراہی کرتے آئے ہیں، آپ میں اس کی صلاحیت ہے۔ خاندان کی سرپرستی اور سربراہی میرے بُوتے کا کام نہیں ہے۔ آپ نہ رہے تو خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا اور وقار مٹ جائے گا۔ مجھ میں خاندان کے سنگیٹر سمیٹ کی ہرگز قابلیت نہیں ہے۔ میرے دو بچوں کا اللہ محافظ ہے۔ اب بھی وہ آپ کی نگرانی میں تھے، آئندہ بھی آپ ان کی نگرانی فرمائیں گے۔ لیجیے، اللہ حافظ، میرے خاتمہ بالخیر کی دُعا کیجیے

اور بارگاہِ ربُ العزّت میں کہیئے کہ میں ثابت قدم رہوں۔" غلام علی خاں دلّی روانہ کر دیے گئے اور انھیں پھانسی چڑھا دیا گیا۔

خواجہ فضل احمد خاں کی نانی میری دادی کی مُمانی تھیں۔ان کا انتقال ہُوا ہے تو میں تین، پونے تین برس کا تھا، لیکن خواجہ فضل احمد کو وہ خوب یاد ہیں۔ان کا بیان ہے، "میرا رے ہزاری گجرے" والا گیت سنتے ہی نانی صاحبہ کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔بھائی کی گرفتاری اور جان ہاری کا ذکر کر کے زار و قطار روتی تھیں۔

غلام نبی خاں الور سے پٹیالے پہنچے۔وہاں حکیم محمود خاں مہاراج کے طبیب خاص تھے۔مہاراج نے سفارش کی اور غلام نبی کی جان بچی۔حکیم اجمل خاں کی بیوی غلام نبی کی نواسی تھیں۔

ایک صاحب تھے، منشی غلام نظام الدین عرف خاکسار۔سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دینے کے بڑے پابند۔حضرت خواجہ حسن نظامی کو ترقی کی راہ پر انھوں نے ہی لگایا تھا۔اللہ تعالےٰ نے انھیں ذریعہ بنا دیا تھا۔درگاہ حضرت سلطان المشائخ کے پیرزادوں میں ہونہار دیکھ کر کہا، "میاں میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے گنگوہ والے مدرسے میں داخل کرائے دیتا ہوں۔فیس وِیس نہیں ہے۔باقی اور جتنے پیسوں کی ضرورت پڑے گی، کچھ بڑے بھائی سے دلواؤں گا، کچھ میں نذر کروں گا۔"

خیر تو یہ منشی غلام نظام الدین المعروف بہ خاکسار صاحب کسی پنجابی سوداگر کے دوست تھے۔ان سوداگر کا نام شیخ عطاء الرحمٰن تھا۔خاکسار اُن کے ہاں جمعہ کے جمعہ جایا کرتے تھے۔بدھ کے بدھ درگاہ سلطان المشائخ اور جمعہ کے جمعہ پنجابی دوست کے گھر۔بُدھ کی صبح کو بیٹا مر گیا، تب بھی درگاہ کی حاضری ناغہ نہیں کی، لیکن یہ اتنا مشکل نہ تھا، جتنا دوست کے گھر جانے کی وضع کو نبھانا۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ہندو مسلمانوں میں مطلق کھنچاؤ نہیں تھا۔۱۸۵۷ء کے بعد کھنچاؤ کی بنیاد پڑ گئی اور ۱۸۷۷ء میں ہندو مسلمانوں میں پہلا مچیٹا ہُوا۔ہندوؤں نے مسلمان علاقوں کا اور مسلمانوں نے ہندو علاقوں کا راستہ چھوڑ دیا۔شیخ عطاء الرحمٰن کے ہاں پہنچنے کے لیے ہندوؤں کے کئی محلّے طے کرنے پڑتے تھے، مگر خاکسار صاحب نے اپنی وضع جاری رکھی۔دو پیسے کے پان اور آدھ سیر دودھ کا کلھڑ لیتے اور پہنچتے۔اگلے وقتوں کے لوگ دوستوں اور عزیزوں کے ہاں خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔حسبِ حیثیت تحفہ لے کر جاتے تھے۔

وضع کا اس قدر پابند کہ وضع نبھانے کے مقابلے میں جان کی پرواہ نہیں تھی، میں نے صرف ایک صاحب کو اور دیکھا ہے، اشتیاق احمد چشتی، مسٹر شاہد احمد، ایڈیٹر ساقی کے ماموں، اُن کا لالہ شمبو ناتھ، مالک دلّی پرنٹنگ ورکس سے دوستانہ تھا۔وہ لالہ شمبو ناتھ کے ہاں خالص ہندو

آبادی میں ہندو مسلم دیوانگی کے عروج کے وقت جاکر بیٹھتے رہے۔
خاکسار صاحب نے خواجہ حسن نظامی کے اثر و رسوخ سے فائدہ اُٹھانے کا خیال دماغ میں کبھی نہیں آنے دیا۔ خواجہ صاحب کی مجلسوں میں بہتر سے بہتر جگہ پیش کی جاتی تھی، مگر خاکسار صاحب اسے پسند نہیں فرماتے تھے کہ دوسروں کے ذریعے عزت اور دولت میں اضافہ ہو۔ اللہ کے عطا کردہ کردار کی وجہ سے جتنی حیثیت میسّر تھی، اسے کافی سمجھتے تھے اور مطمئن تھے، البتہ ان کی قدر خواجہ صاحب کی قدر کے برابر ہے۔ خواجہ صاحب ان کا اس طرح لحاظ کرتے تھے، جس طرح باپ کا کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب کی حرکات و سکنات کا خاکسار صاحب کو علم رہتا تھا۔ جب خواجہ صاحب ان کی دکان پر جاتے تو صفائی سے کہتے کہ تم نے فلاں بات اچھی نہیں کی۔ میں نے بارہا ڈانٹتے بھی دیکھا ہے۔ خواجہ صاحب ان کی ڈانٹ کا بُرا نہیں مانتے تھے۔
خود خواجہ صاحب کی وضع داریاں کیا کم ہیں۔ آگے عرض کرتا ہوں۔ اب ایسے لوگ کہاں؟

یہ ہستیاں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
تک دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمہ سے میری ملاقات ۱۹۰۷ء میں ہوئی تھی۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک خواجہ صاحب میرے گھر میں رہے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۷ء تک میرا ان کا قریباً روزانہ ملنا جلنا رہا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک علی التواتر خط و کتابت رہی۔ بچپن کے سوا میں نے خواجہ صاحب کی زندگی کا ہر دَور دیکھا ہے اور دور سے نہیں، بے حد قریب سے دیکھا ہے۔
تحریر اور تقریر میں ان کے بہت سے ہم عصر اُن کے ہم سر ہیں، لیکن یہ خصوصیت خواجہ صاحب ہی کا حصّہ تھی کہ وہ زمین سے اُبھرے اور آسمان پر اُڑے، مگر انھوں نے اپنے اندر غرور و تکبّر کو نہیں گھُسنے دیا۔ خواجہ صاحب کے نفس پر ہمیشہ رحمان کا سایہ رہا، شیطان ان پر قابو نہ پاسکا۔ میرے نزدیک اس سے بڑی خصوصیت ان کی تحریر و تقریر بھی نہیں ہے۔ بقول مسٹر اے۔ کے۔ بروہی، "ادیب اگر عظیم بننا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ فی الحقیقت انسان ہو۔"
انتہائی افلاس کے وقت کوئی خواجہ صاحب کو مفلس محسوس نہیں کر سکتا تھا، تا آنکہ مجھے بھی افلاس کا حال تب معلوم ہوا، جب خواجہ صاحب نے ۱۹۱۹ء میں اپنی آپ بیتی لکھی اور انتہائی عروج کے وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ خواجہ صاحب مغرور ہو گئے ہیں۔ جس سے جو برتاؤ ۱۹۰۷ء میں تھا، وہی آخر عمر تک رہا۔
منشی قربان علی بسمل خواجہ صاحب کے والد کے ملاقاتی تھے، خواجہ صاحب ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ کچھ ایسی افتاد پڑی کہ منشی قربان علی بسمل نے خواجہ صاحب کے ہاں بہ حیثیت

محرر ملازمت کر لی، مگر خواجہ صاحب نے وضع میں فرق نہیں کیا۔ منشی صاحب دفتر کے کام کے سلسلے میں خواجہ صاحب کے پاس دن میں پہلی مرتبہ تشریف لاتے تھے تو خواجہ صاحب حسبِ معمول کھڑے ہو جاتے تھے۔

خواجہ صاحب اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کا تعلق مشہور و معروف ہے۔ اس کی بنیاد کس طرح پڑی تھی، سننے کے لائق ہے۔ حضرت اکبر کی بیوی خواجہ صاحب سے بیعت تھیں اور بہن اور بھانجے بھی خواجہ صاحب کے مُرید تھے، یعنی مسٹر مشتاق احمد آڈیٹر جنرل پاکستان کی دادی اور والد، لیکن حضرت اکبر کو خواجہ صاحب سے خاص لگاؤ نہیں تھا۔ تاہم خواجہ صاحب الٰہ آباد جاتے تو ٹھیرتے حضرت اکبر ہی کی "عشرت منزل" میں تھے۔ جس دن حضرت اکبر کی بیوی نے انتقال کیا تھا، اس دِن بھی خواجہ صاحب اتفاق سے الٰہ آباد پہنچے۔ سانحہ خواجہ صاحب کے علم میں نہیں تھا۔ حضرت اکبر تدفین سے فارغ ہو کر لوٹے تھے اور کافی آدمی حضرت اکبر کے گرد جمع تھے۔ خواجہ صاحب آتے دکھائی دیے تو حضرت اکبر نے بہ آواز بلند فرمایا "چلے آتے ہیں، چلے آتے ہیں، میاں تمھاری خاطر مدارات کرنے والی اللہ کے ہاں سدھاریں۔ اب یہاں تمھارا ٹھکانا نہیں ہے۔" خواجہ صاحب آدمیوں کی بھیڑ سے سمجھ چکے تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے برجستہ کہا، "مجھے اسی واسطے بھیجا گیا ہے کہ آپ کی تسلّی و تسکین کا ذریعہ بنوں۔" حضرت اکبر نے فرمایا، "جی ـــــ مگر بھیجنے والے نے اتنا نہیں سوچا کہ تمھاری خاطر مدارات کون کرے گا؟" خواجہ صاحب نے کہا، "یہ بات بھیجنے والے کے پیشِ نظر تھی۔ اُس نے کہہ دیا تھا کہ اکبر پر بار نہ ڈالنا۔ دو پیسے کے کباب اور دو پیسے کی خمیری روٹیاں منگانا اور پیٹ بھر لینا۔" حضرت اکبر نے فرمایا "اچھا، یہ کہہ دیا تھا۔" نوکر کو پکارا کہ دو پیسے کے کباب اور دو پیسے کی خمیری روٹیاں خرید لاؤ۔ خواجہ صاحب کباب روٹی کھاتے رہے اور حضرت اکبر جائزہ لیتے رہے۔ خواجہ صاحب نے کھانا ختم کیا تو حضرت اکبر بولے، "خواجہ صاحب! میری آپ کی نبھ جائے گی آپ نے کباب روٹی اسی رغبت سے کھائی ہے، جس رغبت سے اعلا قسم کے کھانے کھاتے ہیں۔" چناں چہ پھر خواجہ صاحب سے حضرت اکبر کی ایسی نبھی کہ حضرت اکبر مرنا خواجہ صاحب کے گھر چاہتے تھے۔ اس نیت سے دلّی آگئے تھے اور خواجہ صاحب کے ہاں بستی درگاہ حضرت سُلطان نظام الدّین اولیا میں مقیم تھے کہ اب یہیں مروں گا اور زیرِ سایہ مزار سُلطان المشائخ دفن ہوں گا۔

یکایک خواجہ صاحب کی بڑی لڑکی حُور بانو مرحومہ کی شادی ٹھیری۔ حُور بانو کو حضرتِ اکبر اپنے چھوٹے لڑکے ہاشم سے بیاہنے والے تھے، مگر ہاشم کا انتقال ہو گیا۔ اب جو حُور بانو کی شادی کا چرچا سُنا تو خواجہ صاحب سے کہا کہ شادی کے زمانے میں یہاں ٹھیرنا خدا جانے مجھ پر

کیا اثر کرے۔ الٰہ آباد جانے کی اجازت دیجیے۔ ہمت بندھی تو شادی کے بعد دوبارہ آجاؤں گا۔

حضرت اکبر نے چلتے چلتے ایک طویل نصیحت آموز نظم لکھی، جو کلیاتِ اکبر میں موجود ہے اور فرمایا، "یہ میری طرف سے جہیز میں دے دیجیے۔"

الٰہ آباد جاکر بھی حضرت اکبر زیادہ دن نہیں جیے۔ رحلت کے وقت خواجہ صاحب اور حضرت اکبر کے بڑے فرزند سید عشرت حسین دو ہی آدمی حضرت اکبر کے پاس تھے اور حضرت اکبر کا سر خواجہ صاحب کی گود میں تھا۔

خواجہ صاحب کے مراسم درجہ اوّل کے راجاؤں، نوابوں اور امراسے تھے۔ ایک اٹھواڑہ میں نے ان کے ساتھ سکندرآباد دکن میں سیٹھ محمد موسیٰ کے ہاں گزارا تھا۔ دوپہر کو اور شام کو بیس اکیس کھانے ہوتے تھے اور جو کھانا ایک دفعہ آجاتا تھا، وہ دوبارہ نہیں آتا تھا۔ آٹھ دن میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین سو سے اُوپر انواع کے کھانے کھائے۔ خواجہ صاحب کو راجاؤں، نوابوں اور امرا کے ہاں کا کھانا بھی کھانا آتا تھا اور غریب سے غریب مرید کے ہاں کا کھانا بھی وہ برغبت کھاتے تھے۔

ایک مخلص مُرید نے، جن کا نام عبدالحمید تھا اور خواجہ صاحب جنھیں قلندر جنگ کہا کرتے تھے، خواجہ صاحب کی اور میری دعوت کی۔ قلندر جنگ نے کسی کٹھرے میں ایک کوٹھری لے رکھی تھی۔ اس میں بیوی بچوں سمیت رہتے تھے۔ بہو کے جہیز کا پلنگ باہر نکال کر بچھا دیا، اس کی دری اور چادر بھی اجلی تھی۔ پلنگ پر کھانا چن دیا، لیکن پلنگ کے نیچے سارے کٹھرے کا گندا پانی بہہ رہا تھا۔ میں دو لقمے حلق سے نہیں اتار سکا، مگر خواجہ صاحب نے خوش ہو کر کھایا اور قلندر جنگ کو خوش کر دیا۔

مذہب کی طرف رُجحان مجھ میں خواجہ صاحب کی ہم نشینی نے پیدا کیا تھا، لیکن غور و فکر اور مطالعے کے بعد میں مذہب ہی کے معاملے میں ان سے اختلاف بھی کرتا رہتا تھا اور اختلاف زبان سے قلم پر آجاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے "مرشد کو سجدۂ تعظیم" نامی کتاب شائع کی تو میں نے نظام المشائخ میں بیس صفحے کا ریویو لکھا اور سجدۂ تعظیم سے اختلاف کیا، مگر خواجہ صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ہماری بلی، ہم ہی سے میاؤں، بلکہ اپنے اخبار منادی میں ریویو کا ذکر فرمایا اور ریویو کے بعض اعتراضات کو بے تکلف قبول کر لیا اور اعلان کیا کہ مرشد کو سجدۂ تعظیم کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا تو واحدی صاحب کا ریویو اس میں شامل کر دیا جائے گا۔ ناظرین مختار ہیں، خواہ واحدی صاحب سے اتفاق کریں، خواہ مجھ سے اتفاق کریں۔

خواجہ صاحب لڑنے بھڑنے کے آدمی نہیں تھے۔ نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا کہ رئیس الاحرار

مولانا محمد علی جوہر اور دیوان سنگھ مفتون سے الجھ گئے تھے۔ میں دونوں اکھاڑوں کے خلاف تھا۔ میں نے ان قلمی جنگوں میں مطلق حصہ نہیں لیا، لیکن خواجہ صاحب کا رویہ اس دوران میں بھی عجیب وغریب تھا۔ شہری تقریبات میں ہم دونوں عموماً ساتھ جاتے تھے۔ وہاں سردار دیوان سنگھ بھی ہوتے تھے۔ سردار صاحب ہماری میز پر آتے اور مجھ سے باتیں کرتے، مگر خواجہ صاحب سے نہ بولتے۔ کبھی میں سردار صاحب کی میز پر چلا جاتا، لیکن خواجہ صاحب کی تیوری پر بل نہ آتا۔

خواجہ صاحب کا قصہ طویل ہوگیا۔ میں کیا کروں ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

چناں کہ لفظ عصا گفت موسیٰ اندر طور

خواجہ صاحب کا قصہ چھڑتا ہے تو پھر زبان اور قلم کا رکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود خواجہ صاحب کا میرے ساتھ یہی حال تھا۔ میرے کراچی چلے آنے کے بعد وہ عید کے عید میرے دلی والے گھر پر جاتے تھے اور گھر کے پھاٹک کو گلے لگاتے تھے اور روتے تھے۔ اُن کا آخری خط، جو اُنھوں نے مرض الموت میں موت سے ڈھائی ماہ قبل بھیجا تھا، میرے دل پر نقش ہے۔ عید الاضحےٰ کی شام کو خواجہ صاحب کی وفات ہوئی تھی۔ عید الفطر کے موقع پر انھوں نے صرف ایک سطر کا خط لکھا تھا، بلکہ لکھوایا تھا، مگر اس سطر کو میں بھول نہیں سکتا۔

دلّی میں ایک جماعت تھی اور شاید اب بھی ہو، جنھیں شُہدے کہا جاتا تھا۔ وہ سب مسلمان تھے۔ اُن کا کام تھا، دُلہن کا جہیز دُولہا کے گھر پہنچانا اور نکاح کے معاً بعد دعاؤں کی صدا لگانا، "اللہ دُولہا کے ابا کو پوتے کھلانے نصیب کرے۔" شہدوں کو دُولہا والوں کی طرف سے انعام ملتا تھا۔ یہ لوگ فرصت کے اوقات میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے تھے۔

جامع مسجد دلّی کے نامور امام شمس العلما مولوی سید احمد صاحب نے، جن کا ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا ہے، مجھے ایک شہدے کا واقعہ سنایا تھا:۔

ایک دن ایک فرنگی جامع مسجد دیکھنے آیا۔ ایک شہدے نے اُس کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ فرنگی نے بٹوا نکال اُسے کچھ دے دیا، مگر جب بٹوا جیب میں رکھنے لگا تو بٹوا سیڑھیوں پر گر گیا اور شہدے نے اُٹھا لیا۔ بٹوے میں کئی اشرفیاں تھیں، اسّی، نوّے برس پہلے کی اشرفیاں، شہدے کے سال، دو سال بسر کرا دینے کے لائق رقم۔ لیکن شہدے نے اشرفیوں کو نہیں چھُوا۔ دوسرے یا تیسرے دن وہی فرنگی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھتا پھر دکھائی دیا۔ شہدے نے پہچان کر پکارا، صاحب! یہ تمھارا بٹوا ہے۔ فرنگی بولا، اتنی رقم پاکر تمھاری نیت نہیں بگڑی۔ تعجب ہے۔ شہدے نے کہا، بگڑی تو تھی، لیکن پھر خیال ہوا کہ تمھارے نبی بھی اللہ کے ہاں ہیں اور

میرے نبی بھی وہیں ہیں۔ تمھارے نبی اُن سے کہیں گے کہ مسلمان نے عیسائی کا مال کھالیا۔ میرے آقا کو میری وجہ سے نگاہ نیچی کرنی پڑے گی۔ دل نے اُسے گوارا نہیں کیا۔

جذبہ چودہ سو برس پہلے کے مسلمان کا نہیں ہے، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کے مسلمان کا بھی نہیں، سو برس پہلے کے مسلمان کا ہے اور کسی عالم، کسی درویش یا کسی باحیثیت مسلمان کا جذبہ نہیں ہے، نہایت ادنا درجے کے، جاہل مسلمان کا جذبہ ہے، جسے عزت نفس سے مطلق واسطہ نہیں تھا، لیکن سو برس پہلے تک اس درجے کا مسلمان بھی اپنے آقا کی عزت کا اتنا پاس کرتا تھا۔"

ایک صاحب تھے، مرزا یارن جان۔ اُن کی دلّی کے چاوڑی بازار میں رفوگری کی دکان تھی۔ بزرگ کبھی کشمیر میں یہ پیشہ کرتے تھے، وہی پیشہ اب بھی تھا۔ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ بے پڑھے لکھے ہیں۔ کشمیریوں کا ناک نقشہ اچھا اور رنگ اُجلا ہوتا ہی ہے۔ جسم بھی سڈول تھا اور ہاتھ پاؤں جان دار تھے۔ بڑے گٹھیلے بوڑھے تھے۔ رفوگری کے باعث شہر کے ہندو مسلمان رئیسوں سے سابقہ رہتا تھا۔ شام کو عموماً حکیم اجمل خاں یا حکیم رضی الدّین کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ حکیم اجمل خاں کے بڑے بھائیوں، حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم واصل خاں سے ملنا جلنا رہ چکا تھا اور حکیم رضی الدّین خاں کے نو والد، حکیم ظہیرالدّین خاں کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے کا شرف حاصل تھا۔

ایک دَور ایسا گزرا کہ حکیم اجمل خاں اور حکیم رضی الدّین خاں کی ٹھن گئی۔ حکیم اجمل خاں کا خاندان تو دلّی کا اہم خاندان تھا ہی، حکیم رضی الدّین خاں کا خاندان بھی گرا پڑا نہیں تھا۔ اُنیس بیس ہی کا فرق ہوگا۔ پھر حکیم رضی الدّین خاں اپنی ذات سے قریب قریب حکیم اجمل خاں کی ٹکر کے طبیب تھے۔ سرکار دربار میں بھی دونوں کی غیر معمولی پُرسش تھی۔ حکیم اجمل خاں کو حاذق الملک کا خطاب تھا تو حکیم رضی الدّین خاں کو شفاء الملک کا۔ بس اسی خطاب کے سلسلے میں حکیم رضی الدّین خاں بگڑ گئے تھے۔ وہ بھی حاذق الملک بننا چاہتے تھے، لیکن حاذق الملک اوّل حکیم عبدالمجید خاں نے حاذق الملک کا خطاب بدایں شرط قبول فرمایا تھا کہ یہ خطاب میرے خاندان کے ساتھ مختص رہے گا۔ میرے خاندان سے باہر کے لوگوں کو نہیں دیا جائے گا۔ حکیم رضی الدّین خاں کے لیے حکومت نے نیا خطاب "شفاء الملک" تجویز کیا، مگر اُسے اُن کے خاندان میں محدود نہیں رکھا۔ حکیم رضی الدّین خاں سمجھے کہ حکیم اجمل خاں نے بھانجی ماری ہے اور حکیم اجمل خاں سے خفا ہو گئے۔ حکیم رضی الدّین خاں اور اُن کے خاص احباب نے حکیم اجمل خاں کی محفل کا بائیکاٹ کر دیا اور حکیم اجمل خاں اور اُن کے خاص احباب نے حکیم رضی الدّین خاں کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا، لیکن مرزا یارن جان اس

قصّے میں نہیں اُلجھے۔ اُنھوں نے دونوں سے وضع نبھائی۔ حکیم رضی الدین خاں کے ہاں حکیم اجمل خاں اور اُن کی پارٹی کا ذکر، وہ اُس میں حصّہ نہیں لیتے تھے اور اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر ہرگز نہیں کہتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کو اُن پر اعتماد تھا۔ دونوں پارٹیاں جانتی تھیں کہ مرزا یارن جان لڑوانے کے شوقین نہیں ہیں۔

اب باقی حال مرزا یارن جان کا خواجہ فضل احمد شیدا کی زبانی سنئے:۔ شیدا صاحب کا یکم نومبر ۱۹۴۸ء کا ایک خط میرے پاس محفوظ ہے، اُسے یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔ ذرا اِس خط کی زبان پر بھی غور کیجیے۔ ایسی زبان آئندہ کوئی نہیں لکھ سکے گا۔ پھر شیدا صاحب نے خط میں جو لکھا ہے، اُس کے ایک ایک لفظ سے "اگلے وقتوں کے لوگ" جھلکتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت خواجہ فضل احمد شیدا کے ذکر کی ضرورت نہیں رہی۔ اُن کا خط اُنھیں سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ خط ملاحظہ فرمائیے:۔

میاں میر صاحب! سلام علیکم ضعفِ پیری کے خیال کو ہمارے دل سے ہٹانے والے! آپ جیتے رہیں۔ اب اتنی بات کہنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔ بھائی! ان ہنگاموں میں ہم لوگوں کی حالت بجائے سُدھرنے کے اور بگڑ گئی۔ مروّت کی جگہ دیدہ دھویاپن، محبّت کی جگہ قابوچی پن اور وفا کی جگہ دغا زور پکڑ گئی اور چوں کہ یہ حرکات منشائے خداوندی کے خلاف ہیں، اندیشہ ہے کہ ابھی اور بھوگ بھوگنے پڑیں گے۔ خیر میاں! آپ کے لکھنے کا ہم پر یہ اثر ہوا کہ ہم نے آیئنے میں رُخِ مبارک کو دیکھا، پھر پنجی سے ڈنٹروں پر نظر دوڑائی اور ذرا تن کر بیٹھ گئے، اِس وقت اللہ بخشے مرزا یارن جان رفوگر، مرزا یارن کشمیری یاد آگئے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے دلّی مرحوم کو، پچاس برس پہلے کی دلّی تھی۔ گو باہمی منافرت کی تخم ریزی شروع ہوگئی تھی، لیکن ابھی شگوفہ کھلا نہیں تھا، جس نے بعد میں کٹا چھنی کی نوبت پہنچائی۔ اُس وقت تک ہندو مسلمان ایک تھے، کیوں کہ اگلے وقتوں کی مروّت اور محبّت کے نمونے اور عہدِ گزشتہ کے بچے کھچے لوگ دونوں قوموں میں موجود تھے۔

عام رواج تھا کہ مرفہ الحال اور فارغ البال حضرات شام کو جوڑیوں میں سوار ہوکر اور دوسرے حضرات پاپیادہ سیر و تفریح یا میل ملاقات کے لیے نکلا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی دکان چاوڑی بازار میں بیچ کی جگہ تھی۔ مرزا صاحب کا معمول تھا کہ عصر کے بعد کام کاج کے متعلق تمام چیزوں کو سمیٹ کر دکان کی کوٹھڑی میں ڈلوا دیتے تھے۔ کوٹھڑی کے دروازے پر شال کا پردہ لٹک جاتا تھا۔ دکان میں سفید براق چاندنی بچھتی، جس پر سلوٹ کا نام نہ ہوتا۔ دیکھو تو دکان چندن سی پڑی ہے۔ شام ہوئی اور مرزا صاحب نے کپڑے بدلے، اوپر سے مہین جھاگ سی تن زیب کا، نیچی چولی کا انگرکھا پہنا اور چھوٹے سے گاؤ تکیے کے سہارے دکان کے سرے پر اس طرح آبیٹھے کہ پشت حوض قاضی کی طرف رہے اور منھ بڑھ شاہ بولا کی طرف۔ ایک شاگرد کو سامنے بٹھاتے کہ جو سواری

حوض قاضی سے چاوڑی بازار میں داخل ہو فوراً بنائے۔ شام کے وقت مرزا صاحب کی دکان رفوگر کی دکان نہیں تھی، سیرگاہ عام تھی۔ دکان کے نیچے پٹری پر مونڈھے پڑے رہتے تھے، اُن پر ایسے سیلانی جیوڑے جن کو مرزا صاحب سے یاد اللہ تھی، آتے جاتے ٹھیکی لگاتے تھے۔

جلیٹھ، بیساکھ کی گرمیاں ہیں۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ دونوں وقت ملا چاہتے ہیں۔ دن بھر کی چلچلاتی دھوپ سے تپتی ہوئی زمین پر سقوں کے چھڑکاؤ نے سوندھی سوندھی خوش بو پھیلا دی ہے۔ ادھر پھول والوں کے جہاں تہاں، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچھے۔ موتیا، بیلا، رابیل، موگرا، چنبیلی کے پھولوں کی ڈھیریاں، گجرے، کنٹھے، ہار، مالا چھبیوں میں کیلوں کے پتّوں پر رکھتے ہیں اور بازار کو مہکا رہے ہیں۔

اب وہ بات آتی ہے، جس کے لیے میں نے یہ سارا قصّہ چھیڑا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے، قاضی کے حوض کی طرف حکیم عبدالمجید خاں کی سواری دکھائی دی۔ سیاہ مُشکی جوڑی، قد آور، مُنھ زور، کس بل کے دھنی گھوڑے بگّی میں جتے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کی مُنھ زوری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ گاڑی کے بموں سے نکلے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب قبلہ راسیں کھینچے، گھوڑوں کی شوخی کو لگام دیے اور انھیں قابو میں کیے چلے آرہے ہیں۔ مرزا صاحب نے ٹوپی اور سر کے بال درست کیے۔ ڈنڑوں پر نظر ڈالی کہ آستین میں کہیں شکن جھرس تو نہیں ہے۔ انگرکھے کی چولی پر ہاتھ پھیرا، اور ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے۔ بگّی دکان کے آگے پہنچی۔ حکیم صاحب نے سلام میں سبقت کی۔ مرزا صاحب نے ذرا بلند ہو کر سلام کا جواب دیا۔ بگّی یہ جا وہ جا۔ تھوڑی دیر بعد لالہ رام کشن داس جی خلف لالہ چھنّا مل جی کی سواری آئی۔ شاگرد نے حسبِ معمول اطلاع دی۔ مرزا صاحب نے وہی پینترے بدلے۔ وہ بھی گزر گئے۔ ابھی چھوٹے لال جوہری، لالہ میناملِ دھولیا والے، نواب احمد سعید خاں، حکیم ظہیر الدین خاں، ڈپٹی ہادی حسین خاں، ڈپٹی الٰہی بخش کی سواریاں آ جا رہی ہیں اور مرزا صاحب سے دعا سلام کے کیا کہنے۔ سنی سنائی نہیں، آنکھوں دیکھی بات ہے، ایک دن حکیم عبدالمجید خاں خدا جانے کس خیال میں مستغرق تھے کہ بگّی مرزا صاحب کی دکان سے آگے نکل گئی اور حکیم صاحب نے توجہ نہیں کی۔ اب صورت یہ ہے کہ بگّی کے گھوڑے اور اس کے اگلے پہیے دکان سے آگے نکل چکے ہیں اور پچھلے پہیے دکان کے مقابل ہیں کہ حکیم صاحب وہیں رُکے۔ اُن لوگوں کی وضع داریوں اور اندازشناسیوں نے جھرجھری سی لی، گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی، اور گردن موڑ کر مرزا صاحب کو سلام کیا۔ بندہ اُس وقت وہاں موجود تھا۔ مرزا صاحب بہت خوش ہوئے۔ نوجوان انھیں چچا میاں کہا کرتے تھے اور وہ سب کو بھتیجا کہتے تھے۔ بولے، بھتیجے! دیکھا، شریف ہیں، شریف۔

غرض آپ کا خط پڑھ کر ہمیں مرزا یار ان جان، اللہ مغفرت فرمائے، یاد آگئے۔ خوش نصیب

تھے کہ یہ وقت نہ دیکھا، ورنہ سر دیواروں سے ٹکراتے اور مر جاتے۔ اب نہ وہ مرزا جی ہیں اور نہ اُن کے وہ دیوانے باؤلے قدر دان۔ مرزا جی کے تھڑے کو انقلاب کی آندھی نے دلّی سے راولپنڈی لے جا پٹکا، سنا ہے اُن کے لڑکے نے وہاں دکان کر لی ہے اور وہ خود اور اُن کے ہم عصر دلّی کے قبرستانوں میں پاؤں پسارے پڑے ہیں۔ تصوّر میں اس امی جمی کے نقشے کھینچتے ہیں تو زندگی بے حلاوت ہو جاتی ہے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

اچھا صاحب! ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا ایک فقرہ نقل کر کے یہ داستان ختم کی جاتی ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا:-

"شاید ایسا وقت آ جائے کہ لوگوں کے پاس ان باتوں کے سننے کا وقت نہ رہے اور جب ان باتوں کی مانگ نہیں ہو گی تو پھر کوئی کیوں ان باتوں کو سُناتا پھرے گا۔" خدا حافظ

شامِ ہمدرد، کراچی
۱۰ر جون ۱۹۶۵ ش

اے۔ڈی اظہر

جناب اے۔ڈی اظہر صاحب اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں اور بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک۔ شامِ ہمدرد میں چائے کے وقت اظہر صاحب کی بذلہ سنجی اور شگفتہ بیانی نُقلِ محفل کا کام دیتی ہے۔ آج نئی تانتی کے سامنے نُقل کا لفظ بولا جائے تو حیرت سے منہ دیکھنے لگیں۔ اور بغیر اعراب کے لکھا جائے تو اسے نَقَل پڑھیں۔ یہی صورت تانتی کا لفظ سن کر پیش آئے۔ بہت ممکن ہے تانتی کو تانت کا مؤنث سمجھیں۔ لیجیے ان ہی دو لفظوں سے آپ نئی پود کی اُردو دانی کا اندازہ لگا لیجئے۔ مضمون کی غلطیوں کو تو نہ پوچھیے املا کی غلطی کا یہ عالم ہے کہ ایک بی۔ اے کے طالب علم نے تعویذ جیسے معمولی لفظ کو ذ سے لکھنے کے بجائے ز سے لکھا۔ حالاں کہ یہ صاحب زادے بی۔ اے تک اُردو پڑھتے چلے آئے تھے۔ یہ تو خیر ابتدائی باتیں تھیں۔ لیکن اظہر صاحب نے شمعِ اُردو کا پروانہ بن کر جب یہ دیکھا کہ اس شمع کو فروزاں رکھنے کے لیے جن لوگوں سے اس کے تیل بتّی کی فراہمی کی توقعات تھیں وہ بجلی کے ہنڈوں کے آگے اب اس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تو ان کے دردمند دل سے بے ساختہ "غریب اُردو" کی صدا نکلی اور اس صدا کو انھوں نے آج کی شامِ ہمدرد میں بلند کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ ان کی اس عنایت کا میں تہِ دل سے ممنون ہوں۔

جناب اظہر صاحب کا اصل نام تو احمد الدین ہے لیکن اے ڈی اظہر کے عرف میں وہ ایسا پوشیدہ ہوا ہے کہ کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ اظہر جو تخلص تھا اب نئے نام کا ضمیمہ ہو گیا ہے۔

اظہر صاحب کی خداداد صلاحیت کا اس بات سے اندازہ لگایئے کہ سیالکوٹ کے نواح میں جہاں آپ پیدا ہوئے وہاں اُس وقت تک تحصیل علم کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آپ اپنی بستی کے پہلے فرد ہیں جنھوں نے علم کے شوق میں گھر کو چھوڑ کر سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔

اسکول کی تعلیم سے فراغت پاکر کالج میں داخلہ لیا اور دونوں جگہ ہر امتحان میں اوّل آئے۔یہیں سیالکوٹ میں شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال کے استادِ گرامی جناب مولانا میر حسن صاحب سے اظہر صاحب کو تلمذ کا شرف حاصل ہوا، اور اُن کی بزرگانہ شفقت سے اظہر صاحب کے دل میں اُردو، فارسی اور عربی کا ذوق پیدا ہوا۔یہ اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ جب انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اوّل آنے پر ان سے پوچھا گیا کہ انعام میں تمھیں کون سی کتاب چاہیے تو آپ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ والے قرآن شریف کی خواہش ظاہر کی اور اسے حاصل کیا۔

لڑکپن سے شاعری کا شوق رہا۔چناں چہ بارہ سال کی عمر میں یہ شعر کہا تھا ؎

خُدایا اپنی رحمت سے مصفّا کر دے دل میرا
بُری باتوں کا آئندہ نہ ہو دل میں میرے ڈیرا

کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر اظہر صاحب نے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کا امتحان پاس کیا اور محکمہ مالیات میں افسر بنے۔آسٹریلیا میں حکومت ہند کے آخری اور حکومت پاکستان کے پہلے ٹریڈ کمشنر رہے۔پھر صوبہ پنجاب میں فنانس سکرٹری اور حکومت پاکستان میں جوائنٹ سکرٹری رہے۔آخر میں پاکستان کے سفارت خانۂ انگلستان میں مشیرِ مالیات اور وزیرِ اقتصادیات کے عہدے سے ریٹائر ہوئے، اور آج کل اُردو کی خدمت کی کشش مرکزی اُردو ترقی بورڈ میں بحیثیت ڈائرکٹر لے آئی ہے۔

اظہر صاحب کو اُردو زبان و ادب کا شوق ہمیشہ سے رہا ہے۔بزمِ اُردو شملہ اور دہلی کے سکرٹری رہے۔بڑے بڑے مشاعروں کی صدارت کی جن میں نواب سراج الدین سائل، پنڈت ساحر، مولانا حسرت موہانی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ثاقب لکھنوی اور جگر مرادآبادی جیسے بڑے شاعر شریک ہوئے۔

پاکستان بننے کے بعد اظہر صاحب مغربی پنجاب کے فنانس سکرٹری بن کر لاہور آئے تو سرکاری فائلوں میں نوٹ اُردو میں لکھے۔

اسلامی مطالعہ کے ساتھ ساتھ اظہر صاحب نے عیسائیت کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔اس لیے اس کے متعلق کافی معلومات رکھتے ہیں۔اور اس موضوع پر آپ نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔

CHRISTIANITY IN HISTORY

اظہر صاحب کے مزاحیہ اور سنجیدہ کلام کا مجموعہ "لذتِ آوارگی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔دوسرا اظہریات کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔

جناب اظہر صاحب نے اپنی تقریر کا عنوان "غریب اُردو" رکھا ہے۔ اس عنوان نے اُردو کے سلسلے میں میرے جذبات واحساسات کو بھی متحرک کر دیا ہے اور چند باتیں عرض کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔

اُردو ہماری قومی زبان ہے۔ ہم کو عزیز ہے۔ ہم اس کی ترقی چاہتے ہیں۔ آپ کسی سے بھی اس مسئلے پر بات کیجیے، وہ اُردو کی حمایت ہی کرے گا۔ بہت کم متنفس ایسے ہوں گے جو اُردو کے خلاف کچھ کہیں گے، لیکن اُردو سے یہ ساری محبت وچاہت زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ کہنے کو عوام اُردو کے حامی ہیں۔ حکومت اُردو کی سرپرست ہے، اور دانش ور اُردو کے علم بردار ہیں۔ لیکن اس سے اُردو کو کیا فائدہ ہوا۔ قوم کا ایک بہت بڑا طبقہ جو اتفاق سے موثر اور حامل اقتدار بھی ہے اُردو کے معاملے میں خود اعتماد نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے اُردو ہماری زبان ہے۔ اور مغربی پاکستان کی قومی زبان بھی ہے۔ لیکن ابھی اُردو میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ سارے کام جو انگریزی میں انجام دیے جا سکتے ہیں اُردو میں بھی اسی حُسن وخوبی کے ساتھ انجام دیے جا سکیں۔ پوچھیے کہ حُسن وخوبی سے کیا مُراد ہے۔ تو وہ چند انگریزی الفاظ پیش کر کے فرمائیں گے کہ دیکھیے صاحب یہ فورس (Force) اور یہ بیوٹی (Beauty) اُردو میں کہاں، اس کے بجائے کون سے اُردو الفاظ آپ استعمال کریں گے۔ اب اگر منزل تک پہنچانے کے لیے الفاظ کے اُردو مترادفات بھی پیش کر دیجیے تو وہ فرمائیں گے کہ ان الفاظ سے وہ مفہوم اور وہ تصوّر واضح نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ پھر ان الفاظ میں "وہ بات" سمجھنا چاہیں کہ اس "وہ بات" سے اُن کا مطلب کیا ہے؟ تو انگریزی اور اُردو میں ملی جلی طویل تقریر کے بعد وہ خود اپنی "وہ بات"، نہ سمجھا سکیں گے۔

یہ ہے وہ تحفہ جو انگریزی نے ہمیں دیا ہے کہ ہم اپنی بات بھی اُردو میں نہیں سمجھا سکتے، انگریزی میں تو کیا سمجھائیں گے۔ اس لیے کہ ہمیں کسی زبان پر کتنا ہی عبور کیوں نہ ہو جب تک ہمارے خیالات واضح اور صاف نہ ہوں ہم کیا سمجھائیں گے۔ انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ہمارے خیالات ہی پختہ نہیں ہو سکے، ہمارا ذہن ہی صاف نہیں ہو سکا، اور یہ حالت عام پڑھے لکھے لوگوں کی نہیں ہے بلکہ ہمارے اساتذہ کی اکثریت کا بھی یہی عالم ہے۔ یہ بات میں ایک مفروضے کے طور پر اپنی جانب سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہمارے ملک کے چوٹی کے ماہرین تعلیم کی رائے دُھرا رہا ہوں۔ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب وائس چانسلر جامعہ کراچی نے ایک بار کراچی میں شامِ ہمدرد ہی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں دعوٰی سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ۹۵ فی صد

اساتذہ کی انگریزی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کی صحیح ترجمانی کر سکیں اور اگر وہ اس کے مدعی ہیں تو ان کا دعویٰ غلط ہے۔ اسی طرح جامعۂ پنجاب کے فاضل وائس چانسلر جناب پروفیسر حمید احمد خان صاحب نے حال ہی میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرنے کا حق دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ غیر ملکی زبان کو سمجھنے کی زیادہ اور اس میں اظہار کی صلاحیت طالب علموں میں کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی طالب علم صحیح انگریزی بولنے یا لکھنے پر قادر نہیں ہے بلکہ میرا تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایک ہزار اساتذہ میں سے صرف ایک اُستاد ہی انگریزی زبان بولنے یا لکھنے پر قادر ہے۔ ہمارے ملک کے مشہور سائنس دان اور ماہرِ تعلیم جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب بھی اُردو کے ذریعۂ تعلیم و تدریس ملنے کی صلاحیت و ضرورت اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کے نقصانات واضح فرما چکے ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب کا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ یورپ میں جو ریاضی کا نصاب تین سال میں مکمل ہوتا تھا، وہ ڈاکٹر صاحب نے دو سال میں اس لیے پورا کر لیا کہ ریاضی کو اُردو زبان میں پڑھنے کی وجہ سے اس پر ڈاکٹر صاحب کو جو عبور حاصل تھا وہ دوسروں کو کم تھا۔

علماء و ماہرین کے خیالات و تجربات تو یہ ہیں۔ اب آپ کس کی رائے کو اہمیت دیں گے اور کس کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے؟ کیا ہمیں کسی غیبی طاقت کا انتظار ہے جو ایک مکمل، بھرپور اور دھلی دھلائی اور آپ کوثر سے دُھلی دُھلائی زبان لاکر ہمیں دے دے اور کہے کہ اب اُردو مکمل ہو گئی، اس میں جو خامیاں آپ کو محسوس ہوتی تھیں اب وہ اس میں نہیں ہیں، اب یہ آپ کے شایانِ شان ہے، اور اب اس میں "وہ بات" بھی ہے جو آپ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جس کی آپ کو تلاش تھی لیجیے اب آپ اس سے شوق فرمایئے۔ خواتین و حضرات! یقین کیجیے کہ وہ وقت کبھی نہیں آئے گا، اور وہ غیبی طاقت بھی ظہور میں نہیں آئے گی۔ لیکن میں یہ عرض کروں کہ وہ طاقت خود آپ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ صرف اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور وہ اُجاگر ہو گی صرف محبت سے۔ جب اُردو ہم کو واقعی محبوب ہو جائے گی تو اس کی خامیاں بھی خوبیاں نظر آنے لگیں گی جیسے کہ ہر محبوب کی بُرائیاں خوبیاں معلوم ہوتی ہیں!

میرے ایک محترم ایرانی دوست نے ایک بار کہا کہ پاکستان میں اُردو تو کوئی نہیں جانتا، کیوں کہ اوّل تو میں نے یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو آپس میں انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے، دوسرے وہ اُردو میں بات کرتے بھی ہیں تو آدھے سے زیادہ الفاظ انگریزی کے استعمال کرتے ہیں۔ پھر اُردو کو قومی زبان کیوں کہا جاتا ہے؟ ان ایرانی دوست کا یہی

نہیں میرے خیال میں ہر اس غیر ملکی کا تاثر یہی ہوتا ہوگا جس کو ہماری مجلسی زندگی کے مشاہدے کا موقع ملتا ہے۔

یہ حقائق ہیں جو تلخ ہیں اور اسی لیے قابلِ غور بھی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اُردو کے مستقبل کی جانب سے میں مایوس نہیں ہوں۔ ہماری بے اعتنائیاں ایک طرف اور اُردو کا اعجاز دوسری طرف۔ ہماری انگریزی دوستی کے باوجود اُردو کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہماری دو یونی ورسٹیوں نے اُردو کو اعلا تعلیم کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اُردو کے اخبارات کا معیار نہ صرف یہ کہ پہلے سے بلند ہو گیا ہے بلکہ ان کی وسیع اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو کے اخبارات بہت تیزی سے انگریزی اخبارات کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ اُردو رسائل بھی پہلے سے بہت زیادہ پڑھے جانے لگے ہیں۔ کئی سرکاری و غیر سرکاری ادارے اُردو کے علمی پہلو کو ترقی دینے میں شب و روز منہمک ہیں۔ اور لاہور میں تو خاص طور پر اُردو تحریک بڑے جوش اور زور کے ساتھ چل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کراچی اور صوبے کے دوسرے شہر بھی لاہور کی تقلید کریں گے اور ایسا ماحول بنانے کی کوشش کریں گے کہ اُردو کو کوئی "غریب اُردو" نہ کہہ سکے۔

حکیم محمد سعید

غریب اُردو

جناب احمد الدین اظہر
ڈائرکٹر اردو ترقی بورڈ، لاہور

بیا دربد گر اینجا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

غالب نے غریب شہر کی پھبتی کہی تو اپنے ہی لیے تھی لیکن آج یہ پھبتی اُردو پر بھی اُسی طرح صادق آتی ہے جس طرح کس زمانے میں مرزا غالب نے اپنے ہم عصروں سے تنگ آ کر اپنے اوپر چسپاں کر لی تھی۔ آج کل اُردو بھی، باوجود اس کے کہ حکومت نے اُسے مغربی پاکستان کی زبان قرار دے دیا ہے، اپنے ہی وطن میں غریب الدیار ہے، اور اپنے ہی وطن میں بھیک مانگتی پھر رہی ہے کہ مجھے دفتروں میں لگاؤ۔ کمپنیوں میں لگاؤ۔ اپنی بول چال میں لگاؤ۔ کہیں لگاؤ مگر مجھے کسی کام پر لگاؤ تو سہی کہ مجھے روٹی، کپڑا اور عزت سے میسّر ہو لیکن اہلِ وطن کو باہر کا کچھ ایسا چسکا پڑا ہے کہ انھوں نے اپنی زبان کو گویا دیس نکالا دے رکھا ہے۔ گھر والوں کو باہر کا چسکا پڑ جائے تو گھر کا یہی حال ہُوا کرتا ہے۔ کچھ عرصہ ہُوا میں نے کہا تھا ہے

گھر والے باہر کے من میں چھوڑ چلے گھر بار
دھکے کھاتے ہیں اغیار کے جا کے سرِ بازار
اُردو بی بی برسوں سے بن ٹھن کر ہے تیار
لیکن پلٹے بیٹھے ہیں انگریزی میم سے یار

اور باہر والے یہاں آتے ہیں تو چاہے وہ امریکا ہی سے کیوں نہ آئیں یہ بات مشکل سے ان

کی سمجھ میں آتی ہے، اور وہ تعجّب بھی کرتے ہیں کہ ہم نہ صرف اپنی زبان نہیں بولتے بلکہ انگریزی یعنی اُن کی زبان بولنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی تعلیم و ثقافت وغیرہ کو بھی اس انگریزی کیلنڈرے سے ناپتے ہیں۔ اب جو اپنی زبان کا چرچا چل نکلا ہے تو ایک واقعہ بھی سنتے جایئے :- (یہ واقعہ اخباروں میں آچکا ہے)۔ میرے ایک دوست فتح محمد شیفتہ جرمنی گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے سنا کہ ایک جغرافیے کا وفد جرمنی سے پاکستان آنے والا ہے۔ وہ وفد کے لیڈر سے ملنے گئے اور حسبِ عادت انگریزی میں بات چیت شروع کی۔ جرمن صاحب نے اُردو میں جواب دیا۔ شیفتہ صاحب بہت خوش ہوئے اور پوچھا "آپ نے اُردو زبان کہاں سے سیکھی؟" انھوں نے کہا کہ "پاکستانیوں اور ہندستانیوں سے جو جرمنی آتے ہیں۔" شیفتہ صاحب نے پوچھا "کیوں سیکھی؟" تو انھوں نے اُردو میں جواب دیا "میں نے سمجھا کہ آپ کے ملک کے لوگوں کے لیے بہترین تحفہ آپ کی زبان ہے۔ یہ زبان سیکھ ہی کے جاؤں گا۔" جب وہ پانچ چھے مہینے کے بعد واپس جرمنی لوٹے تو میرے دوست، جو پھر کسی کام سے جرمنی گئے تھے، ان سے ملنے گئے اور آپ بڑی خود اعتمادی سے جاتے ہی اُردو میں بولنے لگے۔ لیکن اب کے ان جرمن صاحب نے انگریزی میں جواب دیا۔ شیفتہ صاحب سے نہ رہا گیا۔ تعجّب سے بولے کہ "اب آپ کو کیا ہو گیا؟ پہلے میں نے انگریزی میں گفتگو شروع کی تھی تو آپ نے اُردو میں جواب دیا تھا۔ اب آپ کی پاکستان سے واپسی پر میں نے اُردو میں گفتگو کی ہے تو آپ انگریزی میں جواب دے رہے ہیں۔" جرمن صاحب کہنے لگے "اب مجھے اُردو میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے ملک سے ہو آیا ہوں اور وہاں ہر آدمی مجھ سے انگریزی میں بات کرتا تھا۔ کسی نے اُردو میں بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی!"

ایک بار میں جاپان کے سفیر سے باتیں کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے پوچھا "آپ اپنی حکومت سے کس زبان میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں؟ قدرے تعجّب سے کہنے لگے "جاپانی میں!" میں نے کہا "آپ کو کوئی دِقت پیش نہیں آتی؟" کہنے لگے "نہیں تو۔" میں نے ان سے کہا "آپ کے ملک میں کوئی رومن رسم الخط کی تحریک نہیں؟" ان کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ میں نے وضاحت کی تو بولے "او اچھا! اب سمجھا آپ کا مطلب! ہاں اس طرح کی ایک تجویز کچھ امریکنوں نے کی تو تھی مگر وہ چلی نہیں!"

اب جاپان اتنی ترقی کر گیا ہے کہ قریب قریب ہر مغربی ملک سے بھی دو قدم آگے ہی ہے۔ اگر جاپان اپنی زبان کی اتنی دقتوں کے باوجود ترقی کر رہا ہے تو صرف ایک ہمیں کیوں ہیں جو انگریزی چھڑی کے سہارے بغیر نہیں چل سکتے؟ ہماری تو اب یہ حالت ہو چلی ہے کہ کسی

مغربی کی ٹائی اچھی دیکھی ہم نے جھٹ سوچا کہ اس نے ٹائی کی وجہ سے ترقی کی ہے۔ بس کھٹ سے وہ ٹائی خرید لی یعنی پنجابی کہاوت کی رو سے "جس لائی گلی او ہدے نال اٹھ چلی!" کاش ہم اقبال کے کہے ہی کو یاد رکھتے کہ ؎

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب
باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوّتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از بے دینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوّتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست

وغیرہ وغیرہ

مثلاً ایک ہی ادارہ لیجیے جس میں لڑکیوں کے بال تو ہم نے شاید آپ ہی کاٹے ہوں۔ لیکن اس کی مشینوں کا ایک پرزہ بھی ہم آپ نہیں بنا سکتے۔

ہم یہ تو کہتے رہتے ہیں کہ ہماری صنعت وحرفت اپنی ہو مگر ہم اپنی زبان کو نہیں اپناتے۔ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ تقلید ایک ذہنی فعل ہے اور جب تک ہم اپنی زبان نہیں اپنائیں گے اُس وقت تک ہم دوسروں کی تقلید کرتے رہیں گے یعنی جب تک دوسروں کی زبان بولتے رہیں گے تقلیدی ہی رہیں گے۔ تخلیقی نہیں بنیں گے اور کوئی اپنی چیز نہیں بنا پائیں گے۔ اپنی صنعت وحرفت سے یاد آیا کہ ایک مرتبہ مغربی پاکستان کی ایک بہت ہی بڑی اہم جگہ پر ایک صنعت وحرفت کی مجلس منعقد ہو رہی تھی۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ "اگر اجازت ہو تو میں اپنے خیالات انگریزی میں ادا کروں۔ میں انگریزی میں اپنے خیالات بہت عمدگی سے سمجھا سکوں گا۔" اس پر جناب صدر نے، جو ایک بہت ہی بڑی ہستی ہیں، ان سے کہا کہ آپ کی مادری زبان کیا انگریزی ہے؟

انگریزی نہ چھوڑنے پر ایک اور لطیفہ بھی یاد آگیا۔ اپنے وطن میں بڑھتی ہوئی عیسائیت کا رونا ہم آئے دن روتے رہتے ہیں لیکن اس عیسائیت کی زبان کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔

تثلیث کی زباں کو تو ہم چھوڑتے نہیں
اور اس کے ریڈ کراس کے چھڑوانے پر ہے زور
اپنی اس ادا پہ ہیں خوش صاحب لوگ سب
انگلش میں ہو تو شوق سے ہو رات دن یہ شور

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اب ہم پنجابی اور دوسری علاقائی زبانوں کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ آئیے ذرا اس بات کا جائزہ لیں کہ کل تک تو ہم اُردو اُردو پکارتے تھے آج پاکستان بننے پر ہمیں کیا ہو گیا کہ ہم نے پھر سے علاقائی زبانوں کی مالا جپنی شروع کر دی ہے، اور اپنی زبان کو پھر سے گویا اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

آج سے قریباً ساٹھ سال پہلے سنہ ۱۹۰۷ء میں، جب میں ابھی سات سال کا تھا، میں اپنے گاؤں میں پہلا انسان تھا جو پاس کے ایک قصبے کے چھوٹے سے مدرسے میں داخل ہوا۔ چوں کہ میں اپنے گاؤں میں گویا اول العالمین تھا گاؤں والے خط وغیرہ مجھی سے لکھواتے تھے۔ وہ میرے پاس آتے اور مجھے مختصر نویس یعنی سٹینو گرافر گردان کر خط کچھ اس قسم کی اردو میں لکھواتے "اس جگہ خیریت ہے (یعنی خیریت ہے) اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں" ان کا مطلب مکتوب الیہ کی بے ادبی نہ تھا۔ وہ اس سے بہتر اُردو نہ جانتے تھے۔ لیکن پنجابی ہونے کے باوجود وہ لکھواتے اُردو ہی میں تھے۔ پنجابی میں، جو ان کی مادری بولی تھی، کبھی نہ لکھواتے تھے۔ آپ کہیں گے کہ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ اس وقت کا رواج یہی تھا اور کہ وہ رواج کے مارے ہوئے تھے۔ سو اول تو میں کہوں گا کہ یہ محض رواج کی بات نہ تھی۔ اس کی تہہ میں کچھ اور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ وہ جذبہ اسلامی ثقافت کو برقرار رکھنا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۴۹ء سے سنہ ۱۹۵۲ء تک جب میں چاٹ گام کی سرزمین جنت نظیر میں تھا، وہاں ایک بہت بڑے عالم اور بہت بڑے شخص محمد الرحمٰن نے مجھ سے ایک کھانے پر کہا جہاں بہت سے چاٹ گامی بیٹھے تھے، "اظہر صاحب! جب تک انگریز اور ہندو کا راج تھا ہمارے بھائی اُردو اُردو کرتے تھے۔ اب جب انگریز اور ہندو دونوں یہاں سے چلے گئے ہیں تو ہم نے پھر سے اپنی اپنی بولیوں کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو صرف ان لوگوں کے نکالنے کا ذریعہ تھی"۔ دوسرے میں کہوں گا کہ اگر یہ رفاقت پر مذہبی ہی تھی جس کی وجہ سے خط اُردو میں لکھوائے

جانتے تھے تو ایسی روایت تھی کیوں؟ یہ رواج تھا کیوں؟ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ کوئی اور تھی۔

انیسویں صدی کے شروع میں سکھوں کا نیا نویلا راج آیا تو انھوں نے آتے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی اذانیں بند کرادیں۔ جب بے چارے مسلمانوں نے اس کی وجہ پوچھی تو انھیں بتایا گیا کہ مسلمانوں کی اذانوں کی آواز سکھنیوں کے کانوں میں پڑتی ہے تو ان کے کان بھرشٹ ہو جاتے ہیں۔ اذان کو پنجابی میں فارسی کی نقل میں "بانگ" بھی کہتے ہیں چنانچہ بعد میں بانگ کے لفظ سے کئی طرح کے خراب محاورے چل نکلے جو آج تک جاری ہیں۔

سکھوں نے مسلمانوں سے یہ بھی کہا کہ تم اس بولی کے کیا لگتے ہو، یہ تو ہمارے گوروؤں کے مُنھ سے نکلی ہے۔ گورمکھی ہے۔ (آج ہم میں سے کچھ لوگ گورمکھی کو رسم الخط کہتے ہیں سو گزارش ہے کہ ہم میں سے کتنوں نے کس کے منھ سے زبان کے بجائے رسم الخط نکلتے دیکھا ہے۔ جب تک کوئی مداری نہ ہو اور وہ رسم الخط کا کھایا ہوا کاغذ مُنھ سے نہ نکالے!) چناں چہ ہم نے اس وقت سے پنجابی چھوڑی اور باوجود اس کے کہ ہم نے پنجابی میں وارث شاہ اور بلھے شاہ جیسے نام ور ادیب اور صوفی پیدا کیے تھے اردو اپنائی اور سر سیّد، حاؔلی، نذیر احمد، شبلی، محمد حسین آزاد، مولانا ظفر علی اور علامہ اقبال جیسے نام ور اور عظیم ادیب اردو میں پیدا کیے۔ ہم نے پاکستان بنایا تو اُردو کے لیے بھی تھا۔ اب ہم اس سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ خدا نخواستہ ہم نے بنیوں کا مذہب بدلنے کے لیے تو ایسا نہ کیا تھا؟ میں نے ایک جگہ کہا ہے ؎

بسوں میں مارے مارے جو پھرا کرتے تھے بے چارے
جو چارہ مل گیا ان کو تو موٹر بھی نہیں بھاتی
پرانے چور تھے لیکن طریقے سے، سلیقے سے
نئے بنیوں کو چوری بھی سلیقے سے نہیں آتی

تو میں یہ کہنے والا تھا کہ اب اچانک اُردو کو اپنا کر اس کے لیے ایک نیا ملک بنا کر اس سے ہٹنے کی کئی وجہیں ہوں گی۔ لیکن اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ پاکستانیوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اُردو کے اجارہ دار ہم ہیں، دوسرے گنواروں کو اس کا کیا پتا۔ وہ یہ تو بھول گئے ہیں کہ ؎

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور انھوں نے صرف یہ کہنا شروع کر دیا ہے۔ ؎

کہ آتی ہے اُردو زبان آتے آتے

وہ یہ بھی بھول گئے ہیں کہ اب وہ اُس جگہ نہیں جہاں پہلے اُردو بولی جاتی تھی۔ اب وہ پاکستان میں ہیں۔ اب وہ پاکستانی ہیں۔ اب اُردو وہ ہوگی جو یہاں کے میل ملاپ سے بنے گی۔ کچھ لوگ یہ کہتے بھی سنے گئے ہیں کہ کچھ لوگوں کا لہجہ اُس زبان کا سا نہیں ہے جو پہلے بولی جاتی تھی۔ اس کے متعلق پہلی گزارش تو یہ ہے کہ موٹے موٹے لہجے چار ہیں۔ لکھنوی لہجہ جسے دہلوی نہیں مانتے۔ دہلوی لہجہ جسے لکھنوی نہیں مانتے۔ حیدرآبادی (دکن) لہجہ جسے یہ دونوں نہیں مانتے اور آج کے باقی پاکستانی جو اِن تینوں کے لہجوں کو نہیں مانتے! خیر جب یہاں کے پہلے باسی اس طرح کے خطابات سے نوازے جانے لگے جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ تو انھوں نے بھی ضد میں آکر باغیانہ رویہ اختیار کر لیا۔ اور کہا، "اچھا یوں تو یوں ہی سہی۔ ہمیں اُردو نہیں آتی تو پھر ہم اسے بولیں کیوں؟ پھر اُردو پاکستان کے کسی علاقے کی زبان بھی تو نہیں" وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو ایک لحاظ سے اچھی بات ہے کہ اُردو کسی علاقے کی زبان نہیں ورنہ کئی علاقائی بولیوں کے ہوتے ہوئے روز جوتم پیزار ہوتا کہ ہمیں یہ زبان چاہیے۔ اور اگر اب اُردو سے اس لیے بیر ہے کہ یہ پاکستان کے کسی علاقے کی زبان نہیں تو پھر ہم میں سے مثلاً پنجابیوں نے "ہسٹری آف سروسز" میں مادری زبان کے خانے میں "اُردو" زبان کیوں لکھوائی تھی۔ میں اور میرے کئی ساتھی، جو بہت بڑے بڑے عہدوں پر انگریز کے وقت میں مامور رہ چکے ہیں، ان میں سے ہیں۔

آپ کا مرکزی اُردو بورڈ اس مسئلے کی طرف بھی توجہ دے رہا ہے اور بہت حد تک اب یہ مسئلہ سلجھ بھی چکا ہے۔ اس لیے بقیہ مقالے میں میں صرف چند نکات کی طرف مختصر طور پر اشارہ کروں گا۔

کئی لوگ اب بھی ایسے ہیں جنھوں نے یہ کہنا نہیں چھوڑا کہ ان کی مرغوب زبان انگریزی کو رکھیں اور اگر کسی وجہ سے کسی وقت ان کی زبان یعنی انگریزی نہ بھی رہے تو پھر بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ کم از کم رومن رسم الخط تو رہے تا کہ کسی طرح سے ان کی تسکین تو ہو۔ اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ میں صرف یہ رباعی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ۔

کہتے ہیں کہ رسمِ خط ہو رومن اپنا
من اپنا تو ہو مگر نہ ہو تن اپنا
اتنا تو وطن کے یہ ڈریور جانیں
گاڑی وہ اپنی جس کا انجن اپنا

وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلے اُردو تیار ہولے پھر ہم اسے اپنائیں گے۔ آپ ہی بتایئے کہ آج تک کبھی کسی زبان نے ملک سے پہلے فٹنس کا سرٹیفکٹ حاصل کیا ہے۔ یہ سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لیے زبان کا استعمال ضروری ہے۔ یعنی زبان کو صحت کا یہ سرٹیفکٹ دینے والا معالج "استعمال" ہے۔ اور اس معالج کو ہم بلواتے نہیں! اس سلسلے میں میں نے کہا ہے ؎

کہتے ہیں اُردو کو فٹنس کا ملے سرٹیفکٹ
ورنہ اس کی دفتروں میں دال گلنی ہے محال
یہ تو ایسے ہے کہ جیسے ماں کہے بیٹے سے دیکھ
تیرنا جب تک نہ سیکھے پاؤں پانی میں نہ ڈال

دوسرے جب تک اُردو تیار ہوگی تو دوسری زبانیں اور دوسرے علوم جن کی ترجمانی اُردو کو کرنی ہے افیم کھا کر سوتے رہیں گے کیا؟ وہ آگے نہ بڑھیں گے؟ وہ ترقی نہ کریں گے؟ اور دس سالوں میں جب تک اُردو گویا تیار ہوگی دوسری زبانیں آج سے بہت آگے نہ نکل چکی ہوں گی؟ اور ان دس سالوں میں تیاری کے باوجود اُردو پہلے سے بھی پیچھے بہت پیچھے نہ رہ گئی ہوگی؟ انگریزی ہی کو لیجیے۔ جس میں کوئی چھے لاکھ الفاظ ہوں گے۔ اس نے پانچ لاکھ الفاظ باہر سے لیے ہیں جنھیں انگریزی نے آہستہ آہستہ انگریزی کا لباس پہنایا ہے۔ مثلاً tion- والے تمام الفاظ ایک ایک کر کے انگریزی نے لاطینی سے لیے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ زبان استعمال سے منجھتی ہے۔ جو لفظ اُردو میں نہیں ہیں وہ ہم دوسری زبانوں سے لے لیں گے۔ کل جب استعمال سے اپنا ذخیرہ وسیع تر ہوتا جائے گا ہم غیر زبان کی اصطلاحیں کم کرتے جائیں گے۔ اور اُردو انھیں لینے سے ہچکچاتی کہاں ہے۔ اس کی تو خوبی ہی یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنانے میں بہت وسیع القلب ہے اور اس لیے وسیع المشرب ہے ؎

ہر ایک شے کو سمونے کی ہے لچک اِس میں
یہ بات اور جہاں کی کسی زباں میں نہیں

باقی رہی اپنے ترجموں کی بات تو وہ ہوتے ہوتے ہوگی۔ ترجموں سے یاد آیا کہ ۴۹-۱۹۴۸ء میں جب میں سابق پنجاب کا دبیر مالیات (فنانس سیکرٹری) تھا تو میں نے ایک انگریز گورنر کی موجودگی میں اردو کو اپنے محکمہ میں جاری کر دیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے بعض اصطلاحات کے اُردو ترجمے میں کچھ دقتیں پیش آئی تھیں۔ لیکن یقین جانیے کہ اس مشکل کے باوجود میرے کلرکوں، سپرنٹنڈنٹوں اور افسروں نے مجھے کام کی باتیں بتانی شروع کر دی تھیں۔ آج کل

کی طرح نہیں کہ باہر سے نہایت اچھی انگریزی میں لکھا ہوا خط آیا اور کلرک نے اُسے اپنی غلط انگریزی میں ڈھال کر ساتھ ایک منفی "پچر" لگا دی!

اُس زمانے میں مجھے یاد ہے کہ میں نے پطرس بخاری مرحوم اور سالک مرحوم سے Please speak کا ترجمہ پوچھا تھا۔ اور ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ اس اصطلاح کے معنی میں اختصار اس کی جان ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ نہ افسر متعلقہ کچھ لکھے اور نہ اوپر کا افسر۔ ان دونوں صاحبان نے اس کا ترجمہ "بات کریں" یا "گفتگو کریں" سمجھایا۔ میں نے ہنس کر کہا کہ یہ تو ایسے ہوا جیسے افسر متعلقہ مجھ سے روٹھ گئے ہوں۔ وہ بھی ہنس دیے۔ پھر کچھ دیر کے بعد میں نے دونوں سے ٹیلی فون پر پوچھا، "زبانی" کیسا رہے گا۔ دونوں اچھل پڑے کہ ہو گیا۔ بات بن گئی۔ وہ لفظ میرے دوست اور کرم فرما جناب حمید احمد خان صاحب وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی کی نوازش سے اب "چالو" ہے۔ میرے دفتر میں تو وہ چالو ہو گا ہی۔

میں نے تو اُردو کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ میں جب لندن جاتا ہوں تو پرانی یادوں کو زندہ کرنے کی خاطر میرے مشفق مسٹر ڈین جو بی بی سی کے پاکستان سیکشن کے انچارج ہیں، اور کچھ دوسرے کرم فرما منجملہ دوسرے پروگراموں کے بی بی سی پاکستان سیکشن میں میرے لیے ایک "برین ٹرسٹ" یعنی سوال جواب کا پروگرام بھی رکھ لیتے ہیں۔ پچھلی مرتبہ یہ پروگرام میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے ساتھ بی بی سی پر کر رہا تھا۔ دوران پروگرام میں عاشق حسین صاحب نے مجھے ایک بات سنائی جو اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ "اطہر صاحب" عاشق صاحب فرمانے لگے "جس زمانے میں آپ فنانس سیکرٹری کے عہدے سے تبدیل ہو کر باہر چلے گئے تو وہاں کے ایک بہت ہی بڑے سی ایس پی افسر نے کہا، "عاشق صاحب آپ سے کیا چھپائیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہمیں اپنے کلرکوں پر فوقیت ہی اس لیے ہے کہ ہم انگریزی خواں ہیں اگر ہم اُردو جاری کر دیں۔ تو گویا انجمن حمایت اسلام لاہور اور حلقہ ارباب ذوق کے ارکان کی حکومت مان لیں کیا؟ جب تک ہمارا حلقوم میں دم ہے ہم اُردو نہیں آنے دیں گے۔"

معاملے کی اصل روح یہی ذہنیت ہے۔ میں نے ایک جگہ اس روح کا رونا رویا ہے، اور رومن رسم الخط کے بارے میں کہا ہے ؎

اُن کو رومن سے کیوں نہ ہو رغبت
اور انھوں نے پڑھا یہاں کیا ہے

اور سچی بات تو یہ ہے کہ ساری عمر ہم انگریزی پڑھتے رہے۔ انگریزی اور مضامین دونوں

سے کشتی لڑتے رہے۔ لیکن نہ انگریزی آئی نہ مضامین، نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ اب بھی اگر ہم کالج سے فورتھ ٹیئر کے اخیر سے اٹھ کر ولایت جائیں تو وہاں کسی یونی ورسٹی میں ہمیں داخل نہیں کیا جاتا۔ جب تک ہم وہاں کا میٹری کولیشن پاس نہ کرلیں وہ ہمیں پڑھا لکھا ہی خیال نہیں کرتے۔

تھوڑے سے تصرف سے میں نے گفتۂ غالب کو دھرایا ہے ؎

ہم کو اُن سے زبان کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے زبان کیا ہے

جن لوگوں نے اور کچھ پڑھا ہی نہ ہو وہ تو اُسی کو سراہتے رہیں گے جو انھوں نے پڑھا ہے۔ جب میں انگلستان سے واپس آیا تو اس زمانے کے کراچی روٹری کے صدر نے مجھ سے روٹری کے ایک ماہانہ جلسے میں بولنے کی فرمائش کی۔ میرے محکمانہ پس منظر کے پیشِ نظر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کوئی سا مالی یا اقتصادی موضوع چن لیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو مالی یا اقتصادی موضوع پر بولنے والے درجنوں اور بھی مل جائیں گے۔ نہیں ملے گا تو میرے جیسا کوئی اور!........ تعجب سے کہنے لگے وہ کیسے؟ میں نے کہا۔ میں بولوں گا اُردو پر۔ "اُردو بحیثیت قومی زبان" کہنے لگے یہ تو بہت اچھا موضوع ہے اور اس پر ابھی تک کوئی نہیں بولا۔ میں نے کہا مجھے معلوم تھا۔ کہنے لگے۔ آپ بولیں گے تو انگریزی ہی میں نا؟ میں نے کہا نہیں تو۔ اُردو پر انگریزی میں کیسے بولوں گا! اُردو ہی میں بولوں گا۔ ان کا مُنھ ذرا اتر سا گیا۔ کہنے لگے ہمارے آئین میں ہے کہ تقریروں کی زبان انگریزی ہو گی۔ میں نے کہا، میں اس کا علاج کیے دیتا ہوں۔ جھوٹ بولنا مجھے کم ہی سکھایا گیا ہے، لیکن آپ کی خاطر سے اچھا بھلا ہوتے ہوئے میں لکھ بھیجوں گا کہ میں بیمار ہو گیا ہوں۔ حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ آپ کسی بدل (Stand-by) سے تقریر کروا لیجیے۔ کہنے لگے نہیں آپ ہی بولیں۔ میں نے کہا میں تو اُردو ہی میں بولوں گا۔ ایک دفعہ انھوں نے پھر وار کیا اور اب کے وار کچھ زیادہ ہی بھرپور تھا۔ کہنے لگے وہاں اُردو سمجھنے والے ہوں گے بہت کم۔ انگریز، امریکن، ڈچ، جرمن، پارسی وغیرہ بہت ہوں گے۔ پاکستانی ہوں گے تو لیکن نسبتاً کم۔ میں نے کہا، آپ تو ہوں گے، اور اگر آپ نہ بھی ہوتے اور مجھے اس موضوع پر بولنے کے لیے کہا جاتا تو میں اُردو ہی میں بولتا اور بعد میں اس کا ترجمہ ہو جاتا۔ ترجمہ خواہ میری انگریزی جتنا بھی اچھا نہ ہوتا، لیکن میں اُردو ہی میں بولتا۔

یہاں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ میں نے ایک جگہ پڑھا ہے کہ میرے دوست

قیوّم نظر جو گورنمنٹ کالج میں اُردو کے پروفیسر ہیں، کسی کام سے یونسکو کے دورے پر گئے اور فرانس کے فلسفی ژاں پال سارتر سے ملے۔ وہ بہت اچھی انگریزی جانتا تھا۔ لیکن اس نے پروفیسر قیوّم نظر صاحب سے فرانسیسی میں باتیں کیں۔ جب قیوّم نظر صاحب نے کہا کہ انگریزی بولیے کہ میرے بھی کچھ پلے پڑے تو اس نے فرانسیسی میں جواب دیا کہ میں تو فرانسیسی ہی میں کہوں گا۔ لیکن بعد میں اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے گا۔ دور کیوں جاؤ۔ ہم چین اور روس گئے۔ ہم نے وہاں انگریزیاں ماریں۔ سنا ہے کہ انھوں نے تقریریں اپنی چینی روسی میں کیں!

آخر میں ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ نے شاید ضد میں آ کر یہ سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ زبان ہی سب کچھ ہے۔ سو گزارش ہے کہ زبان محض ذریعۂ اظہار ہے، اور وہ ذریعہ ہے ان خیالات کا جن کے لیے مملکت پاکستان کا وجود ضروری ہوا۔ یعنی وہ ذریعہ ہے اسلامی ثقافت کے اظہار کا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے ان خطوط پر سوچنا شروع کیا ہے؟ ہم نے کتنی کتابوں کا قبلہ بدلنے کی تجویزیں کی ہیں یا ان تجویزوں پر عمل کرنا شروع کیا ہے؟ کتنوں کے دل میں اورنگ زیب کی یہ شکل بھی سامنے آئی ہے کہ وہ ظالم نہیں تھا، سب سے زیادہ اسلامی انسان تھا؟ کتنوں نے شبلی کے اس فرمودہ پر عمل کرنا شروع کیا ہے ؎

تمھیں لے دے کے اپنی داستاں سے یاد ہے اتنا
کہ عالم گیر ہندوکش تھا ظالم تھا ستم گر تھا

آج کتنے ہی طالب علم یہاں تک جانتے ہیں کہ ہنری ہشتم کی آٹھ بیویاں تھیں۔ (جن میں سے اس نے اکثر کو مروا دیا تھا) لیکن کتنے ہیں جو اورنگ زیب کے متعلق یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان تاجدار تھا۔ خواہ ظالم ہی تھا۔ یا یہ تک بھی کہ وہ مرد تھا یا عورت تھی!

آج کے دن سے اس وطن عزیز میں تیسرا پنج سالہ منصوبہ شروع ہو رہا ہے۔ ہم اُردو کے بہی خواہوں کو امید کرنی چاہیے کہ اس پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ہماری زبان کی بیل بھی کسی منڈھے چڑھ جائے گی۔ ورنہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟ اور کچھ ہوگا نہ ہوگا اتنا ضرور ہوگا کہ اس وقت کوئی اگر ہم سے پوچھے گا کہ میاں کہاں ہو

توہم اتنا تو کہہ سکیں گے کہ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مختصر بات تھی لمبی کر گیا۔ آپ کے سامنے رہنے کا کوئی بہانہ چاہیے تھا۔

بحرفے میتواں گفتن تمنّائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

شامِ ہمدرد۔ لاہور
یکم جولائی ۱۹۶۵ء

جسٹس قدیر الدّین احمد

جناب جسٹس قدیر الدّین احمد صاحب عالی عدلیۂ پاکستان کے ایک ممتاز رکن ہیں اور اپنی بے لوث خدمات کی بنا پر ملک میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

جسٹس قدیر الدّین احمد صاحب ۱۹۰۹ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے، لیکن چھ سات سال کی عمر میں اپنے آبائی وطن دہلی میں منتقل ہو گئے۔ وہیں آپ نے اینگلو عربک اسکول اور سینٹ اسٹیفنز کالج میں تعلیم پائی۔ ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد آپ نے ۱۹۳۲ء میں سر عبدالرحمٰن کے جونیئر کی حیثیت سے وکالت شروع کی۔

۱۹۴۵ء میں آپ مسلم لیگ صوبہ دہلی کے صدر منتخب ہوئے۔ آزادی سے پہلے آپ کو دہلی یونی ورسٹی کے چانسلر اور گورنر جنرل نے دہلی یونی ورسٹی کی اکیڈمک کونسل کا رکن نامزد کیا۔ تقسیم ہند کے وقت آپ اس کمیشن کے رکن تھے جو حکومت ہند نے دہلی میونسپلٹی کو کارپوریشن میں تبدیل کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان آکر کراچی میں مقیم ہو گئے۔

کراچی میں وزارتِ مالیات نے اسٹیٹ بینک کی بنیاد ڈالنے کے لیے ایک قانون دان کی حیثیت سے آپ کی خدمات حاصل کیں۔ نیشنل بینک آف پاکستان کے قیام کے وقت بھی آپ کی قانونی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ آپ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے پہلے قانونی مشیر تھے۔ پاکستان کی صنعتی قرضوں اور سرمایہ کاری کی کارپوریشن (پکِک) کی بنیادی دستاویزات بھی آپ ہی نے مرتّب فرمائی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں آپ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج مقرر کیے گئے۔ اس تقرّر کے بعد حکومت پاکستان نے ہائی کورٹ سے درخواست کی کہ ٹیکسیشن کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے آپ کی خدمات حکومت کو سپرد کر دی جائیں، لیکن ہائی کورٹ رضامند نہ ہو سکی۔ ۱۹۶۱ء کے آخر میں صدرِ پاکستان نے آپ کو مرکزی کابینہ کی اس کمیٹی کا رکن مقرر کیا جو قانونی اصلاحات کے لیے صدر نے مقرر کی تھی۔

جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب نہ صرف قانون پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں بلکہ قومی زندگی کے دوسرے شعبوں کا بھی دلچسپی سے مطالعہ فرماتے ہیں اور اجتماعی و ملی مسائل پر آپ کی نظر وسیع ہے۔

جسٹس صاحب کی آج کی تقریر کا موضوع "ترقی پذیر ملکوں میں عدلیہ کا کردار" نہایت اہم ہے اور اس پر جسٹس صاحب جیسی وسیع النّظر، تجربے کار اور ماہر شخصیت ہی بخوبی روشنی ڈال سکتی ہے۔

حکیم محمد سعید

کم ترقی یافتہ ملکوں میں عدلیہ کا کردار

جناب جسٹس قدیرالدین احمد

موضوع کے متعلق میں ابتدا ہی میں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک عام غلط خیال ہے کہ عدلیہ ہر دور میں اور ہر ملک میں ایک ہی مقصد کے لیے خدمات انجام دیتی ہے۔ یہ ناممکن ہے، کیوں کہ عدلیہ ایسے افراد کے ایک گروہ پر مشتمل ہوتی ہے جس کو ریاست کی طرف سے قانون کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی شکایت کو دور کرنے کا فریضہ سپرد کیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے عدلیہ کے طریق عمل اور کارروائیوں میں قوانین کے مقاصد اور رُوح کا عکس پایا جاتا ہے۔ قوانین استبدادی، جمہوری، اشتراکی یا خدائی ہوسکتے ہیں۔ انتہائی قدیم، ازمنۂ وسطیٰ سے متعلق، نیم متمدن اور انتہائی ترقی یافتہ ہوسکتے ہیں۔

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایک ملک کی عدلیہ کی کامیابی اس کے فیصلہ کیے ہوئے مقدمات میں کسی معتبر مکتبۂ فکر کے اعلا اصولوں کی تطبیق پر منحصر نہیں بلکہ اس کا انحصار اس معاشرے کے اجتماعی شعور کے اطمینان پر ہوتا ہے جس کے لیے عدلیہ کام کرتی ہے۔ میں اس خیال کی توضیح کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اوّل، آج کل ہم مغربی دنیا کی خواتین کی آزادی پر انتہائی فخر کرنے سے متعلق باخبر ہیں، لیکن ۱۸۷۰ء تک انگلستان میں کسی شادی شدہ عورت کی شخصیت اور املاک اس کے شوہر کی شخصیت اور املاک سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ عملی طور پر عورتوں کو ملکیت کا حق حاصل نہیں تھا۔ انگلستان کی عدالتوں میں صدیوں تک انجیل مقدّس کی تفسیر اور اس سے متعلق بلیک اسٹون (BLACKSTONE) کے بنائے ہوئے اصولوں کی بنیاد پر اس قانون پر عمل ہوتا رہا۔

لیکن برطانیہ کے باشندوں نے اخلاقی طور پر اپنے رویتے کو غلط نہیں سمجھا اور نہ یہ محسوس کیا کہ وہ فکر انسانی کے ارتقا میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کا قانون ان کے صحیح معتقدات اور مسلّم مذہب کا ترجمان تھا۔ دوم، آج کل انگریز آزادیٔ تقریر کو انسان کا پیدائشی حق خیال کرتے ہیں، ایسا حق جو قوانین فطرت کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ خیال نسبتاً قریبی دور کی پیداوار ہے۔ انگریزوں کو صدیوں تک آزادیٔ فکر اور آزادیٔ تقریر حاصل نہ تھی۔ اس سلسلے میں انگلستان میں جو پابندیاں عائد تھیں ان کا نقشہ ڈائسی (DICEY) نے اپنی کتاب "انگلستان میں قانون اور رائے عامہ" میں ان الفاظ میں کھینچا ہے :

"اگر آج کے دور کے کسی انگریز کو جارج سوم کے عہد حکومت میں واپس لے جایا جا سکے تو وہ اس زمانے کے مسلّمہ عقائد کے خلاف کسی قسم کے اظہار خیال کو ممنوع قرار دینے والے اخلاقی اور ذہنی ماحول سے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرے گا۔"

دانش مند مصنّف نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ پابندیاں کسی انگریز کے لیے بار خاطر نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ یہی مصنّف لکھتا ہے :

"لیکن ہمیں یہ مفروضہ قائم کرنا نہیں چاہیے کہ عموماً ان پابندیوں کو باعث شکایت خیال کیا جاتا تھا۔ معاشرے کی رائے عامہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی جکڑ کے محض عوامی جذبات کے مطابق ہونے کی وجہ سے اگر اس کی عملی طور پر تائید نہیں کی جاتی تھی تو اس کو خاموشی سے تسلیم ضرور کر لیا جاتا تھا۔"

ان دو مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی معاشرے کا ارتقا کسی بھی درجے میں ہو وہ معاشرہ اپنے عوام کو ذہنی سکون، اپنے اداروں پر فخر اور زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا جذبہ مہیا کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس معاشرے کو اپنے آپ پر اور اپنی تقدیر پر اعتماد ہو۔ اب ایک اور قسم کے معاشرے کی مثال لیجیے جس میں عزت نفس کا فقدان ہو، جو اپنے اداروں سے بدظن ہو اور جس میں بیرونی جذبات کو اپنانے کی زبردست خواہش موجود ہے۔ اس کے نتیجے میں اس معاشرے میں ذلت کا احساس پیدا ہوگا اور وہ پُراعتماد کاوش سے محروم ہوگا۔ اس کے عوام کی شخصیت میں ایک گہرا تضاد پیدا ہوگا اور ان کی طاقت مل جل کر کسی کام کو کرنے سے پہلے ہی باہمی نزاع میں ضائع ہو جائے گی۔ اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ایک ترقی یافتہ قوم کا معیار نہیں ہے کہ وہ قوم اپنے ادب، آرٹ اور فنِ تعمیر پر فخر کر سکتی ہو اور نہ ہی اس کا یہ معیار ہے کہ وہ اپنے لباس، صفائی، صحت، حفظِ صحت اور سامان آرائش میں ترقی یافتہ ہو، کیوں کہ اگر اس قوم کو اپنے اداروں پر اعتماد نہیں ہے اور اپنی منزل کی پروا نہیں ہے تو اس کی بنیادوں کا متزلزل ہو جانا یقینی امر ہے۔ اس لحاظ سے جنوبی امریکا کی ریاستیں بولیویا اور وینزویلا افریقہ کی ریاست گھانا سے بہتر نہیں ہیں۔ ان کی مادی ترقی کے مدارج ایک دوسرے

سے بہت زیادہ مختلف ہیں، لیکن اپنے ماضی کو حال سے اور حال کو مستقبل سے وابستہ کرنے کے مسئلے میں یہ دونوں ہی الجھن کا شکار ہیں۔ اقوامِ متحدہ نے "پس ماندہ ممالک" کے بجائے "ترقی پذیر ممالک" کی اصطلاح رائج کر دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اقوامِ متحدہ کی تنظیم ہر اس ملک کو ترقی پذیر تصور کرتی ہے جو اس کی فنّی امداد قبول کر لے، کیوں کہ ایسے ملک کو یہ اُمید ہے کہ ایک دن اس کی مادّی سطح ضرور بہت بہتر ہو جائے گی۔ لیکن اقوامِ متحدہ کی تنظیم اس کی امداد حاصل کرنے والے کسی ملک کے اداروں کے بارے میں غیر جانبدار رہتی ہے اور اس کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ اس ملک کا زندگی میں کوئی مقصد ہے یا نہیں۔ اس تنظیم کو اس وجہ سے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ کسی قوم کے عقائد کو مضبوط کرنے اور اس کی زندگی میں جولانی پیدا کرنے کے لیے اس نے بیڑا نہیں اُٹھایا۔

دنیا کی تمام تہذیبیں نفاست، اعلاذوق اور طاقت میں نہ یکساں ہیں نہ کبھی یکساں رہی ہیں۔ آرنلڈ جے ٹوائن بی نے اپنی تصنیف "مطالعۂ تاریخ" میں تہذیبوں کی پیدائش اور موت کے موضوع پر ایک خاص مطالعہ میں دنیا کی تمام تہذیبوں کی پیدائش، ترقی، زوال اور موت پر تبصرہ کیا ہے۔ ہر تہذیب کی پیدائش کے وقت قبائلی سردار، مذہبی رہنما اور سیاسی زعما تمام اقتدار اور قانون کا سرچشمہ تھے۔ انھوں نے جس طرح مناسب خیال کیا اپنے ساتھیوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کیا۔ اس کے باوجود ان کے فیصلوں سے اعتماد پیدا ہوا، کیوں کہ عوام کو ان پر بھروسا تھا۔ جن سرداروں، رہنماؤں اور زعما کو وسیع علاقوں پر اور انسانوں کی ایک بڑی تعداد پر اقتدار حاصل ہوا انھیں اکثر و بیشتر تنازعات حل کرنے کے لیے اپنے اختیارات کسی دوسرے شخص کو تفویض کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ فریقین کے تنازعات گروہوں کے درمیان لڑائیوں کی شکل اختیار نہ کر سکیں۔

یہ تھا عدلیہ کے قیام کا سادہ ترین اور سب سے ابتدائی مقصد۔ جب خصوصی مراعات کے حامل طبقات معرضِ وجود میں آئے تو شخصی ملکیت اور مراعات کے تحفّظ کے لیے ملکیت اور معاہدے کے قوانین وضع کیے گئے۔ اس دور میں عدلیہ کا مقصد پست اور نظم و ضبط سے بیگانہ لوگوں کی دست درازی سے ملکیت کی اصلی حالت کو محفوظ رکھنا تھا۔ قانون کے اصولوں میں معاشرے کی خود اعتمادی اور اپنے حق پر ہونے کے مضبوط عقیدے کا عکس موجود ہونے کی وجہ سے نہ کسی تلخی کا احساس تھا نہ کوئی بدمزگی پیدا ہوتی تھی۔

موجودہ دور میں مغربی تہذیب باقی تمام دنیا پر غالب ہے۔ اس تہذیب کے ارتقا کے ایک مرحلے میں یورپ میں مذہب اور عقل کے درمیان ایک کشمکش شروع ہوئی جس کے نتیجے میں عدل کو انجیلِ مقدّس کے احکام کی پابندی سے آزاد کر دیا گیا۔ گروشیس (GROTIUS)

نے اپنی عظیم تصنیف ۱۶۹۵ء میں لکھی جس میں اُس نے یہ رائے ظاہر کی ہے:

"اگر خدا نہ ہوتا تب بھی وہ قانونِ فطرت کا تصوّر کر سکتا تھا۔"

مغربی فلسفۂ قانون کی امتیازی خصوصیات پروشیا کے کانٹ، فرانس کے روسو، انگلستان کے جون اسٹوارٹ مل اور سر ہنری مین، آسٹریا کے ایلرک (EHLRICH)، جرمنی کے کیلسن اور امریکا کے روسکو پاؤنڈ کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مصنّفین نے نئے اندازِ فکر پیدا کیے لیکن انھوں نے مغربی معاشرے پر ایک انفرادیت پسندانہ رنگ اور پھر اشتراکی جھلک ڈال کر اپنا اثر ڈالا اور معاشرے کو یہ تاثر دیا کہ اس کے مسلّمہ اصول اس کے قوانین اور نظامِ عدل کو فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ اور اس بات پر زور دیا کہ قانون اور عدالتوں کا مقصد تہذیب کا ارتقا ہے۔ موجودہ دور میں تہذیب کو ترقی دینا قانون اور عدل کا مقصد ہے۔ جسٹس ہومز نے اس نظریے کو فروغ دینے میں پہل کی اور امریکا کی عدالتِ عالیہ نے اسے منظور کر لیا ہے۔

چند عشرے پہلے امریکا کی اعلاترین عدالت کو مشکلات درپیش تھیں، کیوں کہ انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان گہرا حسد موجود تھا۔ پروفیسر فرائنڈ نے اپنی کتاب "ریاست ہائے متحدہ کی سپریم کورٹ" میں لکھا ہے:

"اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے سب سے زیادہ با اختیار صدر رہائے مملکت کا ہمارے سب سے زیادہ زوردار حکّامِ عدالت سے بار بار تصادم ہوا۔ جیفرسن اور جیکسن کی تنقید کے طوفانوں سے عدالت کو بحفاظت نکالنے میں مارشل کامیاب رہا۔ اپنی عدالتی زندگی کے اختتام پر ٹانی نے کوئی چارۂ کار نہ پاکر ثابت قدمی کے ساتھ فوجی قانون کی مخالفت کی جس کو خانہ جنگی کے دور میں لنکن کی حمایت حاصل تھی۔ تھیوڈر روزویلٹ نے منصفانِ عدالت اور عدالت کے فیصلوں کے واپس لیے جانے کے لیے جدّوجہد کی۔ فرینکلن روزویلٹ نے اپنے تعمیری منصوبے کی شدید مخالفت کرنے والے پانچ افراد کے ایک مضبوط گروہ سے مقابلہ کے لیے عدالت کو ضرب پہنچائی۔"

اس قسم کے تنازعے کا دور بظاہر اب ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ختم ہو چکا ہے، کیوں کہ اس ملک کو اپنے وسیع ذرائع اور کامیابیوں پر فخر ہے اور امریکی قوم کو یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ عالمی قیادت کو برقرار رکھنا اس کے لیے مقدر ہے۔

افریقہ کے حال ہی میں آزادی حاصل کرنے والے ایک ملک میں تقریباً ڈیڑھ سال پہلے انتظامیہ اور عدلیہ میں ایک شدید تنازع ہو گیا، جو ایسے واقعات کی ایک حالیہ مثال ہے۔ گھانا کی حکومت کی انتظامیہ نے عدالتِ عالیہ کے ججوں اور چیف جسٹس کو اپنی پسند کے خلاف ایک

فیصلہ دینے کی پاداش کے طور پر برطرف کر دیا۔

ایسے تنازعے کی میں ایک اور مثال پیش کر دوں، کیوں کہ یہ غیر منقسم ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں ۱۷۷۳ء اور ۱۷۸۱ء کے درمیان وقوع پذیر ہُوا۔ نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کا سرکاری انتظام سنبھال لیا۔ حکومت کے حالات خوفناک حد تک خراب تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کو بہت سی شکایتیں موصول ہوئیں۔ اس لیے کمپنی کے ملازمین کی من مانی کارروائیوں کو روکنے کے لیے کلکتہ میں عدالتِ عالیہ قائم کر دی گئی، لیکن کمپنی بذاتِ خود حکومت ہونے کی وجہ سے اقدام کے نتیجے میں ایسا نظم و ضبط قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ چناں چہ عدالتِ عالیہ اور حکومت کے درمیان ایک تنازعہ شروع ہوگیا۔ آخری حربے کے طور پر حکومت نے تمام متعلقہ افراد کو ایک مراسلہ جاری کیا کہ

"انھیں عدالت کی کارروائیوں کی تعمیل نہیں کرنی چاہیے!"

عدالت بے سہارا تھی۔ خلاف قانون کارروائیاں اور عدالت کے احکام کی خلاف ورزیاں اتنی زیادہ تھیں کہ برطانوی پارلیمنٹ کو ۱۷۸۱ء میں ان کو نظر انداز کرنے کے لیے معافی کا ایک قانون وضع کرنا پڑا۔

تین علاحدہ برّاعظموں میں ایک مشترکہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ انتظامیہ اور عدلیہ میں تنازعات ہو چکے ہیں، کیوں کہ انتظامیہ کا مقصد ملک کے قانون کے مقاصد سے مختلف تھا۔ عدلیہ قانون سازی نہیں کرتی، اس لیے اس کو قوانین کی خامیوں کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھیرایا جا سکتا، لیکن حکومت کی حکمتِ عملی اور سیاست کی مصلحتوں کی وجہ سے تنازعات پیدا ہوتے ہیں اور انتظامیہ قانون کی بنیادوں پر پابند رہنے کو پریشان کن سمجھتی ہے۔ اس کے برعکس عدالتیں قانون کی تعمیل پر اصرار کرنے کو اپنا مقدس فریضہ خیال کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ تنازعے کی شکل میں رُونما ہوتا ہے اور بہترین عدالتیں انتظامیہ کے معقول رویّہ اختیار نہ کرنے کی صورت میں اکثر اپنے مفاد کے خلاف اسے فوراً قبول کر لیتی ہیں۔

جب اس قسم کا تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو منصفوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بد دماغ اور جاہ طلب ہیں اور انتظامیہ پر غلبہ حاصل کر کے ملک کی حکومت کی زمام اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں۔ ایسے خیالات کی تائید اکثر اوقات انتظامیہ کے محکموں کے وہ سربراہ کرتے ہیں جن کے بے احتیاطی سے تیار کیے ہوئے منصوبے اور تجاویز قانون کی زد میں آ کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ عدالتیں ان کے لیے قربانی کا بکرا بن جاتی ہیں۔

بعض اوقات کم ترقی یافتہ ملکوں میں اس رائے کا اظہار کیا جاتا ہے کہ عدالتیں انتظامیہ کی رقیب بننے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ عموماً منصفین کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا

اور فعال لوگوں کی نظر میں وہ خیالی منصوبے بنانے والے دکھائی دیتے ہیں، لیکن وہ ایسے بے عمل بھی نہیں ہوتے کہ محض خیالی منصوبے بنانے میں ہی ہمیشہ مشغول رہیں۔ امریکی دستور کی منظوری کے تھوڑی دیر بعد ہیملٹن نے کہا، انھیں خبر نہیں ہے کہ:

"عدلیہ اقتدار کے تینوں شعبوں میں مقابلتہً سب سے زیادہ کمزور ہے، کیوں کہ اس کا زور نہ تلوار پر ہے اور نہ خزانے پر۔ نہ اس کو معاشرے کی دولت یا طاقت کا انتظام کرنے کا حق حاصل ہے اور نہ کسی عملی فیصلے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عدلیہ کو نہ طاقت حاصل ہے نہ ارادہ، صرف فیصلے کا حق حاصل ہے۔"

عدالتوں کو یہ فریضہ سپرد کیا گیا ہے کہ وہ معاشرے کے ان مقاصد کی توضیح کریں جن کو اس کے قوانین میں شامل کیا گیا ہے۔ ان مقاصد کی توضیح اُن افراد کے لیے سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے جو اپنے قوانین پر یقین رکھتے ہیں اور اُن پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے عدالتیں ضمیر کے محافظ کے فرائض انجام دیتی ہیں اور معاشرے کے لیے مسلسل تعلیم کا ایک اہم نظام مہیا کرتی ہیں، لیکن وہ افراد جن کے نزدیک قوانین اور ان کے مقاصد کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ان کے لیے عدالتیں مسلسل ناراضگی اور برافروختگی کا منبع بنی رہتی ہیں۔
ایک کم ترقی یافتہ ملک میں قوانین کو اسراف کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ بعض اوقات ترقی یافتہ ملکوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے کم ترقی یافتہ ملکوں کے قوانین میں صحیح خیالات کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے۔ ان کی مستعمل زبان سے اور اسلوب سے اس کے بہت اعلا ہونے کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ منصفوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ خود حقائق کو دیکھ لیں اور حالات کا صحیح اندازہ لگا لیں۔

مندرجہ بالا توضیحات کی بنا پر میں کہ سکتا ہوں کہ ایک کم ترقی یافتہ ملک میں جس کے نظریات اور مذہبی عقائد کمزور ہوتے ہیں ایک آزاد عدلیہ کے لیے سازگار ماحول موجود نہیں ہوتا۔ عوام کے درمیان رائے اور عقیدے کے جتنے اختلافات ہوتے ہیں ان کا عکس ان کی مقدمہ بازی میں ملتا ہے۔ قوانین میں جو خامیاں موجود ہوتی ہیں وہ مقدمات کے دوران ظاہر ہو جاتی ہیں اور اس وجہ سے جو بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے اس کے لیے عدالتوں کو موردِ الزام ٹھیرایا جا سکتا ہے۔ اگر ایک ملک کے عوام کسی بنیادی کسی ایسے بلند نصب العین سے وابستہ نہیں ہیں جو ان کے ذاتی مفاد سے بالاتر ہو، تو وہ اکثر اپنے مفاد کو ناکام ہوتے ہوئے دیکھ کر حق و انصاف کی اہمیت کو قبول نہیں کر سکتے۔ وہ عام طور پر چھوٹے حکام کا اخلاق بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے حکام کی ایمان داری کا اعتراف شاذ و نادر ہی کرتے ہیں۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں، "ایسی چیزیں ہمارے معاشرے میں پائی نہیں جاتیں۔"

یہ بے اعتمادی بڑھتی ہے اور پیچیدہ ہو جاتی ہے تو وہ عدلیہ کے سب سے اعلا حکام کو فرشتوں کے معیار پر پرکھ کر ان کی توہین کرتے ہیں اور اس معیار پر پورے نہ اترنے پر اپنے آپ کو اور معاشرے کی حالت کو نظر انداز کر کے ان پر تنقید کرتے ہیں۔ زندگی کے کسی اعلا مقصد کے بارے میں ایسی تنقید جو ہمدردی، معلومات اور یقین پر مبنی نہ ہو بہت ہی زیادہ الجھن اور تباہی پیدا کرنے والا مشغلہ بن جاتی ہے۔

جیساکہ بیان کیا جا چکا ہے ایسی عدلیہ کے لیے جو قدامت کے استثنا کے ساتھ ہر چیز پر حاوی ہے سب سے بڑا مقصد تنازعات کا فیصلہ کرنا نہیں ہے۔ ایک کم ترقی یافتہ ملک میں ضروری نہیں کہ عدلیہ کا مقصد تہذیب کو ترقی دینا ہو لیکن ایسے ملک میں اس کا مقصد یقیناً یہ ہونا چاہیے کہ وہ معاشرے اور ریاست کو ان مقاصد کے بارے میں مسلسل یاد دلاتی رہے جو اس کے قوانین میں موجود ہیں۔ عدلیہ کے اس مقصد کی اہمیت اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب اس حقیقت کو مدِنظر رکھا جائے کہ اصولوں سے لگاؤ کی کمی کی وجہ سے قوانین قصداً یا بلا مقصد بے جا طور پر استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ان حالات میں عدلیہ قوانین کی تشریح کو قوت عطا کرتی ہے، ان کا صحیح مفہوم متعین کرتی ہے اور اس سے انحراف کی کوششوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ ایسی خدمت اس ملک میں جہاں قوانین کو توڑ موڑ کر ان کی خلاف ورزی کرنے کا جذبہ موجود ہو اور قوانین پر اعتماد کی کمی ہو شدید مخالفت پیدا کر سکتی ہے۔ جو لوگ ایسا جذبہ رکھتے ہیں یا اس کو ظاہر کرتے ہیں عدلیہ انھیں ناخوشگوار نظر آتی ہے، کیوں کہ وہ انھیں بار بار روکتی ہے تاکہ وہ قانون کے متعین کردہ راستے پر چلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام کم ترقی یافتہ ملکوں میں عدلیہ پر سخت دباؤ پڑتا ہے۔

ایس۔ ای فائنر نے ایک قابلِ تعریف کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے The Man On Horseback جس میں اس صدی کے تمام کم ترقی یافتہ ملکوں کا ذکر کیا گیا ہے جہاں قائم شدہ حکومتوں کو اندرونی طاقت نے کمزور کر دیا۔ مصنّف کا دعوا ہے کہ عدلیہ پر جو دباؤ ہے اس کی وجہ سے منصفوں پر بعض اوقات مختلف اندازِ فکر اثر انداز ہوتا ہے جو معاشرے کو منتشر کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں منصف جانب دار ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے عدلیہ کی مکمل ذلّت اور تباہی کا آغاز ہوتا ہے۔

۱۸۹۵ء میں پنسلوانیا کی اعلاترین عدالت کے جسٹس گبسن نے ایکن اور روب کے مقدمہ میں جو فیصلہ صادر کیا ہے اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی پر جو سب سے بڑی آفت نازل ہو سکتی ہے وہ اس کے ضمیر اور وجدان کا بگاڑ ہے۔ جب ضمیر بگڑ جاتا

تو طاقت ور جماعت" دوسروں پر بھروسا کرنے والی طاقت کے حالات کو قابو میں لانے کے لیے معمولی کوششوں پر ہنسی اڑائے گی۔" میں اپنی تقریر کو ڈاکٹر اقبال کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبّت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

(انگریزی سے ترجمہ)

شامِ ہمدرد۔ کراچی
۲ر جولائی ۱۹۶۵ء

ڈاکٹر محمد اجمل

ایک ماہرِ طب جب انسان پر نگاہ کرتا ہے تو انسان اسے گوشت پوست، ہڈیوں، رگوں اور خون و خلیات وغیرہ کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے اور وہ انسان کے دل و دماغ، جگر و معدہ اور اعضائے ہضم کے ذرائع وغیرہ پر غور کرتا ہے۔ ایک ماہرِ حیاتیات انسان پر خالصتہً حیاتیاتی نقطۂ نظر سے غور کرتا ہے اور حیات کی ابتدا سے انتہا تک اس کی نگاہیں چلی جاتی ہیں۔ مگر ایک ماہرِ نفسیات کو انسان ایک "مجموعۂ نفسیات" نظر آتا ہے۔ اگر وہ یہ کہے کہ انسان کا دوسرا نام نفسیات ہے تو اس بیان میں صداقت و معنویت ہی پائی جائے گی۔ ہر ایک انسان اپنی ابتدا سے انتہا تک نفسیاتی عوامل کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا کوئی فعل و عامل دائرۂ نفسیات سے باہر نہیں ہوتا۔ میں اس سے متفق نہیں ہوسکتا کہ نفسیات کوئی جدید علم ہے۔ اور نہ میرے نزدیک یہ صحیح ہوسکتا ہے کہ نفسیات کو قدیم و جدید دو خانوں میں تقسیم کیا جائے، کیوں کہ ایسا کرنے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ زمانۂ قدیم میں نفسیات کی جو صورت تھی زمانۂ جدید میں وہ نہیں ہے بلکہ حالات کے ساتھ علم نفسیات میں تبدیلیاں آگئی ہیں اور آتی جا رہی ہیں۔ میں اس قسم کی کوشش کو مستحسن قرار دینے کے لیے اس لیے بھی تیار نہیں ہوسکتا کہ اس سے ان اصحابِ فکر و نظر کی اصابتِ رائے کی نفی ہوتی ہے کہ درحقیقت ہمارے اکابر رجال کا درجہ رکھتے ہیں اور جنھوں نے علوم و فنون کی بنیادیں رکھی ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعوا کیسے کیا جاسکتا ہے کہ انسان جو آج ہے یا انسان جو آج غور و فکر کرتا ہے ماضی میں اس کا یہ مقام و کمر دار نہ تھا۔ قدیم و جدید نفسیات کی بحث میں ہم زیادہ سے زیادہ یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ موجودہ دور کے انسان کا علم اتنا وسیع نہیں ہے اور اس کی نظر اور حالاتِ ماضی کے درمیان اتنے پردے حائل ہیں کہ وہ ہر زمانے کے علم و نفسیات کا احاطہ کرنے سے معذور ہے۔ درحقیقت ایسی ہی معذوری نے نفسیاتِ جدید کی اصطلاح وضع کرنے میں مدد دی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مبلغ علم کا یہ حال ہے کہ ہمارے سامنے قدما کے جو علوم موجود بھی ہیں ہم ان سے کوئی استفادہ نہیں کرتے اور اکثر و بیشتر

صورتوں میں یہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ قدیم نظریات کو "ماہرین" اپنے ناموں سے پیش کر دیتے ہیں اور اس پر جدّت کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم تعلیمی نفسیات کی گفتگو کرتے ہیں تو کسی جدید ماہر کو اس کا امام قرار دیتے ہیں حال آنکہ قرآنِ حکیم اور تعلیماتِ رسول تعلّم و تعلیم کے باب میں تعلیمی نفسیات پر ایک واضح راہ سے آگاہی بخشتے ہیں۔ اس کے بعد اگر ہم مثالاً ابن خلدون کی تعلیمی رائے پر غور کریں تو اس پر کسی طرح قدامت کی تعریف صادق نہیں آسکتی، وہ آج بھی جدید ہے اور جدید افکار سے ہم آہنگ ہے۔

نفسیات یقیناً ایک اہم موضوع گفتگو ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ نفسیات کے بغیر ہم زندگی کے کسی بھی شعبے میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ ہم حیات کے کسی میدان میں بھی جادہ پیمائی کے قابل نہیں ہو سکتے اگر ہم نفسیات سے صَرفِ نظر کریں۔

جناب ڈاکٹر محمد اجمل مخدوم صاحب ہمارے ملک کے قابلِ فخر ماہر نفسیات ہیں۔ یونیورسٹی آف لندن سے سنہ ۱۹۴۱ش میں نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے بعد وہ دنیا کے مختلف ممالک میں علمِ نفسیات میں مہارت حاصل کرنے کے لیے رہے ہیں۔ اس میدان میں ان کے تجربات بڑے متنوع ہیں اور انھیں پاکستان اور بیرونِ پاکستان مختلف و متعدد حیثیتوں سے نفسیات کے شعبے میں خدمت کا موقع ملا ہے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب جامعۂ پنجاب میں شعبۂ نفسیات کے صدر رہیں۔

حکیم محمد سعید

مذہب اور نفسیات

جناب ڈاکٹر محمد اجمل
استاد نفسیات۔ جامعۂ پنجاب۔ لاہور

نفسیات اور مذہب کے تعلق کا مطالعہ کسی قدر دل چسپ بھی ہے اور کسی قدر یاس آفریں بھی۔ دل چسپ اس لیے کہ باوجود سائنس ہونے کا گھمنڈ کرنے کے نفسیات کے بہت سے مدارس ہیں۔ بہت سے، مختلف اور متضاد نظریے اور نقطہ ہائے نظر بھی، اور ہر مدرسۂ فکر اپنے نقطۂ نظر کو حرفِ آخر سمجھ کر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نقطہ ہائے نظر بھانت بھانت کی بولیاں ہیں، جن میں مذہب کی حقیقت کا سراغ نہیں ملتا۔ ان بولیوں کا انتشار بہ ذاتِ خود ایک دل چسپ حادثہ ہے، کیوں کہ نظریے مذہب کی حقیقت کو تو کیا ظاہر کریں گے، البتہ اُن ماہرین نفسیات کے مزاجوں کی حقیقت تک ضرور راہبری کرتے ہیں۔

یہ مطالعہ یاس آفریں اس لیے ہے کہ ہم لوگ مذہب کا مطالعہ کم کرتے ہیں اور مذہب کی نفسیات کا زیادہ۔ ہماری زبان پر اگر مذہبی کتابوں سے کوئی مقولہ وارد ہوتا ہے تو وہ مذہب کی نفسیات کے ایجادکاروں کے حوالے سے۔ میں نے ابھی نفسیات کے مختلف مدارس فکر کا ذکر کیا ہے۔ ایک مدرسۂ فکر تو وہ ہے جو سوال نامے مرتب کرتا رہتا ہے اور ان کے جوابوں کو ایک خاص سلیقے سے آراستہ و پیراستہ کرنے کو مذہب کی نفسیات کا نام دے دیتا ہے۔ یہ مدرسہ، مدرسۂ فکر نہیں، مدرسۂ تقسیم و ترتیب ہے۔ اس کی دانائی کا راز اس کے اعداد و شمار ہیں۔ مجھے یہ مدرسہ کچھ ایسا دل چسپ معلوم نہیں ہوتا۔ اور اس کے بارے میں آپ

کو یہ حدیثِ نبوی سنانے پر اکتفا کرتا ہوں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے مُردوں کو زندہ کرنا اس امر سے زیادہ آسان تھا کہ وہ احمقوں کو عقل مند بنا سکتے۔

ایک اور مدرسۂ فکر بھی ہے جو نہایت دل چسپ ہے، اور اس لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہے تجزیۂ نفسی کا مدرسہ۔ یہ مدرسہ غلطی اور التباسِ فکر میں فرق کرتا ہے، اگر میں یہ سمجھوں کہ سات سات پندرہ ہوتے ہیں تو یہ میری ذہانت کی غلطی ہے۔ اس غلطی کو میں دوبارہ سات کو سات سے جمع کر کے دور کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے برعکس التباسِ فکر (Illusion) وہ تصور ہے جو دبی ہوئی انجان خواہشوں نے پیدا کیا ہے اور یہ ایک ایسا تصور ہے جسے کوئی خارجی شہادت دور نہیں کر سکتی۔ مثلاً ذہنی ہسپتال میں ایک شخص یہ کہتا ہے کہ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کا صدر ہے۔ وہ اس وثوق سے اس تصور پر ایمان لے آیا ہے کہ کسی قسم کی خارجی شہادت اس تصور کی تردید نہیں کر سکتی۔ ہسپتال میں اس کی بے لبسی اور درماندگی اُس کے لیے اس بات کا ثبوت نہیں اگر وہ امریکا کا صدر نہیں ہے، وہ اپنی بے چارگی کو دیکھ سکتا ہے لیکن اسے اس تصور کی سرمستی کے متناقض نہیں سمجھ سکتا۔

اس مدرسے کے نزدیک مذہبی تصورات اسی قسم کے التباسِ فکر کی مثالیں ہیں۔ یہ لاشعور میں دبی ہوئی جنسی آرزوؤں کی تسکین کرتے ہیں لیکن انھیں آپ کسی خارجی شہادت یا دلائل و براہین سے رد نہیں کر سکتے۔ ان ماہرینِ نفسیات کے نزدیک خدا کا تصور بھی ایک ایسا ہی تصور ہے۔ بچپن میں باپ انسان کی حفاظت کرتا ہے اور باپ کی طاقت اور علم بچے کو غیر محدود معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے بچے کے ذہن میں ایک ایسی ہستی کا تصور جنم لیتا ہے جو لامحدود قوت اور علم، لامحدود جمال اور بے پایاں جلال کی حامل ہے۔ جو غفور الرحیم بھی ہے اور قہار اور جبار بھی۔ یہی تصور بعد میں خدا کا تصور بن جاتا ہے۔ اس کے اثبات یا انکار میں آپ کوئی عقلی دلیل نہیں دے سکتے۔ فلسفیوں نے خدا کی ہستی کے اثبات و انکار میں کئی ثبوت بہم پہنچائے لیکن ہر دلیل میں کوئی نہ کوئی سقم نکل آیا۔ ان دلائل کے باوجود مومن مومن رہے اور کافر کافر۔

اس مدرسۂ فکر کے بانی فرائڈ سے جب یہ کہا گیا کہ حضرت آپ نو عوام کے عقائد سے الجھ پڑے اور کلیسا کے خدا کا تجزیہ کر کے رکھ دیا۔ اس کیفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جسے اصطلاحِ عام میں مذہبی کیفیت کہتے ہیں جس میں انسان کی ہستی خدا کی ہستی میں جذب ہو جاتی ہے اور "انا" لامحدود کے ساتھ ہم آہنگی کا رابطہ قائم کرتی ہے؟ تو فرائڈ نے

جواب دیا کہ مجھ پر ایسی واردات کبھی نہیں گزری۔ بہر حال میں اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرتا کہ اوروں پر بھی نہیں گزری ہوگی۔ اُس کا تجزیہ یہ ہے کہ یہ کیفیت بچپن کی اس منزل پر لوٹنے کا نام ہے جب کہ بچہ اپنے وجود کو ماں کے وجود سے علاحدہ تصور نہیں کرتا۔ وہ احساسِ یگانگت جو نوزائدہ بچہ اپنی ماں کے ساتھ محسوس کرتا ہے یقیناً اس اہتزاز و سرور، اس سرمستی اور سرشاری کے مشابہ ہے جو صوفی وجد میں محسوس کرتا ہے۔ یا اس وقت محسوس کرتا ہے کہ جب وہ اس طرح محبوب سے خطاب کرتا ہے ؎

جانِ من و جانِ تو در اصل یکے تو اند
سوگند بہ جانِ تو کز غیر تو بے زارم

مذہبی کیفیت اور بچہ اور ماں کی یگانگت کے درمیان یہ مشابہت دیکھنا فرائڈ کے ذہن کا کام تھا۔ اور بظاہر یہ مشابہت ایک قوی دلیل کا اثر رکھتی ہے، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا، کہ اس قسم کی مراجعت میں "انا"، کیوں کر مستحکم تر ہو جاتی ہے۔ "انا" کم زور ہو جب ہی وہ حالات کو نامساعد دیکھ کر ماضی کی طرف لوٹتی ہے لیکن اس مراجعت میں "انا" پہلے سے زیادہ مضبوط اور قوی ہو جاتی ہے۔ ذہنی ہسپتال میں جو شخص اپنے آپ کو نپولین سمجھتا ہے اس کی "انا" کم زور ہے۔ وہ حالات کے ہاتھوں بے بس ہو کر بچپن کے کسی تصور کی طرف مراجعت کرتا ہے اور اس پر ایسا ایمان لے آتا ہے کہ خارجی حالات کا اس میں شعور ہی نہیں رہتا۔ اس مراجعت میں اور اس مراجعت میں کیا فرق ہے جس میں مذہبی کیفیت کی وجہ سے صوفی خارجی حالات کا پہلے سے زیادہ گہرا اور وسیع شعور حاصل کرتا ہے۔ ابنِ عربی ہو کہ شاہ ولی اللہ، شیخ عبدالقادر جیلانی ہوں کہ شیخ علی ہجویری، کون کہہ سکتا ہے کہ انھیں خارجی حالات کا شعور نہیں تھا، یا یہ لوگ اپنے عہد کے اقتصادی اور اجتماعی نظام سے باخبر نہیں تھے، یا اپنے زمانے کے مادی اسباب و وسائل کو استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔

بہر حال، فرائڈ کے نزدیک عوام کے مذہبی عقائد کی بنیاد بچپن میں باپ کے تصور کے آثار ہیں اور صوفیا کی مذہبی کیفیتیں بچپن میں ماں کے ساتھ یگانگت کی کیفیت کی طرف لوٹ جانے کا نام ہے۔ گویا مذہب کی کل داستان، انسان کی ابتدائی کیفیتوں کے زندہ رہنے کا نام ہے۔ کنبے کی ابتدا زندگی کے بار بار اعادہ کا نام ہے۔

یہ نظریہ بہت دل فریب ہے، کیوں کہ ایک ہی جست میں یہ مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کو دبوچ لیتا ہے، اور ایک ضرب سے ان دونوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ خدا کے تصور کی چھان بین کیجیے تو اس کی تہ میں آپ کو جنسی اور تخریبی آرزوؤں کا اندوختہ ملے گا۔

اخلاق کے اصولوں کا تجزیہ کیجیے تو اس کے کل اجزا انھیں آرزوؤں کی آگ میں پگھل جائیں گے۔ ضمیر کیا ہے؟ یہ ماں باپ کی آوازوں کی گونج ہے۔ موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشان ہونا۔ حیات اور ممات پر ایمان لانا کیا ہے؟ ان جنسی آرزوؤں کی مکمل اور شدید تسکین کا خواب، جنھیں معاشرہ نے مردود اور مقہور قرار دیا ہے۔ اس نظریے کی صحت قائم کرنے کے لیے مزید امداد بعض امریکی ماہرین نفسیات نے پہنچائی۔ انھوں نے الفاظ کی ایک لمبی فہرست تیار کی، اور اس میں اِدھر اُدھر خطرناک الفاظ مثلاً 'موت'، 'حادثہ' وغیرہ بکھیر دیے، اور ہر لفظ پر ایک آلے کے ذریعے ان کی ذہنی کیفیت ناپ لی۔ مذہب کے نام لیوا یہ کہتے ہیں کہ مذہبی عقائد پر ایمان لے آنے سے موت کا خوف جاتا رہتا ہے اور موت کے وقت مومن کے لب پر تبسم کھیلتا ہے۔ لیکن اس آلے نے اس عقیدے کے بالکل متضاد انکشافات کیے۔ اس میں دیکھا گیا کہ مذہبی لوگ جو بظاہر تو موت اور حادثہ اور الم جیسے الفاظ پر تبسم کرتے ہیں لیکن دراصل وہ ان خیالات سے سخت پریشان ہو جاتے ہیں، موت کا نام لیا اور آلے نے پریشانی ظاہر کی، بس اتنی سی بات ہوتی تو خیریت تھی، لیکن اس کے برعکس یہ بھی دیکھا گیا کہ جو لوگ مذہب پر ایمان نہیں رکھتے یا اس کے عقائد و مسائل سے بے پروا ہیں انھوں نے ان الفاظ پر کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ موت کا ضرورت سے زیادہ خوف رکھنے والے مذہبی عقائد و شعائر میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقت کی تاب نہیں لا سکتے۔ دینوی حقائق کی تلخی کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اور آنکھیں موند کر ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

موت کا خوف کیا ہے؟ اپنی عمر کے آخری منازل میں تو فرائڈ نے موت کو ایک جبلت قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے موت کے خوف کا تجزیہ جنس ہی کے تصور سے کیا تھا۔ موت کا خوف و عوامل جنسی اختلاط سے خوف کا نام ہے، کیوں کہ جنسی اختلاط کی شدید لذت میں ایک طرح کی سپردگی ہے۔ اپنے آپ سے نکل جانے کی کیفیت جو موت سے بہت مشابہ ہے۔ یہ خوف دراصل ماں اور باپ سے محبت کی کش مکش سے پیدا ہوتا ہے۔

میں اس نظریے میں کیڑے ڈالنا نہیں چاہتا، کیوں کہ یہ پہلے ہی کیڑوں، مکوڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں اب ایک اُس مدرسۂ فکر کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں جو ہر ذہنی کیفیت میں دو طرح کے معانی ڈھونڈتا ہے! ایک ادنیٰ اور دوسرا اعلا۔ ایک وہ جس کی تشریح ماضی کے واقعات سے ہوتی ہے، دوسرا وہ جس کی تشریح مستقبل کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ ایک وہ جو ہمیں تحت الثریٰ کی طرف کھینچتا ہے اور دوسرا وہ جو

ہمیں عرشِ معلیٰ کی جانب لے جاتا ہے۔ مثلاً "سونے" ہی کو لیجیے، اس علامت کا ایک مطلب تو غلاظت ہے، لیکن اس کا دوسرا مطلب، روح کی حقیقت کو پا لینا ہے۔ زمانۂ وسطیٰ کے ماہرینِ کیمیا جب لوہے یا تانبے کو کندن بنانے کی کوشش کر رہے تھے تو دراصل وہ اپنے باطن کی کثافتوں اور غلاظتوں کو عرفانِ حقیقت میں تبدیل کرنے کی سعی میں منہمک تھے۔ یہ "پناہ گزیں" یہ "زندگی سے فرار" کرنے والے جدید کیمیا (کیمسٹری) کی بنیاد رکھ رہے تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی روح اور اپنے نفس کی گہرائیوں میں اتر گئے تھے، اور پھر اسے شب و روز کی ریاضت سے کندن کی طرح چمکایا۔ "سونا" ایک خارجی حقیقت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک روحانی علامت بھی ہے بحیثیت ایک علامت کے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی شخصیت کو ختم کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ عرفانِ حقیقت تک رسائی حاصل کرے۔ اسے بقا بھی حاصل ہوتی ہے جب وہ فنا تک پہنچتا ہے۔ حدیثِ نبوی ہے کہ "مر جاؤ مرنے سے پہلے"۔ اور اسی ضمن میں ایک اور حدیث ہے کہ "خدا کی یاد میں "انا" کو فراموش کرنا پڑتا ہے"۔ شاہین کو لیجیے، یہ ادنیٰ سطح پر ایک مخصوص جسمانی عضو کی علامت ہے لیکن اعلیٰ سطح پر یہ روحانی ادراک، قوت اور فقر کی علامت ہے۔ خدا کے تصور کی ابتدا باپ کے تصور سے ہوتی ہوگی۔ اگرچہ غیر مہذب قبائل کے دیوتاؤں اور دیویوں کی بوقلمونی دیکھ کر یہ نظریہ کچھ مشکوک نظر آتا ہے۔ بہرحال خدا کا تصور اعلیٰ سطح پر انسانی شخصیت کے عروج اور اس کے عرفان کا مظہر ہے، جس کی آخری منزل پر انسان رومی سے ہم زبان ہو کر کہتا ہے ؎

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من

خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

تصوف میں چند علامتیں ایسی ہیں جن کی ادنیٰ سطح پر تشریح تو ایک ہی ہے لیکن اعلیٰ سطح پر ان کا مطلب کچھ اور ہے۔ مثلاً فاختہ پاکیزگی کی علامت ہے۔ شاہین قوت کی علامت ہے۔ بطخ روحانی توجہ کے سکون اور اطمینان کی علامت ہے اور تمور روحانی سخاوت اور فراخ دلی کی علامت ہے۔

یہاں میں علائم و اشارات کی ادنیٰ سطح پر تشریح و توضیح کرنے والوں کی ایک اور کوتاہی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اس پہلو پر فرائڈ اور اس کے مقلدوں نے یا اس کے مخالفین نے کبھی بحث نہیں کی اور وہ فرق ہے اخلاقی کردار اور اخلاقی صفات کا۔ اخلاق کا ایک پہلو مجرد اوامر و نواہی ہیں "یہ کرو" "وہ نہ کرو"۔ اس کی بہترین مثال وہ دس احکام ہیں جو حضرت موسیٰؑ پر نازل کیے گئے تھے "قتل نہ کرو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو" وغیرہ۔ حضرت عیسیٰؑ کا پہاڑی وعظ اس کے برعکس اخلاقی صفات کی اہمیت

جتلاتا ہے۔ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب نہیں، کیوں کہ آسمان کی بادشاہت ان ہی کی ہے، وغیرہ۔ اس "کیوں کہ" میں ان صفات کی تربیت سے جو اجر حاصل ہوتا ہے اس کا ذکر ہے۔ قرآن مجید کا پیرایہ اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ وہاں اوامر کے ساتھ ان کی وجہ جواز اخلاقی صفت رکھی ہے اور وہ صفت خدا کی ایک اپنی صفت بھی ہے۔ اسمائے حسنیٰ ہیں خدا کی ان صفات کی طرف اشارہ ہے۔ "تخلقوا باخلاق اللہ" سے بھی یہی مراد ہے۔ اپنے اندر وہ اخلاقی صفات پیدا کرو جن کی طرف اللہ کے اسماء الحسنیٰ اشارہ کرتے ہیں۔ ایک حدیثِ نبویؐ نے ایمان کی شاخوں کا ذکر کرتے ہوئے اخلاقی صفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حدیث ہے کہ "ایمان کی کچھ اوپر ستّر شاخیں ہیں۔ ان میں افضل شاخ لا الہ الا اللہ کا اقرار ہے اور نچلے درجے کی شاخ راستے سے ایذا دہ چیز کا ہٹا دینا ہے۔ اور حیا ایمان کا عظیم ترین شعبہ ہے" (کہ اس کے بغیر کسی بھی نیک عمل کی آدمی کو توفیق نہیں ہو سکتی) گویا ایمان کا اخلاقی مظہر چند اخلاقی صفات ہیں اور جہاں قرآن مجید میں زنا کو ممنوع قرار دیا ہے، ساتھ ہی اس حکم کی توضیح ایک اخلاقی صفت کے حوالے سے کر دی ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے "تم زنا کے پاس مت پھٹکو، کیوں کہ وہ فحش (بے حیائی) ہے، اور بری راہ ہے۔"

یہاں دراصل ممانعت فحش کی ہے، اور فحش ایک صفت ہے جو مختلف اعمال کو ملوث کر سکتی ہے۔ فحش زبان کا بھی ہو سکتا ہے اور خیال کا بھی، فحش حرکتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو فحش اعمال کی طرف لے جاتی ہیں، فحش نظر بھی ہو سکتی ہے، اور اسی طرح زنا بھی ایک فحش عمل ہے جو بالعموم فحش صفت ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

اخلاقی صفت ایک وجودی کیفیت ہے، اور اخلاقی کردار اس کا عملی اظہار ہے، اور اسلام میں یہ صفات دراصل خدا کی صفات سے ماخوذ ہیں، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ روحانی تربیت کے تین مدارج ہیں۔ ایمان، اسلام اور احسان، تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مومن پہلے اللہ پر ایمان لاتا ہے اور کسی اور سے نہیں ڈرتا، اور کسی اور کو نہیں چاہتا اور پھر وہ اپنے اندر اخلاقی صفات اور اعمال پیدا کرتا ہے اور آخر میں وہ حقیقت سے پیوستہ ہو کر ان صفات کو مظاہرِ حقیقت کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔

جہاں تک فرائڈ کی نفسیات کا تعلق ہے اس میں اس قسم کا کوئی امتیاز نہیں ملتا۔ بسا اوقات وہ Superego یا ضمیر کی تشکیل کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ وہ والدین سے حاصل کیے ہوئے اوامر و نواہی کا ایک بے ربط مجموعہ نظر آتا ہے جو وقتاً فوقتاً بچے نے خوف و ہراس کی حالت میں اپنی شخصیت کے اندر سمو لیے تھے۔ اتنے بلند بانگ ادعا سے

شروع کی ہوئی نفسیات اگر اس نازک اور اہم امتیاز کو نظر انداز کر دے تو انسان سوائے اس کے کہ اسے روحانی نظر بندی پر محمول کرے اور کیا کر سکتا ہے۔ اخلاق کے متعلق اس تنگ نظری نے فرائڈ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ضمیر کی سخت گیری کو ذہنی مرض کا ماخذ سمجھے، اور ذہنی مرض کے نفسیاتی علاج کا لبِّ لباب یہ ہے کہ ضمیر کی سخت گیری کو کم کیا جائے۔ جب انسان ضمیر کے درشت احکام کی گرفت سے آزاد ہو جائے اور لذّت اندوزی کی طرف راغب ہو، اور الم گریزی کو اپنا مسلک بنالے تو وہ انسان ذہنی طور پر صحت مند ہے۔ فرائڈ کی نفسیات میں ضمیرِ انسانی شخصیت پر محض ایک بوجھ ہے، ایک خارجی عنصر ہے جس سے اگر نجات حاصل ہو جائے تو انسان ہر وقت چہکتا مہکتا بن جائے۔ جی میں آئے تو کھُل کھیلے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں لذّت اور شدّت کے رنگ بھرے۔ فرائڈ کی نفسیات سے میں کوئی غیر ذمّہ دارانہ نتیجہ مرتب نہیں کر رہا۔ اس کے ایک ہیرو وِلہم رائخ (WILHELM REICH) نے تو کتے کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ دیا تھا، کیوں کہ کتّا اپنی جبلّی خواہشوں کی آزادانہ اور بھرپور تسکین کرتا ہے۔ شاید فرائڈ کے پیرو یہ کہیں کہ فرائڈ نے Sublimation یا ارتفاع کا نظریہ بھی تو پیش کیا تھا۔ کہ جبلّی آرزوؤں کو تخلیقی ملاقات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہاں، اس کے جواب میں میں یہ عرض کر دوں کہ فرائڈ کے ہاں ارتفاع کا تصوّر تو یہ ہے، لیکن اس "ارتفاع" کی کہیں توجیہہ نہیں ملتی۔ فرائڈ کے ہاں ارتفاع ایک لاشعوری عمل ہے، یعنی یہ خود بخود کسی شخصیت میں ہو جاتا ہے، اور کسی میں نہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے، کن حالات میں ہوتا ہے ہم نہیں جانتے۔ ارتفاع کا تصوّر پیش کر کے فرائڈ نے اپنے ضمیر کو دلاسا تو دے دیا لیکن کہیں کہیں اس کا حیوان سے رشک کا رجحان پھوٹ پڑتا ہے اور اس وقت اس کا حسن بیان اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاں جنسی خواہشا کا مکمّل ارتفاع نظر آتا ہے وہ اکثر بزدل، کم ہمّت اور کمینے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ ہیں جو بے باکانہ اپنی جنسی آرزوؤں کی دنیا میں نئے اور نادر راستے تلاش کرتے ہیں۔ جب فرائڈ جوان تھا، اور اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی تو ایک نوجوان شاعر نے اس کی منگیتر کا (جو بعد میں فرائڈ کی بیوی بن گئی) بوسہ لے لیا۔ اس حادثے کی اطلاع پانے پر فرائڈ کی نیند کئی راتوں تک حرام ہو گئی اور ویانا کی گلیوں میں وہ پریشان گھومتا رہا۔ حسد کے اس جذبے کی تشریح اس نے یوں کی کہ چوں کہ میں جوانی میں جنسی اختلاط کی فراوانی سے محروم رہا، اس لیے میری شخصیت میں حسد اور رقابت کا جذبہ شدید ہے۔

مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ فرائڈ کے ہاں ارتفاع کا تصوّر ایک بے معنی اور مہمل تصوّر ہے۔ نہ اس کا کوئی مطلب ہے اور نہ یہ اُس کے نظریۂ شخصیت میں کہیں جچتا ہے۔

ژُنگ کے ہاں ارتفاع کے متعلق ایک معقول اور مربوط تصوّر موجود ہے۔ ژُنگ یہ سمجھتا ہے کہ قوّت جب فقط ادنیٰ سطح پر کام کر رہی ہو تو اسے اعلیٰ سطح پر لایا جا سکتا ہے، لیکن یہ انقلاب، ارادتاً ظہور میں نہیں آتا، یہ ہمیشہ کسی علامت یا علائم کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی اکتساب یا ریاضت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ریاضت کو وہ فعال تخیّل یا Active Imagination کا نام دیتا ہے۔ اس عمل میں آپ انا یا Ego کو کسی قدر معطّل کر کے اپنے تصوّرات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور وہ خود بخود جیسی بھی چاہیں شکلیں اختیار کریں، اس عمل میں اچھی بھلی شکل یکایک بھیانک ہو جاتی ہے اور ایک حسینۂ طنّاز دیکھتے دیکھتے ایک چڑیل کا روپ دھار لیتی ہے۔ انا خاموش ہے اور اس عمل میں دخل نہیں دیتی، اِن تصوّرات سے مکالمے کرنا، یا ان کی رنگ دار تصویریں بنانا، وہ بھی ذہن کی مدد سے نہیں بلکہ نظر کی مدد سے، یا انھیں پتھر کے اصنام میں ڈھالنا، یا اِن کے موضوعات پر رقص کرنا، یہ ہے اس عمل کی نوعیّت، یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس عمل سے ادنیٰ سطح پر پریشان قوّت اعلیٰ سطح پر آجاتی ہے، لیکن اس تغیّر کا ذریعہ کوئی نہ کوئی علامت بن جاتی ہے۔ مثلاً آپ عقاب کو تصوّر میں دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھتے ہیں تو ایک دِن اسی تصوّر سے آپ کے ذہن میں ہیجان پیدا ہوگا اور اہتزاز اور یک سوئی کی کیفیت پیدا ہوگی تو یہ عقاب علامت ہو گیا اس تغیّر کا ایک نئے رُجحان، ایک نئے رویے، ایک نئے زاویۂ نظر کا۔ ژُنگ نے تو علامت کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ علامت قوّت کو مُنقلب کرنے کا آلہ ہے۔

یہ علامتیں ہر شخص کی علاحدہ علاحدہ نہیں ہوتیں۔ ان کا مواد ہر شخص کے ساتھ مختلف ہوتا ہے لیکن اُن کی ہیئت دنیا میں ایک جیسی ہوتی ہے یعنی ژُنگ، یہ کہتا ہے کہ ہماری انا کی تہہ میں ایمان الثابتہ کار فرما ہیں، اور یہ تقریباً وہی بات ہے جو حضرت ابنِ عربی نے بھی کہی تھی۔ ژُنگ کہتا ہے کہ ایمان الثابتہ کے دو پہلو ہیں:۔ ایک اثباتی اور دوسرے تخریبی۔ ایک عین عینِ مادر ہے ایک عینِ پدر، اور ایک سایہ کا عین ہے جہاں تک اِن اعیان کے اثباتی پہلو کے اظہار کا تعلّق ہے یہ ہمیشہ دو کیفیتیں لیے ہوئے ہوتا ہے: ایک یہ کہ اس میں تحیّر کا جذبہ موجود ہوتا ہے اور دوسرے اس میں ایک نورانی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں درست ہیں اور صوفیائے کرام نے اِنھیں تجلّیات

کا نام دیا ہے۔ لیکن صوفیائے کرام یہ کہتے ہیں کہ جب عرفان حاصل ہو جائے تو یہ تجلیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ انسان ایک لق و دق لامحدود میں داخل ہوتا ہے۔ یہ انتہائی منزل ہے جس کا بیان الفاظ میں ناممکن ہے۔ لیکن ژنگ کے ہاں اس منزل کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کے لیے بلند ترین مقام وہ ہے جب کہ "خودی" (Self) کا عین ثابت جلوہ گر ہوتا ہے اور "انا" (Ego) کو بھی اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ صوفیائے کرام نے جو آخری مقامات بتائے ہیں ژنگ کی نفسیات ان کا ذکر ہی نہیں کرتی۔

بات دراصل یہ ہے کہ کسی ماہرِ نفسیات نے سوائے ژنگ اور اس کے پیروؤں کے مذہب کی گہرائیوں اور وسعتوں کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور بہت ممکن ہے یہ کوشش ہی بے کار ثابت ہو، لیکن ژنگ پر بھی مادی سائنس کا رنگ اس طرح چڑھا ہوا تھا کہ وہ آخری دم تک اسے اتار نہیں سکا۔ نفسیات، مذہب کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن امید ہے کہ تجربہ نفسی، تجربہ روحانی بن جائے گا اور یہی مدرسۂ فکر شاید مذہبی کیفیات کی تاب لا سکے۔

مذہبی علوم کی تحصیل کے سلسلے میں میری حیثیت ایک مبتدی کی ہے۔ غالباً اسی لیے نفسیات اور مذہب کے تعلق کے بارے میں جا بہ جا دل میں شک گزرتا ہے۔ تصوف کی اکثر کتابوں میں جو میری نظر سے گزری ہیں شیطان کو بہت برا بھلا کہا گیا ہے اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ الفتح الربانی میں فرماتے ہیں کہ مومن یوں زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے شیطان کی خبر تک نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ الاعلویؒ کی خودنوشت سوانح حیات میں جہاں روحانی تجربات کو یک جا کیا گیا ہے وہاں شیطان سے نہ کوئی مجادلہ نظر آتا ہے اور نہ مکالمہ۔ کہیں کہیں وہ اشارۃً الجیریا کے حالات سے غیر مطمئن ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ نفسیات کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہ بات مجھ پر کٹھن گزری لیکن جب یہ حدیثِ نبویؐ دیکھی تو بات سمجھ میں آئی: آں حضرت صلعم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ آدم اور شیطان میں جنگ رہی لیکن میں نے اپنے شیطان کو مسلمان کر لیا ہے۔ شیطان کو مسلمان کرنا ارتفاع بھی ہے اور جنسی اور تخریبی آرزوؤں کو ایمان کی حدود میں پابند کرنا بھی ہے۔ انجیل میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو شیطان کو تحت الثریٰ میں مقید کر دیا گیا۔ یہی بنیاد تھی اس رہبانیت کی جو بعد میں مسیحیت میں نظر آتی ہے لیکن شیطان کو مسلمان کرنے سے رہبانیت کی ضرورت نہیں رہتی۔

دوسرے تصوف کی کتابوں میں عوام کی غلط کاریوں سے ایک قسم کی جھنجھلاہٹ

اور غصہ نظر آتا ہے۔ عام لوگوں کے افکار و حوادث، ان کے گیت اور ان کی کہانیاں، یہ سب کچھ اعیان الثابتہ کی تخلیق ہیں۔ غالباً جہاں غصہ ہے ہیں وہاں ہم دردی اور رواداری دیکھنا چاہتا ہوں لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ خوف اور غصہ بھی تو فطری جذبات ہیں۔ ممکن ہے لوگ خوف کی چوٹیں اور جراحتیں سہہ کر ہی حقیقت کی محبت کی طرف مائل ہوتے ہوں۔ پھر کہیں کہیں ان کتابوں میں وساوس اور شکوک کی بھی بہت مذمت کی گئی ہے، یہ خدمت بھی مجھ پر گراں گزری، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ جُوں جُوں آپ حقیقت کی طرف بڑھیں گے وساوس اور شکوک بڑھتے جائیں گے، مثلاً نماز میں اکثر اِدھر اُدھر کے خیالات آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو چیز بھول گئی ہو نماز پڑھیں تو وہ یاد آجاتی ہے اور بعض صوفیا نے تو یہ بھی کہا ہے وساوس اور شکوک ہی کو حقیقت سمجھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی نفسیات نے مذہب اور مذہبی کیفیات کا مطالعہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ اس کی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ شاید مشرق کے ماہرینِ نفسیات اس طرف توجہ دیں۔

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۲، ستمبر ۱۹۶۵ ش

ڈاکٹر محمد رفیع الدین احمد

پچھلے ماہ شامِ ہمدرد کے بعد ہی ہندستان کے بلا اعلان جارحانہ حملے نے جو صورتِ حال پیدا کر دی تھی اُس کی کیفیت آنکھوں سے نہیں دیکھی، لیکن جو کچھ گزرا اس کا علم ہر پاکستانی کی طرح مجھے بھی ہے۔ دُشمن کا یہ بزدلانہ حملہ جو لاہور پر ہُوا بہت احتیاط کے باوجود احمقانہ بھی کہا جاسکتا ہے، اس لیے کہ لاہور کی روایات سب کو معلوم ہیں۔ اہلِ لاہور کی زندہ دِلی اور جی داری بھی اظہر من الشمس ہے۔ لاہور پاکستان کا دل ہے اور لاہور والوں کی دلیری و دلاوری بھی کسی سے پوشیدہ نہیں اور جنھوں نے اس کو اہمیت نہیں دی تھی اُن کو بھی اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ کسی کے دِل پر حملہ کرنے کا نتیجہ کیا ہونا ہے۔ الحمد للہ ہمارا دشمن زیر ہُوا اور اس زمینِ پاک کی جانب بڑھنے والے قدم توڑ دیئے گئے۔ ہماری بہادر، جاں فروش اور جان باز قوم نے دشمن کو ویسا ہی دندان شکن جواب دیا جیسا کہ ایک زندہ، وطن پرست اور باعزم و عظیم قوم کے شایانِ شان تھا۔ اہلِ لاہور نے جس جواں مردی کا ثبوت دیا وہ قابلِ مبارک باد ہے اور پاکستان کی تاریخ میں لاہور اور سیالکوٹ دو باب نہایت درخشاں نظر آئیں گے۔

پاکستان کا دِل لاہور پورے ملک کو خون پہنچاتا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی پھر ہمیشہ اسی طرح پہنچاتا رہے گا اور اب زیادہ مصفّا اور صحت مند قوم کو یہ خون پہنچائے گا انشاء اللہ۔

میں آج کے مقرر جناب ڈاکٹر محمد رفیع الدّین احمد صاحب کا تہِ دِل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے ہماری دعوت کو قبول فرمایا اور آج کی تقریب کے لیے "اسلام اور سائنس" کے موضوع پر فاضلانہ مقالہ تحریر فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گراں قدر تصانیف اور فاضلانہ مضامین کی وجہ سے علمی حلقوں میں بخوبی متعارف ہیں۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب اسی جموں میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے جس کی آزادی

کے لیے مجاہدینِ کشمیر نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے۔ آپ نے پرنس آف ویلز کالج جموں سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر مولوی صدر الدین اور مولوی نجم الدین جیسے فاضل اجل اساتذہ سے ڈاکٹر صاحب کو علمی فیض حاصل کرنے کا موقع ملا اور ان حضرات کی صحبت میں عربی زبان کا ذوق آپ کے دل میں پیدا ہوا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں وہ نظر پیدا ہوئی جو انسان کو رموزِ حیات سے آشنا کرتی ہے اور ایسے دانائے راز کو حکیم یا فلسفی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو سائنس سے بھی شغف رہا لیکن ذوقِ قرآنی سائنسی ذوق پر غالب آیا۔

ڈاکٹر صاحب ایک اعلا پائے کے استاد ہیں، منتظم، بلند مقام مصنف اور اہلِ دل فلسفی۔ ڈاکٹر رفیع الدین احمد صاحب نے پہلے Ideology of the Future اور اس کے بعد First Principles of Education نامی کتابیں لکھ کر پنجاب یونی ورسٹی سے پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی اور بعد ازاں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعلا ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر صاحب سری پرتاپ کالج سری نگر اور پرنس آف ویلز کالج جموں میں بیس برس تک عربی، فارسی اور اردو کے پروفیسر رہے ہیں۔ اور پھر اسی بہادروں کے شہر لاہور کے ادارۂ ثقافت اسلامی سے منسلک ہو گئے۔ دو سال تک یہاں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے بعد انھیں اقبال اکادمی کراچی کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا، جہاں وہ بارہ سال سے زائد ہی اس عہدہ پر فائز رہے۔

قدرت نے ڈاکٹر صاحب کو فلسفے کا فطری ذوق مرحمت فرمایا ہے۔ اس حقیقت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فلسفے کی سب سے بڑی اور آخری ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ اردو زبان میں آپ کی اہم تصانیف میں "پاکستان کا مستقبل"، "قرآن اور علمِ جدید"، "مارکسزم کا مطالعہ"، اور "اسلام کا نظریہ تعلیم"، کا شمار ہوتا ہے اور علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ربط و ضبط کا کافی موقع ملا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کی ذات میں ایک عظیم شخصیت ہنوز پوشیدہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے پایۂ علم کا صحیح ادراک کیا جائے، اور ان کی بزرگی اور عظمت کو تعمیرِ ملک و ملت کے لیے احترام و اعزاز کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ چمن میں دیدہ ور بمشکل پیدا ہوتا ہے، ہمارے چمن پاکستان کا یہ دیدہ ور ایسا نہ ہو کہ ہماری غفلتوں کا شکار ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ ہم اپنے اکابرین کو پہچاننے کی کوشش کریں اور ان کے سروں پر عظمت کا جو تاج ہے چشمِ بینا سے اس کے حسن کو دیکھیں۔

حکیم محمد سعید
۷ر اکتوبر ۱۹۶۵ء ش

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت

جناب ڈاکٹر محمد رفیع الدین احمد

سائنس کیا ہے؟

علم کے جس شعبہ کو ہم سائنس کہتے ہیں اس کا دوسرا نام علم کائنات ہے جس میں انسان کا علم بھی شامل ہے۔ سائنسی علوم کی کلید کائنات کے قدرتی حالات اور واقعات کا یا دوسرے لفظوں میں مظاہر قدرت کا مشاہدہ ہے۔ جو ہمارے حواس خمسہ کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے۔ سائنس دان کائنات کے مشاہدے سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے پھر ان نتائج کو ایک قابل فہم تنظیم اور ترتیب کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ ہر درست سائنسی نتیجہ کو ہم ایک مستقل علمی حقیقت یا قانون قدرت سمجھتے ہیں۔ مشاہدے سے دریافت ہونے والے نتائج یا علمی حقائق کو جب مرتب اور منظم کر لیا جاتا ہے تو اسے ہم سائنس کہتے ہیں۔

سائنسی طریق تحقیق کے چار مرحلے

بعض وقت سائنس دان کائنات کے حالات اور واقعات کا مشاہدہ براہ راست ان کی قدرتی حالت میں کرتا ہے اور اس غرض کے لیے ان کو ڈھونڈھ نکالتا ہے اور خود ان کے قریب جاتا ہے۔ لیکن بعض وقت وہ اپنے معمل کے اندر کائنات کے حالات اور واقعات کو مصنوعی طور پر پیدا کر کے ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ گویا ان کو اپنے قریب لاتا ہے لیکن خواہ سائنس دان مظاہر قدرت کے قریب خود جائے یا ان کو اپنے قریب لائے دونوں

صورتوں میں وہ کائنات کے مشاہدے اور مطالعے کی خاطر اپنے لیے سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سائنس دان کی اس کوشش کو تجربہ کا نام دیا جاتا ہے۔ تجربے کی غرض مشاہدہ ہے اور مشاہدے کی غرض غور و فکر کے بعد نتائج اخذ کرنا۔ بعض وقت بہت سے الگ تھلگ سائنسی حقائق مل کر ایک ایسی حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں جو براہِ راست تجربے اور مشاہدے کے طریقوں سے ثابت شدہ نہیں ہوتی۔ تاہم چوں کہ وہ بعض ثابت شدہ حقائق کو منظم کرتی ہے اس لیے سائنس دان اسے ایک قابلِ یقین نظریہ کے طور پر اپنے سائنسی حقائق میں داخل کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کے بغیر اس کے الگ تھلگ سائنسی حقائق قابلِ فہم نہیں ہوتے اور ان میں کوئی عقلی تنظیم یا وحدت پیدا نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ نظریہ بھی جب تک کہ سائنسی حقائق اسے غلط ثابت نہ کریں ایک سائنسی حقیقت کا درجہ رکھتا ہے کیوں کہ وہ بھی ہمارے مشاہدات کے نتائج میں شامل ہوتا ہے۔

سائنس دان کے اس طریقِ تحقیق کو جس کی روح کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ ہے۔ سائنسی طریقِ تحقیق یا سائینٹفک میتھڈ (Scientific Method) کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سائنس دان کے طریقِ تحقیق کے چار مرحلے ہوتے ہیں:

اوّل - تجربہ (Experiment)

دوئم - مشاہدہ (Observation)

سوئم - اخذ نتائج (Inference)

چہارم - تنظیم نتائج (Systematization of Inferences)

سائنسی علوم کی قسمیں

کائنات کے تین واضح طبقے ہیں (۱) مادّہ (۲) زندہ اجسام اور (۳) نفس انسانی اور ان کے بالمقابل علم کائنات یا سائنس کے بھی تین بڑے حصے ہیں۔

(۱) مادّہ کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا طبعیاتی علوم جن میں علم طبیعیات، علم کیمیاء علم الافلاک، علم الارض وغیرہ علوم شامل ہیں۔

(۲) زندگی کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا حیاتیاتی علوم جن میں علم حیاتیات، علم نباتات، علم الحیوانات، علم الجنین، علم الابدان اور طب وغیرہ علوم شامل ہیں۔

(۳) نفس انسانی کی ماہیت اور اس کے مظاہر سے تعلق رکھنے والے علوم یا انسانی یا نفسیاتی علوم جن میں نفسیات فرد، نفسیات جماعت، علم التاریخ، علم السیاست، علم الاخلاق،

علم الاقتصاد، علم القانون، علم التعلیم، وغیرہ شامل ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ریاضیات اور منطق بھی نفسیات ہی کی شاخیں ہیں، کیوں کہ وہ ان اصولوں کی تشریح اور تفصیل پر مشتمل ہیں جن کے مطابق ذہن انسانی سوچتا ہے۔

ہم سائنس کے ان شعبوں کو اختصار کی غرض سے علی الترتیب، طبیعیات، اور حیاتیات اور نفسیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

سائنس دان کے بنیادی اعتقادات

بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنس کو اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں اور دورِ حاضر کا سائنس دان اپنی تحقیق کسی ایسے اعتقاد سے شروع نہیں کرتا جس کو اس نے بلا ثبوت پہلے سے قبول کر لیا ہو۔ بلکہ وہ خالی الذہن ہوتا ہے اور اس کے مشاہدات جس طرف اسے لے جاتے ہیں، چلا جاتا ہے یہ خیال درست نہیں ہر سائنس دان اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد کے طور پر حقیقت سائنس یا حقیقت علم کے متعلق کچھ عقائد رکھتا ہے جو خود حقیقت کائنات کے کسی عقیدہ سے ماخوذ ہوتے ہیں اور جو اس کی تحقیق کے نتائج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر سائنس دان شروع سے ہی اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ کائنات ایک یکساں کل یا وحدت ہے۔ یعنی وہ فاصلہ اور وقت دونوں کے لحاظ سے ایسے منطقوں یا حصوں میں بٹی ہوئی نہیں جن میں متضاد قسم کے قوانین قدرت جاری ہوں۔ کائنات کے قوانین مسلسل اور مستقل ہیں وہ نہ صرف ہر جگہ ایک ہی ہیں بلکہ ہر زمانے میں بھی ایک ہی رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس دان کا یہ عقیدہ صحیح ہے اور اس کی صحت کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ آج تک غلط ثابت نہیں ہو سکا یہ عقیدہ سائنسی تحقیق کا باعث ہے اس کا نتیجہ نہیں، سائنس کی تمام ترقیات جو اب تک ممکن ہوئی ہیں ان کی بنیاد یہی عقیدہ ہے۔ اگر سائنس دان اس عقیدہ سے آغاز نہ کرتے اور یہ عقیدہ صحیح نہ ہوتا تو سائنس ممکن ہی نہ ہوتی۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو سائنس دان کو سائنسی تحقیق کے لیے اکساتا ہے اور اسی کی تصدیق سے وہ اپنے سائنسی نتائج پر مطمئن ہوتا ہے اور اس کی راہ پر آگے قدم اٹھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سائنس دان کو معلوم ہو جائے کہ جو سائنسی حقیقت اس نے اپنی تحقیق سے آج اس وقت اور اس مقام پر دریافت کی ہے وہ محض وقتی اور مقامی ہے اور اس کی متبادل یا متوازی سائنسی حقیقتیں اس کائنات میں بہت سی ہیں یا آئندہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اگر اسے یہ خیال ہو کہ پانی سطح سمندر سے یکساں بلندی پر کہیں تو سو درجہ حرارت پر اور کہیں پچاسی درجہ حرارت پر ابلتا ہے اور کسی خاص مقام پر کسی وقت ۱۰۰ درجہ حرارت پر

اور کسی اور وقت پچاس درجہ حرارت پر ابلتا ہے تو وہ اپنی اس تحقیق کے نتیجہ کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دے گا۔

کائنات کی وحدت کے نتائج

پھر کائنات کی اسی وحدت کی وجہ سے سائنس داں بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ سائنس ایک وحدت ہے اور تمام سچے سائنسی حقائق خواہ وہ طبیعاتی ہوں، یا حیاتیاتی یا نفسیاتی ایک دوسرے کے ساتھ عقلی طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ علمی ربط وضبط رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ایک دوسرے کی تائید اور توثیق کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر روشنی ڈالتے ہیں اور کسی صورت میں بھی آپس میں ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہوتے اور ایک دوسرے کی علمی اور عقلی مخالفت نہیں کرتے۔ سائنس داں بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ تمام سائنسی حقائق مل کر ایک ایسا عقلی اور علمی نظام بناتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی نام نہاد "سائنسی حقیقت" اس میں داخل کر دی جائے جو سچی سائنسی حقیقت نہ ہو تو وہ اس نظام میں سما نہیں سکتی کیوں کہ تمام سائنسی حقائق اس کی علمی اور عقلی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی اعتماد کی وجہ سے جب سائنس داں دیکھتا ہے کہ اس کی تحقیق کے ذریعہ سے کوئی ایسی سائنسی حقیقت آشکار ہوئی ہے جو کسی دوسری سائنسی حقیقت سے جو پہلے سے معلوم اور مسلّم ہو ٹکراتی ہے تو وہ اپنی تحقیق کو ناقص سمجھتا ہے اور اس "نام نہاد" سائنسی حقیقت کو غلط سمجھ کر رد کر دیتا ہے یا پھر پہلی معلوم اور مسلّم سائنسی حقیقت پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ اس پر نظر ثانی کرتا ہے اور اگر وہ غلط ہو تو اسے رد کر دیتا ہے۔ سائنسی حقائق کی وحدت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب سائنس کا کوئی حصہ غلط طور پر ترقی کر رہا ہو تو ساری سائنس کی ترقی پر اس کا برا اثر پڑتا ہے یہاں تک کہ سائنس کے بعض حصوں کی ترقی بالکل رک جاتی ہے سائنس داں بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ اعتماد رکھتا ہے کہ ہر سچی سائنسی حقیقت بہت سی اور سائنسی حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے اور اگر اس نے ایک ایسی حقیقت کو رد کر دیا تو بہت سی اور سائنسی حقیقتیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی اور سائنس کی ترقی اس کے کسی نہ کسی شعبے یا حصے میں رک جائے گی۔ یہ وہ اعتقادات ہیں جن سے سائنس داں اپنی تحقیق کا آغاز کرتا ہے۔ یہ اعتقادات اس کی تحقیق کے آغاز سے پہلے اس کے دل کے اندر بطور مسلّمات کے موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ثابت نہیں کرتا بلکہ قبول کرتا ہے اور ان کی مدد سے اور ان کی روشنی میں اپنے تمام سائنسی حقائق

کو ثابت کرتا ہے۔

سائنس کی وحدت کا سبب حقیقتِ کائنات کی وحدت ہے

سائنس داں وحدتِ کائنات اور وحدتِ سائنس پر بلا ثبوت اور بلا دلیل اعتقاد کیوں رکھتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بحیثیت انسان اپنی فطرت سے ایسا کرنے کے لیے مجبور ہے۔ انسان کی فطرت کے اندر یہ اعتقاد ودیعت کیا گیا ہے کہ حقیقتِ کائنات ایک ہے اور ساری کائنات اسی کا مظہر ہے اور خواہ سائنس دان اپنے اس وجدانی اعتقاد کا اعتراف کرے یا نہ کرے لیکن یہ اعتقاد پھر بھی اس کی فطرت کے جزو لاینفک کے طور پر اس کے لاشعور میں جاگزیں رہتا ہے اور وہ اس اعتقاد کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب تک حقیقتِ کائنات کو شعوری یا لاشعوری طور پر ایک نہ مانا جائے سائنسی حقائق کی وحدت کو ماننا ممکن نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدت بغیر نظم یا اتحاد کے نہیں ہوتی اور نظم کو متحد یا منظم کرنا ——— کسی مرکزی اصول کے بغیر محال ہے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ جو اصول تمام سائنسی حقائق کو متحد اور منظم کرے وہ ان کی جان یا روح یا آخری حقیقت کے طور پر ہو۔ یعنی وہ حقیقت الحقائق یعنی کائنات کی آخری حقیقت ہو اور تمام سائنسی حقائق اس کی تشریح اور تفسیر کے اجزا اور عناصر ہوں اور اس کے ساتھ علمی ربط اور عقلی مطابقت رکھتے ہوں در اصل سائنسی حقائق کے باہمی، علمی اور عقلی ربط و ضبط کی وجہ یہی ہے کہ وہ سب حقیقت کائنات کے ساتھ عقلی اور علمی ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ سائنس داں کا شعوری یا لاشعوری تصورِ حقیقت ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کے سائنسی نتائج پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور چوں کہ سائنسی حقائق صرف صحیح تصورِ حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور کسی غلط تصورِ حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتے لہذا اگر سائنس داں کا تصورِ حقیقت درست ہوگا تو اس کی سائنسی تحقیق درست ہوگی اور اس کو درست نتائج تک پہنچائے گی ورنہ جا بجا غلط ہو جائے گی اور آخر کار رک جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت نفسیاتی یا سائنسی علوم کے دائرہ میں جو تصورِ حقیقت کے ساتھ زیادہ قریب کا تعلق رکھتے ہیں زیادہ شدت سے نمودار ہوگی تصورِ حقیقت کے غلط ہونے سے سائنس کے غلط ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سائنس دان غیر شعوری طور پر بعض صحیح سائنسی حقائق کو بدل کر اپنے غلط تصورِ حقیقت کے مطابق کرتا جاتا ہے اور بعض غلط نام نہاد "سائنسی حقائق" کو جو اس کے مطابق ہوں، صحیح سمجھ کر قبول کر۔۔۔

جاتا ہے۔

فلسفہ کا کام یہ ہے کہ وہ آشکار طور پر کسی تصورِ حقیقت کو پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ تمام سائنسی حقائق کی عقلی اور علمی مطابقت کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فلسفیوں نے صحیح تصورِ حقیقت کے مختلف نظریات قائم کیے ہیں اور قدرتی طور پر ہر فلسفی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تمام سائنسی حقائق صرف اسی کے تصورِ حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اسی کا تصورِ حقیقت صحیح ہے لیکن چوں کہ صرف ایک ہی تصورِ حقیقت تمام سائنسی حقائق کو متحد اور منظم کر سکتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ درست تصورِ حقیقت صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا تصوّرِ حقیقت

روسی اشتراکیوں کے نزدیک یہ تصورِ حقیقت مادّہ ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک یہ تصورِ حقیقت خدا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے نزدیک یہی تصورِ حقیقت ہے جس سے تمام سائنسی حقائق مطابقت رکھتے ہیں اور جو تمام سائنسی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے اور ان کی طرف صحیح راہ نمائی کرتا ہے۔ باقی ہر قسم کے تصوّراتِ حقیقت سائنس کی مجموعی ترقی کے لیے مضر ہیں۔ دراصل ایک ہی تصورِ حقیقت ایسا ہے جو وحدتِ عالم اور وحدتِ علم کی معقول اور قابلِ قبول تشریح کر سکتا ہے اور وہ مسلمانوں کا تصورِ حقیقت ہے جس کی رو سے وہ یہ مانتے ہیں کہ سائنسی حقائق اور قوانینِ قدرت کی حقیقت اور اصلیت یہ ہے کہ وہ کائنات میں خدا کے تخلیقی اور تربیتی اعمال و افعال ہیں اور خدا ایک شخصیت ہے اور شخصیت کا خاصہ ہے کہ اس کا صرف ایک مقصد یا مدّعا ہوتا ہے جس کے ماتحت اس کے سارے اعمال و افعال سرزد ہوتے ہیں۔ جہاں بھی ہمیں اعمال و افعال کا ایک منظّم سلسلہ نظر آئے وہاں کسی شخصیت کی کارفرمائی کا موجود ہونا ضروری ہے۔ فردِ انسانی کے اعمال و افعال کے اندر بھی ایک وحدت ہوتی ہے، کیوں کہ وہ بھی ایک شخصیت ہے اور بیک وقت ہمیشہ ایک مقصد اور مدعا کے ماتحت اپنے سارے کام کرتا ہے۔

چوں کہ کائنات کی تخلیق سے خدا کا ایک مقصد ہے لہٰذا خدا کے سارے اعمال و افعال ہیں جو قوانینِ قدرت یا سائنسی حقائق کی صورت اختیار کرتے ہیں ایک وحدت موجود ہے اس کے برعکس چوں کہ قوانینِ قدرت یا کائنات کے اعمال و افعال کے اندر ایک وحدت موجود ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ان اعمال و افعال کا باعث کوئی شخصیت ہو جو کائنات کی خالق ہو۔

وحدت کائنات سے خدا کے وجود کا قرآنی استشہاد

وحدتِ کائنات کا باعث یہ ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہے اور وہ مقصد ایک ہی ہے اور اس کے مقصد کی وحدت کا باعث یہ ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے اور وہ خالق ایک ہی ہے۔ وحدتِ کائنات پر سائنس دانوں کے غیر شعوری وجدانی اعتقاد کا باعث ان کی فطرت کا یہ مخفی اور غیر شعوری تقاضا ہے کہ وہ کائنات کا ایک مقصد مانیں اور وہ مقصد ایک ہی ہو اور اس کا ایک خالق تسلیم کریں اور وہ خالق ایک ہی ہو۔

قرآن حکیم نے کائنات کی وحدت کی طرف پر زور الفاظ میں توجہ دلائی ہے اور اس کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ کائنات کا کوئی خالق ہے اور وہ خالق ایک ہی ہے۔

ما تریٰ فی خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصر ھل تریٰ من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر۔

(ترجمہ) اے پیغمبر آپ خدا کی تخلیق میں کوئی فرق نہ دیکھیں گے۔ ذرا نظر دوڑائیے اور کائنات کا مشاہدہ کیجیے کیا آپ کو خدا کی اس تخلیق میں کبھی کوئی دراڑ نظر آتا ہے۔ پھر دوبارہ نظر دوڑائیے اور دیکھیے۔ نگاہیں مایوس اور درماندہ ہو کر لوٹیں گی کہ خدا کی تخلیق میں کبھی کوئی دراڑ نہیں (کیا کائنات کی یہ وحدت اس کی مقصدیت کسی خالق کائنات کی ہستی اور وحدت کا ثبوت نہیں)۔

قل ارایتم ما تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرک فی السمٰوات۔

(ترجمہ) اے پیغمبر کہیے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر کس کی عبادت کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ آیا انھوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہے۔

یعنی اگر کائنات کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کوئی اور شریک ہوتا تو زمین و آسمان میں کہیں تو اس کی اپنی تخلیق کا کوئی نشان ملتا جہاں مجدا قسم کے قوانین قدرت نافذ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ منکرین قرآن حکیم کے اس سوال کے جواب میں اسی کائنات کا ایک حصہ پیش کر کے معقولیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ حصہ خدا کے اس شریک نے پیدا کیا ہے جسے ہم مانتے ہیں، کیوں کہ جب کائنات کے اس حصے میں بھی قوانین قدرت وہی ہیں جو باقی کائنات میں ہیں

تو کس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا خالق وہی نہیں جو باقی کائنات کا ہے۔

فلسفہ سائنس کا ہی ایک شعبہ ہے

فلسفہ اور سائنس کے اس باہمی تعلق کی بناء پر ہم فلسفہ کو سائنس سے الگ نہیں کر سکتے۔ جب تک سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے دریافت کیے ہوئے حقائق کی تشریح، توجیہہ یا تنظیم کے لیے نظریات قائم کرے فلسفہ اور سائنس میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ صرف یہی کہا جا سکتا کہ فلسفہ پوری کائنات کی سائنسی تحقیق کی وہ چوتھی اور آخری منزل ہے جہاں تمام کائنات کا سائنسی علم، تجربہ اور مشاہدہ اور استنتاج کے تینوں مرحلوں سے گزر کر تنظیم نتائج کے چوتھے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے۔ دراصل جب سائنسی تحقیق اپنی مجموعی حیثیت سے اپنے آخری درجہ پر پہنچتی ہے تو ہم اسے فلسفہ کہتے ہیں۔

مسلمان سائنسی طریقِ تحقیق کے موجد اور سائنسی علوم کے بانی تھے

بعض یورپی مصنفوں کی غلط بیانیوں کی وجہ سے دنیا مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہے کہ سائنسی علوم اور سائنسی طریقِ تحقیق کے موجد یورپ کے لوگ ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ سائنسی طریقِ تحقیق کا موجد (ROGER BACON) یا اس کا ایک اور ہم نام ہے لیکن سائنسی علوم کی تاریخ کے موضوع پر حال کی علمی تحقیق نے اس ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت سے پردہ چاک کر دیا ہے کہ سائنسی طریقِ تحقیق جس کی بدولت موجودہ سائنسی علوم وجود میں آکر ترقی پذیر ہوئے ہیں مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا اور یورپ کے حالیہ سائنسی علوم کی بنیاد بھی مسلمانوں نے رکھی تھی پھر بعض لوگوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مسلمانوں نے سائنسی طریقِ تحقیق یونانیوں سے سیکھا تھا اور اپنے سائنسی علوم کی بنیاد یونانیوں کی سائنس پر رکھی تھی۔ لیکن یہ خیال بھی درست نہیں۔

تعمیرِ انسانیت (The Making of Humanity) کا مصنف برفالٹ (BRIFFAULT) تمام غلط فہمیوں کی پرزور تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"عصرِ جدید کی دنیا میں عربوں کی تہذیب کا عظیم الشان حصہ سائنس ہے لیکن اس کے پھل کو پکنے میں کچھ دیر لگی۔ جب تک ہسپانوی عربوں کی تہذیب تاریکی میں دوبارہ گم نہیں ہوئی۔ وہ دیو مہیب جس کو اس نے جنم دیا تھا اپنی

پوری قوّت کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا۔ یہ فقط سائنس ہی نہیں تھی جس نے یورپ کو زندہ کیا۔ اسلام کی تہذیب کے اور بہت سے اثرات نے یورپ کی زندگی کو اس کی پہلی چمک دمک سے آراستہ کیا۔"

ص : ۲۰۲

"اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثر کے نشانات موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا کہ اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوّت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے یعنی سائنس اور سائنسی طرزِ فکر۔"

ص : ۱۰۹

"ہماری سائنس فقط انقلاب آفریں نظریات کی حیرت انگیز دریافت کے لیے ہی علوم عرب کی احسان مند نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی بڑے احسان کے لیے عربوں کی تہذیب کی مرہونِ منّت ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے وجود ہی کے لیے اس کے زیرِ احسان ہے۔ دنیائے قدیم یعنی یونانیوں کی تہذیب جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سائنس سے پہلے کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات اور ریاضیات دوسرے ملکوں سے درآمد کی ہوئی چیزیں تھیں جن کو یونانی تہذیب کی آب و ہوا کبھی پوری طرح سازگار نہ آسکی۔ اہل یونان حقائق کو منظم کرتے تھے ان سے عمومی نتائج اور اصول اخذ کرتے تھے۔ لیکن تحقیق و تجسّس کے صبر آزما راستے، مثبت علم کی فراہمی، سائنس کے نکتہ رس طریقے، مفصّل اور طویل مشاہدہ اور تجرباتی چھان بین ایسی چیزوں کا اہل یونان کی اُفتادِ طبیعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ قدیم کلاسیکی دنیا کا علمی کام اگر کسی مقام پر ذرا سا بھی سائنسی تحقیق کے نزدیک پہنچا تو وہ یونانیوں کے دَور کا اسکندریہ تھا۔ جسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں تحقیق کی ایک ایسی نئی روح اور تجسّس کے ایسے نئے طریقوں یعنی تجربہ، مشاہدہ اور پیمائش اور ریاضیات کی اس قسم کی ترقی کے طفیل ظہور پذیر ہوئی تھی جس سے اہل یونان محض بے خبر تھے۔ اس روح کو اور ان طریقوں کو یورپ میں عربوں نے داخل کیا۔"

ص : ۱۹۰

"یورپ میں علوم کا احیاء پندرھویں صدی میں نہیں بلکہ اس وقت ہوا جب عربوں اور مُوروں کی تہذیب کے اثر سے یورپی تہذیب میں زندگی کی نئی روح پھونکی گئی۔ یورپ کی نئی زندگی کا گہوارہ اٹلی نہیں، بلکہ اسپین تھا۔ مدتوں تک بربریت کی پستیوں میں غرق ہوتے رہنے کے بعد یورپ جہالت اور ذلت کی تاریک ترین گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا۔ جب عرب ملکوں کے شہر بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور طلیطلہ تہذیب اور علمی مشاغل کے ترقی پذیر مراکز بنے ہوئے تھے۔ ان شہروں میں اس نئی زندگی کا آغاز ہوا جو نوع انسانی کے ارتقا کے ایک نئے پہلو کی صورت میں جلوہ افروز ہونے والی تھی۔ اس وقت سے لے کر جب عربوں کی تہذیب کا اثر محسوس ہونے لگا نئی زندگی حرکت میں آنے لگی۔"

ص: ۱۸۸

لیکن وہ نقطۂ نظر جس کی روشنی میں عرب موجودہ مواد کو کام میں لاتے تھے، یونانیوں کے نقطۂ نظر کے بالکل متضاد تھا یہ نقطۂ نظر بعینہٖ وہ چیز مہیا کرتا تھا جس کا فقدان یونانیوں کے ذہن کا کمزور اور ناقص پہلو تھا۔ یونانیوں کی دلچسپی کا مرکز نظریہ آفرینی اور اصول سازی تھے، وہ ٹھوس مشاہداتی حقائق سے بے پرواہ تھے اور ان کو نظر انداز کرتے تھے۔ اس کے برعکس عرب محققین کا ذوق دریافت نظریہ آفرینی سے بے پرواہ تھا اور اس کا مقصود ٹھوس حقائق کو بہم پہنچانا اور اپنی معلومات کو صحت اور کمیّت کے معیاروں پر لانا تھا۔ معتبر اور پائیدار سائنس اور ایک ڈھیلے ڈھالے سائنسی ذوق میں جو چیز فرق پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کہنے والا کیفیت نہیں بلکہ کمیّت بیان کر رہا ہے اور اپنی پیمائش کو ہر ممکن طریق سے درست کرنے کے لیے بے تاب ہے عربوں کا سارا وسیع و عریض سائنسی کام اسی معروضی تحقیق اور کمیّتی صحت و صفائی کے ذوق کے زیرِ اثر انجام پا تا رہا ہے۔ روجر بیکن نے آکسفورڈ اسکول میں ان لوگوں کے جانشینوں کے ماتحت عربی زبان اور عربی سائنس کا علم حاصل کیا تھا۔ نہ روجر بیکن اور نہ ہی اس کا دوسرا اہم نام اس بات کا اہل ہے کہ اسے سائنسی طریقِ تحقیق کے موجد ہونے کا اعزاز بخشا جائے، روجر بیکن تو محض عیسائی یورپ کے لیے مسلمانوں کی سائنس کے سفیروں یا پیام رسانوں میں سے ایک تھا اور وہ کبھی یہ کہتے ہوئے نہ تھکتا تھا کہ عربی زبان اور عربی

سائنس کا سیکھنا اس کے ہم عصروں کے لیے سچے علم کا ایک ہی راستہ ہے۔ یہ بحثیں کہ سائنسی طریقِ تحقیق کا موجد کون تھا یورپی تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں ایک بہت بڑی غلط بیانی پر مشتمل ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بیکن سے پہلے عربوں کا تجرباتی طریقِ تحقیق عام ہو چکا تھا اور یورپ بھر میں اس کا تتبّع نہایت ذوق و شوق سے کیا جاتا تھا۔"

مسلمانوں کو یہ امتیاز کیسے حاصل ہوا

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سے فقط مسلمانوں کو ہی یہ امتیاز نصیب ہو سکا کہ انھوں نے قدرت کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کو اپنا شعار بنایا۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوئے کہ سائنسی طریقِ تحقیق ایجاد کریں اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھیں۔ قرآن کی تعلیمات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی اس بات میں ذرا شک باقی نہیں رہتا کہ اس کا سبب خود قرآن حکیم ہے جس کے قریباً ایک تہائی حصے میں قدرت کے گوناگوں مظاہر کی طرف توجہ دلا کر کائنات کے مشاہدے اور مطالعے پر زور دیا گیا ہے۔ دراصل مشاہدہ و مطالعۂ قدرت کے لیے سب سے پہلی موثر آواز جو دنیا میں بلند کی گئی ہے وہ قرآن ہی کی آواز ہے۔

مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت کی قرآنی دعوت

قرآن نے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت پر کیوں زور دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کا نچوڑ یہ ہے کہ خدا کی محبت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے اور جب تک انسان خدا کی ستائش، عبادت اور اطاعت کے ذریعہ سے خدا کی محبت کا اظہار نہ کرے اس کی شخصیت نشوونما پاکر اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی اور اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں ان مسرتوں اور راحتوں کو نہیں پا سکتی جو اس کے کمال کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خدا کی محبت کے ذریعے سے انسانی شخصیت کی تکمیل ہی مقصدِ کائنات ہے لیکن خدا کی محبت جو انسان کی فطرت میں ہے خدا کی معرفت کے بغیر بیدار نہیں ہوتی اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان خدا کی صنعت یعنی کائنات کو دیکھے، اس پر غور و فکر کرے اور اس کے ذریعے سے اس کے صانع کے اوصاف، اور محاسن اور کمالات کو جانے اور پہچانے۔ کائنات کا خود بخود

وجود میں آنا انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا تو پھر جس ہستی نے کائنات پیدا کی ہے اس کے وجود اور صفات کی شہادت اس کائنات سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

افی اللہ شک فاطر السموات والارض۔

کیا خدا میں شک ہے جو کائنات کا خالق ہے۔

صنعت کے اندر صانع کی تمام صفات جلوہ گر ہوتی ہیں اور اس کی صنعت سے اس کے مقاصد اور عزائم اور اس کی قابلیتوں اور اہلیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ خدا کی شخصیت انسان کی آنکھوں سے مخفی ہے تاہم اس کی صفاتِ حُسن کی کارفرمائیاں انسان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہیں۔ جسمانی اور مادّی آنکھوں سے مخفی رہنا شخصیت کا خاصّہ ہے خواہ شخصیت انسان کی ہو یا خدا کی۔ لیکن جس طرح ہمارے لیے کسی ایسے انسان کی شخصیت کو بھی جو بعد میں ہمارے جاننے اور پہچاننے کی وجہ سے ہمارا بہترین دوست بن جانے والا ہو، جاننے اور پہچاننے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم اس کی اندرونی مخفی صفات کے مظاہر کا جو اُس کے اعمال و افعال کی صورت اختیار کرتے ہیں مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ اسی طرح سے خدا کی شخصیت کو جاننے اور پہچاننے کی بھی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم اس کی مخفی صفات کے مظاہر کا جو قدرت کے حالات اور واقعات اور اعمال و افعال کی صورت اختیار کرتے ہیں، مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔

خدا کے خالقِ کائنات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کائنات کے اندر اپنی صفات کے ذریعے سے موجود ہے اور کائنات اور خدا ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ کائنات سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں کہ خُدا کی صفات کی ایک مرئی شکل ہے۔ اگر خدا کی صفات کا ظہور جو کائنات میں ہے غائب ہو جائے تو پوری کائنات ہی فنا ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں مومنین سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہوئے خدا کا ذکر کریں وہاں ان سے اس بات کی بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق (خلقُ السموات والارض) پر غور و فکر کریں۔

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحٰنک فقنا عذاب النار۔

(ترجمہ) وہ اور وہ لوگ جو خدا کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں (یہاں تک کہ پکار اُٹھتے ہیں) اے ہمارے رب، یہ کائنات (جس میں

ہم بھی ہیں اور جس کا ذرہ ذرہ تیری صفاتِ حُسن کا آئینہ دار اور تیری خالقیت اور ربوبیت کا گواہ ہے، تو نے اپنے سچے مقصد کے بغیر پیدا نہیں کی۔ پس (ہمیں کائنات کے اندر اپنے مقصد کے ساتھ اعتقادی اور عملی مطابقت کی توفیق عطا فرما کر) آگ کے عذاب سے بچائیو"۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم مظاہر قدرت کو خدا کی ہستی اور صفات خالقیت و ربوبیت کی نشانیاں (آیت) کہتا ہے۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار لایت لاولی الباب۔

(ترجمہ) اس میں شک نہیں کہ کائنات کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل مندوں کے لیے (خدا کی ہستی اور صفات کی) نشانیاں ہیں۔

وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون۔

(ترجمہ) یقین کرنے والوں کے لیے روئے زمین پر خدا کی ہستی اور صفات کے بہت سے نشانات ہیں اور تمھارے نفوس میں بھی۔

وآیۃ لھم الارض المیتۃ احیینٰھا واخرجنا منہا حبا فمنہ یاکلون۔

(ترجمہ) ایک نشان ان کے لیے یہ ہے کہ ہم نے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس سے دانے اگائے جن کو وہ اپنی خوراک کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر، بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون۔

(ترجمہ) بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے تغیر میں اور کشتی میں، جو سمندر میں لوگوں کو نفع دینے والے تجارتی مال کو لے کر چلتی ہے اور اس بات میں کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور اس بات میں کہ اس نے زمین کے اوپر ہر قسم کے جان دار پھیلا دیے ہیں اور ہواؤں کی تبدیلیوں میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان ٹھہرا دیا جاتا ہے عقل مندوں کے

لیے نشانات ہیں۔

ومن آیاتہ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ ان فی ذالک لایٰت لقوم یتفکرون۔

(ترجمہ) اور اس کے نشانات میں سے ایک یہ ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا اور تم انسان بن کر زمین پر پھیل گئے اور اس کے نشانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تم میں سے ہی تمھارے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اپنی بیوی سے سکون قلب حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ بے شک اس بات میں غور کرنے والوں کے لیے نشانات ہیں۔

ومن آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذالک لایات للعلمین۔

ومن آیاتہ منامکم باللیل والنہار وابتغاءکم من فضلہ ان فی ذالک لایت لقوم یسمعون۔

(ترجمہ) اور اس کے نشانات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمھارے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف ہے۔ بے شک اس میں اہل عالم کے لیے نشانات ہیں اور اس کے نشانات ہی سے تمھارا دن اور رات کو سونا اور رزق کی صورت میں اس کے فضل کی جستجو کرنا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانات ہیں جو سنتے ہیں۔

وآیۃ لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلک المشحون۔

(ترجمہ) اور اس بات میں ان کے لیے خدا کی (ہستی اور صفات) کا ایک نشان ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا۔

حواس سے کام لے کر مظاہر قدرت کا مشاہدہ کرنا اور دل سے کام لے کر ان پر غور و فکر کرنا اور ان سے صحیح صحیح نتائج اخذ کرنا مسلمان پر فرض قرار دیا گیا کیوں کہ ایسا کرنا قرآن کے نزدیک صحیح عقائد اور صحیح اعمال کی بنیاد ہے۔ جو لوگ آنکھیں تو رکھتے ہیں، لیکن دیکھتے نہیں، کان تو رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں اور دل رکھتے ہیں لیکن سوچتے نہیں ان کو چوپایوں سے بدتر اور عذاب جہنم کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

ولقد ذرانا لجهنم کثیراً من الجن والانس لهم قلوب لا یفقهون بها ولهم اعین لا یبصرون بها ولهم اذان لا یسمعون بها اولٰئک کالانعام بل هم اضل۔

(ترجمہ) اور بے شک ہم بہت سے ایسے جنوں اور انسانوں کو جہنم کی طرف ہانک دیں گے جن کے دل ہیں لیکن ان سے سوچتے نہیں، آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

جو لوگ اپنے حواس سے کام نہیں لیتے اور اپنے دلوں سے نہیں سوچتے یا تعصب کی وجہ سے غلط سوچتے ہیں ان سے اپنی ان قوتوں کو ضائع کرنے کے لیے باز پرس کی جائے گی۔

ان السمع والبصر والفواد کل اولٰئک کان عنه مسئولا

(ترجمہ) بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے پوچھا جائے گا۔

قرآن حکیم نے آسمانوں اور زمین میں مظاہر قدرت کو دیکھنے کے بعد ان پر غور و فکر کے بغیر آگے گذر جانے سے منع کیا ہے کہ ایسا کرنے سے خدا کی معرفت کے مواقع ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور انسان کی محبت اور شخصیت کا ارتقا نہیں ہوتا۔

وکاین من آیة فی السمٰوات والارض یمرون علیها وهم عنها معرضون۔

(ترجمہ) آسمانوں میں اور زمین میں کتنے ہی نشانات (خدا کی ہستی اور صفاتِ محسن کے) ایسے ہیں کہ یہ ان سے گزرتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں (اور ان پر غور و فکر نہیں کرتے)

کسی مظہر قدرت یا آیت اللہ پر غور و فکر ترک کر دینا اس سے پہلے کہ اس کی حقیقت پوری طرح سے منکشف ہو یہ بھی اس سے اعراض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو یہ حکم ہے کہ جب موجوداتِ قدرت میں سے کوئی چیز اس کے نوٹس میں آئے تو اسے نظر انداز نہ کرے بلکہ اس کے مشاہدے اور مطالعے کا حق ادا کرے اس کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سے سمجھے اور خدا کی حکمتیں جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں ان سے پوری طرح واقف ہونے کی کوشش کرے۔ گویا جب تک کسی چیز کی حقیقت پوری طرح سے واضح نہ ہو جائے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تحقیق و تجسس کو جاری رکھے۔ حضورؐ نے امت کو ایک دعا سکھائی ہے جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا

وارزقنا اجتنابہ اللھم ارنا الاشیاء کما ھی۔

(ترجمہ) اے خدا ہم کو صداقت بطور صداقت کے دکھا اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق دے اور جھوٹ بطور جھوٹ کے دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ اے خدا ہمیں اشیاء کو اسی طرح سے دکھا جیسی وہ درحقیقت ہیں۔

حضورؐ کی یہ دعا گویا سائنسی طریقِ تحقیق کی حمایت کرتی ہے کیوں کہ سائنسی طریقِ تحقیق جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ مشاہدے کے نتائج کو کامل احتیاط سے اخذ کیا جائے اور انتہائی طور پر درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اشیاء ویسی ہی نظر آئیں جیسی کہ وہ درحقیقت ہیں۔

تفکّر فی الخلق کے قرآنی ارشاد پر عمل کا لازمی نتیجہ سائنسی علوم کی تخلیق اور تکمیل ہے۔

قرآن کی رو سے خدا کی خالقیت اور ربوبیت کے نشانات کائنات کی تینوں سطحوں پر موجود ہیں۔ مادّی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم، چاند، سورج اور ستاروں کی حرکت کا، برق و سحاب کا، ہواؤں کے چلنے کا، اختلاف لیل و نہار کا، مینھ برسنے کا، چاند کے گھٹنے بڑھنے کا، پہاڑوں کا، زمین کی ہموار سطح کا، پہلے آسمان اور زمین کے یکجا ہونے اور پھر الگ الگ ہونے کا اور اس طرح کے اور مظاہر قدرت کا ذکر کر کے ان کے مشاہدے اور مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ہم ان مظاہرِ قدرت کے مشاہدے اور مطالعے کا حق ادا کر کے ان کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سے سمجھ لیں اور ان کے تمام رموز و اسرار سے اور خدا کی ان تمام حکمتوں سے جو اُن کے اندر پوشیدہ ہیں پوری طرح آگاہ ہو جائیں تو نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام طبیعیاتی علوم Physical Sciences وجود میں آجائیں گے۔ اس کی وجہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے یہ ہے کہ تمام سائنسی حقائق ایک سلسلہ بانظام بناتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ علمی اور عقلی ربط و ضبط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دلالت اور راہ نمائی کرتے ہیں۔

اسی طرح سے حیاتیاتی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم زمین

سے روئیدگی کے نمودار ہونے کا لہلہاتی کھیتوں کا، غلّے کے پیدا ہونے کا، مختلف رنگوں اور ذائقوں کے پھلوں کا، پانی سے ہر جاندار کے زندہ ہونے کا، کیچڑ سے انسان کی تخلیق کے آغاز کا، زمین سے نسل انسانی کے اگنے کا، زمین میں ہر قسم کے جانداروں کے پھیل جانے کا، پرندوں کے اڑنے کا، سواری کے کام آنے والے اور دودھ دینے والے چوپایوں کا، نباتات اور حیوانات کے ازواج کا، اونٹ کی حیرت انگیز جسمانی ساخت کا، انسان کے قوتِ فہم و دید و شنید کا اور ماں کے رحم میں انسانی جنین کی حالتوں کے تدریجی تغیّر کا اور اسی طرح کے دوسرے مظاہر قدرت کا ذکر کرکے ان کے مشاہدے اور مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم ان مظاہر قدرت کا پورا مشاہدہ اور مطالعہ کریں یہاں تک کہ ان کے تمام اسرار و رموز سے آشنا ہو جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام حیاتیاتی علوم (Biological Sciences) مکمل طور پر وجود میں آجائیں گے۔

پھر اسی طرح سے نفسیاتی یا انسانی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم انسانی تاریخ کے بعض اہم واقعات اور قوانین کا اور انسانی فطرت کے بعض بنیادی قواعد اور حقائق کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح سے تاریخ عالم میں پے در پے ایسے انسانوں کا ظہور ہوتا رہا جنھوں نے کہا کہ وہ خدا کے رسول ہیں اور لوگوں کو یہ بتانے آئے ہیں کہ ان کا سچا معبود خدا ہے جو اس کائنات کا خالق ہے۔ کس طرح سے رسولوں کی دعوت کو بعض لوگوں نے قبول کر لیا اور بعضوں نے قبول نہ کیا۔ کس طرح سے قبول کرنے والوں کے دل اطمینان اور مسرّت سے بھر گئے یہاں تک کہ وہ خدا کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں اور ذلتیں اٹھانے بلکہ مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کس طرح سے انکار کرنے والوں کو تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو گئے۔ کس طرح سے خدا کی محبّت یا دینِ انسان کی فطرت میں ہے جو لازوال اور غیر مبدّل ہے۔ کس طرح سے خدا کی عبادت انسان کے دل کو مطمئن کرتی ہے۔ کس طرح سے نوعِ انسانی اپنی فطرت کے اصلی تقاضوں کو بھولنے اور مختلف قسم کے غلط اور جھوٹے معبودوں کو اپنانے کی وجہ سے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور کس طرح سے ان کے اتحاد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے سچے معبود کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ کس طرح سے انسان کے دل میں نیک و بد، درست و نادرست اور خوب و زشت کو پرکھنے کا ایک معیار موجود ہے جو خواہ انسان اس سے گریز کے بہانے بناتا رہے ہر وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ پھر انسانی لاشعور کے بعض ایسے وظائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کو ماہرین

نفسیات نے حال ہی میں سمجھا ہے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح سے انسانی فرد کے تمام چھوٹے اور بڑے اعمال اس کے وجود میں ایک نامۂ اعمال کی صورت میں محفوظ رہتے ہیں اور کس طرح سے یہ نامۂ اعمال موت کے بعد انسان کے سامنے کھل جائے گا اور وہ کہے گا کہ میرا کوئی چھوٹا یا بڑا فعل ایسا نہیں جو اس کے اندر لکھا نہ گیا ہو وعلیٰ ہذا القیاس۔ اگر ہم ان حقائق کا پورا پورا تجزیہ کریں اور ان کے معانی اور مطالب اور ان کے نتائج اور مضمرات اور اسباب اور عوامل پر پوری طرح سے حاوی ہو جائیں تو تمام انسانی اور نفسیاتی علوم (Human Sciences) اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ وجود میں آجاتے ہیں۔

گویا اگر ہم قرآن حکیم کے اس ارشاد پر کہ مظاہر قدرت پر پوری طرح سے غور وفکر کرو عمل کریں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام سائنسی علوم آیات اللہ کے ایک سلسلے کے طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔ مسلمانوں نے جو سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی اس کی اصل قرآن کی یہی تعلیم ہے۔

منکرین خدا کا مشاہدہ ومطالعۂ کائنات

شاید یہاں یہ سوال کیا جائے گا کہ اگر مظاہر قدرت آیات اللہ ہیں تو کافر یا دہریہ قسم کے سائنس دان جو مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں خدا پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک منکر خدا کا دل غیر اللہ کی محبت سے معمور ہوتا ہے، لہٰذا وہ مظاہر قدرت کو اس غلط محبت کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان کو اپنے غلط معبود کے ساتھ متعلق کرنے کی کوشش کرتا ہے چوں کہ اس کا تصور حقیقت غلط ہوتا ہے وہ مظاہر قدرت کو دیکھ کر ان سے صحیح نتائج اخذ نہیں کر سکتا ظاہر ہے کہ اگر مظاہر قدرت آیات اللہ یعنی خدا کی ہستی اور اس کی صفات، خالقیت و ربوبیت پر دلالت کرنے والے نشانات ہیں تو ان کو آیات اللہ کے طور پر یعنی خدا کی خالقیت اور ربوبیت کے عقیدہ کی روشنی میں ہی ٹھیک طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان کے مشاہدے اور مطالعے کو خدا کے عقیدہ سے الگ کر دیں تو ان کو ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکیں گے کیوں کہ اس صورت میں ہم ان کو کسی اور قائم مقام عقیدہ کی روشنی میں یعنی کسی جھوٹے خدا کے عقیدہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے مثلاً مادے کو ہی ایک قادر مطلق، خالق اور رب سمجھ لیں گے اور چوں کہ یہ عقیدہ غلط ہو گا وہ ہماری غلط راہ نمائی کرے گا اور ان کے مشاہدے اور مطالعے سے ہم جن نتائج تک پہنچیں گے وہ غلط یا نا تمام اور ناقص ہوں گے۔

آنکھوں کی بینائی اور دل کا اندھاپن

قرآن کی رو سے خدا کائنات کا نور ہے (اللہ نور السموات والارض)۔اس نور سے کائنات کا ایک ایک ذرہ روشن ہے۔اگر ہم اس نور کے بغیر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو ہمارا حال ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص رات کے وقت کسی کمرہ کے برقی قمقمے کو بجھا کر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چیزوں کو ٹٹولتا پھرے۔ ایک مومن کو مظاہر قدرت میں تخلیق اور ترتیب اور تحفظ اور تحسین اور تجمیل اور تنظیم اور رحمت اور عدل اور حکمت اور علم اور قدرت اور زندگی اور بصارت اور سماعت کے آثار آشکار نظر آتے ہیں۔اس لیے اس کا یہ یقین اور محکم ہوجاتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو رب اور رحیم اور قدیر اور حفیظ اور جمیل اور حکیم اور علیم اور قدیر اور سمیع اور بصیر اور حیّ وقیوم ہے۔ اور اسے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کو کوئی منکرِ خدا یہ کہے کہ کائنات میں تخلیق تو موجود ہے لیکن کوئی خالق نہیں، ربوبیت تو موجود ہے لیکن کوئی رب نہیں، تحفظ موجود ہے لیکن کوئی حفیظ نہیں، جمال موجود ہے لیکن کوئی جمیل نہیں اور رحمت اور عدل اور حکمت اور علم اور قدرت اور زندگی اور بصارت اور سماعت تو موجود ہیں لیکن کوئی رحیم یا عادل یا حکیم یا علیم یا قدیر یا سمیع و بصیر وحیّ وقیوم نہیں۔ لیکن یہ بات منکرِ خدا کے بس کی نہیں۔اس کو کائنات میں نہ خدا کی صفات نظر آسکتی ہیں اور نہ خدا، کیوں کہ اس کے دل کی فطری محبت جو سچے خدا کے لیے پیدا کی گئی تھی کسی اور جھوٹے خدا کے لیے مصروف کار ہے۔لہٰذا سچے خدا کے لیے مہیا نہیں ہوسکتی۔وہ حقائق کی غلط ترجمانی کرتا ہے، کیوں کہ اس کی آنکھیں تو دیکھتی ہیں لیکن دل نہیں دیکھتا۔ اسی حالت کے متعلق قرآن حکیم نے فرمایا ہے کہ جو لوگ مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد بھی غلط نتائج پر پہنچتے ہیں ان کی آنکھیں تو اپنا کام کرتی ہیں لیکن دل نہیں دیکھتے۔

فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

(ترجمہ) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں (وہ سب کچھ دیکھتی ہیں) لیکن دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہوجاتے ہیں (کہ غلط سوچتے اور مشاہدات سے غلط نتائج نکالتے ہیں)

اقبال نے اسی مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

قرآن حکیم کی اس آیت میں اور اقبال کے اس شعر میں بھی دل بینا سے مراد ایسا دل ہے جس میں خدا کی محبّت کا فطری جذبہ ابھی غیر اللہ کی محبّت کے لیے اس طرح سے صرف نہ ہُوا ہو کہ پھر خدا کی محبّت کے لیے مہیّا نہ ہو سکے یعنی جس میں غیر اللہ کی غیر فطری محبت سے بے اطمینانی ابھی باقی ہو جیسی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کی بے اطمینانی تھی کہ وہ کسی ستارے، چاند یا سورج کو زیادہ دیر تک اپنا رب نہ مان سکے۔

انسان کی فطرت اس طرح سے بنائی گئی ہے کہ جہاں بھی جس وقت بھی اور جس وقت تک بھی وہ سچے خدا کے عقیدے سے الگ رہے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس جگہ اس وقت اور اس وقت تک وہ سچے خدا کے عقیدے کی بجائے عملی طور پر کسی اور خدا یعنی جھوٹے خدا کے عقیدے کو اختیار کرے اور اسی کو کائنات کا خالق اور مالک اور رب سمجھے، خواہ زبانی طور پر اس بات کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔ نظریاتی غیر جانب داری یا بے یقینی انسان کے لیے ناممکن ہے انسان کا دل کبھی کسی معبود یا خدا کے بغیر نہیں رہ سکتا اور انسان کوئی عمل ایسا نہیں کر سکتا جو اس کے دل سے سر زد نہ ہو۔ جب سچے خدا کا عقیدہ انسان کے دل سے ہٹ جائے تو اسی وقت کسی جھوٹے خدا کا متبادل عقیدہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اگر انسان کا کوئی عمل (خواہ اس کی نوعیت روحانی ہو یا علمی یا اخلاقی یا جمالیاتی) سچے خدا کے عقیدے کے ماتحت سرزد نہ ہو تو وہ کسی جھوٹے خدا کے عقیدے کے ماتحت سرزد ہوتا ہے اور غلط ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کی تعلیمات کے مطابق بتوں سے عملی کفر کرنا خدا پر عملی ایمان لانے کی لازمی شرط ہے۔

ومن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقٰی۔

(ترجمہ) جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے وہ ایک ایسے مضبوط حلقہ کو گرفت میں لیتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

ہر قسم کے بتوں سے انکار خدا کے اقرار کی ایک ایسی شرط ہے جو انسان کی فطرت نے اس پر عائد کر رکھی ہے۔ اس سے گریز سائنس دان کے لیے سائنسی تحقیقات اور تعلیمات کے میدان میں بھی ممکن نہیں۔

قرآن کے فلسفہ سائنس کی بنیادیں

ان مفروضات سے ظاہر ہے کہ علم کائنات کے متعلق قرآن کے فلسفہ کی بنیاد یہ ہے کہ مصنوع کا علم بغیر صانع کے ، اور صانع کا علم بغیر مصنوع کے ممکن نہیں ، دونوں ایک دوسرے کے علم کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کیوں کہ مصنوع صانع کے داخلی محاسن اور کمالات کا ایک خارجی مظہر ہوتا ہے لہٰذا صانع کی صفات کا علم مصنوع کے علم کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ کائنات مصنوع اور مخلوق ہے اور خدا اس کا صانع اور خالق ہے۔ لہٰذا کائنات کا صحیح علم خدا کے علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم خدا کی معرفت چاہتے ہیں تو ہمیں کائنات پر جو خدا نے پیدا کی ہے غور و خوض کرنا پڑے گا یہاں تک کہ ہم اس کے اندر خدا کی صفات خالقیت و ربوبیت کا جلوہ دیکھ لیں۔ اور اگر ہم کائنات کو ٹھیک طرح سے سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا مشاہدہ اور مطالعہ اس عقیدے کی روشنی میں کرنا پڑے گا کہ خدا اس کا خالق اور رب ہے اور اس کی صفات اس میں جلوہ افروز ہیں۔

مظاہرِ قدرت، آیات اللہ کیوں ہیں

شاید یہاں یہ سوال کیا جائے گا کہ اگر مظاہر قدرت خدا کے عقیدے کی طرف راہ نمائی نہیں کرتے بلکہ خدا کا عقیدہ اور مظاہرِ قدرت دونوں بیک وقت ایک دوسرے کی صحیح حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں تو پھر وہ آیات اللہ کس طرح سے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض قرآن حکیم کے طریقِ تعلیم کو جو انسان کی فطرت کے حقائق پر مبنی ہے نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مظاہرِ قدرت آیات اللہ اس لیے نہیں ہیں کہ وہ خود بخود کسی منکرِ خدا کے لیے خدا کی صفتِ خالقیت اور ربوبیت کا منطقی یا استدلالی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ بلکہ وہ آیات اللہ اس لیے ہیں کہ ان کی سچی حقیقت جو علمی اور عقلی طور پر سچی ہو صرف خدا کی خالقیت اور ربوبیت کے عقیدے سے عقلی اور علمی مطابقت رکھتی ہے لیکن ان کی سچی حقیقت کو جاننے کے لیے بھی حقیقتِ کائنات کے صحیح تصور کی صورت میں ایک صحیح ذہنی پس منظر یا صحیح فلسفے کی ضرورت ہے کیوں کہ اگر یہ پس منظر غلط ہو گا تو وہ ایک حجاب بن جائے گا جو اُن کی سچی حقیقت کو نظروں سے اُوجھل کر دے گا۔

سائنس کے لیے کسی عقیدہ کا پس منظر ضروری ہے

حقیقت کائنات مادہ ہے یا خدا! ہم اس سوال کا جواب جو بھی دیں گے ہمارے پیدا کیے ہوئے سائنسی علوم اس نوعیت کے ہوں گے کہ وہ ہمارے اس جواب کے ساتھ مطابقت رکھیں گے۔ ہماری سائنس ہمارے حقیقتِ کائنات کے تصور سے الگ کوئی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔ سائنس ہمیشہ حقیقت کائنات کے کسی تصور کے عقیدے میں پرورش پاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ تصور صحیح ہو گا تو سائنس کی ترقی یا پرورش اپنے کمال کو پہنچے گی ورنہ رک جائے گی۔ یہی سبب ہے کہ اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ سائنس کسی فلسفیانہ پس منظر کے بغیر نہیں ہوتی۔ اس وقت روس میں جو سائنس کے میدان میں دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے سائنس کا فلسفیانہ پس منظر مارکسزم کا عقیدہ ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ممالک میں سائنس کا فلسفیانہ پس منظر یہ عقیدہ ہے کہ اگر خدا کا عقیدہ سائنس کی بنیاد بنایا جائے تو سائنس کی نشو ونما نہیں ہو سکتی اس کے برعکس قرآن کے نقطۂ نظر سے سائنس کا فلسفیانہ پس منظر یہ عقیدہ ہے کہ جب تک خدا کے عقیدے کو سائنس کی بنیاد نہ بنایا جائے سائنس کی نشو ونما اپنے کمال کو نہیں پہنچتی۔

قرآن کا طریقِ تعلیم

قرآن حکیم کا طریقِ تعلیم فطرت کے مطابق ہے اور وہ یہ نہیں کہ وہ اپنے مخاطب کو قائل کرنے کے لیے صغریٰ اور کبریٰ کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے منطقی دلائل دیتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کے وجدان کو بیدار کرتا ہے جس سے وہ براہِ راست ایک ایسی حقیقت کا احساس یا مشاہدہ کر لیتا ہے جس کی طلب اس کی فطرت میں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے۔

بل ھو آیٰت بینٰت فی صدور الذین اوتوا العلم۔

(ترجمہ) بلکہ قرآن ایسی واضح آیات پر مشتمل ہے جو دانایان راز کے سینوں میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔

جس خدا نے قرآن نازل کیا ہے اسی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس نے اپنی محبت انسان کی فطرت میں رکھی ہوئی ہے اور اس کی یہی فطری لاشعوری محبت

اسے خدا کی طرف راہ نمائی کرے گی۔ جب انسان کسی جھوٹے خدا کو مانتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا وجدان غلطی سے شہادت دیتا ہے کہ وہ سچا خدا ہے اور وہ اس غلط وجدانی شہادت کو فی الفور قبول کر لیتا ہے تاکہ اپنی فطرت کے ایک زوردار اور ناقابل التوا تقاضے کو پورا کرے۔ عقلی یا منطقی ثبوت کی بنا پر نہ انسان اپنے جھوٹے خدا کو مانتا ہے اور نہ سچے خدا کو۔ لہٰذا قرآن حکیم منکر خدا کے لیے خدا کی ہستی اور صفات کا استدلالی یا منطقی ثبوت نہیں دیتا، کیوں کہ سننے والے نے ایک جھوٹا خدا پہلے ہی سے استدلالی یا منطقی ثبوت کے بغیر مان لیا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم جب انسان کو دعوت دیتا ہے کہ مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ آیات اللہ کے طور پر کرو تو اس کا مقصود دراصل یہ ہوتا ہے کہ مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے یہ دیکھو کہ آیا یہ مظاہر تمہارے جھوٹے خدا کی صفات کے ساتھ علمی اور عقلی مناسبت رکھتے ہیں یا اس سچے خدا کی صفات کے ساتھ جس کی طرف قرآن تمہیں بلاتا ہے اور جس کی محبت اور طلب تمہاری فطرت میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر انسان مظاہرِ قدرت کا مطالعہ آیات اللہ کے طور پر کرے گا تو یہ عمل اس کی جستجو کی منزل کا سراغ اور اس کے فطرتی جذبۂ محبت کی تشفی کا سامان بن جائے گا۔ قرآن جب یہ کہتا ہے کہ انسان کا سچا مقصود، معبود یا مطلوب خدا ہے تو وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ وہی حقیقت بیان کرتا ہے جو انسان کی فطرت میں غفلتوں کے بوجھ سے دبی ہوئی اور تعصبات کے پردوں میں چھپی ہوئی موجود ہے اور جو خود ابھرنا اور بے نقاب ہونا چاہتی ہے۔ قرآن کائنات کے مشاہدے اور مطالعے کی دعوت دے کر اس مخفی اور سوئی ہوئی حقیقت کو آشکار اور بیدار کرتا ہے۔

ایک مثال سے قرآن کے فلسفۂ سائنس کی وضاحت

قرآن کا یہ نقطۂ نظر کہ کائنات جو مصنوع اور مخلوق ہے اور خدا جو اس کا صانع اور خالق ہے ایک دوسرے کی روشنی میں پوری طرح سمجھے جا سکتے ہیں کس قدر معقول ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے ہو سکے گا۔

فرض کیجیے کہ کسی اور دنیا کا رہنے والا ایک سائنس دان دن کے وقت زمین پر کسی ایسی جگہ جہاں سورج نصف النہار پر ہے یکایک خلا سے نازل ہو جاتا ہے اور سب سے پہلے اسے دھوپ میں پڑا ہوا ایک برقی لیمپ دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے جس کا نچلا حصہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ درمیانی حصہ کی ساخت شیشم کی خوب صورت کام دار لکڑی سے

ہے اور اوپر ایک رنگین خوب صورت فانوس کے اندر شیشے کا قمقمہ لگا ہوا ہے۔ وہ اتفاقاً لیمپ کا بٹن دباتا ہے اور لیمپ روشن ہو جاتا ہے۔ سائنس دان برقی رو اور اس کے استعمال سے آشنا نہیں اور جس دنیا سے آیا ہے وہاں کے حالات یہ ہیں کہ نہ تو وہاں کبھی اندھیرا ہوا ہے کہ کسی لیمپ کی ضرورت ہوئی نہ وہاں کوئی دھات موجود ہے نہ لکڑی ہے اور نہ شیشہ اور نہ ربڑ اور نہ کوئی اور چیز جو ایک خوب صورت ٹیبل لیمپ کی ساخت میں کام آتی ہے۔ اب سائنس دان لیمپ کو سمجھنا چاہتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے کیسے وجود میں آئی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ لہٰذا وہ خوب غور و فکر کر کے اس کے متعلق اپنے مشاہدات کے نتائج قلم بند کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک پتھر یا چٹان کی طرح یہ لیمپ بھی ایک قدرتی چیز ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ یہ اس کی مانند کسی سائنس دان نے کسی خاص مقصد کے لیے بنائی ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس دان کی سابقہ معلومات اس قدر ناکافی ہیں کہ وہ اپنی ذہانت کے باوجود فقط اپنے مشاہدات کی بنا پر لیمپ کے روشن ہونے اور بجھنے کے اسباب اور ذرائع کے متعلق اس کی ساخت کے عمل اور طریق کے متعلق اس کے قدرتی مقاصد اور فوائد کے متعلق اگرچہ اپنی طرف سے نہایت ہی معقول اور مدلل نظریات قائم کرے گا لیکن وہ کرۂ ارض کے رہنے والے ایک تعلیم یافتہ انسان کے نزدیک نہایت ہی مضحکہ خیز ہوں گے۔

فرض کیجیے کہ لیمپ کو شروع سے لے کر آخر تک اپنے استعمال کے لیے ایک ہی شخص نے بنایا ہے اور ان خام اشیاء کی بہم رسانی سے لے کر جو اس کی ساخت میں کام آئی ہیں اس کی آخری حالت تک تخلیق کے تمام مرحلوں سے اسی نے گزار کر اسے مکمل کیا ہے۔ پھر فرض کیجیے کہ ایک فرشتۂ رحمت اس کی پریشانی کو دیکھ کر اس کے پاس آتا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ دے دیتا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ چیز خود بخود بنی ہوئی نہیں بلکہ ایک خاص شخص نے ایک خاص غرض کے لیے بنائی ہے۔ نیز اگرچہ اس کاغذ میں لیمپ کے متعلق براہ راست کچھ لکھا ہوا نہیں، کیوں کہ لیمپ تو اس خلائی سائنس دان کے سامنے پڑا ہے لیکن لیمپ ساز کی قابلیتوں اور خوبیوں کی ایک مفصل اور مکمل فہرست اس کے اندر موجود ہے اور یہ لکھا ہے کہ اگر تم چاہو تو اس لیمپ کے اندر لیمپ ساز کی ان قابلیتوں اور خوبیوں کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔ اس کاغذ کے مطالعہ سے خلائی سائنس دان کے ذہن میں لیمپ ساز کی شخصیت کا اور اس کی صفات اور کمالات کا پورا تصور قائم ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ لیمپ بنانے والا علوم ریاضیات،

طبیعیات، کیمیا، زراعت اور فنون صنعت سے پوری طرح بہرہ ور ہے اور حسن و زیبائی کا ایک ذوق بھی رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ربڑ کے درخت لگا سکتا ہے جن میں سے ایک خاص قسم کا دودھ نکلتا ہے اور وہ اس دودھ سے ربڑ تیار کر سکتا ہے یا مصنوعی ترکیبی (Synthetic) ربڑ بنا سکتا ہے۔ زمین کو کھود کر خام تانبا نکال سکتا ہے۔ اسے صاف کر کے خالص تانبے کا تار بنا سکتا ہے اور اس تار کے گرد ربڑ چڑھا سکتا ہے۔ خام لوہے کو زمین سے نکال کر صاف کر سکتا ہے اور اسے پگھلا کر حسب ضرورت خوب صورت سانچوں میں ڈھال سکتا ہے۔ شیشم کے درخت لگا سکتا ہے۔ ان درختوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے اور ان ٹکڑوں سے ضرورت کی خوب صورت چیزیں بنا سکتا ہے اور ان پر نقش و نگار کھود سکتا ہے۔ مٹی اور ریت سے شیشے کے اجزاء فراہم کر سکتا ہے ان اجزاء کو پگھلا کر شیشے کے برقی قمقموں کی صورت میں ڈھال سکتا ہے۔ ڈائنمو ایسی ایک پیچ دار مشین بنا کر پانی کے بہاؤ کی قوت سے بجلی کی رو تیار کر سکتا ہے اور وہ اس رو کی خاصیات سے پوری طرح واقف ہے۔ اسے ربڑ میں لپٹے ہوئے تانبے کے تاروں میں کہیں سے کہیں لے جا سکتا ہے۔ اور اسے اپنے ضبط میں رکھ سکتا ہے اور اس سے حسب ضرورت مختلف کام لے سکتا ہے جس میں سے ایک برقی قمقمے کو روشن کرنے کا کام بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ لیمپ ساز کی ان خوبیوں اور قابلیتوں کے علم سے اس خلائی سائنس دان کے لیے برقی ٹیبل لیمپ کا عقدہ کھل جائے گا اور وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کے لیے نہایت ہی آسان ہو گیا ہے کہ لیمپ کے روشن ہونے اور بجھنے کے ذرائع اور اسباب کے متعلق اس کی ساخت کے عمل اور طریق کے متعلق اس کے مقاصد اور فوائد کے متعلق معقول اور صحیح نظریات قائم کر سکے پھر وہ یہ بھی محسوس کرے گا کہ لیمپ ساز کی صفات اور کمالات کے متعلق جو نظری واقفیت اسے بہم پہنچائی گئی ہے وہ لیمپ کے علم کی روشنی میں بہت واضح ہو گئی ہے۔ اور ایک ٹھوس اور مرئی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اور اس کے علم کے دونوں شعبے لیمپ کا علم اور لیمپ ساز کا علم ایک دوسرے پر روشنی ڈال رہے ہیں اور ایک دوسرے کو مکمل کر رہے ہیں۔ وہ محسوس کرے گا کہ لیمپ ساز کو جاننے سے خود لیمپ کے متعلق اس کی سابقہ معلومات میں ایک ایسا اضافہ ہوا ہے جو وافر اور گران قدر ہے اور جو اسے فقط لیمپ کو دیکھنے سے کبھی حاصل نہ ہو سکتا۔ پھر اسے صاف طور پر نظر آ جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ لیمپ لیمپ ساز کی صفات اور کمالات ہی کا ایک مظہر ہے اور ان کمالات اور صفات کا علم لیمپ ہی کے علم کا ایک حصہ ہے اور اس سے الگ نہیں۔

لیکن فرض کیا کہ خلائی سائنسداں اس فرشتۂ رحمت کے اصرار کے باوجود کاغذ کو پڑھنے کے بغیر یہ کہہ کر پھینک دیتا ہے کہ یہ اپنے مشاہدات میں کسی بیرونی مداخلت کو گوارا نہیں کرتا۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ برسوں کی ٹھوکروں کے بعد بھی لیمپ کو پوری طرح سے نہ سمجھ سکے گا اور لیمپ کی حقیقت کے متعلق اس کے مشاہدات کے نتائج ہمیشہ مضحکہ خیز رہیں گے۔

عصرِ جدید کے مغربی سائنسداں کی غلطی

یہی حال دَورِ حاضر کے مغربی سائنسدان کا ہے کہ وہ کائنات کو اس کے خالق کی صفات کے علم کے بغیر فقط اپنے مشاہدات کے بل بوتے پر سمجھنا چاہتا ہے اور اپنی تحقیقات کے دوران میں اس بات سے قطع نظر کرتا ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے اور اس کی صفات خالقیت و ربوبیت اس کی اور اس کے اندر کی ہر چیز کی ماہیت کو معین کرتی ہے۔ وہ نہیں سمجھتا خدا کی صفات کو کائنات سے الگ کرنے کے بعد اس کا سچا سائنسی مشاہدہ اور مطالعہ ممکن ہی نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ کپڑے کا جو تعلق کپڑے کے تار و پود سے ہے وہی کائنات کا تعلق خدا کی صفات سے ہے۔ آج بدقسمتی سے اس کا مسلمان نقّال بھی ایسا ہی کر رہا ہے۔ اس کو بھی اپنے مغربی استاد کی راہ نمائی میں مظاہر قدرت، (جو سائنس داں کے مشاہدے اور مطالعے کا موضوع ہیں) کے اندر خدا کا نشان نہیں ملتا حالاں کہ اسے بتایا گیا تھا کہ مظاہرِ قدرت کے اندر خدا کی صفات خالقیت اور ربوبیت اور کارسازی اور حکمت اور قدرت سموئی ہوئی ہیں۔ اور اگر مظاہرِ قدرت کی کوئی حیثیت ہے تو وہ یہی ہے کہ وہ آیات اللہ ہیں۔ ان کی ابتدا اور انتہا خدا ہے اور ان کا ظاہر اور باطن خدا ہے۔

هو الاول والآخر والظاهر والباطن۔

خدا ہی اس کائنات کی ابتدا اور انتہا اور ظاہر اور باطن ہے۔

قدیم سائنسدانوں کا زاویۂ نگاہ

لیکن ان مسلمان سائنسدانوں کا زاویۂ نگاہ، جنھوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی اور جو آج کے مسلمان سائنسدان کے مغربی استادوں کے بھی استاد تھے، آج کے مسلمان سائنس دان سے مختلف تھا وہ خدا کو جو کائنات کا

صانع اور خالق ہے اور کائنات کو جو اس کی مصنوع اور مخلوق ہے ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے تھے ان کے مشاہدہ ومطالعۂ قدرت میں اور سائنسی علوم کی تحقیق اور تدوین میں خدا کی خالقیت اور ربوبیت کا عقیدہ بطور مدار ومحور کے تھا۔ وہ دل سے مسلمان تھے۔ لہٰذا ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح سے خدا روح ورواں کائنات ہے اسی طرح سے وہ علمِ کائنات یا سائنس کی روح ورواں بھی ہے۔ وہ کائنات کا مطالعہ اس لیے کرتے تھے کہ کائنات میں خدا کے تخلیقی اعمال کو سمجھ کر خدا کی صفات کو بہتر طریق سے جانیں اور پہچانیں اور ان کے نزدیک خدا کا عقیدہ ایک روشنی تھا جس کے بغیر یہ مطالعہ ناممکن بھی تھا اور بے معنی اور بے سود بھی۔ انھوں نے دورِ حاضر کے بعض مسلمان سائنس دانوں کی طرح خدا کے عقیدے کو اپنے سائنسی تجزیہ اور تحقیق کے لیے زیرِ غور رکھا ہوا نہیں تھا کہ جب سائنس اسے قبول کرلے گی تو وہ بھی اسے قبول کرلیں گے۔ بلکہ ان کے نزدیک سائنسی تحقیق کے لیے اس عقیدے سے ہٹ کر نہ کوئی راستہ تھا اور نہ منزل۔ ان کے نزدیک خدا کی وحی کا عطا کیا ہوا علم ان کے حواس کے علم سے کہیں زیادہ بلند اور زیادہ یقینی تھا۔ لہٰذا ان کے دل میں اس بات کا خیال تک بھی نہ آسکتا تھا کہ علمِ حواس کسی درجے میں بھی علمِ وحی کا محک ومعیار قرار پاسکتا ہے یا علمِ وحی کی تشریح اور تفسیر کے علاوہ کسی اور حیثیت سے اپنا کوئی مقام یا وزن رکھ سکتا ہے۔

سارٹن کا عذر

یہی وجہ ہے کہ Introduction to the History of Science "تاریخ سائنس کا تعارف" کا مغربی مصنف سارٹن (SARTON) اس بات پر مجبور ہوا ہے کہ ہر دور کے مسلمان سائنس دانوں کے سائنسی کارناموں کا ذکر کرتے وقت ان کے مذہبی معتقدات کا ذکر بھی کرے۔ تاریخِ سائنس کے مصنف کی حیثیت سے اس کا یہ اقدام علمی لادینیت اور افتراقِ مذہب اور سائنس کے اس دور میں یقیناً مشکل سے ہی سمجھ میں آسکتا تھا لہٰذا وہ اپنے قارئین کو مطمئن کرنے کے لیے اس کا عذر پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "وہ مسلمان بھی جو قرآن کو مخلوق سمجھتے تھے اس بات پر متفق تھے کہ وہ خود خدا کا کلام ہے لہٰذا ان کا خیال تھا کہ وہ علم جو ہم محض اپنے غلط بین حواس یا اپنی محدود ذہنی قوتوں کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں لازماً ناقابلِ اعتماد اور کمزور ہے اور قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ قطعی طور

پر صحیح اور یقینی ہے۔ میں پھر پوچھتا ہوں کہ ہم مسلمانوں کی سائنس کو اس وقت تک صحیح طور پر کیسے سمجھ سکتے ہیں جب تک ہم اس بات کو پوری طرح سے نہ سمجھ لیں کہ وہ قرآن کے محور کے گرد گھومتی ہے۔۔۔۔''

''قرون وسطیٰ میں (جب سائنس کے میدان میں صرف مسلمان ہی پیش پیش تھے۔) یہ نقطۂ نظر عام تھا کہ مذہب کی عقلی توجیہہ نہ صرف سائنس کا مدار و محور ہے بلکہ مذہب کی قوت بھی ہے لہٰذا مذہب اور سائنس ناقابل تفریق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم ایک کو دوسرے کے بغیر سمجھ نہیں سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری یہ تحقیق منصفانہ نہیں ہوگی جب تک کہ ہم اس کی بنیاد ''علم مثبت'' کی اپنی تعریف پر رکھنے کی بجائے خود ان لوگوں کی تعریف پر نہ رکھیں جن کی سائنس کی تاریخ ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ اب جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ان لوگوں کی نگاہ میں مذہب کی عقلی توجیہہ نہ صرف علم مثبت تھا بلکہ علم مثبت سے بھی بالاتر کوئی علم تھا ان لوگوں کے فکر کا مرکز (یعنی خدا کا عقیدہ) ہمارے مرکز فکر سے یکسر مختلف تھا۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمان ہی سائنسی طریق تحقیق کے موجد تھے اور سائنسی علوم کی بنیاد بھی انھوں نے ہی رکھی تھی تو پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ انھوں نے سائنس کے میدان میں نہ صرف اپنی قائدانہ حیثیت کو کھو دیا بلکہ عیسائی دنیا کے ہم دوش بھی نہ رہے اور آخر کار سائنس ہی میں ان کے نقال اور مقلد بن گئے اور پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ عیسائی دنیا نے خدا کے عقیدے کو جو مسلمانوں کی قیادت سائنس کے زمانے میں سائنسی علوم کا مدار و محور تھا نہ صرف سائنسی علوم سے الگ کر دیا بلکہ اسے سائنس کے منافی خیال کرنے لگے اور آج مسلمان بھی ان کی نقل اور تقلید میں ایسا ہی کر رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ کسی قوم کی علمی ترقیوں کا باعث اس کی پُرامن اور آزادانہ جستجوئے صداقت ہے۔ ہر قوم علم کے میدان میں صرف اسی وقت تک ترقی کر سکتی ہے جب تک وہ صداقت کی جستجو کے لیے یعنی اس صداقت کی جستجو کے لیے جسے وہ خود صداقت سمجھتی ہے آزاد ہو اور اس کی یہ آزادی امن و امان سے ہمکنار ہو۔ جوں ہی اس کی یہ آزادی ختم ہو جاتی ہے یا خطرے میں پڑ جاتی ہے اس کی جستجوئے صداقت اور تحقیقِ علمی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں کیوں کہ ایسی حالت میں یا تو وہ کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے

جس سے اس کی زندگی اس صداقت کی جستجو کے لیے وقف ہو جاتی ہے جسے یہ دوسری قوم صداقت سمجھتی ہے اور یا پھر وہ اپنی آزادی کھو دینے کی فکر میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کی حفاظت کی تگ و دو میں لگ جاتی ہے۔ غرناطہ اور بغداد کی تباہی نے مسلمانوں کی صدیوں کی علمی تحقیق و تجسس کی روایات کو ختم کر دیا تھا اور اس کے بعد ان کو پھر پُرامن آزادی کا ایسا طویل دور نصیب نہ ہو سکا جس سے وہ اس قابل ہو جاتے کہ ان روایات کو از سرِ نو اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ زندہ کر سکیں۔

مغرب میں خدا اور سائنس کے افتراق کا بنیادی سبب عیسائیت کی تعلیم ہے

یورپ میں سائنس اور عقیدۂ خدا کے الگ الگ ہو جانے کی بڑی اور بنیادی وجہ عیسائیت کی تعلیم ہے۔ جب سائنس مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر عیسائیوں کے ہاتھوں میں آئی تو کچھ عرصے کے لیے خدا کا عقیدہ بدستور سائنس کا مرکز بنا رہا لیکن چونکہ دین اور دنیا کا اتحاد سائنس کے دائرے میں بلکہ انسانی زندگی کے کسی دائرے میں بھی عیسائیت کی سرشت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اس لیے ایسا وقت آنا ضروری تھا جب عیسائی دنیا سائنس کو خدا کے عقیدے سے اور خدا کے عقیدے کو سائنس سے الگ کر دیتی۔ عیسائیت میں دین اور دنیا ایک دوسرے سے الگ الگ بلکہ ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ جس طرح سے دینی سعادتیں ترکِ دنیا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں اسی طرح دنیوی کامیابیاں بھی مذہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حضرت مسیحؑ نے یہ فرما کر کہ "جو کچھ قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو کچھ خدا کا ہے وہ خدا کو دے دو"، نظری طور پر دین کو دنیا سے الگ کر دیا تھا اور حضرت مسیحؑ کی ساری عملی زندگی بھی دین اور دنیا کے اس افتراق کی آئینہ دار تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ جو خدا کے سچے رسول تھے ایک خاص مقصد کے لیے آئے تھے اور وہ یہ تھا کہ دینِ موسوی کے خاص خاص پہلوؤں پر زور دیں اور بنی اسرائیل کو ریاکاری سے جو اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی نجات دلا کر اخلاص اور للّٰہیت پر قائم کریں۔ اپنی پوری عملی زندگی میں دین اور دنیا کو جمع کرنا ان کا کام نہیں تھا کیونکہ یہ عظمت اپنے وقت پر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آنے والی تھی۔ ریورینڈ مارٹن ڈی۔ آرکی (REV. MARTIN D'ARCY) اپنی کتاب (Communism and Christianity) میں سچ کہتا ہے:-

"لیکن ہم اس بات کو جتنی دفعہ بار بار کہیں کم ہے کہ عیسائیت اس لیے وجود میں نہیں آئی تھی کہ کسی قوم یا کسی اعلا قوم کو دنیوی فارغ البالی کا راستہ بتائے۔ یہی بنی اسرائیل کی غلطی تھی اور جب لوگوں نے چاہا کہ حضرت مسیحؑ کو بادشاہ بنا دیں تو وہ ان سے بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گئے"۔

عیسائیت میں دین اور دنیا کی علاحدگی ایک اساسی عقیدہ ہے

عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اگلی دنیا کی راحتیں اس دنیا کی راحتوں کو ترک کیے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ مذہب اور سائنس کا آپس میں کوئی تعلق نہیں کیوں کہ مذہب انسان کی دنیوی زندگی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا اس کا مقصد انسان کی آخروی زندگی کو بہتر بنانا ہے۔ اس کے برعکس علم کائنات اور سائنس اس دنیا کو بہتر بنانے کے لیے کام آتے ہیں۔ مذہب غیر عقلی اعتقادات کا ایک مجموعہ ہے اور ایک ایسی دنیا کے متعلق رائے زنی کرتا ہے جو ماورائے حواس ہے لیکن سائنس کے نتائج عقل اور مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہیں۔ لہذا اگر ہم خدا کے عقیدے کو اپنی علمی بحثوں میں جگہ دیں گے تو ہماری علمی بحثیں عقلیت کے معیار سے گر جائیں گی اور مذہب کے دائرے میں جو تعصب اور نامعقولیت اور عقل اور علم کی محکومی پر زور دیتا ہے داخل ہو جائیں گی۔ دیکھ لیجیے کہ یہ نقطۂ نظر اسلام کے نقطۂ نظر سے جو کائنات پر غور و فکر کرنے اور اپنے قوائے دید و شنید اور فہم و فراست کو کام میں لانے پر زور دیتا ہے کس قدر مختلف ہے۔ ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ عیسائیت کے برعکس اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مظاہر قدرت خدا کی ہستی اور صفات کی نشانیاں ہیں۔ خوب غور سے ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کرو۔ جو لوگ آنکھوں سے دیکھتے نہیں، کانوں سے سنتے نہیں اور دل سے سوچتے نہیں، ان سے باز پرس کی جائے گی اور ان کی سزا دوزخ ہے۔

کلیسا کی سائنس دشمنی اور عیسائیت کی مذہبی عدالتوں کے مظالم

عیسائیت میں اعتقاد، مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت سے بے تعلق ہے بلکہ اس کا مخالف ہے اور اسلام میں اعتقاد، مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت کے بغیر ممکن نہیں۔ عیسائیت کی اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ کلیسا نے سائنسی فکر کو جب بھی وہ ابھرنے لگا بزور تمام دبا دینے کی کوشش کی۔ عیسائیوں کی مذہبی عدالتوں نے سائنس دانوں پر ایسے ظلم ڈھائے کہ یہ بات مسلّم ہو گئی کہ سائنس

اور مذہب ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے اور سائنس کو اگر ترقی کرنا ہے تو اسے بہرحالت میں مذہب سے الگ رہنا چاہیے۔ سائنس دانوں کے دلوں میں یہ خوف راسخ ہو گیا کہ اگر انھوں نے خدا کو سائنس سے اور سائنس کو خدا سے جوڑنے کی کوشش کی تو وہ پھر مذہبی اداروں اور عدالتوں کے محاسبے کی زد میں آجائیں گے اور وہ اور ان کی سائنس دونوں ختم ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی یورپ میں پے درپے ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے خدا اور سائنس کے افتراق کو جسے عیسائیت نے جنم دیا تھا اور محکم کر دیا۔ کلیسا اور ریاست کے جھگڑوں نے اتنا طول کھینچا اور اتنی شدت اختیار کی کہ بالآخر دونوں کو ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑا اور عیسائیت کی تعلیم کے عین مطابق یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی علاقہ نہیں لیکن جب مذہب ایک دفعہ سیاست سے الگ کر دیا جائے تو پھر یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ فرد یا جماعت کی زندگی کے کسی اہم شعبہ پر بھی اپنی گرفت قائم رکھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف فرد اور جماعت اور سیاسی زندگی مذہب سے الگ ہو گئی بلکہ ان کی قانونی، سماجی، اقتصادی، فوجی اور تعلیمی اور علمی زندگی کو بھی مذہب سے کوئی تعلق نہ رہا۔ کیسے ممکن تھا کہ مذہب جو ریاست کے کاروبار سے الگ کر دیا گیا تھا پھر اس کاروبار میں اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کے چور دروازوں سے داخل کر لیا جاتا۔ سائنس اور علم سے خدا کے عقیدے کا اخراج جو اس طرح سے عمل میں آیا اگرچہ عیسائیت کے مزاج کا ایک تقاضا تھا جو بالآخر ایک سیاسی حادثے کے نتیجے کے طور پر رونما ہوا تھا۔ تاہم کچھ عرصے بعد یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ خود سائنس اور علم ہی کا ایک تقاضا ہے۔

انیسویں صدی کی طبیعیات کی غلط فہمی

اس غلط فہمی کے ظہور کے لیے عیسائیت کی تعلیم اور کلیسا اور ریاست کی علاحدگی نے حالات پہلے ہی سازگار کر رکھے تھے لیکن جن خاص اسباب نے اسے جنم دیا ان میں سے ایک مؤثر سبب انیسویں صدی کے ماہرین طبیعیات کا مادی نظریہ تھا جس کے مطابق یہ سمجھا جاتا تھا کہ مادہ کائنات کی آخری حقیقت ہے اور کائنات ایک مادی مشین ہے جو اپنے قوانین سے خود بخود عمل کرتی ہے اور جس کے عمل میں خدا کا کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا اس صدی میں یہ خیال اور راسخ ہو گیا کہ درحقیقت سائنس کا خدا یا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

ڈاروِنزم کا زہر اور اس کی عالمگیر خریداری

لیکن جس شخص نے خدا اور مذہب کے خلاف عیسائیت کی علمی دنیا کے تعصب کو آخرکار

ایک علمی اور عقلی نظریے کا مقام اور ایک سائنسی حقیقت کا درجہ دیا وہ ایک ماہر حیاتیات چارلس ڈارون تھا جس نے سبب ارتقا کا ایک نظریہ پیش کیا ہے۔ ڈارون نے انیسویں صدی کی علمی اور عقلی فضا میں پرورش پائی تھی اور وہ بحیثیت ایک سائنس دان کے اس دور کی جامد اور منتج میکانیت اور مادیت کی پیداوار تھا جس میں عیسائیت کے خلاف سائنس دانوں کا ردِ عمل اپنی پوری شدت پر تھا۔ لہٰذا اس نے نوعِ انسانی کے ظہور کا سبب یہ بتایا کہ کائنات میں ایسی قوتیں کام کر رہی ہیں جن کا کوئی مقصد یا مدعا نہیں اور جس کو اپنے عمل کے نتائج اور عواقب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان قوتوں کو اس نے کشمکش حیات، قدرتی انتخاب، اور بقائے اصلح کے دل فریب نام دیئے۔ اس کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ یہ محض اتفاق ہے کہ انسان عقل و خرد، ہوش و تمیز اور ضمیر اور تخیل ایسی خصوصیات کا مالک بن گیا ہے اور ان کی وجہ سے مذہب اور اخلاق اور سیاست اور تعلیم اور قانون اور جستجوئے علم و فن ایسے مشاغل میں مصروف ہو سکتا ہے۔ آج جو انسان ہے بالکل ممکن تھا کہ وہ انسان نہ ہوتا بلکہ گندی نالیوں میں رینگنے والا ایک کریہہ المنظر جاندار ہوتا۔ اگرچہ یہ نظریہ بالخصوص حیاتیاتی ارتقا کے اسباب سے تعلق رکھتا تھا تاہم اس کے نتائج تمام مادی، حیاتیاتی اور انسانی علوم پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ ڈارون نے کہا تھا کہ میرا نظریہ بالقوہ ایک پورا فلسفہ کائنات ہے اور اس کا یہ کہنا صحیح تھا۔ ڈارون کا نظریہ ہر چیز کی تشریح اس طرح سے کر سکتا ہے کہ اگر کوئی روحانی یا آسمانی قوتیں اس کائنات میں کارفرما ہیں تو پھر بھی کائنات کے حقائق کی تشریح کے لیے ان کے ذکر کی کہیں ضرورت پیش نہیں آتی۔ لہٰذا یہ نظریہ انیسویں صدی کی ذہنی اور علمی فضا کے ساتھ جو مادیت پسندی اور مذہب دشمنی سے معمور تھی خوب ہی مطابقت رکھتا تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اسے ڈارون کے عہد کی علمی دنیا نے بالعموم قبول کر لیا اور پھر اس کے بعد سے لے کر آج تک بھی تمام سائنسی علوم کی ترقیوں کی نوعیت پر گہرے اثرات پیدا کرتا چلا آ رہا ہے۔ یہ اسی نظریہ کی نحوست کا اثر ہے کہ آج یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ہر مظہر قدرت جو طبیعیاتی یا حیاتیاتی یا انسانی دنیا سے تعلق رکھتا ہے عمل ارتقا کا ایک اتفاقی نتیجہ ہے۔ اور ہم اس کے ماضی کے قریبی حالات اور واقعات سے اس کی مکمل اور معقول تشریح کر سکتے ہیں۔

کور چشمی کی ایک بیّن مثال

ڈارون ایک پکا عیسائی تھا۔ اس کے باوجود اسے عمل ارتقا کے اندر جو خالق کائنات کی رب العلمینی کا ایک شاندار اور یقین افروز مظہر ہے خدا کیوں نظر نہیں آیا اور کیوں اس کی بجائے بے شعور اور بے مقصد مادی اور میکانکی قوتیں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ اس کا دل خدا کے عقیدہ کے خلاف ایک علمی قسم کے تعصّب سے معمور تھا اور یہ تعصّب اس ادرہائی نظریۂ علم کی پیداوار تھا جو یورپ کے مخصوص حالات اور واقعات اور خود تعلیم عیسائیت کے زیرِ اثر فروغ پاکر انیسویں صدی میں عام ہو چکا تھا کہ خدا کے عقیدے کو سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاروِن کے زمانہ میں عیسائی دنیا کے سائنس دان اس پر ٹوٹ پڑے اور انھوں نے اسے ایک نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے اور کتنی بڑی کور چشمی ہے جسے سائنس کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کائنات میں عمل ارتقا سے انسان جیسی ایک محیّر العقول ہستی کا ظہور محض اتفاق ہے اور کسی خالق کائنات رب کی ربوبیت کی کارفرمائی نہیں۔ سچ ہے کہ جب دل اندھے ہوں تو محض آنکھوں کے دیکھنے سے کائنات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

(ترجمہ) بے شک آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہو جاتے ہیں۔

خدا کے عقیدے کے خلاف عیسائی مغرب کے سائنس دانوں کا علمی تعصّب لاعلاج ہے

وہ علمی اسباب جنھوں نے یورپ میں سائنسی لادینیت کے نامعقول عقیدے کو ایک علمی تصوّر کا مقام دیا تھا، قریباً ختم ہو چکے ہیں، مثلاً اب بعض چوٹی کے ماہرین طبیعیات نے انیسویں صدی کی طبیعیات کو رد کر کے یہ بتایا ہے کہ حقیقتِ کائنات مادّہ نہیں، بلکہ شعور ہے اور ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کو برگساں (BERGSON) اور ڈریش (DRIESCH) ایسے نامور ماہرین حیاتیات نے محلِ نظر ٹھہرا کر اس کے بالمقابل نہایت ہی معقول اور مدلل نظریات پیش کیے ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ ارتقا کا باعث کوئی باشعور قوّت ہے جو اپنے مقاصد کے لیے کائنات میں عمل پیرا ہے۔ تاہم خدا کے عقیدے کے علمی مقام کے خلاف جس تعصّب کا بیج گزشتہ صدیوں میں یورپ میں بویا گیا تھا اس کی بیخ کنی ابھی تک نہیں ہو سکی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور وہ عیسائیت کی سرشت میں ہیں جس کا کائناتی نقطۂ نظر اہلِ یورپ کی زندگی

میں سمویا ہوا ہے لہذا اہل یورپ کا اس سے نجات پانا بہت مشکل ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ شعور کو حقیقت کائنات کہنے والے مغربی ماہرین طبیعیات اور ماہرین حیاتیات بھی اس کو خالق کائنات خدا کہنے سے گریز کرتے ہیں۔

سائنس اور خدا کے افتراق کے مہلک نتائج

عیسائی مغرب کا خدا کے عقیدے کو سائنس سے خارج کر دینا عالم انسانیت کا ایک نہایت ہی المناک حادثہ ہے جو بظاہر نہایت ہی خاموش اور پُرامن اور بے ضرر تھا لیکن نوع انسانی کی بے شمار قدیم وجدید مصیبتیں اور بدبختیاں اور بربادیاں اور تباہیاں ایسی ہیں کہ اگر ان کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو ان کا آخری اور بنیادی سبب یہی حادثہ نکلتا ہے۔ اسی کی وجہ سے نوع انسانی ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور ہر ٹکڑے نے اپنا نسلی، یا لسانی، یا ثقافتی یا جغرافیائی بت پوجنے کے لیے کھڑا کر لیا ہے۔ اسی کی وجہ سے قوموں کی زندگی باہمی رقابتوں اور مسابقتوں کا اکھاڑہ بنی ہوئی ہے۔ اسی کی وجہ سے استعمار پرستی اور شہنشاہیت اور ان کی ملحقہ برائیاں انسانوں پر مسلط ہوتی رہی ہیں، اسی کی وجہ سے انسانیت دو ہولناک عالم گیر جنگوں کی تباہ کاریوں کا سامنا کر چکی ہے اور تیسری عالم گیر جنگ کے خطرے سے دوچار ہے۔ اسی کی وجہ سے اشتراکیت کا خوفناک فتنہ کھڑا ہوا ہے۔ اسی کی وجہ سے دنیا بھر میں جنسی بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جرم پسندی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اسی کی وجہ سے دنیا بھر کے ملکوں میں خودکشی کرنے والوں اور دماغی ہسپتالوں میں داخل ہونے والوں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے۔ اسی نے علم کی تقدیس کو ختم کر کے اسے محض مادی منفعت طلبی کا ایک آلہ بنا دیا ہے۔ اسی کی وجہ سے طالب علموں کے دلوں سے پروفیسروں اور اُستادوں کا احترام رخصت ہو گیا ہے اور تعلیمی اداروں کے ضبط اور نظم کا سلسلہ ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ اسی کی وجہ سے مادی اور حیاتیاتی سائنسوں کی ترقی کی رفتار متواتر سست ہوتی گئی ہے اور نفسیاتی اور انسانی سائنسوں کی ترقی مدت سے رکی ہوئی پڑی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے مذاہب کے درمیان کی خلیجیں سمٹنے کی بجائے اور وسیع ہوتی جارہی ہیں۔

مسلمانوں کی افسوسناک غلطی!
عیسائی مغرب کے سائنس کی کورانہ تقلید
اور اسلامی فلسفۂ علم کی ناقدردانی

یورپ کی علمی دنیا عیسائیت کے نقائص کی وجہ سے خدا کے عقیدے کے خلاف علمی تعصب کی

جس بدبختی کا شکار ہوئی ہے وہ مسلمانوں کے حصے میں نہ آسکتی تھی کیوں کہ اسلام ان نقائص سے پاک ہے لیکن ہم نے اسلام کی تعلیمات کو اور اپنے آبائے اولین کی روایات کو بھلا کر اور یورپ کی کورانہ تقلید کو اپنا کر اس سے حصہ لیا ہے۔

اے بعشق دیگراں دل باختہ
آبروئے خویش را نشناختہ (اقبال)

اسلام کی رُو سے خدا کا عقیدہ سائنس کی کلید اور بنیاد ہے

اسلام میں خدا کے عقیدے کا کوئی اختلاف سائنس سے نہیں بلکہ اسلام کی رو سے خدا کا عقیدہ سائنس کی کلید ہے جس کے بغیر سائنس پوری طرح سائنس نہیں بن سکتی اور اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اسلام انسان اور کائنات کا علم ہے۔ خدا کا عقیدہ جو اسلام کی روح ہے کائنات کی روح بھی ہے۔

اللہ نور السموات والارض

خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

اور جس طرح سے وہ کائنات کی روح ہے اسی طرح سے وہ علم کائنات یا سائنس کی روح بھی ہے اور کائنات میں کائنات کے تینوں طبقے مادّہ (Matter) جان دار (Life) اور نفس انسانی (Mind) شامل ہیں۔ خدا وہ قانون قوانین ہے جو مادہ، جان دار اور انسان تینوں پر حاوی ہے اور جس کے سامنے تینوں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، کوئی خوشی سے اور کوئی بادل ناخواستہ۔ مادہ اور جان دار اور مومنین کی جماعت تو اس قانون پر اپنی رضا و رغبت سے عمل کرتے ہیں لیکن منکرین خدا اس قانون پر بجبر و اکراہ عمل پیرا ہیں کیوں کہ جب وہ سچے خدا کو خدا نہیں مانتے تو انھیں مجبوراً کسی جھوٹے خدا کو خدا ماننا پڑتا ہے اور پھر اس جھوٹے خدا سے مایوس ہو کر اور دکھ اور نقصان اُٹھا کر وہ زود یا بدیر سچے خدا کی طرف گھسیٹے ہوئے آتے ہیں۔ جو لوگ دین اسلام سے جس کی روح خدا کا عقیدہ ہے انحراف کرنا چاہتے ہیں خدا اُن کو تنبیہ کرتا ہے کہ مایوسی اور دکھ اور نقصان اٹھانے کے بغیر تم ایسا نہیں کر سکو گے اور پھر بھی آخر کار اسی کی طرف ہانکے جاؤ گے، کیوں کہ اسلام کی روح تو وہ قانون ہے جس پر عمل کرنے کے لیے کائنات کی ہر چیز طوعاً و کرہاً مجبور ہے۔ پھر اس انحراف سے تمھیں فائدہ کیا ہے۔

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً و کرھاً و الیہ یرجعون۔

(ترجمہ) کیا وہ خدا کے دین کو جو سچے خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دیتا

ہے) چھوڑ کر کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہتے ہیں حالانکہ سچے خدا کے سامنے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز سر تسلیم جھکائے ہوئے ہے خوشی سے یا بادلِ ناخواستہ اور (آخرکار) وہ (بھی جو بادلِ ناخواستہ اُس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں بخوشی) اس کی طرف لوٹ آئیں گے (پھر اب تمہیں اس انحراف سے کیا حاصل ہے)۔

اِس دَور کے مسلمان سائنس دانوں اور فلسفیوں کا غلط نقطۂ نظر

آج اگر ہم اپنے کسی مسلمان بھائی سے جو کہیں سائنس یا فلسفہ کے پروفیسر ہوں یہ کہیں کہ آپ مادّی، حیاتیاتی اور نفسیاتی سائنسوں میں ایسے نظریات کی تعلیم دے رہے ہیں یا ایسے نظریات کی بنا پر علمی تحقیقات کرا رہے ہیں جو عقلی اور علمی لحاظ سے خدا کے عقیدے کے ساتھ متصادم ہوتے ہیں یا اس کو نظر انداز کرتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے "صاحب میں بھی آپ کی طرح مسلمان ہوں۔ لیکن سائنس اور فلسفہ مذہب سے الگ چیزیں ہیں۔ ان کو خدا کے عقیدے سے اور خدا کے عقیدے کو ان سے الگ رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ سائنس اور فلسفہ بالآخر ان کو ثابت کر دیں۔ سائنس مشاہدات کے بے لاگ نتائج پر اور فلسفہ غیر جانب دارانہ استدلال پر مبنی ہے۔ پہلے سے طے کیا ہوا اعتقاد ایک تعصب ہے جو علم کو رنگ دار اور اس کی صحت اور صفائی کو داغ دار کر دیتا ہے۔ اگر ہم سائنس یا فلسفہ کی تحقیقات میں کسی عقیدہ سے آغاز کریں گے تو نہ ہماری سائنس سائنس رہے گی اور نہ ہمارا فلسفہ فلسفہ رہے گا۔ پھر یہ دونوں چیزیں مذہب ہی بن کر رہ جائیں گی۔ سائنس علت اور معلول کے پورے سلسلے کو معلوم کرنا چاہتی ہے لیکن اگر آپ خدا کے عقیدے کو سائنس کی بنیاد بنا دیں گے تو پھر چونکہ خدا ہر معلول کی علت ہے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ نے ہر معلول کی علت کو پہلے ہی سے معلوم کر لیا ہے لہٰذا آپ کو سائنسی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔"

حقیقتِ وجود اور حقیقتِ علم کے کسی عقیدے کے پس منظر کے بغیر سائنس ناممکن ہے

لیکن یہ جواب از سر تا پا غلط ہے اور کئی مغالطوں سے پُر ہے۔ پہلا مغالطہ تو اس میں یہ ہے کہ سائنس یا فلسفہ کی کوئی ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے جو کسی عقیدے پر مبنی نہ ہو بلکہ عقیدے کے لحاظ

سے غیر جانب دار ہو۔ اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ سائنس کسی فلسفیانہ پس منظر کی محتاج ہے اور ہمیشہ حقیقت کائنات اور حقیقتِ علم کے متعلق کسی اعتقاد کے گہوارے میں پرورش پاتی ہے۔ کیا اس بات کے ثبوت کے طور پر یہ بات کافی نہیں کہ روس کی سائنس سرمایہ دار ممالک کی سائنس سے اور سرمایہ دار عیسائی ممالک کی سائنس روس کی سائنس سے مختلف ہے اور مختلف رکھی جاتی ہے، دونوں میں سے ہر فریق دوسرے کی سائنس کو غلط قرار دیتا ہے۔ ان کے مختلف ہونے کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ دونوں کے پس منظر کے نظریات، جن کے زیرِ اثر ان کی نشوو نما ہوتی ہے، الگ الگ ہیں۔ دونوں فریق ایک ہی طرح کے مشاہدات سے مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں جو اُن کے نظریات کے مطابق ہوتے ہیں کیوں کہ کوئی فریق اپنی انسانی فطرت کے بے پناہ قوانین کی وجہ سے اپنے نظریے کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ روس کی سائنس علی الاعلان اس عقیدہ سے آغاز کرتی ہے اور آخر تک اس پر قائم رہتی ہے کہ

> "حقیقت کائنات مادّی ہے اور اس قسم کی ہے کہ سائنسی حقائق سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم دونوں کے اس تعلق کو مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو اس کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج درست ہوں گے اور اگر ہم اس تعلق کو نہ مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو حقیقت کے مادّی تصوّر کی روشنی میں انجام نہ دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج غلط ہو کر رہ جائیں گے۔"

یہ عقیدہ ایک مذہب کا جزو ہے اور کوئی سائنسی حقیقت نہیں، کیوں کہ سائنسی مشاہدے یا تجربے سے ثابت شدہ نہیں۔ اس مذہب کو روس والے جدلی مادّیات (Dialectical Materialism) کہتے ہیں۔ سرمایہ دار عیسائی ملکوں کی سائنس اس بات کا اعتراف نہیں کرتی کہ وہ کسی عقیدے سے آغاز کرتی ہے یا کسی عقیدے پر مبنی ہے لیکن دراصل اس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ

> "حقیقت کائنات مادّی ہو یا روحانی یا کچھ اور وہ اس قسم کی ہے کہ سائنسی حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے جو کسی وقت خود سائنس ہی ثابت کر دے۔ لہٰذا اگر ہم دونوں کی اس موجودہ بے تعلقی کو مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو اس کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج درست ہوں گے اور اگر ہم دونوں کی اس بے تعلقی کو نہ مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو حقیقت کے کسی تصوّر کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج غلط ہو کر رہ جائیں گے۔"

یہ عقیدہ بھی ایک مذہب کا جزو ہے اور کوئی سائنسی حقیقت نہیں جو کسی تجربے یا مشاہدے سے ثابت ہوتی ہو۔ زمانۂ حال کے مفکرین نے اس مذہب کو سائنٹزم (Scientism) کا نام دے کر دوسرے مذاہب سے ممیز کیا ہے۔

مذہب سائنٹزم کا تضاد

مذہب سائنٹزم (Scientism) کا تضاد جو اسے معقولیت کے پایے سے گرا دیتا ہے یہ ہے کہ اس کا پیرو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی سائنس کی مدد سے کسی وقت حقیقت کائنات کی پردہ کشائی کرے گا بحالیکہ اس کی سائنس خود حقیقت کائنات کے ایک تصور پر مبنی ہے۔ اور جب تک وہ سائنٹزم کا معتقد ہے اس کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی اور وہ حقیقتِ کائنات کا تصور خود سائنٹزم ہے۔ کسی تصورِ حقیقت کی ضرورت ایک انسان کے لیے اس قدر فوری اور شدید اور ناگزیر ہے کہ کوئی سائنس دان ایک لمحے کے لیے بھی اسے ملتوی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اسے اپنے سائنسی نتائج کی متوقع پختگی تک برسوں کے لیے اٹھا رکھے۔ انسان اپنے تصورِ حقیقت کا براہِ راست مشاہدہ یا احساس کرتا ہے اس کو ثابت نہیں کرتا۔ اس کی علمی تحقیق اس کے تصورِ حقیقت کو دریافت نہیں کرتی بلکہ اس کا تصورِ حقیقت اس کی علمی تحقیق کی راہ نمائی کرتا ہے۔

اسلام کی رو سے سائنس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے:۔

> "حقیقت کائنات روحانی ہے اور وہ اس قسم کی ہے کہ سائنسی حقائق سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم دونوں کے اس تعلق کو مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو اس کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج درست ہوں گے اور اگر ہم اس تعلق کو نہ مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو حقیقت کے روحانی تصور کی روشنی میں انجام نہ دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج غلط ہو کر رہ جائیں گے۔"

یہی وہ فلسفۂ سائنس ہے جس کی روشنی میں عہد قدیم کے مسلمانوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی۔

سائنس کے اسلامی اور اشتراکی فلسفوں میں فرق

ظاہر ہے کہ اسلامی فلسفۂ سائنس اور اشتراکی فلسفۂ سائنس میں صرف یہی ایک فرق ہے کہ اشتراکی فلسفۂ سائنس میں حقیقت کائنات مادی ہے اور اسلامی فلسفۂ سائنس میں حقیقت

کائنات روحانی ہے ورنہ دونوں ایک ہیں۔ دونوں ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کی سائنس ایک عقیدہ پر مبنی ہے۔ جب دنیا بھر میں سائنس دان اپنی تحقیقات کی بنیاد کسی عقیدے پر رکھتے ہیں اور کسی عقیدے سے آغاز کرنے کے بغیر کسی سائنس دان کا چارۂ کار نہیں تو پھر کیا مسلمانوں کے لیے ہی یہ جرم ہے کہ وہ سائنس کی بنیاد کسی عقیدے پر رکھیں۔ کیا اس کو جرم قرار دینے والے خود بھی اس جرم کے مرتکب نہیں۔ ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

سائنس کی صحیح اعتقادی بنیاد سائنس کی درستی اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے

جب ہم مجبور ہیں کہ سائنسی تحقیق کی بنیاد کسی نہ کسی عقیدے پر رکھیں تو کیا ضروری نہیں کہ وہ عقیدہ درست ہو اور درست تصورِ حقیقت پر مبنی ہو تاکہ ہمارے سائنسی نتائج غلط نہ ہوں۔ کیا مسلمان کا یہ تصور کہ خدا ہی اس کائنات کی سچی حقیقت ہے تمام ممکن تصورات حقیقت میں صرف ایک ہی تصورِ حقیقت نہیں جو صحیح اور سچا ہے۔ تو پھر اگر اشتراکی اور عیسائی سائنس دان اپنے اپنے باطل تصوراتِ حقیقت پر اپنی اپنی سائنس کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور دعوا کر سکتے ہیں کہ صرف ان ہی کی سائنس صحیح ہے تو مسلمان اپنے صحیح اور سچے تصورِ حقیقت پر سائنس کی بنیاد کیوں نہیں رکھ سکتا اور پھر اس کے بعد کیوں یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ صرف اسی کی سائنس صحیح ہے۔

سائنس اور فلسفہ کسی خدا کو ثابت نہیں کرتے بلکہ بلا ثبوت کسی خدا کو مان کر آگے چلتے ہیں،

دوسرا مغالطہ اس میں یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ خدا کو ثابت کر سکتے ہیں اور کسی وقت خدا کو ثابت کر سکیں گے۔ اسی مغالطے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ سائنس کی بنیاد مشاہدات کے بے لاگ نتائج پر اور فلسفہ کی بنیاد غیر جانب دارانہ استدلال پر رکھی جاتی ہے حالانکہ سائنس اور فلسفہ خود اپنے وجود کے لیے کسی جھوٹے یا سچے خدا یعنی حقیقت کائنات کے کسی غلط یا صحیح تصور کے محتاج ہیں۔ وہ کسی نہ کسی خدا کو پہلے مان کر آگے چلتے ہیں لہذا وہ خدا کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں۔ اگر وہ کسی خدا کو ثابت کر سکتے ہیں تو وہ وہی خدا ہوتا ہے جس کو وہ پہلے مان لیتے ہیں اور اگر وہ

سچے خدا کے تصوّر پر مبنی نہ ہوں تو سچے خدا کو پیش نہیں کر سکتے۔ اور یہ عرض کیا گیا تھا کہ انسانی فطرت کے قوانین کی وجہ سے (جن کے سامنے ایک سائنس دان بھی سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے) سائنس ہمیشہ کسی تصوّرِ حقیقت کے ماتحت وجود میں آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی تصوّرِ حقیقت انسان کا نصب العین ہوتا ہے جو اس کی پوری عملی زندگی پر حکمران ہوتا ہے اور انسان کی عملی زندگی سے اس کی سائنسی سرگرمیاں الگ نہیں ہو سکتیں۔ اور اس کے مشاہدات کے سائنسی نتائج بے لاگ نہیں ہوتے بلکہ اس کے نصب العین کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے فلسفی کی فلسفیانہ سرگرمیاں بھی اس کی عملی زندگی سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔ فلسفی بھی کسی نہ کسی تصوّرِ حقیقت سے آغاز کرتا ہے جس کو وہ بلا ثبوت پہلے ہی مان چکا ہوتا ہے اور پھر اپنے استدلال کا سارا زور یہ ظاہر کرنے کے لیے صرف کرتا ہے کہ حقائقِ عالم اس تصوّرِ حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں تاکہ اس کا مخاطب بھی اس کی معقولیت کا احساس کرے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کسی تصوّرِ حقیقت کو غیر جانب دارانہ استدلال سے ثابت کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ پہلے ہی بلا ثبوت کسی تصوّرِ حقیقت کا قائل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوّرِ حقیقت حُسن کا ایک تصوّر ہوتا ہے اور حُسن کو محسوس کیا جا سکتا ہے، دیکھا جا سکتا ہے، لیکن ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اپنے لیے اور نہ دوسروں کے لیے۔ پہلے سے طے کیے ہوئے اعتقاد کے بغیر سائنس اور فلسفہ دونوں ممکن نہیں ہوتے۔ اقبالؔ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

علم و فن از پیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات

زندگی سرمایہ دار از آرزوست
عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست

اعتقاد کی حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی تصوّر کے اوصاف حسن اور صداقت اور خیر کا ایک احساس ہوتا ہے اور ان اوصاف کی آرزو اس میں شامل ہوتی ہے۔ اقبال اعتقاد ہی کو کبھی عشق اور کبھی آرزو اور کبھی تمنا کہتا ہے اور اسے سرمایۂ زندگی یا سرمایۂ حیات قرار دیتا ہے۔ آرزو زندگی یا حیات کا خاصّہ ہے۔

عقیدۂ توحید کے مضمرات کا انکار

تیسرا مغالطہ اس میں یہ ہے کہ آپ اسلام کے بنیادی معتقدات کے ساتھ جیسا برتاؤ بھی چاہیں کریں، جب چاہیں انھیں چھوڑ دیں یا معطل اور خارج از عمل کر دیں اور جب چاہیں انھیں اختیار کر لیں مؤثر بنا دیں اور عمل میں لے آئیں۔ ایک کوٹ یا سویٹر کی طرح جب چاہیں انھیں پہن لیں اور جب چاہیں مصلحت یا موسم یا نزاکت طبع کے تقاضے سے اتار کر رکھ دیں۔ آپ ویسے کے ویسے ہی مسلمان رہیں گے یہ خیال درست نہیں۔ ہمارے بعض سائنس دانوں کا خیال یہ ہے کہ سائنسی تحقیق نماز کی طرح کی کوئی چیز نہیں کہ اس میں خدا کے عقیدے کو پیش پیش رکھا جائے یا خدا کے عقیدے کے مضمرات کی روشنی میں جاری رکھا جائے۔ لیکن ہم یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ سائنسی تحقیق مظاہر قدرت کے مشاہدے اور مطالعے ہی کا دوسرا نام ہے۔ تعجب ہے ہمارا خدا تو یہ کہے کہ مظاہر قدرت خدا کی ہستی اور صفات کی نشانیاں ہیں اور ان کا مشاہدہ اور مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرو اور ہم صاف کہہ دیں کہ ''نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خدا کی صفات کا مظاہر قدرت سے کیا تعلق؟'' اور پھر بھی ہمارے اعتقاد یا ایمان میں کوئی فرق نہ آئے یہاں تک کہ ہمیں توبہ کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ ہو۔ یہ ایمان میں بھی بی بی تمیز کے وضوئے محکم کی طرح ہے جو کسی حالت میں بھی ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ مسلمان کو تو یہ حکم ہے کہ وہ خدا کے عقیدے کو اپنی پوری عملی زندگی کی قوت محرکہ بنائے جو ہر چھوٹے بڑے کام میں اس کی راہ نمائی کرے۔ اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے اور لیٹے یا کھڑے ہو کر، کسی وقت بھی خدا کو نہ بھلائے۔ ہر کام سے پہلے بِسمِ اللّٰہ پڑھے تاکہ اسے معلوم رہے کہ ہر کام کے حکم کے مطابق اور خدا کی رضا مندی کے لیے کرنا ہے۔ یہاں تک کہ برتن ڈھانپے تو خدا کا نام لے، چراغ بجھائے تو خدا کا نام لے، کسی چٹان یا پہاڑ کے پاس سے گزرے تو خدا کا نام لے۔ ان احکام کے پیشِ نظر سائنس کی تحقیق یا تعلیم کے وقت عمداً خدا کے نام کو حذف اور خدا کے عقیدے کو معطل کر دینا اسلام کے مقاصد کے مطابق کس طرح سے ہے۔ پھر جو شخص سائنسی تحقیقات یعنی مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے وقت خدا کا نام تو لیتا ہے لیکن قرآن کی تعلیمات کے مطابق مظاہر قدرت کے اندر خدا کی صفات کو سمویا ہوا نہیں مانتا وہ خدا کے اعتقاد کے مضمرات کا جیسا کہ قرآن نے ان کی تشریح کی ہے، منکر نہیں تو اور کیا ہے۔

سائنسی تحقیق کو عقیدۂ توحید کی روشنی سے محروم کر دینا نہ صرف سائنس کو غلط کر دینا بلکہ اپنی عملی زندگی کو بھی غلط راستے پر ڈال دینا ہے

اصل بات یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات کے وقت خدا کے عقیدے کو پیش پیش رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز کے وقت، کیوں کہ سائنسی تحقیق میں آپ کی مصروفیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ وہ مشین تیار کر رہے ہیں جو فرد اور قوم کی پوری زندگی کو حرکت میں لائے گی۔ وہ مشین آپ کی قوم کا علم ہے۔ ہر قوم کا عمل اس کے علم کائنات پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر ہم علم سے خدا کے عقیدے کو خارج کر دیں گے تو ضروری ہے کہ وہ قوم کی پوری عملی زندگی سے خارج ہو جائے۔ اگر کسی قوم کا علم لادینی ہے تو اس کی عملی زندگی بھی لادینی ہو گی۔ مسلمانوں کا دینی اور اعتقادی انحطاط ہی ان کے مجموعی انحطاط کا باعث ہوا ہے۔ اسی سے ان کی وحدت اور یک جہتی کا انحطاط ان کا اقتصادی انحطاط، سیاسی انحطاط، اخلاقی انحطاط اور ان کے انحطاط کی اور تمام قسمیں پیدا ہوئی ہیں لیکن مسلمانوں کے دینی اور اعتقادی انحطاط کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انھوں نے عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید میں علم یا سائنس سے خدا کا عقیدہ خارج کر دیا ہے۔ علم کے بگڑنے اور سنورنے سے ہی ذہن بگڑتے اور سنورتے ہیں اور جب ذہن بگڑتے ہیں تو عمل بھی بگڑتا ہے اور جب ذہن سنورتے ہیں تو عمل بھی سنورتا ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وا ما بانفسھم۔

(ترجمہ) بے شک خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک ان کے ذہنوں میں تغیر نہ آجائے۔ علم سے خدا کا عقیدہ خارج کر دینے کے بعد یہ شکایت کرنا کہ ہماری عملی زندگی میں خدا کا عقیدہ باقی نہیں رہا، عبث ہے۔

جس طرح سے کائنات کے طبیعیاتی اور حیاتیاتی طبقے خدا کی خالقیت اور ربوبیت کے مظاہر ہیں۔ اسی طرح سے کائنات کا نفسیاتی اور انسانی طبقہ بھی خدا کی خالقیت اور ربوبیت کا مظہر ہے۔ تاہم جس طرح سے ہمارے طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم خدا کے تصور سے محروم ہیں، اسی طرح سے ہمارے وہ سائنسی علوم بھی جنھیں انسانی علوم کہا جاتا ہے خدا کے عقیدے سے بے تعلق ہیں۔ اور یہی علوم ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے فلسفے ہیں۔ جب ہمارے فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ اقتصادیات، فلسفۂ قانون، فلسفۂ تعلیم اور فلسفۂ تاریخ

ہیں خدا کے عقیدے کے لیے کوئی جگہ نہ بن سکے تو کیسے ممکن ہے کہ ہماری عملی زندگی میں جو ہمارے سیاسی، اخلاقی، اقتصادی، قانونی اور تعلیمی اعمال و افعال پر مشتمل ہوتی ہے خدا کے عقیدے کی کوئی گنجائش نکل آئے اور جب ہماری عملی زندگی کا کوئی پہلو بھی ہمارے اپنے ہی کیے کی وجہ سے خدا سے متعلق نہیں ہو سکتا تو اس بات کی شکایت کیا معنی رکھتی ہے کہ ہم خدا سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ اس کی عملی زندگی کے کسی حصے میں بھی نظریاتی غیر جانب داری (Neutrality) ممکن نہیں۔ اگر وہ اپنی سائنسی تحقیق سے سچے خدا کو خارج کرے گا تو اسے وہاں اس کی بجائے شعوری یا لاشعوری طور پر کسی جھوٹے خدا یا بُت کو رکھنا پڑے گا اور پھر اس کا جھوٹا خدا یا بُت اس کی سائنس کو سائنس کے پایہ سے گرا دے گا۔ زمانہ حال میں اس بُت کو کہیں اشتراکیت کا نام دیا جاتا ہے کہیں لادینی وطنیت اور قومیت کا اور کہیں لادینی جمہوریت کا۔ چوں کہ دل کا خانہ کبھی خالی نہیں رہتا۔ جب تک بُتوں سے کفر نہ کیا جائے خدا پر ایمان لانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خدا پر ایمان لانے سے پہلے بُتوں سے کفر کرنے پر زور دیتا ہے۔

ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی۔

(ترجمہ) جو شخص بُتوں سے کفر کرتا ہے اور خدا پر ایمان لاتا ہے بے شک وہ ایک مضبوط حلقہ کو تھام لیتا ہے۔

عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید سے باز آنے اور قرآن کے فلسفہ سائنس کی طرف جلد از جلد رجوع کرنے کی بجائے ہم اپنی اس ہمالیہ جتنی بڑی غلطی کی تلافی اس طرح سے کر رہے ہیں کہ ہم نے لادینی سائنسی علوم کے ساتھ ایک اور مضمون کا جسے دینیات یا اسلامیات کہا جاتا ہے اضافہ کر دیا ہے اور علوم اسلامیہ کی الگ درس گاہیں اور سوسائٹیاں اور انجمنیں اور دار العلوم اسلامیہ اور موتمر علوم اسلامیہ ایسے ناموں کے ساتھ قائم کر دی ہیں۔ اس کا الٹا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں یہ خیال اور بھی راسخ ہو گیا ہے کہ اسلام اصل علم سے الگ کوئی چیز ہے اور علوم اسلامیہ کا تعلق کسی حالت میں بھی سائنسی علوم سے نہیں۔

خدا کی خالقیت اور ربوبیت سے انکار

حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمان سائنس دان یا فلسفی جو اپنے پورے اختیار کے ساتھ خدا کے عقیدے سے الگ ہو کر یا اس کے علمی اور تحقیقی تقاضوں کو نظر انداز کر کے سائنس یا فلسفہ کی تعلیم اور تحقیق میں مصروف ہوتا ہے اگر ہم اس کی نفسیات کو ذرا بغور دیکھیں تو ہمیں صاف نظر آ جائے

گا کہ یہ کہنا اس کے ساتھ بے انصافی ہرگز نہیں کہ اسے اسلام کے خدا پر یقین ہی نہیں رہا تاہم وہ خدا کے سچے عقیدے سے الگ ہوتا ہے تو اس کی جگہ ایک اور غلط عقیدے کو قبول کرتا ہے۔

تمام علمی سچائیوں کو روشن کرنے والی حقیقت

فلسفی اور سائنس دان سچائیوں کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اگر ایک ایسی سچائی جو قطعی اور یقینی طور پر سچائی ہو اور جس کے غلط ہونے کا کوئی بھی امکان نہ ہو کسی فلسفی یا سائنس دان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر اس سے چمٹ جاتا ہے، کیوں کہ وہ اسے اور سچائیوں کی جستجو میں مدد دیتی ہے اور اس کے لیے ایک روشنی کا مینار بن جاتی ہے جس سے علم کا نور دور دور تک پھیل جاتا ہے اور دوسری سچائیوں کو روشن کرتا جاتا ہے۔ سائنسی تحقیق کا کوئی نتیجہ اگر اس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو تو وہ یقینی طور پر صحیح جان کر قبول کر لیا جاتا ہے اور اگر مطابقت نہ رکھتا ہو تو بدوثوقِ تمام غلط سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ فرض کیا کہ کسی ایسے ذریعۂ علم سے جو بالاتفاق اور مسلم طور پر آنکھوں کے دیکھنے سے بھی ہزار گنا زیادہ قابلِ اعتماد ہے سائنس دانوں کے گروہ کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا فی الواقع موجود ہے اور وہ اس کائنات کا خالق اور رب ہے اور اس کی صفات خالقیت اور ربوبیت اس کائنات میں سموئی ہوئی ہیں تو پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ان کی سائنسی تحقیق اس حقیقت کی راہ نمائی کے بغیر ایک قدم بھی آگے اٹھا سکے۔ یقیناً وہ اسے اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد یا کلید کا درجہ دیں گے اور اسے سب سے بڑی سچائی سمجھیں گے۔ لیکن عیسائی مغرب کے سائنس دانوں کے نزدیک خدا کا تصور اس درجہ کی یقینی اور قطعی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو اپنی سائنسی تحقیق کے لیے مشعلِ راہ نہیں بناتے۔ خدا کے تصور کو سائنسی حقیقت سے بالاتر اور زیادہ یقینی اور زیادہ قابلِ اعتماد کسی حقیقت کا مقام دینا تو درکنار وہ ابھی اسے معمولی سائنسی حقیقت کا مقام بھی نہیں دیتے بلکہ اسے سائنس کے منافی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسے اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد کیسے بنا سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان تو یہ مانتا ہے کہ خدا کا تصور فی الواقع سائنسی حقیقت سے بھی بالاتر مقام رکھنے والی قطعی اور یقینی حقیقت ہے۔ اور اسی یقین کی وجہ سے وہ مسلمان ہے۔

خلافِ قرآن عقیدہ

پھر اگر کوئی فلسفی یا سائنس دان ایسا ہو جو اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود مغربی عیسائی سائنس دانوں کی تقلید میں خدا کے عقیدے کو فلسفے اور سائنس سے بے تعلق یا فلسفہ اور سائنس کے

منافی خیال کرتا ہو تو کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس نے قرآن کی تعلیمات کے خلاف ایک نیا عقیدہ بنا لیا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کا تصوّر تمام سچائیوں کو روشن کرنے والی سچی حقیقت نہیں۔ اور وہ اسلام کے خدا کو اس طرح سے نہیں مانتا جس طرح سے اسلام سے توقع رکھتا ہے۔ ورنہ خود فلسفہ اور سائنس ہی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ خدا کے عقیدے کو فلسفے اور سائنس کی راہ نما حقیقت کے طور پر کام میں لاتا اور اس کی روشنی میں فلسفہ اور سائنس کی صداقتوں کی کامیاب جستجو کرتا۔

محکومی کا سحر

اگر عہدِ قدیم کے ان مسلمانوں کو جو سائنس کے بانی تھے یہ کہا جاتا کہ سائنس کو خدا کے عقیدے سے اور خدا کے عقیدے کو سائنس سے الگ کر دو تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آسکتی اور وہ کہنے والے کو دیوانہ یا احمق سمجھتے۔ پھر کیا یہ تعجّب کی بات نہیں کہ اگر آج کسی مسلمان سائنس دان کو کہا جائے کہ خدا کا عقیدہ سائنس کی لازمی بنیاد ہے جس کے بغیر وہ من کل الوجوہ اور مجموعی طور پر ترقی نہیں کر سکتی تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ الٹی ذہنیت عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید سے پیدا ہوئی ہے اور یہ کورانہ تقلید مغرب کی محکومیت اور مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ محکومی کا خاصہ ہے کہ وہ قوموں کا ضمیر بدل دیتی ہے۔ جو چیز ان کو محکومی سے پہلے اچھی نظر آتی تھی محکومی کے بعد رفتہ رفتہ بُری نظر آنے لگتی ہے اور جو چیز محکومی سے پہلے بُری نظر آتی تھی محکومی کے بعد رفتہ رفتہ اچھی نظر آنے لگتی ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اشتراکیوں کے نزدیک مادّہ اپنی نام نہاد جدلی صفات کے سمیت ایک ایسی ہی یقینی حقیقت ہے جیسی کہ ایک سچے مسلمان کے نزدیک خدا اور اس کی صفات رحمت و ربوبیت۔ لہٰذا انہوں نے مادّے اور اس کی مزعومہ جدلی صفات کو اپنی سائنس کا راہ نما تصور بنایا ہے یہاں تک کہ ان کی سائنس اس تصور کے دائرہ سے ایک انچ باہر نہیں جا سکتی۔ اگر اشتراکی اپنے جھوٹے خدا کے عقیدہ پر سائنس کی بنیاد رکھ سکتا ہے تو مسلمان کو کیا مجبوری ہے کہ وہ اپنے سچے خدا کے عقیدے پر سائنس کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ آج کافر کو اپنے جھوٹے خدا پر جس قدر یقین ہے مسلمان کو اپنے سچے خدا پر نہیں۔

پانچواں مغالطہ اس میں یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ سائنس دان کے لیے علّت اور معلول کے پورے سلسلے کو دریافت کرنے میں سہولت کی بجائے رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ حال آں کہ خدا کے عقیدے میں یہ

بات ہرگز شامل نہیں کہ خدا اپنی تخلیق کے لیے ظاہری اور خارجی اسباب وعلل کے ایک سلسلہ سے کام نہیں لیتا بلکہ اس عقیدے میں یہ بات ایک ضروری عنصر کے طور پر شامل ہے کہ خدا مسبب الاسباب اور علت العلل اور حقیقت الحقائق ہے اور اس کی تخلیق ظاہری اور خارجی اسباب وعلل کے ایک سلسلے کی صورت اختیار کرتی ہے جو ہمارے مشاہدہ اور مطالعہ میں آسکتا ہے۔ اس سلسلے کی دریافت ہمارے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت پر موقوف ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس مشاہدے اور مطالعے کا حق ادا کرنا خود خدا کے عقیدے کی رو سے ہمارے لیے کس قدر ضروری ہے اور یہ کہ مشاہدے اور مطالعے سے درست نتائج اخذ کرنے کے لیے بھی خدا کا عقیدہ کس قدر اہمیت رکھتا ہے مظاہر قدرت میں سلسلۂ اسباب وعلل کی ہر کڑی یعنی ہر علت اور ہر سبب بذاتِ خود ایک مظہر صفات باری تعالیٰ اور ایک آیت اللہ ہے اور مردِ مومن کے مشاہدے اور مطالعے کا ایسا ہی حق دار ہے جیسے کہ اور مظاہر قدرت کیوں کہ وہ بھی اپنی نوعیت یا ماہیت خدا کی صفات کے عمل سے اخذ کرتا ہے اور خدا کی صفات کا آئینہ دار ہے۔ خدا کے عقیدے کی وجہ سے سائنس دان کی تحقیق پر صرف یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ ہر علت اور سبب کے اندر خدا کی صفات کا جلوہ دیکھتا ہے اور لہٰذا اس کو پوری طرح سمجھتا ہے حضور ؐ کی اس دعا کے مطابق جو اوپر نقل کی گئی ہے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اشیا کو اس طرح دیکھے جس طرح کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اگر اسباب وعلل کا سلسلہ جیسا کہ وہ فی الواقع ہے کسی خاص مقام پر نہیں رکتا تو وہ سائنس دان جو سچا مسلمان ہے اپنی سائنسی تحقیق کو خدا کے عقیدے کی وجہ سے اسے وہاں روکنے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ اسے آگے لے جائے گا اور اس کی انتہا تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور یقین کے معاملے میں کافر مسلمان پر سبقت لے گیا ہے۔

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ مُرد اندر حرم

غلطی سے رجوع کرنا ، حالتِ انحطاط سے نجات کا واحد راستہ ہے

اگر ہم اپنی موجودہ یاس انگیز حالت انحطاط سے نجات پانا چاہتے ہیں تو اس کا طریق سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہماری جو بڑی غلطی اس کا سبب بنی ہے اس پر اصرار کرنا ترک کر دیں اور اس سے رجوع کریں۔ عیسائی مغرب کی تقلید میں سائنس کو خدا سے اور خدا کو سائنس سے الگ نہ کریں۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق مظاہرِ قدرت کا مطالعہ آیات اللہ کے طور پر کریں تمام سائنسی علوم یعنی مادّی ، حیاتیاتی اور نفسیاتی اور انسانی علوم کو مقدس اور اسلامی علوم سمجھیں کیوں کہ وہ ہمارے خدا کی پیدا کی ہوئی مقدس کائنات کے اور آیات اللہ کے تشریحی علوم ہیں اور اپنے ان آبائے اولین کی روایات کو زندہ کرتے ہوئے جو دنیا کے سب سے پہلے

سائنس دان تھے خدا کے عقیدے کو پھر اسی طرح سائنس کی اساس بنا دیں جس طرح وہ پہلے تھا۔

سائنسی علوم کی ماڈل اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت

اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی بنائیں جس کی طرز پر بعد میں اور یونیورسٹیاں بنائی جا سکیں۔ اس یونیورسٹی کے لیے ایم۔ ایس۔ سی تک تمام سائنسی علوم کی نصابی کتابوں کو قرآن کے فلسفۂ علم کی روشنی میں نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ خدا کی خالقیت اور ربوبیت عالم کا عقیدہ ہر سائنسی علم کا مرکز اور مدار اور محور بن جائے۔ اور طالب علم کو یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ اس علم کا مطالعہ نہیں کر رہا بلکہ خدا کی صفات خالقیت اور ربوبیت کا مطالعہ کر رہا ہے جیسا کہ ان کا ظہور کائنات کے اس طبقہ یا حصہ میں ہوا ہے جس کا علم اس کو بہم پہنچایا جا رہا ہے۔

سائنسی علوم کی تشکیل جدید کے بنیادی اصول۔ اوّل

سائنسی علوم کی تشکیل جدید کے دوران میں سب سے پہلی بات جو ہمیں مدنظر رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ صحیح تصورِ حقیقت کو سائنسی علوم کے اندر سمونے سے تمام غلط سائنسی علوم تبدیل ہو کر درست ہوتے ہیں اور تبدیلی نہ صرف ان علوم کے نقطۂ نظر اور ان کی غرض و غایت میں ہوتی ہے بلکہ ان کا متن یا مواد بھی بدل جاتا ہے۔ لیکن ان کے متن یا مواد کے اندر جو تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ طبیعیاتی علوم میں بہت کم، حیاتیاتی علوم میں اس سے زیادہ اور نفسیاتی یا انسانی علوم میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے مواد کے اندر تبدیلی کی وسعت اسی نسبت سے زیادہ ہوتی جاتی ہے جس نسبت سے کائنات کا وہ طبقہ جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں شعوری مقصدی فعلیت کے وصف سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظریۂ کائنات مقصد کائنات کا ایک نظریہ بھی ہوتا ہے اور وہ کائنات کے تینوں طبقوں میں سے کسی طبقے کے علم کے اندر اتنا ہی داخل ہو سکتا ہے جتنا کہ خود اس طبقے کے اندر کائنات کا مقصد شعوری طور پر آزادیا آشکار ہو۔ مادّہ مقصدی فعلیت سے بالکل محروم ہے لہٰذا نظریے کی نوعیت مادی یا طبیعیاتی علوم پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے۔ حیوان غیر شعوری مقصدی فعلیت سے بہرہ ور ہے لہٰذا نظریے کی نوعیت حیاتیاتی علوم پر مادی علوم کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے لیکن

انسان خود شعور ہے اور آزادانہ شعوری مقصدی فعلیت کی استعداد رکھتا ہے۔ لہٰذا نظریے کی نوعیت نفسیاتی یا انسانی علوم پر حیاتیاتی علوم سے بھی زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک نئے نظریے کی روشنی میں یہ سائنسی علوم یک سر بدل جاتے ہیں۔ اور یہ سائنسی علوم وہ ہیں جو انسان کی عملی زندگی کے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے غلط ہونے سے انسان کی ساری عملی زندگی غلط ہو جاتی ہے یہاں تک کہ دوسرے سائنسی علوم کا بھی صحیح استعمال نہیں کر سکتا اور ان کے درست ہونے سے اس کی ساری عملی زندگی درست ہو جاتی ہے اور وہ دوسرے سائنسی علوم سے بھی پورا پورا فائدہ اُٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحیح تصورِ کائنات کے مطابق سائنسی علوم کا تعمیر کرنا یا بدلنا انسان کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایک یا دوسرے نظریہ کو ریاضیات یا طبیعیات ایسے مستیقن (Exact) علوم کے اندر داخل کرنے سے ان علوم کے اندر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی لیکن یہاں میں شہرۂ آفاق حکیم شپنگلر (SPENGLER) کی کتاب "زوال مغرب" (The Decline of the West) کا ایک حوالہ درج کرتا ہوں جس سے پتہ چل جائے گا کہ اس سلسلے میں غیر جانب دارانہ محققین کی رائے کیا ہے:

"ہر علمی حقیقت خواہ وہ کیسی ہی سادہ ہو آغاز ہی سے اپنے دامن میں ایک نظریے کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ چیز جسے ہم ایک حقیقت کہتے ہیں ایک نادر الوقوع اثر ہے جو ایک بیدار شخصیت پر پڑتا ہے اور تمام باتوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا وہ شخصیت جس پر یہ اثر پڑ رہا ہے یا پڑ رہا تھا کلاسیکی ہے یا مغربی، گاتھکی ہے یا بیرونی" ص: ۳۷۹

"ہر مستیقن Exact چیز بذاتِ خود بے معنی ہوتی ہے۔ ہر طبیعیاتی مشاہدہ اس طرح سے تشکیل پاتا ہے کہ وہ بعض سابقہ خیالی مفروضات کی بنیاد کو ثابت کرتا ہے اور اس کے کامیاب انصرام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سابقہ مفروضات اور زیادہ قابل یقین ہو جاتے ہیں۔ ان مفروضات کے بغیر نتیجہ محض خالی خولی اعداد تک منحصر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن درحقیقت ان مفروضات سے نہ تو ہم الگ ہوتے ہیں اور نہ ہی ہو سکتے ہیں اگر کوئی محقق کوشش کر کے اپنے تمام مفروضات کو جنہیں وہ جانتا ہے طے کر کے ایک طرف رکھ دے تو خواہ وہ یہ سمجھے کہ اب اس کا کام بالکل صاف اور واضح ہو گیا ہے تاہم جوں ہی وہ اپنی

تحقیق کا آغاز کرے گا مفروضات پر اس کا یہ تصرّف نہ رہے گا کہ وہ ان کو الگ کر سکے بلکہ وہ خود ان مفروضات کے غیر شعوری تصرّف میں چلا جائے گا کیوں کہ تحقیق بہر حال ایک زندہ عمل ہے اور ہر زندہ عمل میں ایک انسان اپنی ثقافت، اپنے عصر، اپنے مدرسہ اور اپنی روایات کے تابع ہونے پر مجبور رہے۔ ایمان اور علم دراصل باطنی ایقان ہی کے دو پہلو ہیں مگر ان دونوں میں، ایمان کو تقدم حاصل ہے اور علم کے تمام اعتبارات پر خواہ وہ کیسے ہی غیر واضح ہوں، اس کی بالادستی کا سکّہ رواں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ نظریات ہیں نہ کہ محض اعداد جو تمام طبعی علوم کی بنیاد بنتے ہیں۔ ثقافتی انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر اس اصلی سائنس کی لاشعوری طلب کروٹیں لیتی رہتی ہے جو اس کی اپنی ثقافت کی روح کے مطابق ہو اور یہ طلب قدرت کے کسی عالم گیر تصوّر کو سمجھنے اور اس پر حاوی ہونے اور اس کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے کار فرما ہوتی ہے۔ دشوار اور محنت طلب پیمائش، جو محض پیمائشوں کی خاطر کی جائیں، چھوٹے ذہنوں کے لیے باعثِ اطمینان ہونے کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

ہر تصوّر جو کسی حالت میں بھی دائرۂ امکان میں داخل ہوتا ہے اپنے موجد کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ مقولہ کہ "انسان نے خدا کو اپنے نمونہ پر بنایا ہے" ہر تاریخی مذہب پر صادق آتا ہے لیکن ہر طبیعیاتی علم کے لیے بھی کچھ کم صحیح نہیں خواہ اس علم کی نام نہاد واقعاتی یا تجرباتی اساس کتنی ہی محکم کیوں نہ ہو۔"

ص: ۳۸۱

"عالم کی عقلی تشکیل کی اس صورت کو (یعنی علم طبیعیات کو) ایسی ہی دوسری صورتوں پر اوّلیت دینے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں۔ ہر تنقیدی علم، ہر مذہبی یا غیر مذہبی عقیدے کی طرح باطنی ایقان پر ہی قائم ہوتا ہے۔ اگرچہ ہیئت اور مزاج کے اعتبار سے اس باطنی ایقان کے مظاہر لاتعداد ہوتے ہیں تاہم وہ اپنے بنیادی اصول کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے۔ لہٰذا طبعی علوم کا مذہب کو ہدف ملامت بنانا "بومرانگ" ایسے ہتھیار کی طرح ہے جو پھینکنے والے ہی کی سمت میں لوٹ آتا ہے۔

ہر تہذیب خیالات واعمال کا اپنا منفرد اور ذاتی ہیولیٰ خود تیار کرتی ہے جو اس کے اپنے لیے امر حق ہوتا ہے اور اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک کہ وہ

تہذیب خود زندہ رہتی ہے اور اپنے امکانات کو آشکار کرتی رہتی ہے۔ جب کوئی تہذیب اپنے خاتمے کے قریب پہنچتی ہے اور اس کے تخلیقی قوا فنا ہوجاتے ہیں یعنی اس کی قوت تخیل اور فکر وزبان کی قوتیں مردہ ہوجاتی ہیں تو صرف بے روح ضابطے اور مردہ نظام ہائے فکر کے ڈھانچے باقی رہ جاتے ہیں جن کو دوسری تہذیب سے وابستہ افراد لفظاً تو پڑھ لیتے ہیں مگر ان کو تہی از معنی محسوس کرتے ہیں یا غیر اہم گردانتے ہیں۔ پھر یا تو وہ ان کو میکانکی انداز میں محفوظ کر لیتے ہیں یا حقیر جان کر فراموش کر دیتے ہیں۔ اعداد، ضوابط اور قوانین کا کچھ مطلب نہیں اور وہ کچھ نہیں ہوتے۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کا کوئی جسد ہو، صرف ایک زندہ جماعت ہی جو اپنی زندگی کو ان کے وجود کے اندر اور ان کے وجود کی معرفت وسعت دیتی ہو اور ان کے ذریعے سے اپنا اظہار کرتی ہو اور اندر ہی اندر ان کو اپناتی ہو ان کو اس نعمت سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی مطلق علم طبیعیات کا وجود نہیں ہوتا بلکہ الگ الگ علوم طبیعیات کا وجود ہوتا ہے جو اپنی مخصوص تہذیبوں کے گہواروں میں پروان چڑھتے اور مٹ جاتے ہیں۔" ص: ۳۸۲

"حسی وقوف میں صرف طول وعرض ہی موجود ہوتا ہے اور یہ تعبیر کا زندہ اور ضروی عمل ہی ہے (اور یاد رہے کہ زندہ چیز کی طرح یہ عمل اپنے اندر سمت، حرکت، اور رجعت ناپذیری کے وہ تمام اوصاف رکھتا ہے جن کو ہمارا شعور "وقت" کی اصطلاح میں جمع کر دیتا ہے) جو ان کے اندر گہرائی پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان کے تار و پود سے حقیقت اور نوعیت عالم کی تشکیل کرتا ہے۔ زندگی ہمارے تجربات میں، ایک تیسرے بُعد کی حیثیت سے داخل ہوتی ہے۔" (اوسوالڈ شپینگلر: "زوالِ مغرب" جلد اوّل، باب III انگریزی اشاعت ۱۹۴۴ ش)

دوم:

سائنس کی درسی کتابوں کو نئے سرے سے لکھتے وقت دوسری بات جو ہمیں مد نظر رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم سائنسی علوم کو بدل کے اسلام کی اپنی مرغوب اور پسندیدہ تشریح کے مطابق کریں۔ مظاہر قدرت کے مشاہدے اور مطالعے سے بہ تکلف ایسے نتائج اخذ کریں جو اسلام کی اُس تشریح کے مطابق درست

ہوں جو ہم نے خود کر رکھی ہے۔ ایسا کرنے سے ہمیں ایک طرف سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہم سائنس دان کی امتیازی خصوصیات یعنی مخلصانہ طلب صداقت اور دیانت دارانہ جستجوئے حقائق سے محروم ہو جائیں گے اور دوسری طرف سے اسلام کی اس توجیہ کو جو ہم نے خود کر رکھی ہے خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو سائنس کے نام پر پیش کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم سائنس اور اسلام دونوں کو اپنی خواہشات کے مطابق بدل رہے ہوں گے۔ ایسا کرنا ایک بہت بڑا علمی جرم ہوگا۔ جس کا پردہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد خود بخود چاک ہو جائے گا ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم کائنات میں خدا کی خالقیت اور ربوبیت اور تمام صفات جلال و جمال کی کارفرمائی کو ایک معلوم اور مسلّم اور بنیادی سائنسی حقیقت کے طور پر سمجھیں اور مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس کی روشنی میں کریں۔ پھر ہمارے نتائج جس طرف خود چلتے ہیں، چلتے جائیں اور ہم ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ قرآن حکیم کے اندر ہمیں یہی ہدایت ملتی ہے۔ یتفکرون فی خلق السموات والارض کا مطلب یہ ہے کہ ہم آسمانوں اور زمین کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں پر جیسی کہ وہ فی الواقع موجود ہیں۔ غور و فکر کریں نہ یہ کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق ان کی توجیہہ کریں اور حضورؐ کی اس دعا میں بھی یہی ارشاد مضمر ہے۔

اللھم ارنا الاشیاء کما ھی۔

(ترجمہ) اے ہمارے رب ہمیں چیزوں کو اس طرح دکھا جس طرح وہ فی الواقع موجود ہیں۔

دونوں باتوں کا فرق

ایک نظریۂ حیات کے طور پر اسلام کی صداقت مُسلّم ہے۔ لیکن اسلام کی مختلف توجیہات کی جا سکتی ہیں اور کی جا رہی ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ اسلام کی ہر توجیہ صحیح ہو کیوں کہ اسلام کی صحیح توجیہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اسے دریافت کرنا اور اسے اپنا راہ نما بنانا ہمارا فرض ہے۔ کسی علم کو جو اسلام کی کسی خاص توجیہ کے مطابق صحیح نہ ہو بدل کر اسلام کی اس توجیہ کے مطابق کرنا اور عقیدۂ توحید یعنی خدا کی خالقیت اور ربوبیت کے عقیدے کی روشنی میں مظاہر قدرت کا بے لاگ اور دیانت دارانہ مطالعہ اور مشاہدہ کرنا دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔ پہلا کام اس عالم دین کا ہے جو اسلام کی اس خاص توجیہ کا حامی ہو جس کے مطابق وہ کسی علم کو بدلنا چاہتا ہے اور دوسرا

کام ایک صحیح الخیال سائنس داں کا ہے۔ سائنسی علوم کی اسلامی یونیورسٹی کو پہلے کام سے نہیں، بلکہ دوسرے کام سے اپنے آپ کو متعلق کرنا پڑے گا۔ سائنسی علوم کی اسلامی یونیورسٹی کا مقصد فقط یہ ہوگا کہ عقیدۂ توحید کو جیسا کہ قرآن نے اس کی تشریح کی ہے سائنس کی بنیاد بنایا جائے اور اس کی روشنی میں سائنسی حقائق اور مشاہدات کے نتائج کو سمجھا اور سمجھایا جائے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ سائنس داں کی بے لاگ اور دیانت دارانہ سائنسی تحقیق اسے کسی وقت ایسے نتائج پر پہنچا دے جو اسلام کی کسی خاص توجیہ کے ساتھ مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ اس صورت میں سائنس داں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ہر حالت میں اپنی تحقیق کے نتائج کے ساتھ وابستہ رہے اور سائنسی نتائج کی دنیا سے باہر اسلام کی توجیہات کی دنیا میں علمائے دین کے اختلافات سے الگ رہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے نتائج صحیح ہوں تو علمائے دین اس کی روشنی میں اپنے اختلافات کو مٹا کر متحد ہو جائیں یا اگر اس کے اپنے نتائج درست نہ ہوں تو وہ مزید سائنسی تحقیق کی روشنی میں اپنے نتائج کو درست کر کے اتفاقاً اسلام کی کسی اور توجیہ کے ساتھ متفق ہو جائے۔

سوئم: سائنس کی سیدھی راہ سے انحراف کا علاج

تیسری بات جو ہمیں مدِ نظر رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ سائنس کا راستہ فقط ایک ہی ہے اور وہ ایک سیدھی سڑک کی طرح ہے جس کی ہر اگلی منزل پچھلی منزل پر منحصر ہوتی ہے اگر سائنس کسی مقام پر غلط ہو کر اس راستے سے ذرا ہٹ جائے تو پھر وہ ایک غلط راستہ اختیار کرتی ہے اور ہر روز اور زیادہ غلط ہوتی جاتی ہے اور اس کا راستہ سائنس کے اصلی راستے سے ہر قدم پر اور دور ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں سے آگے کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا اور یہاں آکر غلط راستے پر اس کی مزید ترقی رک جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم چاہیں کہ سائنس پھر اپنے اصلی اور صحیح راستے پر آجائے تو ہمیں اس کو پھر اسی مقام پر واپس لانا پڑے گا جہاں سے اس کا راستہ بدل گیا تھا اور اس غلط سائنسی حقیقت کو درست کرنا پڑے گا جس کی نادرستی کی وجہ سے اس کا راستہ ابتدا میں غلط ہوا تھا اور اس کی مزید غلطیاں ظہور پذیر ہوئی تھیں۔ اس غلط سائنسی حقیقت کو درست کرنے کے بعد خود بخود اس کی ساری بعد کی غلطیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ عیسائی مغرب کے سائنسی علوم میں سے ہر ایک کس کس مقام پر غلط راہ سے چل نکلا ہے۔ جہاں اسے پھر واپس لا کر صحیح راستے پر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک ریل گاڑی جو ایک خاص منزل کی طرف جا رہی ہو، راستے کے کسی

اسٹیشن پر کانٹا غلط بدلنے سے کسی غلط لائن پر آ جائے اور پھر دور تک اسی پر نکل جائے۔ اگر ہم چاہیں کہ اس کو پھر صحیح لائن پر لے آئیں تو ہم اس کو بعینہ اس مقام پر جہاں سے اس کا کانٹا غلط طور پر بدل دیا گیا تھا واپس لانے کے بعد ہی ایسا کر سکتے ہیں لیکن جب ہم ایک دفعہ اس کو صحیح راستے پر ڈال دیں تو پھر وہ خود بخود صحیح راستے پر چلتی جاتی ہے۔

طبیعیاتی علوم کی تشکیل جدید

طبیعیاتی علوم Physical Sciences میں نصابی کتب کو نئے سرے سے ترتیب دینے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ عیسائی مغرب کی سائنس میں علم طبیعیات کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے:

"طبیعیات مادّہ کا علم ہے"

Physics is the science of matter

لیکن اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ تعریف غلط ہے کیوں کہ اس کے اندر یہ خیال مضمر ہے کہ مادہ کوئی ایسی چیز ہے جو خود بخود موجود ہے اور جس کا علم ہمیں اس کو جاننے کی خاطر حاصل کرنا چاہیے حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں۔

یہ تعریف دہریت کے امکان کو تسلیم کرتی ہے اور اس کے لیے راستہ کھلا چھوڑتی ہے لیکن قرآن کی تعلیمات کے مطابق مادّہ حتمی طور پر خدا کی خالقیت اور ربوبیت کی وجہ سے موجود ہے۔ وہ اپنا کوئی بالذات وجود نہیں رکھتا بلکہ اپنے خالق کی خالقیت اور ربوبیت کا ایک نشان (یا آیۃ اللہ) ہے لہٰذا اس کا جو علم ہو گا وہ پہلے اس کے خالق اور رب کا علم ہو گا اور بنیادی طور پر ہمیں اس کا علم حاصل کرنے کی ضرورت اس لیے ہو گی تاکہ ہم اس کے خالق کی خالقیت اور ربوبیت کو جانیں اور پہچانیں۔ لہٰذا قرآن کے فلسفۂ علم کے مطابق طبیعیات کی صحیح تعریف یہ ہوگی:

"طبیعیات خدا کے اس تخلیقی اور تربیتی عمل کی سائنس ہے جو مادی دنیا میں ظہور پذیر ہوا ہے۔"

"Physics is the science of the creative activity of God as it manifests itself in that part of His creation which is the world of matter."

اگر طبیعیات کی درسی کتاب لکھنے والا ماہر طبیعیات اس تعریف کو مدنظر رکھے گا تو پھر وہ ہر طبیعیاتی

حقیقت کو خدا کی خالقیت و ربوبیت کا مظہر سمجھے گا اور اس کو طالب علم کے سامنے اسی حیثیت سے پیش کرے گا۔ عیسائی سائنس دانوں کی تحقیقات کے مطابق مادّے کے وجود اور مادی دنیا کے ارتقا کا باعث برقی قوّت ہے۔ برقی رو کے مثبت اور منفی قطبوں کی باہمی کشش ہر قدم پر مادّی دنیا کی تعمیر اور ترقی کا سبب بنتی رہی یہاں تک کہ مادّی دنیا اپنی موجودہ حالت تکمیل تک پہنچ گئی۔ مادّہ کے تمام قوانین برقی قوّت کے عمل کی مختلف شکلیں ہیں۔ سب سے پہلے کسی نامعلوم قوّت کے زیرِ اثر برقی روشنی کی کرنیں کائناتی شعاعوں کی صورت میں وقت اور فاصلہ کی ایک بسیط فضا میں پھیل گئیں۔ پھر ان کائناتی شعاعوں نے برقی لہروں کی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں کی صورت اختیار کر لی جنھیں الکٹران اور پروٹان کہا جاتا ہے پھر ان گٹھڑیوں کی باہمی کشش کی وجہ سے مختلف ترکیبوں کے یعنی مختلف عناصر کے جواہر (ایٹم) تیار ہوئے اور بعد کے طبیعیاتی ارتقا کی ساری منزلیں طے ہوئیں۔ ان منزلوں کے طے ہونے کے بعد ہی مادّہ کے اندر وہ اسرار و خواص پیدا ہوئے جن میں سے بعض کو آج ہم جانتے ہیں اور جن کی پوری تحقیق علم طبیعیات کا موضوع ہے لیکن عیسائی مغرب کے ماہرینِ طبیعیات یہ نہیں بتاتے کہ برقی قوّت کہاں سے آئی تھی اور جن تخلیقی اور ترتیبی خصوصیات کی وہ حامل ثابت ہوئی ہے وہ اس میں کہاں سے آگئی تھیں۔

بیسویں صدی کے بعض مقتدر ماہرینِ طبیعیات ایک قدم آگے بڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ برقی توانائی بھی مادّے کی آخری حقیقت نہیں اور خود برقی توانائی کی حقیقت ایک شعوری یا ذہنی قوّت ہے۔ چناں چہ اس نتیجے کی وضاحت کرنے کے لیے، ایڈنگٹن اور جیمز جینز ایسے نامور ماہرینِ طبیعیات نے کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن یہ سائنس دان بھی ہمیں نہیں بتاتے کہ اس ذہن یا شعور کے اوصاف و خواص کیا ہیں جو ان کے نزدیک مادّے کی آخری حقیقت ثابت ہوا ہے۔

ایڈنگٹن اسے شعوری مواد (Mind-stuff) کہتا ہے گویا اسے شعور قرار دینے کے بعد پھر بھی مادّہ سے الگ نہیں کرتا بلکہ ایک قسم کا مادّہ ہی سمجھتا ہے اور جیمز جینز یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا ہے کہ یہ شعور ایک ریاضیاتی ذہن (Mathematical Mind) ہے یعنی ریاضیات جانتا ہے۔

دراصل چوں کہ عیسائی دنیا کے سائنس داں اس نامعقول عقیدہ یا تعصّب سے آغاز کرتے ہیں کہ خدا کے عقیدے کو سائنس سے الگ رہنا چاہیے وہ اپنے مشاہدات کی واضح دلالت کے باوجود اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ شعور جو حقیقتِ کائنات ثابت ہوتا ہے محض شعور ہی نہیں بلکہ ایک شخصیت ہے جو کائنات کی خالق اور رب ہے اور شخصیّت کی دوسری صفات کی مالک ہے۔ انسانوں کے مشاہدات کے مطابق ایسا شعور ایک شخصیت ہی کا خاصّہ ہے اور ضروری ہے کہ وہ جہاں بھی ہو شخصیّت کی صفات کا مالک ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سائنسداں

اپنے تجربات اور مشاہدات سے اس نتیجے پر تو پہنچ جائے کہ فلاں جگہ دھواں موجود ہے لیکن اس نتیجے پر پہنچنے سے گریز کرے کہ وہاں آگ بھی ہے حالاں کہ انسانوں کے مشاہدات کے مطابق دھواں کبھی آگ کے بغیر نہیں ہوتا۔ اور وہ گریز اس لیے کرے کہ اس نے یہ اصول پہلے ہی سے طے کرلیا ہے کہ وہاں آگ کو نہیں ہونا چاہیے۔ سائنس دانوں کا یہ تعصب اس بات کا ثبوت ہے کہ سائنس دان جس تصورِ حقیقت سے اپنی سائنسی تحقیق کا آغاز کرتا ہے آخر تک اس کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ اور یہ بات قرآن کے اس ارشاد کی صداقت کی بھی ایک دلیل ہے کہ جب آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود انسان صحیح نتائج پر نہ پہنچ سکے تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ تعصب نے دلوں کو اندھا کر دیا ہے۔

فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور

قرآن کی تعلیم

اس کے برعکس قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ خدا نے کائنات اور کائنات کی ہر چیز کو اپنے حکم سے پیدا کیا ہے۔ وہی کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا پرورش کنندہ اور کارساز ہے۔

اللہ خالق کل شی وھو علی کل شی وکیل۔

(ترجمہ) خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ہر چیز کا کارساز بھی ہے۔

انما امرہ اذا ارادشیئا ان یقول لہ کن فیکون۔

(ترجمہ) بے شک اس کے حکم کی کیفیت یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے، ہو جا، اور وہ ہو جاتی ہے۔

لہٰذا جب ہم عقیدۂ توحید کی روشنی میں موجودہ طبیعیاتی علوم پر نظرِ ثانی کریں گے تو ہمیں ان تمام علوم کا بنیادی تصور یہ قرار دینا پڑے گا کہ بیسویں صدی کے ماہرین طبیعیات مثلاً جیمز جینز اور ایڈنگٹن کا یہ خیال درست ہے کہ حقیقت کائنات ایک ریاضیاتی شعور ہے لیکن ریاضیاتی شعور شخصیت کے باقی اوصاف کے بغیر نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ ریاضیاتی شعور خدا ہے جو کائنات کا خالق اور رب ہے اور حکیم و علیم ہے۔ برقی قوت از خود موجود نہیں ہوئی تھی بلکہ خدا کے حکم سے اور قول کُن سے پیدا ہوئی تھی۔ گویا خدا کے ارادۂ تخلیق کی قوت یا اس کے قول کن کی قوت نے ہی برقی قوت کی صورت اختیار کی تھی۔ ادھر خدا نے قول کُن کہا اور ادھر برقی قوت کارفرما ہو گئی۔ اور برقی قوت کی صفات بھی ایک عمل تخلیق میں سے گزری ہیں اور اس عمل کے دوران میں اُس کی ہر خاصیت بروقت ضرورت، ایک خاص مقصد کے ماتحت مادے کی مکمل تدریجی تخلیق اور تربیت کے لیے خدا کے

حکم سے وجود میں آئی تھی اور اس وقت سے لے کر مستقل طور پر اس میں موجود چلی آتی ہے۔ پھر الکٹرانوں اور پروٹانوں کا مل کر مختلف عناصر کو ترتیب دینا اور مادے کی دوسری خاصیتوں کا مادی ارتقا کے قدم قدم پر ایک ایک کر کے ظہور پانا خدا کے حکم سے ممکن ہوا ہے ورنہ مادہ کے اندر اس قسم کے ارتقا کی منزلیں خود بخود طے کر لینے کی کوئی صلاحیت موجود نہ تھی مثلاً (Oxygen) اور (Hydrogen) میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جس سے وہ مل کر پانی بنا دیں اور پانی کے وجود میں آنے سے پہلے کوئی سائنس داں آکسیجن اور ہائیڈروجن کی خاصیات کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ نہ کر سکتا تھا کہ ان کا ایک خاص نسبت سے کیمیاوی ترکیب پانا ممکن ہے اور ان کی ترکیب کا نتیجہ پانی ایسے ایک سیّال کی صورت میں رونما ہوگا۔ ان کا مل کر پانی بن جانا خدا کے حکم سے ممکن ہوا ہے۔ ارتقاے ابداعی (Emergent Evolution) کا نظریہ قرآن کے اس نظریے کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے اگرچہ اس کے عیسائی قائلین اپنے مخصوص عیسائیت نواز فلسفۂ علم کی وجہ سے اس بات کا اعتراف نہیں کرتے کہ کائنات کے عمل ارتقا کے ہر قدم پر جو غیر متوقع لیکن معنی خیز تغیرات اس کو وجود میں لاتے رہے ہیں اور لا رہے ہیں ان کا آخری سبب کسی قادر مطلق خدا کے ارادۂ تخلیق کی قوت ہے۔

حیاتیاتی علوم کی تشکیلِ جدید

اسی طرح سے حیاتیاتی علوم (Biological Sciences) میں درسی کتابوں پر نظرثانی کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے حیاتیات کی تعریف پر نظرثانی کرنا چاہیے۔ مغربی عیسائی سائنس دانوں نے حیاتیات کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"حیاتیات زندگی (یعنی زندہ اجسام) کی سائنس ہے۔"

Biology is the science of life.

لیکن طبیعیات کی تعریف کی طرح ان کی یہ تعریف بھی غلط ہے کیوں کہ اس میں بھی اس بات کو نظرانداز کیا گیا ہے کہ زندگی خود بخود موجود نہیں بلکہ خدا نے پیدا کی ہے اور خدا کی خالقیت اور ربوبیت کا ایک مظہر ہے۔ لہٰذا حیاتیات کی صحیح تعریف اس طرح سے کی جائے گی۔

"حیاتیات خدا کے اس تخلیقی اور تربیتی عمل کی سائنس ہے جو خدا کی تخلیق کے اس حصے میں جسے ہم جان دار اجسام کی دنیا کہتے ہیں ظہور پذیر ہوا ہے۔"

"Biology is the science of the creative activity of God as it manifests itself in the world of life".

حیاتیاتی علوم کے بارے میں عیسائی مغرب کے سائنس دانوں کی تحقیق یہ ہے کہ جب مادہ اپنے ارتقا کی انتہا کو پہنچ گیا تو بعض نامعلوم اسباب کے ماتحت سمندروں کے کناروں پر کسی جگہ کیچڑ میں ایک زندہ خلیہ نمودار ہوا جسے اب امیبا کہا جاتا ہے۔ یہ خلیہ خود بخود خوراک حاصل کرنے اور زندہ رہنے کے لیے جدّوجہد کرنے لگا لہٰذا زندہ رہی اور اس کی نسل ترقی کرتی رہی۔ اس کی نسل کے افراد کی جسمانی ساخت میں بغیر کسی وجہ کے قدرتی طور پر ہر قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہیں جن کے جمع ہو جانے سے بعض نئی قسم کے جان دار ظہور میں آتے رہے۔ وہ جان دار جن کی جسمانی تبدیلیاں ایسی تھیں کہ وہ ان کو اتفاقاً کشمکش حیات کے لیے موزوں بناتی تھیں زندہ رہے اور باقی کشمکش حیات کے اس امتحان میں ناکام ہو کر موت کے گھاٹ اتر گئے۔ گویا کشمکش حیات کی ضرورت کی وجہ سے قدرت خود بخود بقائے اصلح کی وجہ سے زندہ رہنے کے قابل جان داروں کا انتخاب کرتی رہی۔ یہ کشمکش حیات اور بقائے اصلح اور قدرتی انتخاب کے بے مقصد اور بے پروا اصولوں کی کارفرمائی تھی۔ اس طرح سے جو نئی انواع حیوانات وجود میں آتی رہیں ان میں سے ایک انسان ہے۔ جو قدرت کی محولہ بالا اندھا دھند قوتوں کے عمل سے اتفاقاً پیدا ہو گیا ہے۔ ان سائنس دانوں کا خیال ہے کہ نوع انسانی اتفاقاً جن حیاتیاتی تعمیرات میں سے گزری ہے چوں کہ وہ اس کی حیاتیاتی تعمیر کے اندر راسخ ہو گئے ہیں لہٰذا انسانی جنین ماں کے رحم کے اندر ان کا اعادہ کرتا ہے۔ چوں کہ یہ نظریہ جو انیسویں صدی میں پیش کیا گیا تھا عیسائیت کے لادینی فلسفۂ علم کے عین مطابق تھا۔ اس لیے اسے اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ نظریہ اب بھی ہکسلے (JULIAN HUXLEY) ایسے نامور ماہرین حیاتیات کے نزدیک حیاتیاتی ارتقا کا معیاری نظریہ ہے لیکن چوں کہ یہ نظریہ مشاہدے میں آنے والے بعض قدرتی حالات اور واقعات کے خلاف تھا لہٰذا بعض عیسائی سائنس دانوں نے اس کی تردید کی جن میں برگسان (BERGSON) اور ڈریش (DRIESCH) زیادہ مشہور ہیں اس کے بالمقابل نظریات پیش کیے جن میں قدر مشترک یہ ہے کہ خود جان دار کے جسم کے اندر ایک باشعور تخلیقی قوت کارفرما ہے جسے قوت حیات کہنا چاہیے۔ ڈریش نے بالخصوص جان داروں کے جنین پر تجربات کر کے یہ دریافت کیا کہ یہ قوت حیات مزاحمتوں کے باوجود اپنی طے کی ہوئی سمت میں جان دار کی نشوونما کرتی ہے۔ لہٰذا اپنے مقصد کو جانتی اور اس کے حصول پر قدرت رکھتی ہے اور اس کا مقصد جان دار کی تربیت اور جسمانی نشوونما کرنا ہے جس میں اس کی صحت اور تندرستی کو قائم رکھنا بھی شامل ہے۔ ماں کے رحم کے اندر انسانی جنین کے بامقصد اور بامعنی تغیرات اسی قوت کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں۔ یہی قوت جان دار کی جسمانی ساخت کو بہتر بنا کر اسے ایک

اور زیادہ ترقی یافتہ جان دار کی صورت میں بدلنے کا موجب ہوتی ہے۔ اسی قوت کے عمل کی وجہ سے ہی انواع حیوانات میں وہ حیاتیاتی ارتقا ہوتا رہا ہے جس کا منتہائے کمال انسان کا ظہور ہے برگسان اور ڈریش نے اپنے ان نتائج سے جو آخری نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ یہی باشعور قوت حیات، حقیقت کائنات ہے۔ لیکن ان کے نتائج یہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ ماہرین حیاتیات بھی اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ حقیقتِ کائنات شعور ہے یہ کہنے سے گریز کرتے ہیں کہ یہ شعور ایک شخصیت ہے جو قادر مطلق ہے اور کائنات کی خالق اور رب ہے اور اس کی وجہ پھر عیسائی مغرب کا وہی غیر سائنسی عقیدہ ہے کہ سائنس کو خدا کے عقیدے سے الگ رہنا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مغرب کا علم حیاتیات اپنے صحیح راستے سے ہٹ گیا ہے اور اس سے اس کا ہٹ جانا نفسیاتی اور انسانی علوم کی ترقی کے لیے ایک بہت بڑی رکاوٹ کا موجب ہوا ہے۔

ان نظریات کے بالمقابل قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ وہ قوت حیات جو حیاتی ارتقا کا باعث ہے جو جان دار کے جسم کے اندر اس کی تخلیق و تربیت کے لیے کارفرما ہے اور جو رحم مادر کے اندر انسانی جنین کے بامقصد اور بامعنی تغیرات کا باعث ہے خدا کے ارادہ تخلیق و تربیت کی قوت ہے۔

ثم جعلنہ نطفة فی قرار مکین۔ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا مضغة عظاماً فکسونا العظام لحما۔ ثم انشانہ خلقاً آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین

(ترجمہ) پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا ایک ٹھہر جانے اور جما ؤ پانے کی جگہ میں۔ پھر نطفہ کو ہم نے علقہ بنایا پھر علقہ کو ایک گوشت کا ٹکڑا سا کر دیا پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ پیدا کیا۔ پھر ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی۔ پھر دیکھو اسے کس طرح ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا۔ تو کیا ہی برکتوں والی ہستی ہے اللہ کی۔ پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا۔

فاذا مرضت فھو یشفین۔

(ترجمہ) جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ خدا مجھے شفا بخشتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن کے نقطہ منظر کے مطابق سبب ارتقا کا پہلا نظریہ جسے ڈارون اور اس کے ہم خیالوں کی حمایت حاصل ہے قطعی طور پر غلط ہے لیکن برگسان (BERGSON) اور ڈریش (DRIESCH) کے نظریات قرآن کے نظریے سے زیادہ قریب ہیں۔ قرآن کے اس نظریے کے مطابق جب ہم حیاتیاتی علوم میں درسی کتابوں کی تشکیل کریں گے تو ہمیں ان علوم کا بنیادی

تصور یہ قرار دینا پڑے گا کہ برگساں اور ڈریش ایسے ماہرین حیاتیات کا یہ خیال درست ہے کہ جان دار کے جسم کے اندر ایک باشعور اور بامقصد قوت حیات کار فرما ہے جو ایک خاص طے شدہ شکل و صورت اور مقصد اور مدعا کے مطابق جان دار کی نشو و نما کرتی ہے۔ اس قوت کا عمل اگرچہ جان دار کی نشو و نما کے لیے ظہور پاتا ہے تاہم وہ جان دار کے اپنے اختیار اور ارادے سے باہر ہوتا ہے جس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ قوت کوئی مادی یا حیاتیاتی قوت نہیں جو اتفاقاً جان دار کے جسم کے اندر پیدا ہو گئی ہے بلکہ ایک قادر مطلق رحیم و کریم، خالق اور رب خدا کے ارادۂ تخلیق و تربیت کی قوت ہے جو محض اس کے قول کُن سے کارفرما ہو گئی ہے۔ یہی قوت مادی مرحلۂ ارتقا میں برقی قوت کی صورت میں اپنا کام کر رہی تھی اور یہی قوت حیاتیاتی عمل ارتقاء کو لاکھوں برس تک ایک خاص سمت میں متواتر آگے دھکیلتی رہی یہاں تک کہ جسم انسانی ظہور پذیر ہوا۔ حیاتیات میں اس تصور کے داخل کرنے سے علم حیاتیات پھر اپنی ترقی کے صحیح راستے پر آجاتا ہے اور انسانی اور نفسیاتی علوم کی صحیح راہ نمائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

نفسیاتی علوم کی تشکیل جدید

نفسیاتی اور انسانی علوم کے دائرے میں خدا اور سائنس کی بے تعلقی کے نظریہ پر اصرار کرنے والے مغربی سائنس دانوں کی پراگندہ خیالی اس سے کہیں زیادہ ہے جو ہمیں ان کے حیاتیاتی علوم میں نظر آتی ہے۔

ان میں سے ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو سرے سے انکار کرتے ہیں کہ ہمیں یہ فرض کرنے کی ضرورت ہے کہ انسانی اعمال و افعال کا سرچشمہ کوئی ایسی چیز ہے جسے نفس انسانی (Human Mind) کہا جاتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ انسان فقط کسی بیرونی محرک (Stimulus) سے متاثر ہو کر اور اس کے جواب (Response) میں کسی کردار (Behaviour) کا اظہار کرتا ہے۔ انسان کا نفس یا ذہن ہمیں نظر نہیں آتا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ در حقیقت موجود ہے لیکن ہم انسان کے کردار کو دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہ واٹسن (WATSON) اور اس کے شاگرد ہیں جو کرداریت کے حامی ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک نفسیات کی تعریف یہ ہے:

"نفسیات کردار کا علم ہے"

"Psychology is the science of behaviour".

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو نفسِ انسانی کے وجود کے قائل تو ہیں اور نفسیات کی تعریف اس طرح سے کرتے ہیں:

"نفسیات، نفس انسانی کا علم ہے"

"Psychology is the science of mind."

لیکن نفس انسانی کے بلند ترین وظائف کو جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں انسان کی حیوانی فطرت کے بعض تقاضوں کی پیداوار اور ان ہی کا خدمت گزار سمجھتے ہیں۔ یہ دوسرا گروہ فطرت انسانی کے بارے میں جن حقائق پر اب تک متفق ہو سکا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) انسان کی بعض خواہشات ایسی ہیں، جو حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہیں اور وہ انسان کی حیوانی جبلتیں ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ حیوان یا انسان ان کی تشفی کر کے اپنے آپ کو اور اپنی نسل کو قائم رکھ سکے۔

(۲) انسان کی بعض خواہشات ایسی ہیں جو انسان سے خاص ہیں اور جن میں حیوان اس کے ساتھ شریک نہیں۔ ان سب خواہشات کا مقصد کسی نہ کسی صورت میں حُسن کی طلب ہے اور ان میں سب سے بڑی اور مرکزی خواہش کسی ایسے تصور کی محبت یا جستجو کی خواہش ہے جس کی طرف انسان حُسن کے بعض اوصاف سے منسوب کرتا ہو۔ اس قسم کے تصورِ حُسن کو نظریہ یا النصب العین (Ideal) بھی کہا جاتا ہے۔

(۳) انسان کی فطری خواہشات میں سے ایک خواہش ایسی ہے جو اس کی تمام خواہشات پر جن میں اس کی حیوانی جبلتیں بھی شامل ہیں، حکمراں ہے اور اس کے سارے اعمال و افعال کو اپنے ماتحت منظم کرتی ہے۔ گویا ایسی خواہش انسانی افعال کی قوتِ محرکہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان کے سارے اعمال و افعال کے اندر ایک وحدت ہے جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ہر فرد انسانی ایک شخصیت، یا انفرادیت رکھتا ہے۔

لیکن اگر انسان کی کوئی خواہش ایسی ہے جو اس کے سارے اعمال و افعال کی قوتِ محرکہ اور منظمہ ہے تو ضروری ہے کہ انسان کے تمام انفرادی اور تمام اجتماعی مشاغل خواہ وہ اخلاقی ہوں یا سیاسی، یا اقتصادی، یا قانونی، یا تعلیمی، یا علمی، یا فنی اسی کے مظاہر ہوں اور تمام انسانی علوم یعنی فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اقتصادیات، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ قانون، فلسفۂ تعلیم، فلسفۂ علم اور فلسفۂ فن وغیرہ اسی پر مبنی ہوں اور اس کی ماہیئت اور حقیقت کے مختلف پہلوؤں کے فلسفے ہوں اور اسی کے وظائف کے تشریحی اور تفصیلی علوم ہوں۔ انسان کی یہ خواہش گویا تمام انسانی علوم کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ خواہش جس قدر اہم ہے اسی قدر اس دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والے عیسائی مغرب کے سائنس دان اس کی نوعیت اور حقیقت کے متعلق کوئی یقینی یا قطعی رائے قائم

کرنے سے قاصر ہیں۔ انھوں نے اس کے متعلق جتنے نظریات قائم کیے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا مدلّل اور منظّم نہیں کہ انسانی فعلیتوں میں سے کسی فعلیت کے فلسفے کی بنیاد اس پر رکھی جا سکے۔ چناں چہ مغربی فلسفیوں میں سے (سوائے کارل مارکس کے جس کا فلسفہ محرک اعمال انسانی فطرت انسانی کے حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا اور لہٰذا درست نہیں ہو سکتا) کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اپنے فلسفۂ سیاست یا فلسفۂ جمالیات یا فلسفۂ اقتصادیات یا فلسفۂ قانون یا فلسفۂ تعلیم یا فلسفۂ علم یا فلسفۂ جمالیات یا فلسفۂ تاریخ کی بنیاد انسانی اعمال کی قوتِ محرکہ کے کسی واضح فلسفے پر رکھی ہو۔ ان میں سے ایک فریق کا خیال یہ ہے کہ انسانی اعمال کی قوتِ محرکہ جبلت جنس ہے اور نظریات یا نصب العین جبلت جنس سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے خدمت گزار ہیں جب انسان کی جبلتی خواہشات اپنا صحیح اظہار نہیں پا سکتیں تو وہ بگڑ کر کسی نظریے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں تاکہ انسان ان سے ایک قائم مقام تسلی حاصل کر سکے۔ یہ فرائڈ اور اس کے شاگرد ہیں۔ دوسرا فریق یہ سمجھتا ہے کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ، جبلت تفوق یا جبلت استیلا ہے اور نظریات جبلت استیلا سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب انسان کی جبلت تفوق مطمئن نہیں ہو سکتی تو انسان کوئی ایسا بلند قسم کا خیالی نظریہ پیدا کر لیتا ہے جو اس کی مسدود خواہش تفوق کی تشفی کر سکے اور پھر اس کی جستجو کرنے لگتا ہے۔ یہ ایڈلر اور اس کے شاگردوں کا گروہ ہے۔ ایک اور فریق یہ سمجھتا ہے کہ انسان کے اعمال کا سرچشمہ تمام جبلتوں کا مجموعہ ہے اور نظریات جبلتوں کے ایک نفسیاتی مرکب سے جسے وہ جذبۂ ذات اندیشی (Sentiment of self-regard) کہتے ہیں پیدا ہوتے ہیں اور پھر جبلت تفوق اس مرکب کو اکساتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی نظریے کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے یہ خیال میکڈوگل اور اس کے ہم نواؤں کا ہے ایک اور فریق یہ سمجھتا ہے کہ انسانی اعمال کی قوت محرکہ، جبلت تغذیہ یا ضرورت خوراک ہے جس میں وہ موسم کے مطابق لباس اور آفات سے امن مکان بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب انسانی زندگی کی یہ بنیادی ضرورتیں ٹھیک طرح سے پوری نہیں ہوتیں تو وہ فرض کر لیتا ہے کہ اس کو ان چیزوں کی نہیں بلکہ کسی نظریے یا نصب العین کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ کوئی مناسب خیالی نظریہ پیدا کر لیتا ہے جس کے تتبع کے پردے میں وہ درحقیقت اپنی اقتصادی ضرورتوں کی تشفی کا سامان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ دراصل اس کا نظریہ اس کی اقتصادی ضرورتوں کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہوتا ہے۔ یہ کارل مارکس اور اس کے شاگردوں کا نظریہ ہے۔ ان نظریات میں سے ہر نظریے کے اندر عقلی اور علمی نقطۂ نظر سے بہت سی کمزوریاں اور خامیاں ہیں جن کی وجہ سے ہر نظریہ ناتسلی بخش ہے۔ ان تمام نظریات میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی ایک حیوانی جبلت کو یا تمام حیوانی جبلتوں کو انسان

کے اعمال کا محرک قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے موجد فلسفیوں کے ذہن خدا اور سائنس کے افتراق کی فضا میں نشوونما پاتے ہوتے ہیں۔ ڈارون کے نظریے کے زیر اثر ان کا خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے مادہ تھا۔ مادے سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ اور کسی قادر مطلق خدا کا ارادۂ تخلیق مادے کے ظہور کا سبب نہ تھا۔ مادے کے بعد حیوان وجود میں آیا اور حیوان سے انسان پیدا ہوا۔ لہٰذا اگر انسان میں کوئی ایسی خواہش ہے جو حیوان میں نہیں تھی مثلاً یہی نظریہ یا نصب العین کی محبت تو وہ لامحالہ حیوان کی بعض خواہشات سے جن کو جبلتیں کہا جاتا ہے پیدا ہوسکتی ہے ورنہ اس کا وجود ممکن نہیں لہٰذا یہ جبلتیں ہی ہیں جن میں سے کوئی ایک یا جن کا مجموعہ آخر کار انسان کے اعمال کی قوت محرکہ ہے۔

اس کے برعکس قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کے سارے اعمال و افعال کی قوت محرکہ خدا کی محبت ہے جو کائنات کا خالق اور رب ہے۔ خدا کی محبت خدا کی ستائش اور عبادت اور اطاعت کا تقاضا کرتی ہے اور یہ وہ اعمال ہیں جن کو دین کہا جاتا ہے۔ اس دین پر یکسوئی سے قائم رہنا یعنی ان تمام خواہشات کو جو اس سے ہٹانے والی ہوں ترک کرنا اور اپنے تمام اعمال کو اس کے تابع رکھنا اور اسی کو اپنے سارے اعمال کا محرک بنانا نوع انسانی کی فطرت ہے جو مستقل اور محکم ہے اور تبدیل نہیں ہوسکتی۔ اور چوں کہ یہ دین انسانی فطرت کی پختہ اور محکم بنیادوں پر قائم ہے لہٰذا پختہ اور محکم ہے۔

اقم وجهك للدين حنيفاً فطرة الله التى فطر الناس عليها لاتبديل لخلق الله ذالك الدين القيم۔

(ترجمہ) اے پیغمبر دین پر یکسوئی سے قائم رہیے یہ خدا کی پیدا کی ہوئی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے خدا کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی یہی دین محکم ہے۔

خدا نے انسان کو سوائے عبادت کے کسی اور کام کے لیے پیدا ہی نہیں کیا۔ خدا کی عبادت کا جذبہ اس کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے اور عبادت یہ ہے کہ انسان کسی کام کو خدا کی محبت اور رضامندی کے لیے کرے۔ گویا اگر انسان اپنی فطرت کا پابند رہے تو خدا کی محبت کے سوائے اس کے اعمال کا کوئی اور محرک نہیں ہوسکتا۔

ماخلقت الجن والانس الا ليعبدون۔

(ترجمہ) میں نے جنوں اور انسانوں کو سوائے عبادت کے اور کسی غرض کے لیے پیدا نہیں کیا۔

حضورؐ کو یہ حکم ہوا کہ کہہ دیجیے کہ میری نماز اور قربانی ہی نہیں بلکہ میرا جینا اور مرنا ہر چیز خدا کی عبادت کے لیے وقف ہے۔

اور اس میں خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنا یعنی اپنی زندگی کے بعض اعمال کو خدا کے لیے وقف کرنا اور بعض کو غیر اللہ کے لیے وقف کرنا جس میں میری ذات بھی شامل ہے ممکن نہیں۔ مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں اس کے حکم کے سامنے سب سے پہلے سر جھکاتا ہوں۔

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لاشریک لہ وبذالك امرت وانا اول المسلمین۔

(ترجمہ) اے پیغمبرؐ کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور موت سب اللہ کے لیے ہیں جو اہل جہاں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

ان آیات مبارکہ کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ اگر انسان کے تمام اعمال و اشغال خدا کی محبت کے لیے سرزد ہوں تو یہ اس کی فطرت کا عین تقاضا ہوگا۔

قرآن حکیم نے انسان کی جبلی خواہشات اور نصب العینی یا نظریاتی خواہشات کے باہمی تعلق کی وضاحت کر دی ہے۔ انسان کی جبلی حیوانی قسم کی خواہشات کو قرآن کی اصطلاح میں ہوا کہا گیا ہے۔ جب انسان خدا کی محبت کو چھوڑ کر اپنی کسی جبلی خواہش کو اپنے اعمال کا محرک بناتا ہے تو وہ اپنی اس خواہش کو خدا کا مقام دیتا ہے کیوں کہ انسان کی فطرت کی رو سے خدا کی محبت ہی کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ انسان کے اعمال کا محرک بنے۔

افرایت من اتخذ الٰہہ ھواہ۔

(ترجمہ) اے پیغمبرؐ کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی جبلی خواہشات کو اپنا خدا بنالیا ہے۔

انسان کا جو عمل خدا کی محبت کے لیے سرزد ہو وہ عمل صالح ہے اور جو اس کی جبلی یا حیوانی خواہشات کے ماتحت اور ان ہی کی اعانت یا خدمت کے لیے سرزد ہو وہ غیر صالح ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے سارے اعمال صالح ہوں اور اس کا کوئی ایک عمل بھی غیر صالح نہ ہو یعنی اس کے سارے اعمال خدا کی محبت کے سرچشمہ سے نکلیں اور خدا کی محبت ہی ان کا محرک بنے۔ عمل صالح کو عمل غیر صالح سے مخلوط کرنا انسان کی فطرت نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے اور توبہ کرنے سے وہ نجات تو پا جائے گا لیکن خدا کے مقربین

میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

وآخرین اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملاً صالحاً وغیر ذالک سیاً

(ترجمہ) اور دوسرا گروہ جنھوں نے گناہوں کا اعتراف کرلیا اور عملِ صالح کو عملِ غیر صالح سے خلط ملط کر دیا۔

مومن خدا کی محبت کے تقاضوں پر سختی سے کاربند رہتا ہے اور اپنے کسی عمل کو ان تقاضوں کے خلاف سرزد نہیں ہونے دیتا۔

والذین اٰمنوا اشدّ حباللہ

(ترجمہ) وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا عمل خدا کی محبت کے تقاضوں کے مطابق سرزد نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ خدا کو مانتے نہیں یا کسی اور سبب سے تو قرآن کی رو سے ان کا فطری محرکِ عمل کیوں کام نہیں کرتا۔ قرآن حکیم اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ ان کا فطری محرکِ عمل برابر اپنا کام کر رہا ہوتا ہے لیکن وہ اللہ کو نہ جاننے یا کم جاننے کی وجہ سے اللہ کی صفاتِ حُسن و کمال کسی غیر اللہ کے وجود کے تصور کو سونپ کر اسی کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ پھر اسی کی محبت ان کے اعمال کا محرک بن جاتی ہے اور ان کی باقی تمام خواہشات کو اپنے ماتحت کر لیتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ خدا کی محبت مومن کے اعمال کا محرک ہوتی ہے اور مومن کی باقی خواہشات کو اپنے ماتحت کر لیتی ہے۔

و اتخذوا من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ۔

(ترجمہ) اور انھوں نے خدا کو چھوڑ کر بعض معبود بنا لیے ہیں جن سے وہ ایسی محبت کرتے ہیں جو فقط خدا کے لائق ہے۔

لیکن قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ اس صورت میں کچھ عرصے کے بعد اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا تصورِ حُسن، درحقیقت ناقص ہے اور اپنے نقائص کی وجہ سے اس کے جذبۂ حُسن کو مطمئن نہیں کر سکتا اور اس کی محبت کی پیاس کو نہیں بجھا سکتا۔ ناقص اور غلط تصورِ حُسن یا ناقص اور غلط معبود ایک سراب کی طرح ہے، جس کے پاس ایک پیاسا اپنی پیاس بجھانے کے لیے آتا ہے لیکن جب وہ اس کے پاس پہنچ جاتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں پاتا۔

کسرابٍ بقیعۃٍ یحسبہ الظمان ماءً فاذا جاءہ لم یجدہ شیئاً

(ترجمہ) جنگل کے ایک سرابِ کی طرح کہ پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس آتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔

اس کا چاہنے والا ایسے شخص کی طرح ہے جو کوئیں کے پانی کی طرف پانی کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے لیکن محض ہاتھ پھیلانے سے پانی اسے کہاں مل سکتا ہے۔

الا کباسط کفیہ الی الماء لیبلغ فاہ وما ھو ببالغہ۔

(ترجمہ) اس شخص کی طرح جو پانی کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن وہ اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں۔

لہٰذا وہ اسے ترک کر کے کسی اور تصور کو اپنا معبود بناتا ہے۔ گویا ناقص تصور، ناقص ہی نہیں ہوتا بلکہ ناپائیدار بھی ہوتا ہے۔

مثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالھا من قرار۔

(ترجمہ) ایک ناپاک تصور کی مثال ایک ناپاک درخت کی طرح ہے جو زمین سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے اور اُسے پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔

مثل الذین اتخذوا من دونہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتاً ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت۔

(ترجمہ) وہ لوگ جنھوں نے خدا کو چھوڑ کر اوروں کو دوست بنایا ہے ان کی مثال مکڑی کی طرح ہے جو گھر بناتی ہے۔ بے شک تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے۔

اس کے بالمقابل خدا کا تصور پختہ اور پائیدار ہوتا ہے۔

ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا۔

(ترجمہ) اور جو شخص بتوں سے کفر کرتا ہے اور خدا پر ایمان لاتا ہے بے شک وہ ایک ایسے مضبوط حلقہ کو تھام لیتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

گویا قرآن حکیم کے نزدیک تصوراتِ حُسن یا نظریات کی محبت جس کی وجہ سے انسان تمام حیوانات پر فوقیت رکھتا ہے خود وہ قوت ہے جو انسان کے سارے اعمال کو حرکت میں لاتی ہے اور یہ قوت نہ تو جبلتِ جنس کی پیداوار اور خدمت گزار ہے اور نہ ہی جبلتِ تفوق کی نہ جبلتِ تغذیہ کی اور نہ ہی جبلتوں کے کسی مجموعے کی بلکہ وہ انسان کی فطرت کا ایک مستقل تقاضا ہے جو جبلتوں پر بھی حکمرانی کرتا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ اگر یہ قوت جبلتوں سے پیدا نہیں ہوئی تو کہاں سے آئی ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حیاتیاتی سطحِ ارتقا پر قوتِ حیات کہاں سے آئی تھی اور طبیعیاتی سطح

وجود پر برقی قوت کہاں سے نمودار ہوئی تھی قرآن مجید کی محولہ بالا آیات کے مطابق اس قوت کو اسی خالق کائنات نے پیدا کیا ہے جس نے حیاتیاتی سطح ارتقا پر قوت حیات کو پیدا کیا تھا تاکہ حیوانات کی نشوونما اور ارتقا کا باعث بنے اور جس نے مادی سطح ارتقا پر برقی قوت کو پیدا کیا تھا تاکہ عناصر کی نشوونما اور ارتقا کا باعث بنے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسانی سطح ارتقا پر تصور کی اس قوت کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ انسانی سطح ارتقا پر نوع انسانی کے اعمال کو حرکت میں لائے اور اس طرح سے اس کی تصوراتی اور نظریاتی نشوونما اور ارتقا کا باعث بنے۔

والله خلقكم وما تعملون۔

(ترجمہ) اور خدا نے ہی تم کو پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال و افعال کو بھی۔

دراصل جس طرح سے برقی قوت خدا کے قول "کُن" یا ارادہ تخلیق و تربیت کی قوت تھی جو مادی دنیا میں کارفرما تھی۔ یا جس طرح سے قوتِ حیات خدا کے قول کُن یا ارادہ تخلیق و تربیت کی قوت تھی جو حیاتیاتی دنیا میں کارفرما تھی اسی طرح سے نظریات کی محبت کی قوت خدا کے قولِ کُن یا ارادہ تخلیق کی قوت ہے جو انسانی سطح ارتقا پر کارفرما ہے۔ انسانی دنیا کے تمام مظاہر قدرت جو انسانی اعمال و افعال کی صورت اختیار کرتے ہیں اسی کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں۔ یہی وہ قوت ہے جو انسان کی سیاسی، سماجی، اخلاقی، اقتصادی، مذہبی، قانونی، علمی، تعلیمی، جمالیاتی اور عسکری اعمال و افعال کا منبع اور مصدر ہے اور ساری تاریخ کا تار و پود بناتی ہے۔

والله خلقكم وما تعملون۔

(ترجمہ) اور خدا نے ہی تم کو پیدا کیا ہے۔ اور تمہارے اعمال و افعال کو بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کی روشنی میں نفسیات (Psychology) کی صحیح تعریف یہ ہوگی۔

Psychology is the science of the creative activity of God in the world of the human mind and its manifestations.

لہٰذا جب ہم قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں انسانی علوم یعنی انفرادی نفسیات، اجتماعی نفسیات، فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ تعلیم، فلسفۂ قانون، فلسفۂ تاریخ، فلسفۂ جمالیات وغیرہ کو نئے سرے سے لکھیں گے تو ان علوم کا بنیادی تصور یہی قرار دینا پڑے گا کہ کسی

تصورِ حُسن کی محبت انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ ہے۔ جب انسان کا تصورِ حُسن یا نظریہ خُدا ہو جو بدرجۂ کمال تمام صفاتِ حُسن کا مالک ہے تو یہ فطری جذبۂ محبت اپنا صحیح راستہ پاتا ہے۔ اور پوری طرح سے اپنا اظہار کرتا اور مطمئن ہوتا ہے لیکن جب انسان کا تصور خُدا نہ ہو تو انسان خدا کی صفاتِ حُسن شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی اور تصور کی طرف منسوب کر کے اسی تصور سے اپنے فطرتی ذوق محبت کو مطمئن کرنے لگتا ہے لیکن اس صورت میں اس کا تصورِ حُسن غلط اور ناقص ہوتا ہے اور چوں کہ وہ صفاتِ حُسن سے عاری ہوتا ہے اسے زود یا بدیر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ درحقیقت غلط اور ناقص ہے لہٰذا وہ مایوس ہو کر اسے ترک کر دیتا ہے اور ایک نئے تصورِ حُسن کو اختیار کرتا ہے۔ اس طرح سے غلط نظریات کی پرستار انسانی جماعتیں مٹتی اور ابھرتی رہتی ہیں لیکن صحیح اور کامل نظریے کو اپنانے والی انسانی جماعت کلیتہً مٹ نہیں سکتی۔ اگرچہ اس کی زندگی کا راستہ تمام ترقیوں کی انتہائی منزل پر پہنچنے سے پہلے ترقی اور تنزل کی معمولی منزلوں پر چڑھتا اور اترتا رہتا ہے۔

شام ہمدرد، لاہور
اکتوبر ۱۹۶۵ ش

کلماتِ تشکّر

جناب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
سیکرٹری اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آج کے خصوصی مہمان جناب ڈاکٹر رفیع الدین احمد صاحب اور آپ سب کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے آج کی شامِ ہمدرد کو اپنی تشریف آوری سے وہ رونق و نظر افروزی بخشی ہے کہ اُس کی یاد برسوں دِلوں کو گرماتی رہے گی۔ آج کی شام اس اعتبار سے بھی ایک یادگار شام ہے کہ اس میں جو مقالہ پڑھا گیا ہے وہ فکر انگیز بھی ہے اور بصیرت افروز بھی، نیز اس میں ایک ایسی منزل کی نشان دہی کی گئی ہے جو کاروانِ ملّت کی منزلِ مقصود ہے اور جس پر پہنچے بغیر یہ کارواں علم وحکمت کی اس متاعِ گم شدہ کو نہیں پا سکتا جو صدیاں ہوئیں ہم کھو بیٹھے ہیں، اور جو مغرب کے لادینی علوم کی تاریکیوں میں کچھ اس طرح نظروں سے اُوجھل ہو چکی ہے کہ اس منزل پر پہنچے بغیر ہم اس متاعِ زندگی کو دیکھ سکتے ہیں نہ پہچان سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ منزل اسلامی علوم مجوّزہ کی یونیورسٹی ہے جس میں طبیعی و مابعد الطبیعی دونوں قسم کے علوم کو اسلامی نقطۂ نظر سے پڑھایا جائے گا۔ تاکہ وہاں سے جو طالب علم بھی فارغ التحصیل ہو کر نکلے مومن کا دِل و دماغ لے کر نکلے۔ اور اُسے دیکھ کر پھر کوئی اہلِ نظر یہ کہنے پر مجبور نہ ہو جائے کہ : ع

قلبِ او مومن دماغش کافر است

ڈاکٹر موصوف کے مشن کو ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مجوّزہ یونیورسٹی کے ہر طالب علم کے دل و دماغ کو مومن بنانا چاہتے ہیں، اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ علوم جدیدہ کی ہر لادینی صنف کو چاہے وہ طبیعی ہو یا غیر طبیعی، اسلامی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ایک نوخیز طالب علم کے دل و دماغ آئینے کی طرح ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر نقش کو، جو اُستاد اُن پر مُرتسم کرنا چاہے آسانی سے قبول کر لیتے ہیں، چناں چہ جب طبیعات یا سائنس کے اساتذہ بچوں کو یہ یاد کرائیں کہ سائنس کا ہر اصول مسلّمہ حیثیت رکھتا ہے۔ اور پھر یہ درس دیں کہ مادہ قدیم ہے، یعنی اُسے خدا تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا اور وہ لافانی ہے تو وہ طالب علم قرآنِ حکیم کی اس تعلیم پر کیسے کامل ایمان لا سکتا ہے کہ مادہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اس لیے حادث ہے۔ اس ابتدائی تشکیک کا نتیجہ بالآخر دہریت میں نکلتا ہے۔ بالفاظِ دیگر

اُس کا قلب مومن رہے یا نہ رہے لیکن اُس کے دماغ کا کافر بن جانا یقینی ہے۔ یہ دماغ کا کفر ہے جو مغربی علوم اور طرزِ تفکر کے ذریعہ اسلامی معاشرے میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے اور جس کے روکنے کا واحد حل ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اُن کی مجوزہ یونیورسٹی ہے۔

یہ راز اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ یہ اس ذہنی لادینیت کا نتیجہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے گوشے گوشے میں کفرِ ذہنی کے اثرات نمایاں ہیں۔ مثلاً معاشیات میں سود کی حلت یا فلسفے سے وحی و تنزیل کا اخراج، سائنس میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت و ربوبیت کی صفات سے انکار یا تاریخ میں قرآنی مسلمات سے اغماض اور اخلاقیات میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف۔ اگر کوئی پوچھے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ علوم جدیدہ، جو ہماری یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں لادینی یا کافر ہیں جب علم ہی کافر ہو تو پھر ذہن کا مائل بہ کفر ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشرے کو اس کفرِ ذہنی سے پاک وصاف کرنے اور اُسے ہمیشہ کے لیے اس کفر سے محفوظ کر دینے کے لیے ڈاکٹر صاحب ایک ایسی یونیورسٹی کے خواہاں ہیں، جس میں علوم جدیدہ کو مسلمان کرنے کے بعد پڑھایا جائے گا، جیسا کہ ہمارے اسلاف کا شیوہ تھا۔ میرے نزدیک یہ تجویز معقول بھی ہے اور قابلِ عمل بھی، یہ بصیرت افروز بھی ہے اور انقلاب آفرین بھی۔ یہ تجویز اگر ایک طرف اپنے نظامِ تعلیم کی کفر آفرینیوں کی نشان دہی کرتی ہے تو دوسری طرف اسلامی علوم کی ایمان افروزیوں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ تجویز ہمارے لیے مشعلِ راہ بھی ہے اور عبرت کا تازیانہ بھی۔ زمانہ آپ سے یہ پوچھتا ہے کہ آپ اپنے دل و دماغ کو لادینی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں یا اللہ کے رنگ سے؟ حالاں کہ قرآنِ حکیم کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اللہ کا رنگ سب رنگوں سے بہتر اور حسین ہے، بلکہ فقط یہی ایک رنگ حسین و نظر افروز ہے۔ اور حُسن سے محبّت رکھنا سنّتِ الٰہی ہے، جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہے: "اللہ جمیل ویحب الجمال" یعنی اللہ حسین ہے اور اس لیے وہ حسن سے محبّت رکھتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی مجوزہ یونیورسٹی حُسن آفرین ہوگی تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ علم و حکمت کا حُسن ہوگا جس سے لادینی تعلیمات کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور دل و دماغ حسین و منوّر ہو جائیں گے۔ نیز یہ حُسن و نور ہر طالبِ علم کی طلب و جستجو بن جائے گا۔ اور اس کا قلب حسین حُسنِ حقیقی سے پکار پکار کر یہ دعا کرے گا۔

ربنا اتمم لنا نورنا۔ اے ہمارے پروردگار ہمارے لیے ہمارے اس نورِ حُسن کو تکمیل کر دے۔ قلبِ مومن سے نکلی ہوئی یہ دُعا قبول ہوگی اور یقیناً ہوگی، کیوں کہ اجابت خود مومن کی دعا کی طلب گار و منتظر ہوتی ہے۔

جسٹس انوار الحق

پاکستان کے صدرِ محترم جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب نے ایک مردِ مومن کی فراست سے کام لے کر قوم کی سود و بہبود کے لیے ملک کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو تعمیر ملک و ملت کے پیشِ نظر یہ قیمتی مشورہ دیا کہ انھیں اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے ملک کی اخلاقی اور تعمیری اقدار کو بلند کرنا چاہیے، کیوں کہ قوم کی اخلاقی اقدار پر ہی ملک و ملت کی عزت اور وقار کا انحصار ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؒ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

صدرِ مملکت نے جس جذبے سے یہ مفید مشورہ ہمارے اہلِ قلم کو دیا تھا، الحمد للہ ہمارے نامور اہلِ قلم صحافی حضرات اور اراکین محکمۂ نشریات نے اس جذبے کی پذیرائی کرتے ہوئے ملت کی اخلاقی اقدار کو ارفع کرنے کے لیے اور ان کے دلوں میں حوصلہ اور حوصلے میں توانائی پیدا کرنے کی غرض سے ایسی شاندار خدمات سر انجام دی ہیں جو زندہ و بیدار قوم کے صاحبانِ علم و فن کے شایانِ شان ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں اگر یہ عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ "شامِ ہمدرد" کی ان مجالسِ علمیہ کا انعقاد بھی علم و عمل کی قوتوں کو بڑھانے اور تعمیر و اخلاق اور اقدار اسلامی کے تحفظ کے جذبے کے تحت عمل میں آیا ہے۔ مجالس شامِ ہمدرد فقط اہلِ دانش اور صاحبانِ علم و فکر کے ساتھ مل بیٹھنے اور تبادلِ خیال ہی کا ذریعہ نہیں ہوتیں بلکہ اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں کہ ان میں اہلِ فکر و نظر کے بصیرت افروز اور اخلاق آموز مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ چناں چہ ہماری آج کی مجلس میں جناب جسٹس انوار الحق صاحب محترم "نظم و نسق اور شہری" کے عنوان سے نہایت اہم اور فاضلانہ مقالے سے حاضرین کو مستفید فرمائیں گے۔

میں محترم جناب جسٹس انوار الحق صاحب کا تہ دل سے تشکر گزار ہوں کہ صاحبِ موصوف نے اپنی اہم مصروفیات کے باوجود شامِ ہمدرد میں تشریف لا کر اس مجلس کو رونق

بخشی ہے۔

"نظم ونسق اور شہری" ایک ایسا موضوع ہے جس پر ماہرین ہی کچھ کہنے کا حق رکھتے ہیں، اور خصوصاً جب کہ مسٹر جسٹس انوار الحق جیسے اہل الرائے اور صاحبِ علم اس موضوع پر روشنی ڈالنے والے ہوں اس موضوع پر میرا کچھ کہنا صاحبِ موصوف اور آپ کے درمیان حائل ہونے کے ہم معنی ہوگا۔ لیکن ایک شہری کی حیثیت سے کچھ باتیں کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

نظم ونسق اور انتظام وانصرام نُظَما اور منتظمین کا کام ہے اور ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس کی کامیابی کا سہرا بھی اُن کے سر بندھتا ہے اور ناکامی پر ہدفِ ملامت ونشانۂ تنقید بھی ان ہی کو بننا پڑتا ہے۔ لیکن نظمِ عامّہ یا پبلک ایڈمنسٹریشن جس کو کہا جاتا ہے اس کی وسعت اور شہریوں کی زندگی پر اس کے ہمہ گیر اثرات کی بنا پر شہریوں کے رویّے اور ردِّ عمل سے یہ بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ شہریوں کا تعاون یا عدمِ تعاون نظم ونسق کو کامیاب بنانے یا ناکام کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انتظامی قواعد اور انتظامی تدابیر کا مقصد اور منتظمین کے جہد وعمل کا مرکز ومحور دراصل شہریوں کا فائدہ اور ان کی بھلائی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر رشوت کو روکنے اور چوروں کو من مانی نہ کرنے دینے میں ہر شہری کی فلاح ہے۔ اس بات کو سب مانتے ہیں، لیکن بعض اوقات بعض اصحاب اپنا کام نہ نکلتا دیکھ کر رشوت دے دینے کو آسان راستہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف یہ کہ ایک اخلاقی اور قانونی بُرائی میں مبتلا ہوتے ہیں بلکہ انتظامیہ سے عدمِ تعاون کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ جب رشوت کے بغیر کام چل ہی نہیں رہا تو کیا کیا جائے، مجبوری ہے! لیکن میرے خیال میں اس طرح وہ اپنی مجبوری کو بڑھا لیتے ہیں۔ ایڈمنسٹریشن کے بعض غلط ارکان اگر اپنا فرض ادا نہیں کرتے اور جس کام کے لیے ان کو تنخواہ ملتی ہے اس کو رشوت لے کر یا احسان جتا کر انجام دیتے ہیں تو ایسے افسروں کی ہمت شکنی کرنے، اُن کی اصلاح کرنے اور انتظامیہ کو پاک کرنے میں شہریوں کا تعاون ناگزیر ہے۔ شہریوں کے تعاون کے بغیر انتظامیہ کا پھوڑا اچھا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسی بیماری ہے جس کے علاج میں معالج کے ساتھ ساتھ تیمارداروں کی مدد بھی لازمی ہے۔ مریضِ رشوت کو اگر تیماردار شہری بد پرہیزی کی ذرا بھی اجازت دیں گے تو مرض کا ازالہ ہونے کے بجائے ایک مرض دوسرے بہت سے امراض کی بنیاد بن جائے گا اور آپ کا ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ نظم ونسق کی خرابیوں کو بڑھانے اور پختہ کرنے میں ہم بادلِ ناخواستہ اور طوعاً وکرہاً ہی سہی سہارا دے رہے ہیں۔ ایک شہری

کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور کچھ فرائض بھی۔ حقوق اسی وقت حاصل ہوتے ہیں اور ایک پاکیزہ معاشرہ کے فیوض و برکات سے شہری اسی وقت مستفید ہوسکتے ہیں کہ جب اپنے فرائض ادا کریں۔ ایک شہری کا فرض دوسرے کا حق۔ اِن فرائض اور حقوق کے توازن کو برقرار رکھنا اچھی انتظامیہ کا کام ہے۔ ہماری انتظامیہ کہاں تک اس میں کامیاب ہے اس کے متعلق مجھے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ میں اس کا رکن نہیں ہوں۔ اور اب بیرونی حملے کے بعد سے تو ہمارا طریقہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر طبقہ اور ہر حصہ اپنے نقائص خود محسوس کر لے اور خود اصلاح کی کوشش کرے، بجائے اس کے کہ قوم کا دوسرا طبقہ یا حصہ اس پر توجہ یا تنقید کرے۔

جناب جسٹس انوار الحق صاحب ہمارے ملک کی ان بلند شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنی اصابتِ رائے اور اپنے کردار اور حسنِ عمل کی بنا پر دوسروں پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہیں۔ جناب جسٹس صاحب ہماری جانی پہچانی شخصیت ہیں اور تعارف و تعریف سے بالا، تاہم میں اجازت چاہتا ہوں کہ ان کے حالاتِ ذاتی کو شامِ ہمدرد کے لیے محفوظ کر دوں۔

جناب جسٹس انوار الحق صاحب ۱۱ مئی ۱۹۱۷ء کو جالندھر کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سرزمین ہے جس نے کئی ایک بڑی شخصیتوں کو جنم دیا ہے۔ آپ نے جالندھر کے ہائی اسکول سے میٹرک کی اور ۱۹۳۶ء میں جالندھر کے ڈی۔ اے۔ وی کالج سے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری لی۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے کر پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اس کے ایک سال بعد آپ انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں شامل ہوئے اور آپ کو انڈین سول سروس کے لیے منتخب کر لیا گیا اور آپ تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ ایک سال تک اوکسفرڈ یونیورسٹی سے وابستہ رہنے کے بعد جب آپ نومبر ۱۹۴۰ء میں ہندستان تشریف لائے تو فیروزپور میں اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیے گئے۔ اس عہدے پر دو سال کام کرنے کے بعد آپ کی قابلیت کو سراہتے ہوئے آپ کو صوبہ سرحد اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ یہاں کچھ عرصے کام کرنے کے بعد تقسیم سے پہلے آپ گورداس پور کے پھر ضلع حصار کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ اسی اثنا میں بمقام گورداس پور سیشن جج رہے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ راولپنڈی، منٹگمری اور سیالکوٹ میں اسی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک حکومت پاکستان کی وزارتِ دفاع میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔

فروری ۱۹۵۷ء میں آپ کراچی کے ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج مقرر ہوئے۔ وہاں ایک سال کام کرنے کے بعد آپ کا تبادلہ بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج لاہور ہوگیا۔ یہاں ایک سال کام کرنے کے بعد آپ کی قانونی قابلیت کے اعتراف میں آپ کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ جہاں ۱۹۵۹ء سے تاحال آپ عدل کی کرسی پر رونق افروز ہیں اور انصاف کا حق ادا فرمارہے ہیں۔

حکیم محمد سعید
۴ر نومبر ۱۹۶۵ء

نظم و نسق اور شہری

جناب جسٹس انوار الحق
جج ہائی کورٹ۔ مغربی پاکستان۔ لاہور

۶ ستمبر سے قوم جن حالات سے دوچار ہے ان کے باعث اکثر معمولات میں خاصا فرق آگیا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے "شامِ ہمدرد" کی شاندار روایات کو قائم اور برقرار رکھا ہے۔ اس ہنگامی دور میں ایسی ادبی اور علمی محفل کا انعقاد ایک خوش گوار امر ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ گوناگوں آزمائشوں کے باوجود ہم میں علمی ذوق و جستجو بدستور زندہ ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ حالیہ واقعات سے ہم پر اپنے متعلق کئی حیران کن انکشافات ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہم میں نہ صرف علمی ذوق و جستجو بلکہ کئی اور جذبات اور صفات بھی ابھی زندہ ہیں۔ تقسیمِ ملک کے بعد متروکہ جائیداد میں اکثر مسلمانوں کا ایمان بہہ گیا۔ آپس میں سیاسی، سماجی، لسانی اور صوبائی اختلافات کے باعث سالہا سال تک ملک پر ایک بحرانی کیفیت طاری رہی نوجوان طبقے نے کئی مواقع پر ایسے مظاہرے کیے جنھیں غیر ذمہ دارانہ کہا جاسکتا ہے، ان وجوہ کے باعث بعض اوقات ہم میں سے کئی اصحاب ایک شدید احساسِ یاس کا شکار ہوجاتے تھے، اور سوچا کرتے تھے کہ یا الٰہی وہ اعلا مقاصد کب حاصل ہوں گے جن کی خاطر قائدِ اعظم مرحوم کی قیادت میں اس برِ صغیر کے مسلمانوں نے قیامِ پاکستان کے لیے اتنی عظیم قربانیاں دی تھیں! وہ اسلامی اقدار اس ملک میں کب رائج ہوں گی جن کی بنا پر اور جن کے احیاء کے لیے ہم نے اپنے آپ کو ایک علاحدہ قوم تصور کیا اور ایک علاحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا؟ ہم ان سوالات پر غور و فکر میں مبتلا ہی

تھے کہ ۶ ستمبر (۱۹۶۵ء) کی وہ صبح طلوع ہوئی جس نے ہندستان کے بزدلانہ اور جارحانہ حملے کی خبر دی، جس ہمت اور جواں مردی سے ہماری افواج نے اس حملے کا منھ توڑ جواب دیا ہے اور ہمارے جواں سال فوجی افسروں اور سپاہیوں نے جس عزم، مضبوطیٔ کردار اور قوتِ ایمانی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے شہری طبقہ اور طلبا نے، شاعروں اور ادیبوں نے آرٹسٹوں، تاجروں، صنعت کاروں اور سرکاری ملازمین نے جس طرح اپنے وطنِ عزیز کی استقامت اور حفاظت کے لیے جسمانی، مالی اور ذہنی خدمات پیش کی ہیں، اور ہماری خواتین نے جس محبت اور جانفشانی سے مجاہدین اور مہاجرین کی خدمت اور امداد کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے، اور ساری قوم نے پاکستان کے طول و عرض میں جس یک جہتی، اتفاق اور اتحاد سے جارحیت کے مقابلے کے لیے کمر باندھ لی ہے، ان سب قرائن سے صاف عیاں ہے کہ تائیدِ ایزدی اب بھی ہم گنہگار مسلمانوں کے ساتھ ہے، اور اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور بے راہ رویوں کے باوجود ہم میں جذبۂ ایثار و قربانی باقی ہے، اور ہمارے دلوں میں بدستور شمعِ ایماں فروزاں ہے۔ یہ جذبات وصفات مسلمانوں کی بقا اور پاکستان کی سلامتی کے ضامن ہیں، اور ان کی موجودگی میں مستقبل کے بارے میں ہمارے خدشات بے بنیاد ہیں۔

میری آج کی گفت گو کا موضوع دراصل زمانۂ امن سے تعلق رکھتا ہے۔ جنگ کے ہنگامی حالات میں نظریات وطریقِ کار مختلف ہوتے ہیں، حکومت اور شہریوں کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے شہریوں کو اپنے بیشتر حقوق، اپنا جان و مال غرض اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے، تاکہ ملک وقوم کی سالمیت و آزادی برقرار رہ سکے۔ ایسے حالات میں شہری اور اربابِ نظم ونسق آپس میں مدغم ہو جاتے ہیں اور جن مسائل کا ذکر میں آج کرنے والا ہوں، ان پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔

لیکن یہ تمام قربانیاں ملک کی سلامتی اور امن کے لیے اس لیے ضروری اور جائز سمجھی جاتی ہیں کہ ملک کی بقا اور استحکام اور آزادی ہی میں شہریوں کا مستقبل اور ان کی فلاح وبہبود مضمر ہے۔ اگر ملک ہی نہ رہا تو کہاں اور کس کے شہری؟ جمہوری اور اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی اور ملکی آزادی کا درحقیقت مقصد اور منشا یہ ہے کہ عوام کو ایسی سہولتیں اور ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور شخصیتوں کی آزادانہ طور پر نشوونما کر سکیں اور ان کو وہ تمام بنیادی مراعات حاصل

ہوں جو بطور انسان ان کا حق نہیں اور جن کے حصول کے بعد ہی زندگی اپنے معراج کو پہنچتی ہے۔

انسانی سوسائٹی کے آغاز میں حالات و نظریات مختلف تھے۔ حکومت کا تصور محض یہ تھا کہ ہر قبیلے میں افراد اپنے سردار کے تابع تھے۔ کبھی وہ ان سے شفیق باپ کی طرح سلوک کرتا تھا اور کبھی ایک ظالم اور جابر حاکم کی حیثیت سے قبیلے کو محض اپنی تسکین ہوس کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ جب مختلف قبائل کے مل بیٹھنے سے ملکوں کی تشکیل ہوئی تو بادشاہت کا تصور پیدا ہوا۔ لیکن بنیادی نظریہ وہی رہا۔ لوگ بادشاہ کی رعایا تھے۔ ان کے اپنے حقوق ہونے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ ان کا سب کچھ ان کے بادشاہ کے لیے تھا۔ البتہ بادشاہ کا یہ فرض تھا کہ وہ محبت اور انصاف سے حکومت کرے۔ لیکن اس کو اختیار مطلق تھا کہ وہ اپنی رعایا اور اس کے جان و مال کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ جمہوری نظریات کے ظہور پذیر ہونے کے بعد فرد کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا اور حکومت اور شہری کے درمیان جو رشتہ شروع سے چلا آتا تھا اس کی نوعیت بتدریج بدلنے لگی۔ آج آزاد اور مہذب ممالک میں حاکم و محکوم کا تصور ختم ہو چکا ہے۔ شہری خود اپنی حکومت کو منتخب کرتے ہیں اور اپنی دستور ساز اور قانون ساز مجالس کے ذریعے سے اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ حکومت کو کیا اختیار تفویض کیے جائیں اور ارباب حکومت ان اختیارات کو کس طرز پر اور کن حدود کے اندر رہ کر بروئے کار لائیں۔

ابتدا میں دنیا کے اکثر ممالک اور خصوصاً ہمارے برصغیر میں حکومت کے فرائض ایک لحاظ سے خاصے محدود تھے یعنی حکومت اندرون ملک امن قائم رکھتی تھی اور بیرونی دشمنوں سے ملک کا تحفظ کرتی تھی۔ یہ درست ہے کہ پرانے زمانے میں بھی نیک بادشاہوں نے سڑکیں، اسکول، مساجد اور کنوئیں تعمیر کروائے، لیکن عام نقشہ حکومت یہی تھا کہ بادشاہوں نے اپنی زیادہ تر توجہ عوام کو اپنے پنجۂ گرفت میں رکھنے پر مرکوز کی یا وہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ جنگ و جدل میں مصروف رہتے۔ اقتصادی معاملات میں عام طور پر حکومتوں نے بہت کم دخل دیا۔ انگلستان اور یورپ میں انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد تو نظریہ یہ تھا کہ اقتصادی ترقی کے لیے، بہترین ماحول پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حکومت ان معاملات میں بالکل دخل انداز نہ ہو، اس انداز فکر کو Policy of laissez-faire کا نام دیا گیا۔

مجموعی طور پر ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے پلاننگ کا تصور تو بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔

تقسیم ملک سے پیشتر اگرچہ ہمارے ہاں زراعت، صنعت، تعلیم اور ذرائع آمد و رفت میں ترقی کے لیے حکومت نے چند اقدامات ضرور اٹھائے لیکن بنیادی طور پر حکومت اور اس کے کارندے اپنا بیشتر وقت اور توجہ رعایا کو اپنے قابو میں رکھنے پر صرف کرتے تھے تاکہ غیر ملکی حکومت کا رعب اور دبدبہ قائم رہے۔ حکومت کے اس رویّے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اربابِ نظم و نسق ہمیشہ رعایا کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرتے تھے۔ اس زمرہ میں ڈپٹی کمشنر، کپتان پولیس اور مجسٹریٹ صاحبان تو خیر تھے ہی لیکن ترقیاتی محکموں کے افسران بھی اپنے آپ کو حاکم تصوّر کرتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں بھی بجائے خدمت کے حکومت کا شوق ہوتا تھا۔ یہ تو آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ آج سے پچیس تیس سال پیشتر کسی چھوٹے گاؤں میں ایک پولیس کانسٹیبل کا ورود ایک عظیم حادثے سے کم نہ تھا۔ ساری آبادی میں فوراً خوف و ہراس کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی اور لوگ اللہ سے پناہ مانگتے تھے۔ اس کیفیت کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ سپاہی اپنی ذات میں کوئی ہیبت ناک چیز ہوتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک زبردست اور جابر طاقت کا نمائندہ تھا جو کہ شہریوں کو کسی وقت بھی کچل کر رکھ سکتی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ تقسیم ملک سے پیشتر جب کبھی میں بطور ڈپٹی کمشنر دیہات کے دورے پر جاتا تو لوگوں کی غلامانہ ذہنیت کے مختلف مظاہروں سے طبیعت نہایت مکدّر ہوتی اور اس ذہنیت کے صفِ اوّل کے علم بردار چند ایسے عہدہ دار ہوتے تھے جو کہ اس وقت کی حکومت نے اپنے مخصوص اغراض کے حصول کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ یہ حضرات ڈپٹی کمشنر کو خدائے مجازی مانتے تھے جو کہ ایک ان دیکھی لیکن زبردست طاقت کا نمائندہ تھا جو سات سمندر پار بیٹھی ہوئی سارے ملک پر راج کرتی تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد صورتِ حالات بدلنا شروع ہوئی، غیر ملکی حاکموں کا وجود ختم ہوا اور عوام میں احساسِ خودی بیدار ہونا شروع ہوا۔ ان میں اپنی سیاسی اہمیت کا شعور پرورش پانے لگا، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں حکومتوں کا اندازِ فکر بھی بدلنے لگا، اور اب ایک نیا "نظریہ فلاحی مملکت" جڑ پکڑ گیا ہے۔ تمام جمہوری ممالک میں اب یہ اصول تسلیم کیا جا چکا ہے کہ حکومت کے قیام کا مقصد ماسوا اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ملک و ملّت کی بہبود کے لیے کام کرے اور یہ امر بھی اب طے شدہ ہے کہ ملک و ملّت کی بہبود سے مُراد اُن لاکھوں کروڑوں شہریوں کی خوش حالی اور مسرت ہے جن سے مل کر ملک و ملّت کی تشکیل ہوتی ہے۔

اس نظریے کے ساتھ ساتھ ایک اور نظریہ بھی پروان چڑھا ہے اور وہ یہ کہ مجموعی فلاح و بہبود کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقتصادی معاملات میں حکومت وسیع پیمانے پر دخل انداز ہو۔ تاکہ ملک کے اقتصادی نظام کو عوامی بہبود کی ضروریات کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ اِن دونوں نظریات کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ حکومت کے کاموں میں بے تحاشا توسیع ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اربابِ نظم ونسق کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا ہے اور اب شہری کو زندگی میں ہر مرحلے پر پنگوڑے سے لے کر قبر تک حکومت کے کارندوں سے سابقہ پڑنے لگا ہے۔ اب شہری زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس میں بغیر پرمٹ یا لائسنس کے گزارہ ہو سکے۔

اِن تمام تغیرات کے باوجود ہمارے ملک میں انتظامیہ کا ایک پہلو ایسا ہے جس میں ابھی تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ ترقی یافتہ ممالک میں مقامی امور میں مرکزی یا صوبائی حکومتوں کو بہت کم دخل حاصل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں انتظامیہ کے مقامی افسران صوبائی یا مرکزی حکومت کے نمائندے ہیں اور ان کا یہ فرض ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کی پالیسی پر عمل کرائیں۔ اِس میں شک نہیں کہ بنیادی جمہوریتوں کے قیام سے عوام کو اپنے مقامی مسائل کو حل کرنے کے لیے مواقع میسر آ گئے ہیں لیکن فی الحال یہ نظام اس حد تک پختہ اور تجربہ کار نہیں ہوا جیسا کہ انگلستان یا امریکا میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک سرکاری ملازم کو اب بھی وہ رسوخ، رتبہ اور اہمیت حاصل ہے جو کہ دوسرے کئی ممالک میں عرصہ ہوا مفقود ہو چکی ہے، پھر ہماری سوسائٹی میں شہریوں کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہے اور ظاہری شان و شوکت کی پرستار۔ ان حالات میں اربابِ نظم ونسق پر یہ اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف حکومت کی ہدایات پر شہریوں سے عمل کرائیں بلکہ اپنے اپنے علاقوں میں اخلاقی، روحانی اور سماجی قیادت کا فرض بھی ادا کریں اور یہ ذمہ داری ان پر اس وقت تک رہے گی جب تک مقامی جمہوریتیں اور سیاسی جماعتیں اس قابل نہیں ہو جاتیں کہ عوام کی صحیح طور پر رہنمائی اور ترجمانی کر سکیں۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا غیر مناسب نہ ہو گا کہ مقامی قیادت کا فرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کے ارکان پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ مقامی لوگوں کے احساسات وجذبات کو سمجھیں۔ ان کی نکتہ چینی برداشت کریں اور وقت آنے پر قیادت کا کام غیر سرکاری حضرات کو خوش اسلوبی سے سونپ دیں۔ قوم کی تعمیر میں اربابِ نظم ونسق کا یہ کردار میرے نزدیک نہایت اہم ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اِس امتحان میں پورے اتریں گے۔

انتظامیہ کے فرائض

یہ تو تھا شہریوں اور اربابِ نظم ونسق کا باہمی، اخلاقی اور سیاسی تعلق اب آئیے ذرا ان کے خالصتاً سرکاری فرائض منصبی کا بھی جائزہ لیں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انتظامیہ کے فرائض عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں: اوّلاً حکومت کے پروگرام اور نظریات کے مطابق منصوبہ بندی میں ماہرانہ امداد اور مشورہ دینا اور جو ترقیاتی منصوبے منظور کیے جائیں ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب اقدام اٹھانا۔ دوم زندگی کے مختلف شعبوں میں حکومت اور مقننہ کی عاید کردہ قانونی پابندیوں کو نافذ کرنا اور شہریوں سے ان پر عمل کرانا، تاکہ قومی زندگی میں نظم وضبط پیدا ہو، اور ہر فرد اور ادارہ اپنی حدود کے اندر رہ کر کام کرے اور دوسروں کے راستے میں حارج نہ ہو۔

جہاں تک فرائض کی پہلی قسم کا تعلق ہے یعنی منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کرنا، اربابِ نظم ونسق کی اوّلین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایمان داری سے حکومتِ وقت کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں مدد دیں۔ اس اصول کی بنیاد یہ ہے کہ ایک جمہوری نظام میں بھی سیاسی جماعت برسرِاقتدار ہوگی اسے عوام کا اعتماد ضرور حاصل ہوگا یا ہونا چاہیے، اور اس لحاظ سے کہ اس جماعت کے نظریات اور پروگرام قوم کی اکثریت کے خیالات اور خواہشات کے آئینہ دار ہوں گے، انتظامیہ کے ارکان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایمان داری سے اپنی لیاقت، تربیت اور تجربہ کی بنا پر سیاسی زعمائے حکومت کو ان معاملات میں صحیح مشورہ دیں، انھیں مختلف طریقہ ہائے کار کے نشیب وفراز سے آگاہ کریں اور جب ایک دفعہ مختلف امور کے متعلق مناسب فیصلے کر لیے جائیں تو ان فیصلوں کو عملی طور پر کامیاب بنانے میں مدد دیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت اپنے منصوبوں کو اسی وقت خاطر خواہ طور پر عملی جامہ پہنا سکتی ہے کہ جب ملک میں ایک تربیت یافتہ سول سروس ایمان داری سے اس کی ممد ومعاون ہو اس لیے قومی مفاد کا یہ تقاضا ہے کہ مستقل ملازمتوں کے ارکان وفاداری سے حکومتِ وقت کے ساتھ تعاون کریں تاکہ قوم کے منشا کے مطابق ترقیاتی منصوبہ بندی پر عمل ہو سکے۔ یہ فرض تمام محکمہ جات کے افسروں اور دوسرے اہلِ کاروں پر عاید ہوتا ہے خواہ وہ ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، ڈپٹی کمشنر ہوں یا محکمہ جنگلات کے افسر، ماہرِ اقتصادیات ہوں یا ماہرِ معدنیات۔

اربابِ نظم ونسق کے دوسرے فرائض کی کیفیت ذرا مختلف ہے۔ اس فہرست میں نہ صرف وہ کام شامل ہیں جن کا تعلق براہِ راست امن قائم رکھنے سے ہے جیسے کہ پولیس:

اور مجسٹریٹوں کی ذمہ داریاں ہیں، بلکہ وہ تمام اختیارات بھی شامل ہیں جن کے تحت مختلف پرمٹ اور لائسنس دیے جاتے ہیں یا نئی صنعتیں لگانے کی اجازت دی جاتی ہے، یا کسی پیشے کو اختیار کرنے کے لیے لائسنس دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض وہ تمام اختیارات جن کا مقصد شہریوں سے قانونی اور انتظامی پابندیوں پر عمل کرانا ہے تاکہ ہر فرد آزادی سے مروجہ قانون کے مطابق زندگی بسر کر سکے ظاہر ہے کہ یہ پابندیاں بعض افراد یا گروہوں کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہیں اور وہ اپنے اثر و رسوخ کے باعث ان سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر اوقات مختلف شہریوں میں بعض خصوصی مراعات حاصل کرنے کے لیے سخت مقابلہ ہو جاتا ہے ایسے حالات میں انتظامیہ کے ارکان پر یہ بڑا دشوار اور اہم فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ سختی سے قانون پر عمل کریں اور تمام شہریوں سے مساوی اور منصفانہ سلوک کریں۔ ان کی یہ خاص ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا لحاظ رکھیں کہ کہیں یہ قانونی پابندیاں اور یہ لائسنسوں اور اجازت ناموں کا نظام شہریوں کے حقوق اور ان کی فلاح و بہبود کا ضامن ہونے کے بجائے ان کی مزید خستہ حالی کا موجب نہ بن جائے۔ ایسا نہ ہو کہ امیر تو امیر تر ہوتے جائیں اور غریب غریب تر۔ ان اختیارات کا استعمال ایک نازک مسئلہ ہے۔ میرا ایمان ہے کہ ان اختیارات کا جائز ایماندارانہ اور منصفانہ استعمال قوم کے حق میں کئی بڑے ترقیاتی منصوبوں سے بہتر ہے۔ ایک اوسط درجے کا خوش حال مگر انصاف پرور ماحول انسانی ترقی اور تسکینِ قلب کے لیے اس ماحول سے ہزار درجہ بہتر ہے جہاں دولت تو ہو لیکن سماجی انصاف اور مساوات نہ ہو انتظامیہ کی طرف سے غیر مساوی سلوک کی ایک وجہ رشوت ستانی یا کنبہ پروری یا دوست نوازی ہو سکتی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ بڑی لعنت ہے جسے دور کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعلقہ اربابِ اختیار پر سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے اور وہ اپنی مجبوریوں اور کوتاہیوں کے باعث اس دباؤ کے سامنے جھک جاتے ہیں اور اپنے فیصلوں کی بنیاد انصاف اور قانون کے بجائے وقتی مصلحتوں پر رکھتے ہیں۔ انتظامیہ کے ارکان پر لازم ہے کہ وہ اپنے ان فرائض کی انجام دہی میں اپنے ضمیر کے مطابق عمل کریں اور ایمان داری سے قانون اور انصاف کی عمل داری قائم کریں تاکہ شہریوں کو ان کے سماجی، اقتصادی اور فلاحی حقوق قانون کے مطابق میسر ہوں۔ اس لحاظ سے انتظامیہ کے ان فرائض کی نوعیت عدلیہ کے فرائض سے کچھ مختلف نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کی کافی سمع خراشی کر لی ہے اس لیے بات کو مزید طول دیے بغیر اپنی معروضات کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے

اس کا مختصراً خلاصہ یہ ہے :

اولاً ہمارے ملک کی موجودہ سیاسی، سماجی اور علمی ترقی کے مدِ نظر سول سروس کے ارکان اور دوسرے شعبوں کے ذمّہ دار افسران پر یہ اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مقامی معاملات میں شہریوں کی قیادت اور راہ نمائی کریں تاآں کہ مقامی جمہوری ادارے اور سیاسی جماعتیں اس قابل ہو جائیں کہ اس فرض کو سنبھال سکیں۔ اس عبوری دور میں اربابِ نظم ونسق کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو مقامی جذبات و احساسات سے ہم آہنگ بنائیں اور عوامی نکتہ چینی کو برداشت کرنے کا مادّہ پیدا کریں۔

دوم جہاں تک حکومتِ وقت کے نظریات اور پروگراموں کا تعلق ہے انتظامیہ کے ارکان کی یہ ذمّہ داری ہے کہ وہ ایمان داری اور وفاداری سے ترقیاتی منصوبہ بندی کے سلسلے میں حکومت سے تعاون کریں اور ان منصوبوں کو کام یاب بنانے کے لیے حتی المقدور کوشش کریں اس اصول کی بنیاد یہ ہے کہ ایک جمہوری حکومت قوم کے احساسات اور خواہشات کی آئینہ دار ہوتی ہے اور سرکاری ملازمین کا یہ فرض ہے کہ قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کریں۔

سوم۔ اپنے اُن فرائض کی ادائیگی میں جن کا تعلق قانون کے نفاذ اور شہریوں کے قانونی و بنیادی حقوق اور مراعات سے ہے۔ اربابِ نظم ونسق پر لازم ہے کہ وہ عدلیہ کے مانند ہر وقت حق و انصاف کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھیں اور سیاسی دباؤ اور ذاتی طمع اور لالچ سے بلند ہو کر ہر شہری کو اس کا حق دلائیں اور اس کی جائیداد، آزادی اور عزّت و ناموس کی حفاظت کریں۔

چہارم۔ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ متعلقہ قانون کے مطابق اور قانون کی حدود کے اندر اپنے اختیارات کا استعمال کریں اور اس بات کو ہمیشہ ذہن نشین رکھیں کہ حکومت شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہے اور اربابِ نظم ونسق کا اوّلین و آخری فرض شہری کی خدمت ہے نہ کہ اس پر حکومت۔

شامِ ہمدرد۔ لاہور

۴ر نومبر ۱۹۶۵ء

مولانا رئیس احمد جعفری

۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندستان کی آزادی میں یہاں کے مسلم رہنمایانِ آزادی اور مسلم زعما کے کارنامے ہندو لیڈروں کے کارناموں سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم ہیں جب تک مسلمان اکابر نے کانگریس کا ساتھ نہیں دیا وہ اعتدال پسندوں کی ایک جماعت کے علاوہ کچھ نہ تھی۔ افسوس کا مقام ہے کہ رفتہ رفتہ یہ اکابر فراموش اور اُن کے کارنامے وقفِ طاقِ نسیاں ہوتے جا رہے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نے جو طویل و ضخیم تاریخِ آزادیٔ ہند مرتب کی ہے اس میں ان مسلمان اکابر کا ذکر برائے نام ہے جب کہ ہندو رضا کاروں تک کو زعیم بنا کر پبلش کیا گیا ہے۔

اِن قابلِ صد احترام شخصیتوں میں بعض کے ساتھ ہمارے آج کے مہمان مقرر جناب مولانا رئیس احمد جعفری صاحب کو سالہا سال رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بعض کو اُنھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جن مجاہدینِ آزادی کو جناب جعفری صاحب نے قریب سے دیکھا اُن میں اپنے ملک کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک کے مجاہدینِ آزادی بھی تھے۔ میں جناب رئیس احمد جعفری صاحب کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر اپنے مشاہدات اور رفاقت کی داستان کے کچھ حصے آج کی مجلس میں سنانے منظور فرمائے ہیں۔ یہ داستان دلچسپ بھی ہے اور قیمتی بھی۔ یہ داستان زیادہ دلچسپ اس لیے بھی ہو جاتی ہے کہ یہ آج ایک ایسے وقت سنائی جا رہی ہے کہ جب ثمرِ آزادی یعنی پاکستان کے دفاع و تحفظ کا وہ تاریخی اور معرکتہ الآرا کارنامہ مجاہدینِ پاکستان انجام دے چکے ہیں جس کو نہ صرف حملہ آور بھارت بلکہ تمام دنیا کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ لاہور اور سیالکوٹ کے محاذوں پر اسلامی طریقۂ جنگ کو اس طرح دُہرایا گیا ہے کہ سارا عالم ورطۂ حیرت میں ہے اور سب نے ایک بار پھر جان لیا ہے کہ مسلمان جب مسلمان بن کر میدانِ جنگ میں کُودتا ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے زیر نہیں کر سکتی۔

مجھے اجازت دیجیے کہ میں آج کے مہمان مقرر کے بارے میں چند کلمات عرض کر دوں۔

جناب رئیس احمد جعفری صاحب ۱۹۱۲ء میں بمقام خیر آباد پیدا ہوئے۔ عربی اور علوم اسلامیہ کی تکمیل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی جس کا سلسلہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔ ندوۃ العلماء کے آخری طالب علمی کے زمانے میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کی رہنمائی میں مضمون نگاری کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ میں انشا پردازی کی فطری صلاحیت تھی۔ دریا ملنے کی دیر تھی کہ ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ چناں چہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے ہفت روزہ "سچ" میں جواب "صدق" کے نام سے نکلتا ہے مضمون پر مضمون لکھنے لگے۔ معارف اور نگار میں بھی مقالات لکھے۔ مولانا محمد علی کے روزنامہ "ہمدرد" سے بھی وابستہ رہے۔

جعفری صاحب نے انگریزی اور علوم عصری کی تحصیل جامع ملیہ دہلی میں کی جس کا سلسلہ ۱۹۳۰ء سے دسمبر ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ جامع کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تحریک اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کے ایماء پر "سیرت محمد علی" لکھی جو اس موضوع پر سب سے اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔

رسالہ "جامعہ" میں مختلف علمی، مذہبی، تاریخی اور ادبی عنوانات پر ۱۹۴۷ء تک مقالات لکھتے رہے۔

یکم جنوری ۱۹۳۴ء کو روزنامہ خلافت بمبئی کی ادارت سنبھالی جس کا سلسلہ ستمبر ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ مولانا شوکت علی نے نہ صرف روزنامہ "خلافت" کی ادارت سونپ رکھی تھی بلکہ خلافت پریس کی مینجری اور خلافت ہاؤس کا انتظام بھی سپرد کر رکھا تھا اور ان کا یہ اعتماد آخر وقت تک قائم رہا۔

مسلم لیگ کے احیا کے بعد جعفری صاحب نے اس کی سرگرم حمایت کی۔ اسی کی وجہ سے قائد اعظم سے کئی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور جب سیرتِ قائدِ اعظم لکھی تو قائدِ اعظم نے جعفری صاحب کو طلب کر کے ان سے کتاب کے کئی باب سنے اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

پاکستان بننے کے بعد جعفری صاحب پاکستان آگئے۔ اور "ادارۂ ثقافت اسلامیہ" میں علمی خدمت بجا لانے کے علاوہ دوسرے اداروں کے لیے بھی قابلِ قدر کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ ادب کا شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر جعفری صاحب نے کچھ نہ لکھا ہو۔ ہزارہا اخباری صفحات کے علاوہ جعفری صاحب نے تقریباً دو سو کتابیں تصنیف اور تالیف کیں۔

حکیم محمد سعید

رہ نمایانِ جہادِ آزادی کے ساتھ چند لمحات

جناب مولانا رئیس احمد جعفری

میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ اسلام کے مجاہدوں اور غازیوں، ملت کے پاسبانوں اور رہنماؤں، قوم کے ناخداؤں اور سرداروں میں سے کئی کو ہیں نے قریب سے دیکھا اور اُن کے نطق و کلام اور کردار و سیرت کے مطالعے کا مجھے موقع ملا۔ ایمان و استقامت، عزم و عمل، اور فدائیت کی وہ چنگاری جو شعلہ بنی، پھر خاکستر بن کر فروغِ جاوداں کی دولت سے بہرہ ور ہوئی کئی مرتبہ میں نے اپنی آنکھوں سے چمکتی دیکھی۔ وہ زمانہ اب گزر چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جگ بیت گیا لیکن نقوش و تاثرات مرورِ ایام کے باوجود اتنے تازہ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ابھی کا واقعہ ہو۔

علامہ عبدالعزیز ثعلبی

تیس۳۰ سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے، میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ابتدائی درجے کا ایک حقیر طالب علم تھا کہ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن کی زیرِ صدارت ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہُوا۔ حاضرین میں ایک بھاری بھرکم شخصیت تیونس کے ایک جلا وطن باغی علامہ عبدالعزیز ثعلبی کی بھی تھی۔ علم و فضل کے اعتبار سے یگانہ، کردار میں مجاہد کی شان، عزم و عمل میں غازی کا ولولہ، فرانس کی قہرمانیت اور استبداد کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر چیز داؤں پر لگادی۔

سجن و زنداں کی سختیاں جھیلیں، دار و رسن کو لبیک کہنے پر آمادہ تھے کہ جلا وطن کر دیے گئے۔ وطن میں عیش و تنعّم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پردیس میں فقر و فاقے کی زندگی بسر کرنی پڑی، لباس دریدہ اور شکستہ، جیب خالی، پاؤں میں ایک معمولی سے چپل، تقریر کی دعوت دی گئی۔ اسٹیج پر تشریف لائے۔ وقار و تمکنت کے ساتھ کرسی پر بیٹھے اور دادِ خطابت دینے لگے۔ اقبال نے جس "نطقِ اعرابی" کا ذکر کیا ہے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا، ایک غلام دوسرے غلاموں سے مخاطب تھا۔ لوگوں کے منھ سے پھول جھڑتے تھے اس کے منھ سے انگارے اور شعلے برس رہے تھے۔ یہ بغاوت کا نقیب تھا، یہ عشقِ بلاخیز کا پیامبر تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ باغیانہ تھا، اور اس کی یہ بغاوت متعدّی تھی۔ اس نے قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ حدیث کے حوالے دیے۔ اسلاف کے واقعات سنائے۔ پھر کہا فرانس برطانیہ سے کہیں زیادہ شقی و سفاک ہے، ہم اس سے لڑ رہے ہیں اور لڑتے رہیں گے۔ لیکن تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟ تم آزادی کیوں نہیں چھین لیتے؟ تم نے خلافت کی تحریک چلائی اور ساری دنیا میں غلغلہ مچا دیا۔ مگر اب تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ قیامت سر پر کھڑی ہے اور تم جاگنے کا نام نہیں لیتے؟ چند در چند وجوہ کی بنا پر مولانا شیروانی کے لیے یہ تقریر بڑی صبر آزما تھی۔ خطیب پر بس نہ تھا کہ اسے روک دیتے۔ اپنے بس آنا یارا نہ تھا کہ خاموشی سے سنتے رہتے۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا۔ صدائے اذان بلند ہوئی۔

موذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

مولانا کی مشکل حل ہو گئی۔ انھوں نے اجلاس دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیا۔

مولانا حسرت موہانی

غیر منقسم ہندستان کے رہ نمایانِ آزادی میں مولانا حسرت موہانی کے نام نامی سے کون واقف نہیں؟ انھوں نے برطانوی استعمار کے خلاف عملی جدّ و جہد کا اس وقت آغاز کیا کہ جب گاندھی جی جنوبی افریقہ کے ایک غیر معروف وکیل تھے۔ موتی لال نہرو اور دوسرے کانگریسی ہند حکومت برطانیہ کے نیاز مند تھے اور اس سے مخلصانہ تعاون کر رہے تھے۔ مولانا اس وقت جیل گئے کہ جب سیاسی اسیروں کے لیے درجہ بندی وجود میں نہیں آئی تھی اور وہ بھی اخلاقی قیدیوں کے ساتھ چکّی پیستے اور مونج بٹتے تھے۔ اس زمانے میں مولانا نے کہا تھا ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

آدمی شروع سے مذہبی تھے ۔ نماز روزے کے سختی سے پابند ۔ جیل میں بھی یہ وضع قائم رہی ۔ اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

کٹ گیا جیل میں ماہِ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

مولانا شروع ہی سے آزادیٔ کامل کے طلب گار تھے ، درجۂ نوآبادیات کا تصور بھی ان کے نزدیک مصیبت تھا ۔ ۱۹۲۸ء میں جب موتی لال نہرو نے نہرو رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے سامنے پیش کی تو وہ لوگ بھی جو نہرو رپورٹ کی سفارشات سے سنگین اختلاف رکھتے تھے اس پر آمادہ ہو گئے کہ رپورٹ کی دفعات پر حسب موقع اپنے اختلافی خیالات کا اظہار ترمیم پیش کریں گے لیکن اس رسمی تجویز کی تائید کریں گے جو پنڈت موتی لال نہرو کی کاوش اور محنت کے شکریے پر مشتمل تھی ۔ تجویز پیش ہوئی ، ہر مکتبِ فکر کے نمائندوں نے اس کی تائید کی اور عین اس وقت جب تجویز پر ووٹ لیا جانے والا تھا اور اس کے بالاتفاق منظور ہونے کا اعلان کیا جانے والا تھا مولانا حسرت موہانی اسٹیج پر تشریف لائے ۔ اُنھوں نے فرمایا :۔

”پنڈت موتی لال ہرگز کسی شکر و سپاس کے مستحق نہیں ہیں ۔ اُنھوں نے اپنی رپورٹ میں درجۂ نوآبادیات کو منزلِ مقصود قرار دیا ہے ۔ یہ ملک کے ساتھ غداری ہے اور کسی غدّار کے لیے شکریے کی تجویز ستم ظریفی کی انتہا ہے ۔ ہماری منزلِ مقصود آزادیٔ کامل ہے اور اس سے کم پر ہم کبھی راضی نہیں ہو سکتے !“

مولانا کی اس تقریر نے قیصر باغ کی بارہ دری کے ہال میں سناٹا طاری کر دیا ۔ ڈاکٹر انصاری ، مولانا ابوالکلام آزاد ، لالہ لاج پت رائے ، سرتیج بہادر سپرو ، سبھاش چندر بوس ، جے ۔ ایم ۔ سین گپتا ، مہاراجہ محمود آباد ، مسز سروجنی نائیڈو ، پنڈت مدن موہن مالوی ، سب دنگ تھے ۔ اس لیے کہ ابھی ابھی تائید کر کے بیٹھے تھے ۔ پنڈت موتی لال نے بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔

”مولانا میں آپ کی تائید کرتا ہوں اور مجھے آپ سے ہمدردی بھی ہے اس لیے کہ ایوان کی عظیم اکثریت کے سامنے ہم دونوں کی حیثیت ایک حقیر اقلیت سے زیادہ نہیں “

مولانا نے جواب دیا :۔

”اس کے باوجود شکریے کی تجویز کے بالاتفاق منظور ہونے کا اعلان نہیں کیا جا سکے گا ۔ یہی میرا مقصد ہے !“

تجویز قہقہوں کے شور میں منظور ہو گئی ۔ اس کے بعد مولانا نے متعدد اہم ترمیمیں پیش

گیں لیکن کوئی ترمیم بھی منظور نہ ہو سکی۔ ہر شکست کے بعد ایک تازہ ولولے کے ساتھ مولانا نئی ترمیم پیش کر دیتے۔ جلسہ جب ختم ہوا تو یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ دستخط لینے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ مولانا ہر کاپی پر دستخط کے ساتھ اپنا کوئی شعر بھی ضرور لکھتے تھے۔ ایک شعر اب بھی یاد ہے:

بندۂ بندگان حضرتِ عشق
حسرت سرفرازِ رسوائی!!

یہ شعر موقع کی مناسبت سے کچھ ایسا چسپاں تھا کہ نقش ہو گیا۔

مولانا انتہائی مذہبی آدمی تھے۔ تصوّف کے لذّت آشنا بھی تھے۔ خاندان فرنگی محل میں بیعت تھے۔ جس طرح نماز روزے کے پابند تھے اسی طرح اوراد و وظائف کی بھی پابندی کرتے تھے۔ بمبئی جب تشریف لاتے تو خلافت ہاؤس ضرور آتے۔ خلافت ہاؤس آتے تو میرے کمرۂ ادارت میں بھی قدم رنجہ فرماتے۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے کہ روسی ترکستان کا ایک خانماں برباد اور خانہ بدوش شخص میرے پاس آیا اور مسلمانوں پر کمیونسٹوں کے مظالم کی داستانِ درد بیان کرنے لگا۔ اُس نے استدعا کی کہ یہ باتیں روزنامہ خلافت میں شائع کر دوں۔ اتفاق کی بات مولانا بھی تشریف رکھتے تھے۔ روسی ترکستان کا یہ شخص سوز و درد کے ساتھ اپنی داستان بیان کر رہا تھا کہ دفعتہً مولانا نے مداخلت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"بالکل جھوٹ بالکل غلط"

وہ شخص سراپا حیرت بن کر مولانا کو دیکھنے لگا۔ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ مولانا نے ہم دونوں کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے فرمایا:۔

"آپ ان باتوں کا کیوں یقین کر رہے ہیں۔ یہ سب جھوٹ اور افترا ہے۔ نہ کمیونسٹوں میں کوئی برائی ہے نہ کمیونزم میں۔ یہ دونوں انسانیت کے لیے رحمت ہیں۔

مولانا کی مولویانہ وضع قطع اور سج دھج دیکھ کر اور مذہبی معاملات میں ان کے خضوع و خشوع سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث مجھے شدید حیرت تھی کہ یہ اتنے کٹر کمیونسٹ کیسے ہیں؟ ان کے کٹرپن کا اندازہ اس سے کیجیے کہ معاملات و مسائل میں اختلافی نقطۂ نظر وہ توجہ اور خاموشی سے سُن سکتے تھے، لیکن کمیونزم کے خلاف لفظ سُننا بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا، یہ معمّا آج تک میرے لیے معمّا ہی ہے۔ یہ عابدِ شب زندہ دار، یہ صوفی، یہ ہر سال پابندی سے حج کرنے والا، مقاماتِ مقدسہ اور عتباتِ عالیات کا یہ مستقل ذاکر، آشنا بڑا اور بے لچک

کمیونسٹ کیسے بن گیا! ایک طرف کمیونزم سے یہ لگاؤ دوسری طرف معرفت کا یہ حال کہ فرماتے ہیں:۔

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
کام بے کار ہیں سب ان کی محبت کے سوا

مولانا محمدؐ علی جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمدؐ علی کے عظیم و جلیل، لازوال اور غیر فانی کارنامے تاریخ برصغیر کے ناقابلِ فراموش باب بن چکے ہیں۔ مولانا محمدؐ علی کی سیاست اور صحافت صرف حق اور سچائی کے لیے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دوست اور دشمن بدلتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اور ناحق سے مقابلہ کیا۔ خواہ ناحق پر اُن کا کوئی عزیز ترین دوست اور ساتھی کیوں نہ ہو اور حق کا پرچم اُن کے کسی حریف اور مخالف کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو۔ شخصیت سے مرعوب ہونا اگرچہ وہ کتنی ہی بھاری بھرکم اور واجب الاحترام ہو اُنھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی اور کسی موقع پر حق سے روگردانی بھی کی جاسکتی ہے انھوں نے ایک مرتبہ نواب محسن الملک کو، جن کا وہ حد درجہ ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے، علی گڑھ کے معاملات پر ایک تند و تیز خط لکھا۔ اُس خط میں اُنھوں نے لکھا تھا:۔

"شوکت کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے معلوم ہو کہ وہ باطل کا ساتھ دے رہے ہیں تو ایک چھُری لوں گا اور ان کی گردن پر پھیر دوں گا۔ اور پھر یہ چھُری بتقاضائے محبت اپنے حلقوم پر پھیر لوں گا۔"

مولانا عبدالباری فرنگی محلی محمدؐ علی کے مرشد تھے، لیکن آویزش نجد و حجاز کے زمانے میں مولانا کا مسلک محمدؐ علی کے نزدیک غلط تھا۔ اُنھوں نے بے تامل اپنے مُرشد سے اختلاف کا اظہار کیا۔ نوبت قریب قریب فسخ بیعت تک پہنچ گئی اور یہ صورت محمدؐ علی کے لیے حد درجہ اذیتِ قلب کا سبب تھی لیکن وہ اپنے مسلک پر چٹان کی طرح قائم رہے۔ مہاراجا اندور سے محمدؐ علی کے ذاتی اور خاندانی تعلقات تھے لیکن جب وہاں ہندو مسلم فساد ہوا مسلمان ہدفِ ستم بنے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو مسلمانوں کی پیروی کے لیے آپہنچے اور فوراً ہی ریاست میں ان کا قیام ممنوع قرار دے دیا گیا تو محمدؐ علی نے وہ سنگین اختلافات فراموش کر دیے جو ڈاکٹر کچلو سے چلے آرہے تھے اور ان دیرینہ و مستحکم تعلقات کو نظر انداز کر دیا جو مہاراجا اندور سے قائم تھے۔ یہ ہمدرد میں اُنھوں نے پوری قوت سے مہاراجا کی مخالفت کی اور ڈاکٹر کچلو کے عزم وہمت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ مہاراجا محمود آباد اور سر آغا خان محمدؐ علی کے محسن تھے لیکن جب ایک

نازک ترین مسئلے پر اُنھوں نے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دیا اور انگریزوں سے تعاون کیا تو محمدؐ علی نے پھر بغیر کسی جھجک کے اپنے اخبارات میں ان دونوں حضرات پر سخت و شدید لہجے میں نکتہ چینی کی۔ نواب صاحب رام پور اُن کے مربّی، ان کے خاندان کے سرپرست تھے۔ ذاتی طور پر ان کے مدّاح، ثناخواں اور قدر داں تھے۔ لیکن حادثہ مسجد کان پور کے زمانے میں اور اس کے بعد دوسری جنگِ عظیم کے آغاز کے وقت محمدؐ علی نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" میں ان کی ریاست اور ان کے اندازِ سیاست سے شدید اختلاف کیا۔ اس جرم میں ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی، اپنے حقوق سے محروم ہو گئے، ریاست میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا اور کئی سال تک وہ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکے۔ لیکن اپنے مسلک میں نواب صاحب کی وجہ سے نرمی پیدا کر لی ہو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کراچی کے سشن کورٹ میں جب ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا تو اُنھوں نے کسی طرح کی ہچکچاہٹ ظاہر کیے بغیر اپنے باغی ہونے کا اعتراف کر لیا اور ہنستے مسکراتے جیل چلے گئے۔ بقول خود:-

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

ہر موقع پر سچی بات کہنا نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر اپنے افکار و خیالات کا اظہار کرنا "پرائیویٹ" اور "پبلک" کی دیوار کو گرا کر اپنی ذات کو یک سر پبلک بنا دینا محمدؐ علی کی خصوصیت تھی۔

حجاز پر قبضہ کرتے وقت سلطان ابن سعود نے وعدہ کیا تھا کہ وہ وہاں سلطان بننے نہیں جا رہے ہیں۔ محمدؐ علی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ حجاز پر کسی فرد یا خاندان کی حکومت نہیں ہونی چاہیے۔ اس مقدس سرزمین پر ہر مسلمان کا حق ہے لہٰذا اس پر عالمِ اسلام کی حکومت ہونی چاہیے۔ ایک ایسی ہیئت حاکمہ قائم ہونی چاہیے جس میں تمام مسلم ممالک کے منتخب نمائندے شریک ہوں۔ اس ملک کی روشنی میں سلطان کا وعدہ ان کے لیے حد درجہ تسلّی بخش ثابت ہوا اور اُنھوں تائید و حمایت شروع کر دی۔

لیکن قبضہ اور تسلّط کے بعد باشندگانِ حجاز کے اصرار سے مجبور ہو کر سلطان حجاز کے شاہ ذی جاہ بن گئے۔ محمدؐ علی کو اس بات سے تکلیف پہنچی۔ سلطان کی طلب کردہ پہلی مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے وہ حجاز تشریف لے گئے۔ حجاز کا یہ پہلا سفر تھا۔ نیت حج اور زیارت کی بھی تھی۔ ان کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ مصارفِ سفر مجلس خلافت سے وصول کریں۔ کچھ جائیداد جو بچ رہی تھی وہ بیچی کچھ بیگم محمدؐ علی کا زیور بیچا اور تشریف لے گئے۔

موتمر پر مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا چھائے ہوئے تھے۔ وہ سلطان کے مقرب خاص تھے اور سلطان کو سلطانِ حجاز بنانے میں بھی ان کا بڑا حصہ تھا۔ اجلاس کا افتتاح سلطان نے بہ نفسِ نفیس کیا اور موقع کی مناسبت سے ایک موثر اور طویل تقریر بھی فرمائی اور کتاب و سنّت کی روشنی میں حکومت کرنے کا اعلان کیا۔ اس موقع پر محمدؐ علی خاموش نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے فاش اور برملا سلطان کی مخالفت کرکے کہا،

"لیکن قیصر و کسریٰ کی جس سنّت پر آپ عمل کر رہے ہیں پہلے اُسے تو ترک کیجیے!"

محمدؐ علی کے یہ الفاظ بجلی بن کر پنڈال میں گرے، سنّاٹا چھا گیا۔ سلطان ناگواری کے ساتھ اُٹھے اور تشریف لے گئے اور پھر مؤتمر کے کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے کانفرنس میں ایران، ترکیہ اور دوسرے ممالک کے نمائندے بھی موجود تھے۔ لیکن ایک غلام ملک کے باشندے کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر وہ رشک اور حسرت کی نظر سے اس مردِ قلندر کو دیکھنے لگے۔

اس طرح کا مظاہرہ محمدؐ علی نے ہندستان میں بھی وقت آنے پر کیا۔ مرکزی اسمبلی نے جب ساردا بل پاس کرکے کم سنی کی شادی ممنوع قرار دے دی تو محمدؐ علی نے مسلمانوں کے لیے بعض استثنائی صورتوں میں اس کے قانونی جواز کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ بل ایکٹ بن گیا۔ محمدؐ علی ایک وفد لے کر وائسرائے ہند لارڈ اردن کے پاس پہنچے اور ان سے اپنا مطالبہ دُہرایا:-

وائسرائے نے جواب دیا:۔ "ہندستان میں ہر مذہب کو آزادی حاصل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مفادِ عمومی سے نہ ٹکرائے۔ اس صورت میں حکومت کے قانون کو بالادستی حاصل ہو گی اور اس کا نفاذ بھی بہرحال کیا جائے گا۔

محمدؐ علی نے جواب دیا:۔ "میں قانون پر مذہب کی بالادستی کا قائل ہوں۔ لہٰذا اسے کسی صورت میں مسلمانوں پر نافذ نہیں ہونے دوں گا۔"

وائسرائے نے تھوڑے سے تامّل کے بعد کہا: "مجھے یقین ہے کہ اس سے آپ کی مُراد قانون شکنی نہیں ہے؟"

محمدؐ علی نے جواب دیا: "اس یقین میں میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوں، کیوں کہ میری مُراد قانون شکنی ہے۔" اور پھر اس کے بعد اخبار میں اعلان کرکے محمدؐ علی نے قانون شکنی کی۔ مگر حکومت ان پر ہاتھ ڈالنے کی جُرأت نہیں کر سکی۔

محمدؐ علی شیکسپیئر کے جس طرح بہت بڑے نقّاد تھے اسی طرح آرٹ کے بھی اداشناس

تھے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ایسی بہت سی تصویریں تھیں جو ان کے نزدیک آرٹ کا شاہکار تھیں۔ ان میں جہاں مردوں اور بچوں کی تصویریں تھیں وہاں عورتوں کی بھی تھیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کا محمد علی بہت احترام کرتے تھے۔ آخر میں دونوں کے مابین فکر و نظر کا شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ پھر بھی یہ اختلاف احترام کے راستے میں حائل نہیں ہوا۔ مولانا حسین احمد صرف ایک عالم دین ہی نہیں تھے صوفی اور مرشد بھی تھے، زاہد اور متقی بھی تھے۔ قایم اللیل بھی تھے اور صایم النہار بھی تھے، وہ محمد علی کے ہاں آتے تو ان تصویروں کو دیکھ کر بہت جز بز ہوتے۔ آخر ایک روز ضبط نہ کر سکے۔ تصویروں کے عدم جواز کا ذکر کرتے ہوئے اصرار کیا کہ یہ تصویریں ڈرائنگ روم سے ہٹا دی جائیں۔ لیکن محمد علی نے اس اصرار کے سامنے سر نہیں جھکایا، نہ مطلق طور پر تصویروں کے عدم جواز کا فتویٰ تسلیم کیا۔ وہ اپنے دلائل رکھتے تھے اور جب تک انشراحِ قلب کے ساتھ قائل نہ ہو جائیں کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اپنی بات ان سے نہیں منوا سکتی تھی خواہ خود ان کی نظر میں کتنی ہی معزز اور محترم کیوں نہ ہو۔

لاہور کے ایک گندہ ذہن راج پال نے ایک کتاب شائع کی جس میں آں حضرتؐ کی حیات طیبہ پر نہایت رکیک اور غلیظ حملے کیے گئے تھے۔ معاملہ عدالت تک گیا۔ ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے ملزم کو بری کر دیا۔ اس فیصلے نے ہندستان میں تہلکہ مچا دیا۔ چوں کہ واقعہ لاہور کا تھا۔ اس لیے یہاں کا جوش و خروش حد بیان سے باہر تھا۔ اخبارات نے اداریے لکھے اور جسٹس دلیپ سنگھ سے مطالبہ کیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں کیوں کہ ان کا یہ فیصلہ انصاف سے دور اور تعصب سے قریب تھا۔ جن اخبارات نے یہ اداریے لکھے تھے ان پر توہینِ عدالت کا مقدمہ چلا اور ان کے ایڈیٹروں کو جیل بھیج دیا گیا۔

محمد علی کی تمام زندگی عشق رسولؐ کا پر تو تھی۔ آں حضرتؐ کا نام آیا اور وہ اشک بار ہوئے۔ سب کو ان سے توقع تھی کہ دلیپ سنگھ استعفا کی نئی تحریک میں وہ پیش پیش ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے "ہمدرد" میں ایک طویل مقالہ لکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ قصور قاضی کا نہیں بلکہ قانون کا ہے، یعنی تعزیراتِ ہند میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے جس کی رو سے کسی ایسے شخص کو جو انبیاء اور بزرگانِ دین کی توہین کا مرتکب ہو اسے سزا دی جائے۔ دلیپ سنگھ اگر استعفا بھی دیں تو ان کی جگہ جو دوسرا جج آئے گا وہ بھی یہی فیصلہ دے گا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ دلیپ سنگھ سے استعفا طلب کیا جائے حکومت کو ایک تعزیری قانون بنانے پر مجبور کیا جائے۔

شروع شروع میں محمد علی کی اس رائے سے سخت اختلاف کیا گیا۔ میر غلام بھیک نیرنگ

اور محمدؐ علی نے اس سلسلے میں جو طویل خط وکتابت کی وہ سب میں نے محمدؐ علی کے فائل میں دیکھی تھی۔ میر صاحب اگرچہ محمدؐ علی کی اصابت رائے کے قائل تھے لیکن یہ اصرار والتجا کر رہے تھے کہ اس مسئلے پر سکوت اختیار کریں ورنہ ان کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ محمدؐ علی کا جواب یہ تھا کہ اخبارات اسی لیے ہوتے ہیں کہ رائے عامہ کی رہنمائی کریں۔ اس لیے نہیں ہوتے کہ اپنے تحفظ کے لیے رائے عامہ کی قیادت قبول کرلیں۔ آغاز میں واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کی قیادت کا آفتاب غروب ہوا لیکن بہت جلد حالات نے پلٹا کھایا اور بالآخر تمام زعماء اس رائے سے متفق ہو گئے کہ قانون بدلوایا جائے۔ محمدؐ علی نے جو قانون کا مسودہ تیار کیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ حاجی سر عبد اللہ ہارون نے اسے مرکزی اسمبلی میں پیش کیا اور یہ غیر معمولی کثرتِ رائے سے منظور ہو گیا۔

ہندستان کے والیانِ ریاست میں مہاراجا الور کو شیفتگی کی حد تک محمدؐ علی سے تعلق خاطر تھا۔ وہ ان کی قابلیت، ذہانت، فراست اور خدمات کے بہت زیادہ معترف تھے۔ نواب صاحب رام پور سے ان کے برادرانہ اور عزیزانہ تعلقات تھے لیکن محمدؐ علی کی خاطر وہ نواب صاحب سے لڑ گئے۔ اور پھر آخر وقت تک دونوں کے تعلقات استوار نہیں ہو سکے۔ بات صرف اتنی تھی کہ نواب صاحب رام پور ان پر سے داخلے کی پابندی ہٹانے کو تیار نہیں تھے۔

اُنھیں مہاراجا الور نے اپنے جشنِ سال گرہ پر بڑے اشتیاق واصرار کے ساتھ الور مدعو کیا۔ محمدؐ علی گئے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے متعدد والیانِ ریاست اور حکومتِ ہند کے اعلا حکام وافسران، کراؤن پریزنسٹیڈ اور ریزیڈنٹ وغیرہ سب موجود تھے۔ ہندستان کے والیانِ ریاست میں مہاراجا الور غیر معمولی صفات کے حامل تھے۔ وہ بہترین سیاست دان تھے۔ عصری علوم پر گہری اور وسیع نظر تھی۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ برجستہ تقریر کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس موقع پر انگریز اور ہندستانی اکابر نے جو تقریریں کیں ان میں مہاراجا کے ان اوصاف کو بہت سراہا۔ محمدؐ علی سے بھی تقریر کے لیے اصرار کیا گیا تو انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"مہاراجا کے یہ سب اوصاف وکمالات درست اور بجا ہیں۔ لیکن میرے نہاں خانۂ تصورات میں کسی میجسٹی یا ہز ہائی نس کی گنجائش نہیں ہے۔ میں مہاراجا کو جمہوریۂ ہند کا آئینی صدرِ مملکت بنانے پر بخوشی رضامند ہو سکتا ہوں لیکن فرماں روائے مطلق بنانے پر نہیں اور ایک چھوٹی سی ریاست کا بھی نہیں۔"

مہاراجا کے جشنِ سال گرہ کی مسرت میں ہر سال اُردو اور انگریزی کے اخبارات

خصوصی نمبر دھوم دھام سے نکالتے تھے اور دامنِ اُمید کو آرزو سے بھر لیتے تھے۔ مہاراجا نے چاہا کہ اس طرح کا ایک خصوصی نمبر ہمدرد کا بھی نکلے۔ یہ بات جب محمد علی تک پہنچی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا:۔

”خاص نمبر نکالنا میرے اصول کے خلاف ہے، ہمدرد کا آج تک کوئی خاص نمبر شائع نہیں ہُوا اور نہ آئندہ ہوگا۔“

مجلسِ خلافت کی مالی حالت حد درجہ سقیم ہو رہی تھی۔ جوش و خروش کا دور ختم ہو چکا تھا۔ سرد مہری اور کس مپرسی کا دور جاری تھا۔ تعلیم بالغان، نیشنل والنٹیر کور، آل انڈیا تنظیم، کھدر کی ترویج، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ماہانہ مالی امداد اور دوسرے متعدد تعمیری، تعلیمی اور سیاسی کام اس نے جاری کر رکھے تھے اور ان سب پر کافی رقم ہر مہینے خرچ کرنی پڑتی تھی سرمایہ ناپید تھا۔ مصارف میں کمی ممکن نہیں۔ شوکت صاحب سخت پریشان تھے کہ سارا بار انھیں کے دوش زبردست پر تھا۔ اسی اثنا میں رنگون کے ایک میمن تاجر کی طرف سے پیش کش ہوئی کہ اگر مولانا محمد علی برما کا دورہ کریں اور وہاں کے مسلمانوں کے سامنے تقریر کریں تو مجلسِ خلافت کے لیے دو تین لاکھ رُپے فراہم کرنے کا وہ ذمّہ لیتے ہیں۔ خود محمد علی بھی اس زمانے میں ذاتی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ خود ذیابیطس کے مریض، چہیتی لڑکی بسترِ علالت پر، جو بہت جلد بسترِ مرگ بننے والا تھا۔ روزنامہ ہمدرد اور کامریڈ کی پریشانیاں، رفقائے کار کا قحط، لیکن مجلسِ خلافت کے لیے اپنی ذاتی پریشانیوں کو فراموش کر کے رنگون روانہ ہو گئے۔

رنگون میں محمد علی کا شاہانہ استقبال ہُوا۔ اتنا بڑا جلوس آج تک کسی سیاسی زعیم کا وہاں نہیں نکلا تھا۔ مسلم اور غیر مسلم کوئی ایسا نہ تھا جو متاثر نہ ہُوا ہو۔ ملکی اور غیر ملکی تک کا امتیاز ختم ہو گیا تھا۔ جلسے شروع ہوئے تو ان کا بھی ریکارڈ قائم ہو گیا۔ انھیں دیکھنے اور سُننے کے لیے وسیع و عریض جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ لوگ تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ درختوں پر اور چھتوں پر بھی لوگ تقریر سُننے اور زیارت کرنے کی دُھن میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ قیام گاہ پر بھی ہر وقت مشتاقانِ دید کا مجمع لگا رہتا تھا۔ محمد علی کی تقریروں نے نیا ولولہ، ایک نیا جوش اور ایک نیا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ اسلامیت کا جوش، اسلامی قومیت کا ولولہ اور اسلامی وحدت کا جذبہ، محمد علی سے پہلے جواہر لال اور گاندھی جی بھی رنگون کا دورہ کر چکے تھے اور قومیتِ متحدہ کا صور پھونک آئے تھے، لیکن محمد علی کی تقریروں نے اس طلسم کا پردہ چاک کر دیا۔

لیکن مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ محمد علی کو ڈرامہ سے

بڑا شغف تھا۔ شیکسپیر پر تو وہ اتھارٹی مانے جاتے تھے۔ تھیٹر اور سینما سے انھیں دل چسپی تھی کوئی اچھی فلم آجائے تو ضرور دیکھتے تھے۔ رنگون کے دوران قیام میں ان کی پسندیدہ فلم آئی۔ چند اصحاب کے ساتھ وہ اسے دیکھنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو میزبان نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ:

"آپ کی سینما بینی سے ڈر یہ ہے کہ کہیں عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے، یہاں کے لوگ اگر بھڑک گئے، جب کہ مخالف بھڑکانے میں پر تُلے ہوئے ہیں، تو مجلسِ خلافت کے لیے چندہ فراہم کرنے میں بھی دشواری پیش آئے گی لہٰذا اگر سینما دیکھنا ہی ہے تو آخری شو دیکھ لیا کیجیے۔"

محمد علی نے جواب دیا: "میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے میں سینما بینی کو حرام نہیں سمجھتا اور عقیدت مندوں کے ڈر سے اپنی روش نہیں بدل سکتا۔ نہ چشمِ مردم سے چھپنے کے لیے آخری شو کا انتخاب کروں گا۔ میرا ارادہ نہیں تھا کہ کل بھی سینما جاؤں لیکن اب جاؤں گا۔ باقی رہا مجلسِ خلافت کا چندہ تو وہ اگر اس شرط پر مل سکتا ہے کہ میں اپنا ظاہر کچھ رکھوں اور باطن کچھ تو چندہ نہیں چاہیے۔ میں پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا۔"

میزبان نے پاؤں پکڑ لیے، مگر محمد علی اپنی ہٹ پر قائم رہے۔

محمد علی کو غصہ بہت جلد آجاتا تھا لیکن ان کے غصے میں بھی ایک بانکپن تھا اور شوخی۔ بذلہ سنجی اور طنزِ لطیف کے تو وہ بادشاہ تھے۔ بات میں بات پیدا کرنا، ذرا سے ہیر پھیر سے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دینا، چٹکیاں اور گدگدیاں ان کا خاص فن تھا اور اس فن میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

عطیہ بیگم کی موجودگی میں ایک مرتبہ بمبئی کی سڑکوں کے نام زیرِ بحث آئے۔ گرانٹ روڈ کے ذکر پر انھوں نے مزے سے کہا! "اس کا نام شارعِ عطیہ ہونا چاہیے!" محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے اجتماعات میں حتی الامکان پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عبدالمجید خواجہ صاحب کے دولت کدے پر چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مسٹر ضیاالدین بھی اس موقع پر موجود تھے۔ محمد علی شریفے کھا رہے تھے اور بیج زمین پر پھینک رہے تھے۔ ایک دوست نے کہا:

"محمد علی تمیز سے کھاؤ بیج زمین پر کیوں پھینک رہے ہو؟" محمد علی نے جواب دیا:

"اس لیے کہ یہاں شریفوں کی بہت کمی ہے۔"

لکھنؤ کے ایڈیٹر مولانا ظفر الملک علوی، سچ بات کہنے میں شمشیر برہنہ تھے، کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ محمد علی ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ "لوگ سچ کو کڑوا سمجھتے ہیں ظفر الملک کے نزدیک کڑوے پن کا نام سچ ہے!"

نہرو رپورٹ کے زمانے میں محمد علی پٹنہ تشریف لے گئے۔ وہاں پروفیسر عبدالباری کانگریس کے زبردست کارکن تھے اور نہرو رپورٹ کے زبردست حامی تھے۔ نہرو رپورٹ اور کانگریس کی حمایت میں ان دونوں نے ایک پمفلٹ اس جلسے میں تقسیم کیا جس میں محمد علی تقریر کے لیے آ رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں کہا:-

"جن لوگوں کو جھوٹ بولنے کا فن سیکھنا ہو وہ "باری باری" سے سیکھیں"۔

مولانا شوکت علی، محمد علی کے بڑے بھائی تھے۔ ذوالفقار علی خان گوہر داغ کے شاگرد اور بہت اچھے شعر گو تھے۔ لیکن ان کا مذہبی عقیدہ اور سیاسی مسلک علی برادران سے جدا تھا۔ چھے سال کے لیے محمد علی جب چھندواڑہ میں نظر بند اور بیتول جیل میں قید ہوئے تو گوہر نے گویا معذرت کرتے ہوئے اُنھیں لکھا:

جورِ اعدا کے گلے ، تیری جدائی کے گلے
اس دلِ تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے

محمد علی نے جواب دیا:-

خوفِ غمّاز ، عدالت کا خطر ، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

روزنامہ سیاست لاہور کے مدیر شہیر مولانا سید حبیب مرحوم کی محمد علی سے نہیں بنتی تھی۔ دونوں کے مسلک میں بُعد المشرقین تھا۔ صرف مسلک میں ہی نہیں طبیعت، مزاج، کردار، سیرت اور سیاست میں بھی۔

ایک مرتبہ مولانا سید حبیب نے سیاست میں ایک طویل مقالہ انشائیہ محمد علی اور ان کی سیاست پر لکھا۔ اس میں کہیں اُنھیں "خوفناک" قرار دیا کہیں "خطرناک"، کہیں حالت عبرتناک بتائی کہیں ان کے سیاسی مسلک کو ملک وملت کے لیے "اندوھناک" قرار دیا، کبھی ان کی روش کو قوم کے لیے "المناک" فرمایا کہیں "شرمناک"۔

محمد علی نے اس تحریر کا جواب دیتے ہوئے لکھا: "مگر ان ساری باتوں میں "سچ ناک" ایک بھی نہیں ہے"۔

شعیب قریشی

جن لوگوں نے محمدؐ علی کے زیرِ سایہ سیاسی تربیت حاصل کی ان میں شعیب قریشی مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شعیب صاحب علی گڑھ اور آکسفورڈ کے گریجویٹ تھے۔ علی گڑھ سے ایل۔ ایل۔ بی۔ کا امتحان پاس کیا۔ لندن سے بیرسٹری کا ۱۹۳۰ء میں۔ محمدؐ علی جب وفد خلافت لے کر لندن پہنچے تو یہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ محمدؐ علی کے پہنچتے ہی ایک سال تعلیم ملتوی کر دی اور وفد کے کارگزاروں میں شامل ہو گئے۔ پہلے علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں ڈاکٹر انصاری کے طبّی وفد کے ساتھ، جو محمدؐ علی نے ترکیہ بھیجا تھا۔ شریک ہو کر قسطنطنیہ پہنچے اور گراں بہا خدمات انجام دیں۔ انگریزی اتنی اچھی لکھتے تھے کہ کامریڈ کے بند ہونے کے بعد غلام حسین مرحوم کے ساتھ مل کر جو محمدؐ علی کے دستِ راست رہ چکے تھے۔ لکھنؤ سے "نیو ایرا" نکالا جو بہت مقبول ہُوا۔ پھر گاندھی جی کو جب چھے سال کی سزا ہوئی تو اُنھوں نے "ینگ انڈیا" کا ایڈیٹر شعیب صاحب ہی کو نامزد کیا۔ اسی جرم میں دو سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد شعیب صاحب مرکزی مجلسِ خلافت کے آنریری سکریٹری ہو گئے۔ اُنھوں نے جس بے لوثی اور خلوص کے ساتھ قوم کی خدمت کی اس کی مثالیں نایاب ہیں۔ کبھی ایک پیسہ بھی قومی فنڈ کا اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔ خلافت ہاؤس میں تھے اور کام خلافت کا کرتے تھے لیکن کھانا کبھی مفت نہیں کھایا۔ ہر ماہ پابندی کے ساتھ بل ادا کرتے تھے۔ آبائی جائیداد نے جب تک ساتھ دیا اُسے فروخت کر کے اپنے مصارف پورے کرتے رہے۔ جب یہ ختم ہو گئی تو نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال نے، جو علی گڑھ کے ساتھی تھے، اپنے پاس بُلا لیا اور زبردستی وزارت کا منصب سونپ دیا۔ وزارت بھی اس دیانت سے کی کہ دوست دشمن سب سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آگئے۔ اور ایسٹرن فیڈل انشورنس کمپنی کے نگراں کار بن گئے۔ شعیب صاحب اس کمپنی کے بانیوں میں تھے۔ پھر لیاقت علی خان کی نگاہِ انتخاب نے پاکستان کا سفیر بنا کر اُنھیں روس بھیج دیا۔ ہندستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور مرکزی حکومت کے وزیر بھی رہے۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے عرض کیا تھا کہ "تحریکِ خلافت کی تاریخ" سرکاری وسائل و ذرائع کو بروئے کار لا کر مرتب کرائیں۔ کانگریس نے اپنی داستانوں کو تاریخ بنا دیا ہے۔ حیف ہے اگر ہم اپنی تاریخ کو افسانہ بنا دیں۔ میری یہ گزارش توجّہ سے سُنی اور اس سلسلے میں استطاعت کے مطابق سب کچھ کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ سیاسی حالات بار بار پلٹا کھا رہے تھے۔ اسی اُلٹ پلٹ میں ان کی وزارت بھی جاتی رہی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!

نہرو کمیٹی کے ایک رکن شعیب صاحب بھی تھے۔ موتی لال ان کا اتنا خیال کرتے تھے جتنا جواہر لال کا۔ یہ بھی ان کا واقعی احترام کرتے تھے۔ لیکن نہرو کمیٹی نے ترتیب دستور کے وقت جب مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کو پامال کرنا چاہا تو شعیب صاحب ذاتی تعلقات و روابط کو بالائے طاق رکھ کر مقابلے میں ڈٹ گئے۔ موتی لال خفا ہو گئے۔ ڈاکٹر انصاری سے دیرینہ اور انتہائی مخلصانہ تعلقات تلخ ہو گئے۔ گاندھی جی نے "متعصب مسلمان" کا خطاب دیا۔ جواہر لال سے ان بن ہو گئی۔ لیکن اُنھوں نے کوئی پروا نہ کی اور زبردست اختلافی نوٹ لکھا۔ وہ نوٹ اتنا سخت اور سنگین تھا کہ موتی لال کی ہمت نہیں پڑی کہ نہرو رپورٹ کے ساتھ اسے شائع کر سکیں۔ اس پر مجلس خلافت کی طرف سے سخت احتجاج بھی کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ وہ اختلافی نوٹ شائع کیا جائے۔ آخر بعد از خرابیٔ بسیار اُسے الگ سے ایک مدت گزرنے کے بعد شائع کیا گیا۔ اس واقعہ سے شعیب صاحب اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ سیاسیات ملکی سے قریب قریب اُنھوں نے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔

رؤف بے

ترکیہ کی تاریخ حریت میں رؤف بے اور خالدہ ادیب خانم کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان دونوں نے جس بے جگری، بے خوفی اور جراٗت کے ساتھ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کا ساتھ دیا وہ ترکیہ کی تاریخ استقلال کا ایک زریں باب ہے۔ لیکن ترکیہ کی آزادی کے بعد ان دونوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ اتاترک ان کا فطری اختلاف برداشت نہ کر سکے۔ انھیں جلاوطنی کا حکم ملا اور یہ اپنے اس محبوب وطن سے رخصت ہو گئے جس کی آزادی کے لیے اُنھوں نے تن، من، دھن کی بازی لگائی تھی۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم طبی وفد کے قائد کی حیثیت سے عرصے تک ترکی میں مقیم رہے تھے اور ان کے تعلقات ترک زعماء سے بہت گہرے اور دوستانہ تھے، ۱۹۳۳ء میں جامعہ مِلّیہ کے چانسلر کی حیثیت سے اُنھوں نے رؤف پاشا کو توسیعی خطبات دینے پر مجبور کیا۔ جلسے کے منتظمین میں طلباء بھی شریک تھے اور اُن میں ان سطروں کا لکھنے والا بھی شامل تھا۔ جلسے کی صدارت ہر روز کوئی ملک کا ممتاز فرد کرتا تھا۔ سر راس مسعود اور علّامہ اقبال نے بھی ایک ایک جلسے کی صدارت فرمائی۔

رؤف پاشا کی شخصیت ہندستان میں غیر معروف نہ تھی۔ ان کے جنگی جہاز حمیدیہ کے کارنامے مولانا محمد علی نے کامریڈ میں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں اس شان سے متواتر اور مسلسل

شائع کیے تھے کہ ملک کی اُردُو دان اور انگریزی خواں پبلک ان سے ایک والہانہ تعلق محسوس کرنے لگی تھی۔ رؤف پاشا خلیفۃ المسلمین کی بحریہ کا امیر البحر، اور حمیدیہ کا ناخُدا، جس نے دشمن کے کئی جہاز غرق کر دیے اور اپنے جہاز پر آنچ بھی نہ آنے دی، دلّی آیا تو خلقت شوقِ دیدار میں دیوانہ وار ٹوٹ پڑی۔ قرول باغ میں جامعہ کے تعلیمی مرکز نمبر ایک کا ہال سامعین اور مشتاقانِ دید سے کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ جلسہ گاہ سے باہر ہزاروں آدمی صفیں باندھے کھڑے تھے۔

افتتاحی اور صدارتی تقریر کے بعد رؤف پاشا کھڑے ہوئے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے غیر فانی کارنامے سرانجام دیے۔ اس مجاہد، اس غازی، اس ترکِ تیغ زن پر اس کی زمین تنگ ہوگئی۔ دیارِ غیر میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن اپنی قوم کی شان میں رطب اللسان، اپنے ملک کے لیے آتش بیان اور اپنے قائد کا مدّاح اور ثنا خواں!

ترکیہ کے ماضی اور حال پر رؤف پاشا نے کئی تقریریں کیں لیکن کسی تقریر میں نہ اتاترک کی تنقیص تھی اور نہ دستورِ حکومت پر تنقید، جہادِ آزادی کی ایک داستان تھی اور داستان گو وہ جو خود اس کہانی کا ہیرو تھا۔

لوگ منتظر تھے کہ رؤف پاشا دستورِ حکومت پر بے دردی کے ساتھ نکتہ چینی کریں گے۔ اتاترک کے اسرار اوروں پر آشکار کریں گے، ملکی اور ملّی سیاست کے بخیے اُدھیڑیں گے۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ تقریر کے آخر میں سوالات کی اجازت تھی۔ ایک صاحب سے نہ رہا گیا۔ سوال کیا:-

"اتاترک کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

رؤف پاشا نے جواب دیا۔ "جو ہر ترک کی ہے! بہت اچھی"

پھر سوال ہُوا:-

لیکن آپ کے اور اتاترک کے مابین تو شدید اختلافات ہیں اور اسی وجہ سے آپ وطن سے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

رؤف پاشا کا سُرخ و سپید چہرہ تمتما اٹھا۔ اُنھوں نے ایک فوجی کے تیور سے جواب دیا:

"میرے اختلافات کا تعلق بیرونی دنیا سے نہیں ہے۔ یہ طویل سفر میں نے اپنے ملک کے خلاف زہر چکانی کے لیے اختیار نہیں کیا۔ ترکیہ حیات تو اتاترک کی رہین منت ہے اور ترک ان کے اس عظیم اور لازوال کارنامے کو عظمت کی نگاہ سے دیکھنے اور عقیدت کے ساتھ یاد رکھنے پر مجبور ہیں!"

کامریڈ، الہلال کی تحریروں نے رؤف پاشا کی جو عظمت میرے دل میں پیدا کی تھی ان

کے اس جواب نے اسے عقیدت میں تبدیل کر دیا۔

مولانا شوکت علی

ہندستان کے مسلمان رہنماؤں میں مولانا شوکت علی کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت بڑے آدمی تھے، صرف تن و توش کے اعتبار سے نہیں، کردار و سیرت کے اعتبار سے بھی۔ ان کی خدمت میں کئی سال رہ کر میں نے یہ جانا کہ قوم کا خادم قوم کا مخدوم کس طرح بنتا ہے۔ اور قوم کے مخدوم کو کس طرح کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اور قوم کی ناخدائی کرنے والے کو کیوں کر اپنی جان، اپنے مال اور اپنی عزیز ترین چیزیں قربان کرنے پر تیار رہنا چاہیے۔

شوکت صاحب خوش خوراک تھے، خوش لباس تھے، خوش اوقات تھے، لیکن اسی وقت تک جب تک ان کے پاس دھن تھا۔ پنشن ضبط، آبائی جائیداد بک گئی وہ قلندرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ہفتے گزر جاتے تھے گوشت کی صورت دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ بیٹیوں نے مایوس ہو کر خلافت ہاؤس کی اقامت ترک کر دی تھی۔ لیکن شوکت صاحب کی شادمانی کو کوئی نہ چھین سکا۔ دال روٹی اس شوق سے اور تعریفیں کر کر کے کھاتے تھے جیسے من و سلویٰ کھا رہے ہوں۔ دن میں دو مرتبہ غسل کرنا اور لباس تبدیل کرنا ان کا معمول تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ غربت کسی آدمی کو میلا کچیلا رہنے پر مجبور نہیں کرتی، پیسے نہ ہوں تو آدمی خود اپنے کپڑے ہر روز دھو سکتا ہے۔ لباس پھٹا ہوا ہو تو پیوند لگا سکتا ہے اور اُجلا رہ سکتا ہے اور خود ان کا عمل بھی یہی تھا۔ ان کے پاجامہ تار تار ہیں میں نے کئی مرتبہ پیوند لگتے اور بخیہ ہوتے دیکھا ہے۔ دوستوں کی جیب پر ڈاکہ مارنے میں وہ کمال رکھتے تھے۔ لوگ خلافت کو چندہ دیتے گھبراتے تھے۔ لیکن شوکت صاحب کا مطالبہ رد کر دیں یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بابائے اردو ایک مرتبہ اورنگ آباد سے انجمن کے لیے چندہ وصول کرنے کا پروگرام لے کر حیدر آباد تشریف لائے ان کا اثر و رسوخ، چھوٹوں اور بڑوں پر ان کا دباؤ، اس امر کا غماز تھا کہ جھولی بھر کر واپس آئیں گے۔ لیکن حیدر آباد پہنچے تو شوکت صاحب کی صورت میں ایک قد آور حریف موجود تھا اور قبل اس کے مولوی صاحب حرفِ مطلب زبان پر لائیں۔ یہ حریف بے درنگ مشترک دوستوں کی جیبیں خالی کرا لیتا تھا۔ بڑی بے بسی کے ساتھ سید ہاشمی فرید آبادی سے مولوی صاحب نے شوکت صاحب کا ذکر کرتے ہوئے کہا یہ شخص تو ڈاکہ ڈال رہا ہے میں کیا کروں؟ لیکن ڈاکے کی رقمیں اس ڈاکو نے کبھی اپنی ذات پر یا اپنے اہل و عیال پر خرچ نہیں کیں۔ اس کا ایک بیٹا کلکتہ کی ایک مِل میں کام کرتا تھا۔ اور دوسرا بیٹا

دوسری جگہوں پر روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہا اور یہ رقمیں لالاکر خلافت فنڈ میں جمع کرتا رہا۔ فقروفاقے کے اس عالم میں بھی علی گڑھ کا کوئی دوست آجائے، علی گڑھ کی کوئی ٹیم آجائے، علی گڑھ کا کوئی وفد آجائے تو خلافت ہاؤس ان مہمانوں کے لیے وقف۔ قرض لے لے کر خاطر تواضع کا حق ادا ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ سے خلافت ہاؤس منتقل ہوگئی ہے۔ چہچہے، قہقہے، پرانی داستانیں، دوستوں کا ذکر، یاروں کا تذکرہ، محفل آرائیوں کی داستان؛ بلا سے ان مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد فاقہ مستی رنگ لائے مگر اب تو آرام سے گزر رہی ہے۔

بمبئی کے محلّوں سے کچھ ہندو بچے غائب ہوئے۔ پروپیگنڈا یہ شروع ہوا کہ یہ حرکت مسلمانوں کی ہے، دادر کا علاقہ ہندو آبادی پر مشتمل ہے، وہاں پٹھانوں پر قاتلانہ حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور پھر بہت جلد ہندو مسلم فساد نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شہر کے دوسرے محلّوں میں تو مسلمان کلّہ بہ کلّہ لڑ رہے تھے لیکن دادر میں پٹھانوں کی حالت بہت سقیم تھی۔ پٹھان کسی ایک جگہ آباد نہیں تھے۔ مختلف چالوں میں بکھرے ہوئے تھے اور تعداد میں بھی ہندوؤں سے بہت کم تھے۔ مولانا شوکت علی موٹر میں پہنچے اور سیدھے دادر۔ خشت باری اور سنگ باری ہو رہی تھی، نعرے لگ رہے تھے، پٹھان اپنی اپنی کوٹھڑیوں اور کمروں میں محبوس تھے۔ جو اِکّا دُکّا نظر آتا تھا قتل کر دیا جاتا تھا۔ پولیس افسر نے شوکت صاحب سے کہا، حالات نازک ہیں آپ آبادی میں تشریف نہ لے جائیں۔ ہم سے جو ہو سکتا ہے کر رہے ہیں۔

شوکت صاحب نے جواب دیا:

"تم تو کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو۔ میں اپنی زندگی کا خود ذمّے دار ہوں۔ ہم کو راستہ دو۔ وہ مرعوب ہو کر ہٹ گیا۔ شوکت صاحب کو دیکھ کر بلوائیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ لیکن اُنھوں نے ذرا نوٹس نہ لیا۔ ایک ایک چال میں، ایک ایک گھر پر پہنچے اور شوکت صاحب نے رضاکاروں کی مدد سے دادر کے تمام پٹھانوں کو جن کی تعداد کئی سو تھی نرغے سے نکالا۔ خلافت ہاؤس میں ٹھہرایا اور جب تک حالات معمول پر نہ آگئے ان کی مہمان داری کرتے رہے، خود چاہے فاقہ کر لیا ہو مگر پٹھان کو بھوکا سو جانے دیا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا۔

فری پریس جرنل کے بدزبان اور شورہ پشت ایڈیٹر سدانند نے شوکت صاحب پر الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کو شہ دے کر ہندوؤں کو قتل کروا رہے ہیں اور جس ٹرک میں خلافت کے رضاکار گشت کر رہے تھے اس سے خون اور چھرے برآمد ہوئے ہیں۔ بمبئی کارپوریشن نے ایک مجلسِ صلح طلب کی۔ شوکت صاحب کو بھی مدعو کیا۔ اُنھوں نے صلح اور سلام کی حمایت میں ایک دل نشین تقریر کی۔ بمبئی کے ادب پتی سرمایہ دار اور ساہوکار سر پرشوتم داس ٹھاکر داس

اُٹھے۔ اُنھوں نے فری پریس کی خبر حاضرین کو سنائی اور پھر کہا لوگ باتیں اتحاد اور صلح کی کرتے ہیں لیکن موقع پاتے ہی چاقو اور چھُرے کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ شوکت صاحب نے پرشوتم داس ٹھاکر داس کو تُرکی بتُرکی جواب دیا اور خفا ہو کر اجلاس سے چلے آئے۔ دوسرے روز سدآنند پر حیثیت عرفی کا مقدمہ چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر کر دیا۔

مقدمہ دائر کر کے شوکت صاحب نے بمبئی کے سارے پریس کو اپنا مخالف بنا لیا۔ سدآنند با اثر آدمی تھے۔ ہندو سرمایہ داروں نے مقدمہ کو ناکام بنانے کے لیے تھیلیوں کے مُنھ کھول دیے۔ شہر کے بڑے بڑے وکیل اور بیرسٹر سدآنند کا مقدمہ مفت کرنے کو میدان میں آگئے۔ سدآنند اس مقدمے سے بہت خوش ہوا۔ ایک تو اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ شوکت صاحب جیت نہیں سکتے، دوسرے اس لیے کہ ازالہ حیثیت کا ثابت کرنا اور کڑی سے کڑی بلکہ ناگفتہ جرح کے لیے تیار رہنا ایک لیڈر کے بس کی بات نہیں ہے کیوں کہ وہ شیش محل میں رہتا ہے۔

شوکت صاحب کے دوستوں نے رائے دی کہ مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ مسلم سرمایہ دار سدآنند سے اتنے خائف تھے کہ اُنھوں نے بھی کوئی مدد نہیں کی۔ لیکن شوکت صاحب کو خدا پر بھروسا تھا۔ وہ لڑتے رہے اور مقدمہ چلا اور بڑی شان سے لڑا گیا۔ شوکت صاحب نے سدآنند کی جرح کا ایک ایسا نپا تُلا جواب دیا کہ وہ خود مجروح ہو کر رہ گیا۔ اس کے دونوں مفروضے غلط ثابت ہوئے۔ چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے جس روز فیصلہ سنایا عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن فیصلہ سدآنند کے خلاف تھا۔ اسے جرمانے کی سزا ہوئی۔ فیصلہ اتنا زبردست تھا کہ سدآنند اپیل کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور جرمانہ ادا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

مولانا شوکت علی نے جس خلوص کے ساتھ مسلم لیگ کی خدمت کی۔ اسے ہر دل عزیز اور مقبول بنایا۔ اس کے قائدِ اعظم بھی معترف تھے۔ قائدِ اعظم ہمیشہ نازک موقع پر ان کے تعاون اور رفاقت کے جویا ہوتے۔ ان کی لڑکی نے جب ایک غیر مسلم سے شادی کرنے کا فیصلہ ننھیالی تربیت کے باعث کیا تو قائدِ اعظم نے شوکت صاحب کو یاد کیا۔ اور بہ چشمِ پُر نم ان سے اصرار کیا کہ وہ کسی ایسے قابلِ اعتماد مسلمان کا بندوبست کر دیں جو انگریزی اچھی طرح جانتا ہو اور اسلام کی خوبیوں سے اسے واقف کر سکے کیوں کہ وہ اسلام سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بات قائدِ اعظم شوکت صاحب کے سوا کسی اور کے علم میں نہیں لائے۔ انھیں اُمید تھی کہ لڑکی راہِ راست پر آجائے گی۔ اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوں اور بات پھیلے۔ شوکت صاحب نے وعدہ کر لیا۔ لیکن چند

ہی روز گزرے تھے کہ اُس نے اپنے پارسی خان دان کے ایک پل اونر سے شادی کر لی۔ اس حادثے کا قائدِ اعظم پر جو اثر ہُوا وہ تو ہونا ہی چاہیے تھا لیکن شوکت صاحب کا یہ حال تھا کہ آنسو نہیں تھمتے تھے۔

مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ قائدِ اعظم کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور میں نے پہلی بار شوکت صاحب کو روتے دیکھا۔

انڈیا ایکٹ کے تحت ۱۹۳۵ ش میں جب صوبائی مجالس قانون ساز کا انتخاب ہُوا تو جھانسی کے الیکشن کو کانگریس نے اور لیگ نے معیار بنا لیا تھا۔ جواہر لال نے بار بار اعلان کیا کہ ہم مسلم لیگ کو شکست دے کر رہیں گے۔ قائدِ اعظم نے یہ مہم شوکت صاحب کے سپرد کی۔ وہ بمبئی سے سیدھے جھانسی روانہ ہو گئے۔ کانگریس کے امیدوار کے لیے رفیع احمد قدوائی مرحوم کی سرکردگی میں جمعیت علمائے ہند، مسلم مجلس، مسلم نیشلسٹ پارٹی کے اکابر اور زعماء شب و روز کام کر رہے تھے۔ شوکت صاحب کے ساتھ مسلم لیگی رہ نماؤں اور کارکنوں کا قافلہ تھا۔ کانگریس کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ مسلم لیگ اب پھر اُبھرنی شروع ہوئی تھی اور قائدِ اعظم چندے کی اپیل کے خلاف تھے۔ لہٰذا لیگ کے ذرائع اور وسائل حد درجہ محدود تھے۔ مگر شوکت صاحب کی جواں ہمتی اور اولوالعزمی نے یہ مرحلہ بہت آسانی کے ساتھ طے کر لیا۔ گرمی کا موسم تھا وہ بھی بندیل کھنڈ کی گرمی جہاں آفتاب سوا نیزے پر آجاتا ہے۔ ووٹروں کو مستعد اور منظم کرنے کے لیے دُور دراز کے دیہاتوں اور قصبوں کا دَورہ ضروری تھا۔ سواری کہیں، یکّہ کہیں، تانگہ کہیں۔ بیل گاڑی۔ جو مل جائے۔ چل چلاتی ہوئی دھوپ میں ایک روز کئی میل کا سفر بیل گاڑی میں کرنا پڑا۔ شوکت صاحب جسیم شحیم بھی تھے اور ذیابیطس کے مریض بھی۔ سفر ختم ہُوا تو خون کا پیشاب کئی مرتبہ آیا۔ لیکن ان کے عزم و ہمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی زندہ دلی، وہی بذلہ سنجی، وہی حاضر جوابی، وہی جوش و خروش۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ آج آرام کر لیں جلسہ کل سہی لیکن شوکت صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ اس حالت میں جلسہ گاہ تک پہنچے اور ایک زوردار تقریر کی۔ کانگریس یہاں عرصہ سے کام کر رہی تھی۔ اور بہت پُر اُمید تھی لیکن شوکت صاحب نے پانسہ پلٹ دیا۔

یہ معرکہ کا انتخاب تھا۔ اس میں مسلم لیگ کو فتح مبین حاصل ہوئی اور کانگریس کو شکستِ فاش۔

نومبر ۱۹۳۸ ش کے آخر ہفتے میں برونکائٹس کا ان پر شدید حملہ ہُوا۔ اس حالت

میں مسلم لیگ کے کام سے آسام کے شہر شیلانگ کے دورے کا پروگرام بنایا۔یکم دسمبر تاریخ روانگی طے پائی ۔ ۲۸ ر نومبر کو بیگم محمدؐ علی کی قیام گاہ کے صحن میں لیٹے دھوپ کھا رہے تھے کہ تمازت ناگوار محسوس ہوئی ۔ جاکر اپنے کمرے میں لیٹ رہے۔ ذرا دیر کے بعد بیگم محمدؐ علی کچھ دریافت کرنے کمرے میں پہنچیں تو شوکت صاحب اس دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

ع   سُبک بار مردم سُبک تر روند

شامِ ہمدرد ، لاہور
دسمبر ۱۹۶۵ ش

مولانا کوثر نیازی

اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے مہینے میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کو جن گراں قدر نعمتوں سے نوازا، روزے کو فضیلت بخشی اور روزے دار کو روزہ رکھنے کے عوض جس اجرِ عظیم کی بشارت دی اُس کے روح پرور اور ایمان افروز بیان کے لیے آج کی شام ہمدرد مختص کی گئی ہے تاکہ ہمارے لیے یہ ذکرِ خیر سعادت و رحمت کا باعث ہو۔

مَیں ملک کے نامور خطیب جناب مولانا کوثر نیازی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس مبارک موضوع پر خطاب منظور فرمایا: مجھے تو اس وقت آپ کے سامنے صرف دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک روزے کی فضیلت کے متعلق دوسری روزے کی فرضیت کے بارے میں۔ روزے کی یہ فضیلت کیا کچھ کم ہے کہ اگرچہ ترتیب کے لحاظ سے روزہ اسلام کا تیسرا رکن ہے لیکن اس کی فضیلت کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان فرمایا ہے کہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔" رہی روزے کی فرضیت تو جب اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کل دنیا کے لیے مبعوث فرمایا اور قرآن مجید کی شکل میں جو ہدایت نامہ آپ کو مرحمت فرمایا اس روزے کے متعلق ارشاد ہے "مومنو! تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح پہلی اقوام کے لیے تھا۔"

اس آیت مبارکہ میں روزے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت فرما دی ہے کہ تمام اقوام و ملل میں روزے کی فرضیت تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دعوا کیا کہ روزہ سابقہ تمام اُمتوں میں فرض رہا ہے۔ ایسے وقت میں کہا جب کہ دنیا کی کسی تاریخ نے اس امر پر کوئی روشنی نہیں ڈالی تھی اور نہ تاریخ اُمم کی تلاش و تحقیق کے ادارے قائم ہوئے تھے اور اب جیسا کہ سوشیالوجی کے ماہرین اور تاریخ الاُمم کے مبصّرین نے مختلف قوموں کے اوضاع و اطوار، رسوم و عادات، عقائد اور طریقِ عبادت کی تحقیقات

کیں تو انھوں نے تسلیم کیا کہ روزہ ہمیشہ سے ایک مذہبی حیثیت سے مانا گیا ہے اور اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرسل یزدانی اور قرآنِ حکیم کے کتابِ ربانی ہونے کے انکار کا کوئی امکان نہیں رہ سکتا۔

اجازت دیجئے کہ میں آج کے مہمان مقرر کے متعلق کچھ عرض کروں۔ جناب مولانا کوثر نیازی صاحب ادیب بھی ہیں اور خطیب بھی، شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی، عالم بھی ہیں اور مبلغ بھی۔ ۱۹۳۲ء میں بہ مقام میاں والی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے اُردو، فارسی اور عربی کے اعلا امتحانات پاس کیے۔ انگریزی میں بھی کافی استعداد بہم پہنچائی۔ علمی اور ادبی ذوق فطری تھا اور تبلیغ اسلام آپ کا خاص مشن۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں سہ روزہ "کوثر" کی ادارت سنبھالی جس کا سلسلہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد روزنامہ "تسنیم" میں رکن ادارہ کی حیثیت سے صحافتی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۰ء میں ہفت روزہ "شہاب" جاری کیا جو اس وقت تک پابندی اور کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اسلامی صحافت میں خاص مقام رکھتا ہے۔ کئی سال سے لاہور میں درسِ قرآن مجید کا سلسلہ جاری رہا اور تقریباً آٹھ سال سے شاہ عالم مارکیٹ کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کو نمازیوں کی بڑی تعداد کے سامنے دینی خطبہ دیتے ہیں جس کو سننے کی مجھے بھی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ مولانا کوثر نیازی صاحب کی خطابت اتنی پُر مغز اور پُر لطف ہوتی ہے کہ لاہور کے علاوہ مغربی پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دینی مجالس ہوں یا علمی، ادبی مجالس ہوں یا سیاسی مولانا کو ان میں بڑے اشتیاق اور احترام کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔

مولانا کی تصانیف میں قصہ آدم و ابلیس، اَن دیکھی حقیقتیں، آئینہ تثلیث اور ووٹ کی شرعی حقیقت مشہور ہیں۔ جن میں سے آئینہ تثلیث کا انگریزی ترجمہ ہو رہا ہے۔ ووٹ کی شرعی حقیقت کی مانگ کا اس سے اندازہ لگایئے کہ یہ رسالہ اُردو، سندھی اور بنگالی زبانوں میں اسّی ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے۔

مولانا شعر بھی کہتے ہیں۔ چناں چہ آپ کے کلام کے دو مجموعے "زیرِ گل اور بوئے گل" کے نام سے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ لیکن اب تقریباً تین سال سے نعتِ سرورِ کائنات کے علاوہ دیگر اصنافِ شعر میں طبع آزمائی نہیں فرماتے۔

حالیہ جنگ کے دوران جناب مولانا کوثر نیازی صاحب نے ریڈیو پر اور پبلک جلسوں میں بڑی مؤثر تقریریں کیں اور دینی جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کر کے دفاعی

فنڈ کے لیے ساڑھے تین لاکھ رُپے کے قریب جمع کر کے حکومت کو پیش کیا۔ مشہور مقرر جناب شورش کاشمیری نے مولانا کوثر نیازی کے بارے میں بعض خوب باتیں کہی ہیں۔

"میاں والی نے پیدا کیا۔ لاہور نے چمکایا۔ قلم کی خوبیوں میں اپنی عمر سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ .... غزل کہتے ہیں لیکن اس میں غزل کی آنچ نہیں ہوتی، رکھ رکھاؤ ضرور ہوتا ہے۔ ادیب بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، مدیر بھی ہیں۔ الفاظ بولتے نہیں تولتے ہیں۔ ہر لفظ میزان میں تُلا ہُوا نکلتا ہے۔ اعتماد سے بولتے ہیں۔ لہجے میں میاں والی ہے، زبان میں دہلی، لباس میں لکھنؤ ہے اور جو باقی رہتا ہے وہ لاہور ہے"۔

پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ مشیتِ ایزدی ان سے کوئی مفید کام ضرور لینا چاہتی ہے۔

وادیٔ قیس سلامت ہے تو انشاء اللہ
سربکف ہو کے جوانانِ وطن نکلیں گے

حکیم محمد سعید

روزہ ــــ فلسفہ ــــ فضیلت

جناب مولانا کوثر نیازی صاحب

یہ عجب اتفاق ہے کہ جب مسلمانوں پر پہلی مرتبہ روزہ فرض ہوا تو انہیں اس کے چند ہی دن بعد ۱۷ رمضان کو میدانِ جہاد میں نکلنا پڑا اور اس طرح حق و باطل کا وہ عظیم الشان معرکہ ظہور پذیر ہوا، جسے تاریخ غزوۂ بدر کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اِدھر ہم پاکستانیوں نے سترہ دنوں کے جہاد سے ابھی ابھی سرخروئی اور کامرانی حاصل کی تھی اور آزمائش و امتحان اور حصولِ نصب العین کے اعتبار سے ابھی ہم گویا حالتِ جہاد ہی میں تھے کہ رمضان آگیا۔ دیکھا جائے تو تمام دوسرے عقلی و نقلی دلائل سے قطع نظر صرف یہی واقعاتی شہادت اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ روزے اور جہاد کا باہم دگر بڑا گہرا تعلق ہے، اتنا گہرا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ جو روزہ دار ہے وہ مجاہد ہے اور جو مجاہد ہے، وہ بھی روزہ دار بننے کی مشقت و محنت سے جی نہیں چراتا۔

قرآن حکیم میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام پر غور کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شریعتِ حقہ، ہر مسلمان کو مجاہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے، ایسا مجاہد، جس کی تمام عبادتیں، تمام قربانیاں، یہاں تک کہ جینا اور مرنا بھی اللہ رب العالمین کی رضا کے لیے خاص ہو اور اس کی زندگی زبانِ حال سے بھی اس کی شہادت دے کہ "اِنَّ صَلوٰتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔

وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سامنے اپنی مرضی کو، اس کی پسند کے بالمقابل اپنی پسند کو اور

اس کی خواہش کے مقابلے میں اپنی خواہش کو قربان کر دے۔ حدیث شریف میں ایمانِ کامل کا مرتبہ یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی اپنی دوستی اور دشمنی میں بھی رضائے الٰہی کا تابع فرمان بن جائے۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ "لن تنالوا البرّ حتّٰی تنفقوا ممّا تحبّون" ایمانِ کامل کا مرتبہ اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا، جب تک تم خدا کی راہ میں اپنی پسندیدہ اور محبوب و مرغوب چیزوں کی قربانی نہ پیش کرو۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اہلِ ایمان سے ان کا خدا اُن کی جانوں اور مالوں کا اپنی رضا کے عوض سودا کر چکا ہے اور مومن کامل وہی ہے، جو جان نذر کرنے کے بعد بھی یہ احساس رکھتا ہو کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

ظاہر ہے کہ ایمان کامل کے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے نفس پرستی اور سہل بصری کی راہ چھوڑ کر ضبطِ نفس اور سخت کوشش کی زندگی گزارنے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر کوئی شخص اسلام کے مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ اسلام اس سے سرفروشی اور جان نثاری کی اپیل کرے گا اور وہ اپنے معمولات اور اپنی حاجتوں کا حوالہ دے کر بیٹھ رہے گا، وہ یہی سمجھے گا کہ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے، اس طرح وہ اپنے مادّی تقاضوں کی قربان گاہ پر اپنے روحانی تقاضوں کو بھینٹ چڑھا دے گا۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر قرآن حکیم میں بار بار اہلِ ایمان کو اپنے اندر صبر اور قوّتِ برداشت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری لکھتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں ستّر مرتبہ صبر کا ذکر آیا ہے اور یہ ایسی بنیادی صفت ہے کہ اسے بجا طور پر تمام نیکیوں کی ماں کہا جا سکتا ہے۔ قرآن پر طائرانہ نظر بھی ڈال لی جائے، تب بھی صبر سے متعلق اس کی آیات کے یہ ٹکڑے جگہ جگہ دامانِ نظر کو تھام لیتے ہیں۔ فرمایا:

یا ایّھا الّذین اٰمنوا استعینوا بالصّبر والصّلوٰۃ
یا ایّھا الّذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا
انّ اللہ مع الصّابرین
وبشّر الصّابرین
والصّابرین فی البأسآء والضّرّآء وحین البأس
ولئن صبرتم فھو خیرٌ للصّابرین
واصبر وما صبرک الّا باللہ

فاصبر علیٰ ما یقولون
الذین صبروا وعلیٰ ربّہم یتوکّلون
واصبر انّ وعد اللّٰہ حقّ
فاصبر لحکم ربک
الذین امنوا وعملوا الصّالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصّبر۔

اِن آیات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بادنا تأمل سامنے آجاتی ہے کہ شریعت کے نزدیک جب تک مسلمان میں صبر کا جوہر پیدا نہیں ہوگا، وہ قربانی نہیں دے سکتا اور جب وہ قربانی نہیں دے سکتا تو میدانِ جہاد پر ثابت قدم رہ کر دشمن کا مُنھ بھی نہیں پھیر سکتا۔

جب صبر جہاد کے لیے اتنا لازم و ملزوم ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟ رسولِ مکرم، نبیٔ معظم، سرورِ عالم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ صبر پیدا کرنے کے لیے روزے سے بڑھ کر کوئی نسخہ کارگر اور مفید نہیں، اِسی لیے آپؐ نے ماہِ رمضان کو "شہر الصّبر" یعنی صبر کا مہینہ قرار دیا ہے۔ رمضان کے فضائل کے ضمن میں حضرت سلمان فارسی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ، نے حضور نبیٔ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کا ایک طویل خطبہ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے شعبان کی آخری تاریخ میں ہم لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے لوگو! تم پر ایک ایسا مہینہ سایہ اَفگن ہونے والا ہے، جو بڑا مبارک بڑا عظیم مہینہ ہے۔ اس میں ایک رات ہے، جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ (یہ وہ رات ہے، جسے قرآن نے لیلۃ القدر کہہ کر پکارا ہے اور جس میں قرآن حکیم نازل ہوا) اللّٰہ تعالیٰ نے اس کے روزے کو فرض ٹھہرایا اور راتوں میں قیام کو بڑے اجر کی چیز بنایا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں نفل کے ذریعے اللّٰہ تعالیٰ کا تقرب چاہتا ہے تو اس کا اجر اتنا ہے، جتنا رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں فرض ادا کرنے کا۔ اور جو شخص اس مہینے میں فرض ادا کرتا ہے تو اس کا اجر اتنا ہے، جتنا رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں ستر فرض ادا کرنے کا۔"

اسی طویل خطبے میں آپؐ نے آگے چل کر فرمایا:

وھو شھر الصّبر والصّبر ثوابہ الجنۃ ۔

"یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنّت ہے۔"

رمضان کو "شہر الصّبر" فرمانے سے سمجھانا یہ مقصود ہے کہ وہ صفت جس سے متّصف ہو کر انسان معیّتِ الٰہیہ کے مقام سے سرفراز ہوتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے جو سالانہ پریڈ

اسلام نے مقرر کی ہے، وہ رمضان کے روزے ہیں، جو پاکیزگیٔ رُوح اور اصلاحِ نفس کے لیے تیر بہدف ہیں، جن کی مسلسل ٹریننگ سے انسان بڑی سے بڑی ترغیبات اور تحریصات کے مقابلے میں بھی صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور اس طرح بتدریج اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الطافِ بے پایاں کا سزاوار بنا لیتا ہے۔

قرآنِ حکیم کہتا ہے: "انما یوفی الصّٰبرون اجرھم بغیر حساب۔" "بلاشبہ صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر دیا جاتا ہے۔"

یوں تو یہ آیت صبر کرنے والے سب اہلِ ایمان کے لیے عام ہے، لیکن صوفیائے کرام کہ شریعت کے رمز شناس بحرِ معانی کے حقیقی غوّاص ہیں، اسے روزے داروں کے لیے خاص قرار دیتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ یہاں صابرین سے مراد روزے دار ہیں، کیوں کہ روزے حقیقت میں صبر ہی کا دوسرا نام ہے۔

لیکن اس مختصر سی گفتگو کے نتیجے میں یہ فیصلہ کر لینا کچھ دشوار نہیں کہ صبر اور جہاد دونوں آپس میں نہ ٹوٹنے والا رشتہ رکھتے ہیں اور صبر کی صفت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ روزوں کا سہارا لیا جائے۔ یہ وہ خاص عبادت ہے، جس پر مسلمانوں کو اپنے معمولات، نیند، آرام اور کھانے پینے تک کی قربانی دینے کی مسلسل مشق کرائی جاتی ہے۔ وہ اپنے رب کی رضا کے لیے حرام چیزیں تو ایک طرف رہیں، حلال چیزیں بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ضبطِ نفس کی دولت سے مالا مال ہو کر وہ جہاد کے میدان میں اپنا سب کچھ لُٹا دینے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں یہ یقین جاگزیں ہو جاتا ہے کہ زندگی ضائع کرنے کی چیز نہیں اور یہ ایک جنسِ گراں ہے۔ اس جنسِ گراں کو جہاد کے لیے وقف کر دینا چاہیے کہ یہی بندگی کا تقاضا اور یہی حسنِ عمل کا مفہوم ہے۔

اس کے ہر لمحے میں آباد ہے خوشیوں کا جہاں
دلِ مومن کے لیے عید ہے ماہِ رمضان
شکریہ اس ترے احسان کا اے ماہِ صیام
منکشف ہم پہ ہوا تجھ سے یہ اک سرِّ نہاں
بندگی، حُسنِ عمل، حُسنِ عمل، حُسنِ عمل
زندگی، حُسنِ گراں، حُسنِ گراں، حُسنِ گراں

پس میرے نزدیک جہاد کی موجودہ فضا میں رمضان اپنے ہمراہ عبرت و عظمت کا ایک جہانِ تازہ لے کر نمودار ہوا ہے اور مسلمانانِ پاکستان پر لازم ہے کہ اگر اس سے پہلے وہ اس بابرکت مہینے کے ساتھ ایک ناخواندہ مہمان کا سا سلوک کرتے رہے ہیں تو اب تلافیٔ مافات

کے لیے کمر بستہ ہو جائیں اور اگر اس سے پہلے انھوں نے اس عظیم عبادت کو سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تو اب اس کی تاریخ، فلسفہ اور فضیلت پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے تقاضوں اور مطالبوں پر دھیان دیں کہ ان کی انفرادی زندگی ہی کا نہیں، حیاتِ ملّی و بقائے اجتماعی کا راز بھی اسی رمضان کی سعادتوں میں مضمر ہے۔

در آمد نش مژدۂ روح آمدہ است
در کارِ ترا فوز و فتوح آمدہ است
کُن از دِل خود توبہ و صد استغفار
ہنگام دعا ہائے نصُوح آمدہ است

روزے کی تاریخ

روزے کی عبادت اِتنی ہی پُرانی ہے، جتنا خود انسان۔ انسان کے خود ساختہ دھرموں اور رسموں میں بھی اس کا سراغ مل جاتا ہے۔ ہندوؤں اور جینیوں کے برت اسی قبیل کی چیز ہیں۔ سادھوؤں اور سنتوں کے ہاں چُپ کے روزے ابھی تک رائج ہیں۔ رہے آسمانی اور الہامی مذاہب تو قرآن حکیم نے قرطاس و قلم، علم و فن، آرٹ اور لٹریچر کے دَور میں نہیں، اس دَور میں جب کہ اخبارات نہ تھے، لائبریریاں نہ تھیں، رسل و رسائل کے موجودہ ذرائع نہ تھے، یہ دعوا کیا کہ روزہ پہلی مرتبہ مسلمانوں پر ہی فرض نہیں کیا گیا، ان سے پہلے جو آسمانی مذاہب گزرے ہیں، یہ ان کے ماننے والوں پر بھی فرض تھا۔ فرمایا:
"یایّھا الّذین اٰمنوا کتب علیکم الصّیام کما کتب علی الّذین من قبلکم لعلّکم تتّقون۔" "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے، جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، جو تم سے قبل ہو گزرے ہیں۔ عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔"

اسے پیش نظر رکھیے کہ یہ دعوا ایک اُمّی سے کرایا جا رہا ہے، جس نے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، جس نے کسی دوسرے سے نہیں پڑھا، جو ایک ایسے ملک میں پیدا ہُوا ہے جو قریب قریب دنیا کے تمام دوسرے ملکوں سے بے تعلق ہے، مگر وہ اُمّی ہونے کے باوجود نکتہ دانِ عالم البلہ ہے کہ دوسرے مذاہب اور ان کی تاریخ کے متعلق جو بات کہتا ہے، کسی کے بس میں نہیں کہ اس کی تردید کر سکے۔ اُلٹا دوسرے مذاہب کی کتابیں خود اس کے دعوے کی شہادت اور اس کے مقدمے کی دلیل ہیں۔

بائبل میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر چالیس روزے رکھے۔ (خروج ۳۴: ۳۸) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بیاباں میں چالیس روزے رکھے (ی ۴: ۱۲)۔ حضرت

دانیال نے تین ہفتے کے روزے رکھے (دانیال باب ۱۵)۔حضرت یحییٰ علیہ السّلام اوران کے پیروکار بھی روزے رکھتے تھے۔ (مرقس ۲: ۱۸)۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن جلد ۹ ص ۱۰۶ اور جلد ۱۰ ص ۱۹۳ کی بحث پڑھیے تو اس سے مذاہب میں روزے کا لزوم ثابت ہوتا ہے۔اس کے یہ الفاظ قرآن کے دعوے کی کھلی ہوئی تصدیق نہیں تو اور کیا ہیں کہ

"By the greater number of religions in the lower middle and higher cultures alike fasting is largely prescribed".

اسی کے ساتھ ساتھ خود غیر مذاہب کی مستند کتابیں بتاتی ہیں کہ روزہ ان کے ہاں رائج تو تھا، مگر بہت محدود اور معمولی مقاصد کے لیے، اس سلسلے میں کوئی عظیم نصب العین اُن کے سامنے نہ تھا۔ جیوس انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ ص ۳۴۷ میں ہے:

"The jews and christians took to fasting as were made of expiation or penitence or even narrowed and strictly formal. In olden times fasting was instituted as a sign of mourning or when danger threatened or when a saint was preparing himself for a divine revelation".

"یہودیوں اور عیسائیوں کا روزہ سخت رسمی ہوتا تھا، وہ اسے کفارہ یا توبہ یا اس سے بھی تنگ تر مقصد کے لیے رکھتے تھے۔قدیم وقتوں میں روزہ یا تو بطور علامتِ ماتم رکھا جاتا تھا یا جب کوئی خطرہ لاحق ہوتا تھا اور یا پھر جب سالک اپنے اندر قبولِ الہام کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔"

اس اقتباس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ روزہ اسلام سے پہلے بھی رائج تھا، مگر اس کے مقاصد بڑے تنگ اور محدود تھے۔ایک طرف اسلام نے ان تنگ مقاصد کے بجائے تقوا کو روزے کا مقصود و مدّعا قرار دیا، دوسری طرف پابندیوں اور حدود و قیود کے معاملے میں افراط و تفریط کے بجائے اعتدال کی روش اختیار کی۔یہودیوں کے ہاں روزے کا طریق کار یہ ہے کہ وہ افطار کے وقت ایک دفعہ جو کچھ کھا لیتے ہیں، اس پر قناعت کرتے ہیں۔پھر چوبیس گھنٹے تک وہ کچھ کھا ہی نہیں سکتے۔ہندو برت کی بعض قسموں میں پھل جو بھی اور جتنا بھی کوئی کھالے، اس میں حرج نہیں، البتّہ اناج ان کے ہاں جنّت کے روایتی دانۂ گندم کی طرح ممنوع ہے۔چینی ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ان کے ہاں روزہ بعض اوقات کئی کئی ہفتوں کا بھی ہو جاتا ہے۔

اسلام، جو دینِ فطرت ہے، وہ دوسرے امور کی طرح اس معاملے میں بھی "خیر الامور اوسطہا

کا قائل ہے۔ اس کے روزے میں صرف کھانے کے اوقات بدل دیے گئے ہیں۔ ہر دوپہر کے کھانے کے بجائے سحری ہے۔ شام کا کھانا اُسی طرح بحال ہے۔ گویا اسلام عادت کا غلام بنانے کے بجائے ہمیں عادت بدلنے پر قادر بناتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ایذا رسانی نہیں، وہ صرف گرم و سرد حالات کا لذت چشیدہ بنا کر ہمارے نفس میں ضبط و انضباط کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ پھر دوسرے مذاہب اور اسلام کے روزے کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ دوسرے مذاہب میں روزے شمسی حساب سے رکھے جاتے ہیں۔ یہ اگر ایک مرتبہ کسی تکلیف دہ موسم میں معیّن ہو چکے تو بس ہمیشہ اسی موسم میں آئیں گے، لیکن اسلام نے اس معاملے میں قمری حساب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کے روزے ہر عہد میں مختلف موسموں میں لازم ہوتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کو بھوک، پیاس، گرمی، سردی ہر ریاضت کا مزاج شناس بنا دیتے ہیں۔

حقیقتِ صوم

روزے کی حقیقت اور اس کا فلسفہ کیا ہے، اس کے سمجھنے میں روزہ، برت یا کسی زبان کا دوسرا لفظ ہماری مدد نہیں کر سکتا، اس لیے کہ ہمیں عربی زبان کے لفظ "صوم" کا لغوی مفہوم دیکھنا پڑے گا۔ صاحبِ مفردات امام راغبؒ کہتے ہیں کہ:

"صوم کے اصل معنی کسی کام سے رک جانے کے ہیں، خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا گفتگو کرنے اور چلنے پھرنے سے۔ اس بنا پر گھوڑا چلنے پھرنے یا چارہ کھانے سے رک جائے تو اسے صائم کہا جاتا۔ شاعر کہتا ہے:

"خیل صیام، واخریٰ غیر صائمہ" بعض گھوڑے چارہ کھا رہے تھے اور بعض خاموش کھڑے تھے۔ اور تھمی ہوئی ہوا اور دوپہر کے وقت کو بھی صوم کہتے ہیں، اس تصور کے ساتھ کہ اس وقت سورج وسطِ آسمان پر رک جاتا ہے۔

امام راغبؒ کی اس تشریح سے معلوم ہوا کہ کسی چیز سے رک جانے کی کیفیت کا نام صوم ہے۔ چوں کہ روزے کی حالت میں مسلمان کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جاتے ہیں، اس لیے بھی صوم سے تعبیر فرمایا اور مسلمانوں پر لازم کر دیا کہ صوم کی حقیقت اور معنویت حاصل کرنے کے لیے وہ گناہوں کے ارتکاب سے بھی پوری طرح رک جائیں، زبان جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے سے رک جائے، کان لغو باتیں نہ سنیں، ہاتھ کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، پاؤں غلط راستے اور آنکھیں ہر وہ چیز دیکھنے سے رک جائیں، جسے دیکھنے سے شریعت منع کرتی ہے۔ عارفانِ شریعت کا کہنا ہے کہ کھانا پینا ایک حلال امر ہے، اسے ایک معیّن مدت تک حرام قرار دینے

سے اہلِ ایمان میں یہ شعور پیدا کرنا مقصود ہے کہ جب رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کبھی کبھی ترک مباحات بھی لازم آجاتا ہے تو ہم ابدی ممنوعات اور محرمات میں ملوّث ہوتے ہوئے فلاحِ اُخروی سے کس طرح ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ روزہ کی حالت میں کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جھوٹ، گالی، غیبت وغیرہ سے نہیں ٹوٹتا، لیکن اس کی مثال یُوں ہے، جیسے ایک انڈا ہے کہ وہ گِر کر ٹوٹ جاتا ہے اور کبھی بہ ظاہر تو ثابت لگتا ہے، لیکن اندر سے خراب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ روزے کے ممنوعات کی بھی یہی صورت ہے۔ کچھ ممنوعات تو ظاہری ہیں، ان کا ارتکاب کیا جائے تو ہر شخص جان لیتا ہے کہ روزہ ٹوٹ گیا، مگر کچھ ممنوعاتِ باطنی، اخلاقی اور روحانی ہیں، ان سے روزہ ٹوٹتا تو نہیں، اندر ہی اندر خراب ہو کر اپنی معنویت کے اعتبار سے گندے انڈے کی طرح بے کار ہو جاتا ہے۔

یہی وہ بات ہے جسے حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس للّٰه حاجة ان یدع طعامه وشرابهٗ"

"جو شخص غلط، جھوٹ اور گناہ کی بات اور اس پر عمل کرنا ترک نہیں کرتا تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔"

ایک دوسرے موقع پر فرمایا: "کم من صائم لیس له من صومه الّا الظّماء"

"کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں، جن کو بھوکا پیاسا رہنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

روزے کا مقصد

قرآنِ حکیم نے روزے کی مقصدیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے اسلوبِ خاص کے مطابق ایک بڑا بلیغ لفظ استعمال کیا ہے: لعلکم تتّقون ——— "تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، تاکہ تم تقوا حاصل کر سکو۔" تقوا کیا چیز ہے؟ اس کی بہترین تشریح صحابیٔ رسولؐ حضرت ابی ابن کعبؓ نے فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرِ فاروقؓ نے ان سے سوال کیا کہ تقوا کسے کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا، "کیا آپ کبھی ایسے راستے سے گزرے ہیں، جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں؟" حضرت عمرِ فاروقؓ نے جواب دیا "ہاں"۔ پوچھا، "آپ اس طرح کا راستہ کس طرح طے کرتے ہیں؟" حضرت عمرِ فاروقؓ نے کہا، "میں اپنے کپڑوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیتا ہوں۔ کہیں وہ جھاڑیوں میں نہ الجھ جائیں۔" حضرت ابیؓ نے فرمایا، "دو بس یہی تقوا ہے۔"

دیکھا جائے تو یہ مثال دنیا کی اس زندگی پر بڑی اچھی طرح صادق آتی ہے۔ دنیا کی یہ رہ گزر

بھی دو رویہ خواہشات اور تحریصات کی خار دار جھاڑیوں سے اٹی پڑی ہے، اس میں بے احتیاطی سے چلا جائے تو دامنِ حیات قدم قدم پر ان میں الجھتا اور آخر کار تار تار ہو کر رہتا ہے۔ متقی وہ ہے، جو اس راستے پر پھونک پھونک کر قدم رکھے اور اپنے دامن کو گناہ کے کانٹوں سے بچاتا ہوا منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔ وہ کبائر ہی سے احتراز نہ کرے، صغائر سے بھی کنارہ کش ہو جائے۔ بقول حضرت امام ابن قیم "وہ یہ نہ دیکھے کہ گناہ کتنا چھوٹا ہے، یہ غور کرنے کا خوگر ہو جائے کہ جس کی نافرمانی کی جا رہی ہے۔ وہ کتنا بڑا ہے"، عربی کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

خل الذنوب صغيرها وكبيرها ذاك التقىٰ
لا تحقرن صغيرةً ان الجبال من الحصىٰ

"چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دو، تقوا اسی کا نام ہے اور چھوٹے گناہوں کو حقیر نہ سمجھو، کیوں کہ کنکروں ہی سے پہاڑ بن جاتے ہیں۔"

تقوے کی یہ خوبی پیدا کرنے کے لیے خدا کے سامنے جواب دہی کا عقیدہ ہمہ وقت مستحضر رہنا چاہیے۔ اگر ہم اس حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیں تو نفسِ امارہ کے مقابلے میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے۔ روزہ اس عقیدے کو بہت حسن و خوبی کے ساتھ ہمارے قلب و دماغ میں اُتارتا ہے اور اس کی بنیادوں کو استوار کر کے ایمان اور اسلام کے قصرِ رفیع الشان کی تعمیر کرتا ہے۔ روزے کے سوا جتنی عبادتیں ہیں، ان سب میں ریا اور نمود و نمائش کا امکان ہے۔ وہ جو لمبے لمبے سجدے کر رہا ہے، ہو سکتا ہے، اس طرح خلقِ خدا پر اپنے زہد کی دھونس جمانا چاہتا ہو۔ جس نے زکوٰۃ دی ہے، کیا خبر وہ اس طرح اپنی سخاوت اور فیاضی کا چرچا کرنا چاہتا ہو۔ جو حج پر جا رہا ہے، وہ "حاجی صاحب" کہلانے کی آرزو میں مبتلا ہو، لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا تعلق صرف عبد اور معبود کے درمیان ہے، کوئی تیسرا یہ جان بھی نہیں سکتا کہ فی الحقیقت روزہ رکھا گیا ہے یا نہیں؟ اس میں خوفِ خدا اور عقیدۂ آخرت کے استحضار کا اتنا زبردست اہتمام ہے کہ روزے دار غسل خانے میں ہے، پیاس کے مارے جان نکل رہی ہے، دیکھنے والا بھی کوئی موجود نہیں، مگر کیا مجال جو وہ پانی کا ایک قطرہ بھی حلقوم سے نیچے اترنے دے۔ بھوک زوروں پر ہے، روزہ دار تنہا اپنے کمرے میں ہے، کھانے پینے کا سامان سامنے رکھا ہوا ہے، مگر وہ اس کی طرف ہاتھ تک نہیں بڑھاتا۔ سبب یہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ دیکھنے والے خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ اس طرح پورے ایک مہینے اہلِ ایمان کو تقوا کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں بھی اسی انداز سے زندگی بسر کر سکیں۔ روزے کا یہی وہ امتیازی پہلو ہے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جتنے بھی نیک اعمال ہیں، ان کی جزا دس سے لے کر سات سو گنا تک ہے، لیکن روزہ ایسی نیکی ہے کہ یہ خاص میرے لیے ہے اور انا اجزی بہ، میں خود اس کی جزا دیتا ہوں یا میں خود ہی اس کی جزا ہوں۔"

نسائی شریف میں اس بات کو ایک دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ابو اُسامہ سے روایت ہے، "میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ مجھے کسی ایسے کام کا حکم فرمائیں، جس کو میں آپ سے لے کر گرہ میں باندھ لوں اور اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نفع بخشے۔" آپؐ نے فرمایا: علیکَ بالصّوم فانّہٗ لا مثل لہٗ وباللّٰہ التّوفیق۔" (تم روزے کو اپنے اوپر لازم کر لو، اس لیے کہ اس کا کوئی مثل نہیں اور اللہ ہی کی طرف سے اس کی توفیق ارزانی ہوتی ہے۔")

جسمانی صحت کا پہلو

روزہ روحانی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کی بہتری کا بھی ضامن ہے اور اس کی یہ خصوصیت بھی لفظ تقویٰ کے ضمن میں عیاں ہو جاتی ہے۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ تقویٰ کے اصل معنی اپنے آپ کو اس چیز سے بچانے کے ہیں، جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اگر اس مقام پر تقوے کو اس کے مخصوص اصطلاحی مفہوم کے بجائے عمومیت کا رنگ دے دیا جائے اور لغوی اعتبار سے بچاؤ کے اس پہلو کو رُوح اور اعمال کے علاوہ جسم سے بھی متعلق مان لیا جائے تو اپنے روحانی اور مادّی فوائد کے اعتبار سے روزے کی حکمت یہ قرار پائی ہے:۔

یہ وہ عبادت ہے، جس کے ذریعے سے اہلِ ایمان اپنے باطن اور اپنی روح کو تمام کیفیاتِ باطلہ سے بچاتے ہیں۔ ان اعمال کو ان آفات سے بچاتے ہیں، جو انھیں خراب کرتی ہیں اور اپنی جسمانی صحت کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس مفہوم کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے روزے کو جسم کی زکوٰۃ قرار دیا ہے۔ ابنِ ماجہ میں ہے، آپؐ نے فرمایا "لکلّ شیءٍ زکوٰۃ وزکوٰۃ العبد صومٌ" "ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے۔" زکوٰۃ تزکیہ سے اسم ہے اور اس کے معنی ہیں پاک صاف کرنا اور نشو و نما بخشنا شامل ہے۔ زکوٰۃ مالی سے سرمایہ پاک بھی ہوتا ہے اور اس میں برکت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح زکوٰۃِ جسمانی یعنی روزے سے جسم فاسد رطوبتوں اور بے اعتدالیوں کے اثرات سے پاک ہو کر صحت و عافیت کے خزانوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

طبؔ کی باریکیاں تو حضرات اطبا ہی بیان کر سکتے ہیں، مگر اتنی بات تو ایک عامی سے عامی آدمی بھی جانتا ہے کہ اکثر و بیشتر بیماریوں کی جڑ ہمارا معدہ ہے اور یہ خراب اِس لیے ہو جاتا ہے کہ ہم اس پر ضرورت سے زیادہ بار ڈال دیتے ہیں۔ مشین چاہے لوہے کی بھی کیوں نہ ہو، اگر ہر وقت چلتی رہے تو جلد خراب ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے تیل بھی دیا جائے اور کبھی کبھی آرام دے کر اس کے کل پُرزے بھی صاف کیے جاتے رہیں۔ اگر یہ اہتمام رہے تو مشین زیادہ سے زیادہ کارآمد اور دیرپا ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ ہی صورتِ حال ہماری جسمانی مشین کی ہے، اس کے کل پُرزوں کو بھی وقفے وقفے سے آرام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہمارے جسم کے بعض اعضا ایسے ہیں، جو کئی گھنٹے کام میں مشغول رہنے کے بعد نیند اور آرام سے تر و تازگی حاصل کر لیتے ہیں، لیکن معدہ غریب ایک ایسا پُرزہ ہے، جو ہضم کا بڑا محنت طلب اور کٹھن فریضہ انجام دینے کے باوجود بہت کم آرام پاتا ہے۔ ہم اکثر اسے مشغول کار رکھتے یا یوں کہا جائے اسے بلا معاوضہ اوور ٹائم لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ عرصے بعد اس میں ضعف اور تکان کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں اور آدمی آہستہ آہستہ سوئے ہضم، نفخ، تیزابیت، غذائی سمیت، بلڈ پریشر اور طرح طرح کے دوسرے عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔

معدے کو آرام پہنچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم روزہ رکھیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مہینے میں کم از کم چاندرات کے تین روزے ضرور رکھتے۔ ہفتے میں دو شنبے کو بھی عام طور پر آپؐ کا روزہ ہوتا تھا۔ اگر ہمارے لیے ایسا کرنا مشکل ہو تو پھر سال میں کامل ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھ کر معدے کو سالانہ تعطیلات دی جاسکتی ہیں۔ (یہ الگ بات ہے کہ یار لوگ اِس زمانے میں بھی افطار اور سحری کے وقت اس غریب پر ظلم ڈھاتے اور معمول سے کہیں زیادہ مشقت اٹھواتے ہیں!)

ایمان اور احتساب کی شرط

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے بے شمار فضائل بیان فرمائے ہیں:

فرمایا: روزے دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں، ایک افطار کے وقت دوسرے اپنے پروردگار کی ملاقات کے وقت۔

فرمایا: روزے دار کے مُنھ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک و عنبر سے بڑھ کر ہے۔

فرمایا: روزہ آتشِ دوزخ سے بچانے کے لیے ایک ڈھال ہے۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ افطار کے وقت روزے دار کی دعا قبول کرتا ہے۔

فرمایا: ماہِ رمضان کے پہلے دس دن سراپا رحمت، اس کی دوسری دہائی مجسّم مغفرت اور اس کے آخری دس دن جہنّم سے نجات اور رُستگاری کے دن ہیں۔

فرمایا: روزے داروں کو ایک خاص دروازے سے جنّت میں داخل کیا جائے گا، جسے باب الرّیان یعنی سیرابی کا دروازہ کہتے ہیں۔

حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو روزے کی یہ اور اس طرح کی بے شمار دوسری فضیلتیں بیان فرمائی ہیں تو اسے خوب اچھی طرح جان لیجیے کہ یہ روزے کی ظاہری صورت پوری کر دینے والے شخص کے حصے میں نہیں آتیں۔ اس کے لیے شارع علیہ السّلام نے دو شرطیں مقرر کی ہیں، جن کی پابندی کی جائے تو روزے کے سارے روحانی اور مادّی فائدے حاصل ہو جاتے ہیں، ورنہ دوسری صورت میں بھوک پیاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ دو شرطیں کیا ہیں؟ فرمایا:

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ

شرطِ اوّل یہ ہے کہ "من صام رمضان ایمانا" جس نے روزے رکھے ایمان کے ساتھ یعنی جس نے روزہ صرف رضائے الٰہی کے لیے رکھا، اس کے سوا اس کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا، اگر اس کے نتیجے میں اسے جسمانی فوائد حاصل ہو جائیں تو یہ اللہ کی دین ہے، اس کی رحمت ہے، ورنہ وہ تو روزے رکھنے کے لیے اس صورت میں بھی تیار تھا، جب اُسے یقین تھا کہ اس سے میری صحت گر جائے گی، اسلام کی شرط سے معلوم ہوا کہ مَرَن بَرَت، بھوک ہڑتال اور دوسرے مذاہب کے روزے اجر و ثواب کے نقطۂ نظر سے اس لیے بے کار ہیں کہ ان میں ایمان باللہ اور ایمان بالرّسالت کی رُوح کارفرما نہیں ہوتی۔

ایمان کے ساتھ دوسری شرط آپ نے احتساباً کی عائد فرمائی، یعنی روزے دار روزے کی حالت میں قدم قدم پر برابر اپنا محاسبہ کرتا رہے کہ کہیں اس سے شریعت کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی۔

آپ نے کئی دوستوں کو شکایت کرتے سنا ہو گا، "صاحب! ہم کو بتایا گیا تھا کہ روزے سے یہ کچھ برکتیں حاصل ہوتی ہیں، مگر ہم نے تو کتنے ہی روزے داروں کو دیکھا ہے، جو پورے روزے رکھتے ہیں، مگر رمضان کے بعد پھر ان کی زندگی ویسی کی ویسی ہو جاتی ہے، ان میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔"

کوئی شک نہیں کہ روزے کے اندر وہ ساری برکتیں اور فضیلتیں ہیں، جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے بیان فرمایا ہے۔ اس نسخۂ شفا کو ہر زمانے میں لاکھوں کروڑوں افراد نے آزمایا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم اس کی صورت کا تو لحاظ کرتے ہیں، اس کی رُوح کا نہیں۔ ہم روزے کی

حالت میں بھی بدستور گناہوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم روزے کے انوار و برکات کو اپنے دامن میں نہیں سمیٹ پاتے اور اس کا فلسفہ اور فضیلت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

رمضان اور پاکستان

روزے کے فلسفے اور فضیلت کا ایک درخشندہ پہلو یہ بھی ہے کہ اس ظرف ماہِ رمضان کو مظروف کے طور پر سخت کیا گیا ہے۔ اس مہینے کی عظمت یہ ہے کہ اسی میں قرآن حکیم کے نزول کا آغاز ہوا۔ "شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن" یہ وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں دُنیائے اسلام نے زندگی بخش پیغام کا حرفِ اوّل سُنا۔ دُنیا پر رحمتوں کے دروازے کھلے اور اسے انسانی برادری، مساوات، خدائے قدّوس کی وحدانیت اور انسانی عظمتوں اور رفعتوں کے پیغامات دیے گئے۔ اس لحاظ سے یہ مہینہ تاریخ عالم میں یادگار حیثیت کا حامل ہے اور اس کی یاد کو جتنی محبّت کے ساتھ منایا جائے کم ہے۔

اسلام دُنیا کو ایک مخصوص نصب العین دینے اور دُنیا والوں کے فکر و عمل کو ایک مخصوص راہ پر چلانے کے لیے آیا تھا، جسے قرآن حکیم صراطِ مستقیم کا پُرشکوہ اور معنی خیز نام دیتا ہے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے اور اس راستے کو اختیار کرنے کے چند متعیّن آداب ہیں جن کے بغیر نہ نصب العین حاصل ہو سکتا ہے، نہ صراطِ مستقیم کو حاصل کرنا ممکن ہے، یہاں تک کہ یہ راستہ اختیار کرنے والوں کے اظہارِ غم اور حصولِ مسرّت کے طریقے بھی متعیّن ہو جاتے ہیں مسلمان جب غم میں مبتلا ہوتا ہے، اس وقت بھی وہ اپنے اللہ ہی کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے اور اس سے صبر و استقامت کی توفیق مانگتا ہے جب وہ خوشی کا اظہار کرتا ہے، تب بھی اس کا سر اپنے آقا کے سامنے جُھک جاتا ہے اور وہ اس مسرّت کا شکر ادا کرتا ہے۔ رمضان المبارک دنیا پر رحمت کا باب اوّل اور مسلمان کے نزدیک اظہارِ مسرّت کا بہت بڑا مہینہ ہے، اس لیے اس مہینے میں اسلامی طریقے سے اظہارِ مسرّت و تشکّر کیا جاتا ہے۔ یہ اسلامی طریقہ عبادت ہے۔ اس مہینے میں مسلمان سورج کی روشنی کی ابتدا سے سورج کی روشنی کی انتہا تک خورونوش اور دوسری خواہشوں کا مقابلہ کرتا ہے اور اس طرح جسم کی بنیادی ضرورتوں کی قربانی دے کر عبادت کے ایک لطیف پہلو کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ تراویح کے قیام اور شب و روز کے اکثر حصّوں میں تسبیح و تحمید کا فرض ادا کر کے اپنے خالق حقیقی کے سامنے اپنی عبدیت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ مسلمان کے اظہارِ مسرّت کے آداب ہیں۔

رمضان المبارک کی اس تاریخی عظمت کے علاوہ ہم اہلِ پاکستان کے لیے اس مہینے کی

اہمیّت ایک دُوسرے پہلو سے بھی خاص ہے۔ ہم نے ہندو اور انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی جدّوجہد کو اسی مہینے میں بار آور ہوتے دیکھا تھا۔ اسی مہینے میں سیاسی تاریخ کا وہ معجزہ ظہور پذیر ہوا تھا، جسے پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ۲۷ رمضان المبارک کی بجائے ۱۴ اگست کو یومِ آزادی مناتے ہیں اور ہم میں سے بہت سے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ پاکستان رمضان میں قائم ہُوا تھا۔ عین اس دن جو نزولِ قرآن کا مُبارک اور یادگار دن ہے۔ میرے خیال میں یہ قران السعدین اپنے اندر مطالب و مفاہیم کی ایک دُنیا لیے ہوئے ہے۔ گویا اس مہینے میں خدائے رحمٰن و رحیم کے خاص کرم سے یہ خطۂ زمین ہمیں اس لیے حاصل ہُوا تھا کہ ہم اس کی سرحدوں کے اندر قرآنی نظریات کو اپنے عمل اور اپنی زندگی کے ہر لمحے میں متشکّل کر کے پوری دُنیا پر یہ ثابت کر سکیں کہ یہ نظریۂ حیات اور زندگی کا یہ دستور العمل قابلِ عمل بھی ہے اور ان تمام نظریات سے بہتر اور افضل بھی، جو اب تک پیش ہوئے۔ دیکھا جائے تو اس پہلو سے یہ مہینہ ہمارے لیے قومی اجتماعی نقطۂ نظر سے احتساب کا مہینہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مہینے میں ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر اپنے ضمیر سے یہ سوال پوچھیں کہ ہم نے اٹھارہ اُنیس سال کے عرصے میں اس مقصد کے حصول میں کتنی منزلیں طے کیں اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یقین جانیے اس مہینے میں ہم نے اپنے آپ سے یہ اہم سوال نہ پوچھا اور اپنے دل کے اس جواب کا تجزیہ نہ کیا، جو یقیناً ہمیں ملے گا تو گویا اس مہینے میں قیامِ پاکستان کی مصلحتِ ربانی کے مضمرات ایک دفعہ پھر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ایک دفعہ پھر ہم سوچ اور فکر کے جادۂ مستقیم سے بھٹک گئے۔

بس یہ مہینہ جہاں انفرادی تزکیہ و تربیت کا مہینہ ہے، وہاں یہ ہر سال ہم اہلِ پاکستان کے لیے قومی پیمانے پر بھی ایک عظیم پیغام لے کر آتا ہے۔ خدا کرے کہ ہم برکتوں اور رحمتوں کے اس مہینے میں اللہ تبارک و تعالٰی سے مخصوص تعلّق قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اس حیات آموز اور حیات افروز پیغام کے تقاضوں پر بھی لبیک کہیں اور یہ بھی سوچیں کہ دُنیا بھر کے لیے قرآنی نظامِ حیات کا منارۂ نور قائم کرنے کے لیے اب تک ہم نے کیا کامیابی حاصل کی ہے؟

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

شامِ ہمدرد، لاہور
۶ رجنوری ۱۹۶۶ء

جناب ڈاکٹر محمد رضی الدّین صدیقی

آج کی "شامِ ہمدرد" کے مہمان مقرّر دنیائے علم و حکمت کی نامور شخصیت جناب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی صاحب ہیں۔ میں آپ کی طرف سے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن اور خود اپنی جانب سے ڈاکٹر صاحب محترم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوصف ہماری دعوت کو قبول فرمایا اور "شامِ ہمدرد" کی اس مجلس کو مخاطب کرنے یہاں تشریف لانے کی زحمت فرمائی۔

۷ر اپریل ۱۹۰۵ء کو ضرور کوئی خصوصیت حاصل ہے کہ اس دن پیدا ہونے والے اوّلیت حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ابتدائی تعلیم سے عثمانیہ یونی ورسٹی میں بی۔ اے تک ہمیشہ امتحانات میں اوّل آتے رہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کیمبرج سے ایم۔ اے کرنے میں اور لیپ زگ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے تک کیا صورت رہی۔ مگر یہ ضرور صحیح ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی فارغ التحصیل یہ اوّلین شخصیت ہیں کہ اس یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر ہونے کے بعد وائس چانسلر مقرّر ہوئے۔ اس کے بعد پشاور اور سندھ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہے اور یہی وہ اولیّت ہے کہ جو اُن کے اسلام آباد یونیورسٹی کے اوّلین وائس چانسلر ہونے میں کارفرما ہے۔ اور یہی اوّلیت ان کی "شامِ ہمدرد" میں بھی موجود ہے کہ یہ راولپنڈی میں اس کی اوّلین مجلس کو خطاب کریں گے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کا اکیڈمک کیریر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس مختصر وقت میں میرے لیے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی سائنسی اور علمی سرگرمیوں میں یہ ہمیشہ سرگرم رہے ہیں اور بیرونِ ملک آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ملک کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ تعلیمی ادارے ہوں یا تحقیقی و سائنسی، تعلیمی کمیشن ہو یا سائنسی کمیشن

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا وجود ان میں قطعی ضرور سمجھا جاتا ہے۔ ان تھک انسان ہیں۔ فرائض کی انجام دہی میں پرخلوص ہیں اور رات دن ایک کر دیتے ہیں۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے جب انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ کا تخیل پیش کیا تو اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں بھی ڈاکٹر صاحب پیش پیش تھے۔

گوناگوں مشغولیتوں اور مصروفیتوں کے باوجود تصنیف و تالیف سے بھی انھیں شغف ہے۔ چناں چہ اردو زبان، سائنس اور تعلیم کے مسائل و نظریات پر آپ کی چند بہترین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں "نظریۂ اضافیت" اس موضوع پر اردو میں غالباً واحد تصنیف ہے۔ "تعلیم کا مسئلہ" ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم کتاب ہے جو مختصر ہونے کے باوجود تعلیمات پر جامع اور مکمل کتاب مانی گئی ہے۔ "اقبال کا تصور زمان و مکان" ادبی حلقوں میں مقبول ہے۔ "اقبال اور مسئلہ خودی" اور سائنسی موضوعات پر انگریزی زبان میں لیکچروں کے علاوہ آپ کے پچاس سے زیادہ سائنسی تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

آج کی تقریر کا موضوع "علم و حکمت" ہے۔

کائنات اور موجودات پر غور و فکر، اشیا کی ماہیت اور اصلیت کی تلاش اور پھر واقعات و علل کے باہمی تعلق کو دریافت کرنے کی کوشش ہی دراصل وہ خصوصیت ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر انفس و آفاق میں موجود خدائی آیات و براہین میں غور و فکر کی یہ خواہش جبلتاً انسان کو ودیعت نہ کی گئی ہوتی تو انسان اپنی انسانیت کو قائم و باقی رکھنے پر قادر نہ ہوتا۔

اگر آپ خود کو صدیوں پیشتر کی دنیا کا ایک باشندہ تصور کر سکیں تو اپنے ماحول اور اس ماحول میں خود کی موجودگی سے کس قدر وحشت ہوگی! ہماری آج کی پر بہار زندگی اور اس کے سارے نقش و نگار، آرام و آسائش کے سارے اسباب، تمدن و تہذیب کے تمام آثار اسی فکر اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے علم کے مرہون منت ہیں۔

رنگ و بو کا حسین امتزاج رکھنے والی زمین، روشن اور خوش نما ستاروں کا خوب صورت آسمان اور ان کے درمیان جو بھی کچھ ہے خدا کا فرمان ہے کہ وہ انسان کی منفعت اور خدمت کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ ان اشیاء میں خدائے عظیم نے جو اسرار رکھے ہیں فکر و تلاش کی یہ خواہش ہی ان کے دریافت کرنے کو مہمیز کا کام دیتی ہے۔ ان اسرار کی دریافت سے نہ صرف انسان علم الاشیا اور علت و معلول میں متعلقہ حقائق سے روشناس ہوتا ہے بلکہ اس کو ان میں غور و تدبر سے علم حقیقی تک رہنمائی

ہوتی ہے۔ ساتھ ہی انسان کو خالق و مخلوق کے باہمی رشتے کی بھی خبر ہوتی ہے اور جب یہ عظیم نسبت اس پر واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے ناسوتی اور ناپائیدار ہونے کے باوصف خدائے برتر کے ساتھ، جو ابدی اور سرمدی ذات ہے، ایک محکم رشتہ رکھتا ہے تو یہ تصور انسانیت کے مقام کو کس قدر بلند کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زمین و آسمان اور ما بین ارض و سما پر غور و تدبر کو ذکرِ الٰہی کا درجہ دیا ہے اور ان کو خدائے عزّ و جل تک رسائی کا ذریعہ بتایا ہے۔ یہی غور و فکر ہے جسے ہم نے اپنی زبان میں "علم و حکمت" کا نام دیا ہے۔

حکیم محمد سعید
یکم فروری ۱۹۶۶ء ش

علم و حکمت

جناب ڈاکٹر محمد رضی الدّین صدیقی
وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی

(حکیم محمد سعید صاحب نے اپنی تقریر میں میرے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ حکیم صاحب موصوف نے طب اور علم و ادب کی ناقابلِ فراموش خدمات سر انجام دی ہیں۔ میں اپنی مصروفیات کے سبب اس قسم کی تقریبات میں شمولیت کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔ لیکن حکیم صاحب کی فرمائش کا ٹالنا مشکل تھا اور اس لیے میں ان کے ارشاد کی تعمیل کی خاطر یہاں حاضر ہوا ہوں۔)

تقریر کے شروع کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے خیالات قلم بند کرنے کا وقت نہیں مل سکا۔ ویسے بھی میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ سامعین سے کسی تحریر کے توسط کے بغیر خطاب کیا جائے۔

میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے "علم و حکمت"۔ اس سے مراد اصطلاحی حکمت نہیں، جیسا کہ حکیم سعید صاحب کی مناسبت سے فوری طور پر ذہن میں آسکتا ہے! بلکہ اس سے مراد وہ علم ہے جس کو آجکل سائنس کہا جاتا ہے۔

میں سب سے پہلے اس امر پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ کیا سائنس کی ماہیت کے لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ سائنس دورِ جدید کی ایجاد ہے؟ (جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے) اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ سائنس کی بنیاد اوّل تجربے اور

مشاہدے اور دوم غور و فکر پر ہے۔ محض تجربے اور مشاہدے سے سائنس کی تکمیل نہیں ہو سکتی، کیوں کہ اس طرح زیادہ سے زیادہ ایک فہرست (کیٹلاگ) بن سکتی ہے۔ سائنس کی تکمیل کے لیے مشاہدے اور تجربے کے ساتھ غور و فکر کی بھی اشد ضرورت ہے۔ جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے اس کی ابتدا تو صدیوں قبل تاریخ کے ابتدائی زمانے میں ہی ہو گئی تھی۔ اس وقت لوگ محض مشاہدات کی بنا پر اپنے تصورات قائم کر لیتے تھے۔ اُن کا علم محدود تھا۔ اسی وجہ سے جن لوگوں کو تھوڑا بہت علم اور تجربہ حاصل ہو جاتا تھا وہ اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے اور لوگوں کی توہم پرستی سے اپنا مقصد حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد جب یونانیوں کا زمانہ آیا تو وہ فلسفے کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے غور و فکر ہی کو آخری چیز قرار دے دیا اور کہا کہ اصل چیز صرف یہ ہے کہ انسان ایک طرف بیٹھا غور و فکر کرتا رہے۔ اور اسی بنا پر اُن میں سے بعض نے یہاں تک غلو کیا کہ غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچیں وہی صحیح ہے خواہ مشاہدے اور تجربے اس کے خلاف ہی کیوں نہ گواہی دیں۔

جدید سائنس درحقیقت ان دونوں کے امتزاج کا نتیجہ ہے اور یہ امتزاج وہی ہے جو اسلامی اور قرآنی تعلیمات میں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں بار بار افلا تتفکرون اور افلا تتدبرون کے ذریعے تفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، اور ہمارے اسلاف نے قرآن پاک کے اسی ارشاد پر عمل کرتے ہوئے تمام علوم میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ جدید سائنس کی ابتدا اُسی وقت ہوئی کہ جب اسلام نے اپنا "علم کا نظریہ" پیش کیا جس کو بعد میں یورپ والوں نے اپنا لیا اور اس کو مزید ترقی دی، اور جس کے متعلق اب سمجھا جانے لگا ہے کہ اس کی ابتدا بھی یورپ والوں ہی نے کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ابتدا عرب مسلمانوں نے اُس وقت کی کہ جب دوسرے ملکوں بالخصوص یورپ میں اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ بدقسمتی سے کچھ عرصے کے بعد ہمارے لوگ اُن اوصاف سے محروم ہو گئے جن سے ہمارے آبا و اجداد متصف تھے اور یورپ والوں نے اس کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور سائنسی علوم میں دنیا کی رہنمائی کرنے لگے۔

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

یہ باتیں ایسی نہیں جن کے متعلق صرف میرا یا مجھ جیسے دوسرے مسلمانوں کا خیال ہے بلکہ خود مغربی محققین، جنھوں نے جدید سائنسی علوم کی تاریخ لکھی ہے، ان حقائق کو تسلیم

کرتے ہیں، اور انھوں نے واضح طور پر اپنی تصنیفات میں اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ میں ان میں سے چند محققین کی تحریروں کا اقتباس آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

فرانسیسی مؤرخ رابرٹ بریفو اپنی کتاب "میکنگ آف ہیومینیٹی" میں لکھتا ہے:

"Neither Roger Bacon nor his later namesake has any title to be credited with having introduced the experimental method. Roger Bacon was no more than one of the apostles of Muslim science and method to Christian Europe. The experimental method of Arabs was by Bacon's time widespread and eagerly cultivated throughout Europe" (BRIFFAULT p.200).

"For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the permanent distinctive force of the modern world and the supreme source of its victory -- nature science and the scientific spirit."

(BRIFFAULT p.191).

"The debt of our science to that of the Arabs does not consist in starting discoveries or revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture. It owes its existence...what we call science arose in Europe as a result of new spirit of enquiry, of new methods of investigation, of the methods of experiment, observation, measurement, of the development of mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs." (BRIFFAULT p.190).

سر الیور لاج نے اعتراف کیا ہے:

"The only effective link between the old and the new science is afforded by the Arabs. The dark ages come as an utter gap in the scientific history of Europe, and for more than a thousand years there was not a scientific man of note except in Arabia." (SIR OLIVER LODGE p.9)

دنیا کو اسلامی تعلیم ملنے کے ساڑھے تیرہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی اقوام متحدہ کے چارٹر میں علم کا حصول ہر انسان کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے علم صرف چند مذہبی رہنماؤں اور طبقوں میں محدود تھا اور صرف کاہن اور برہمن وغیرہ علم حاصل کرنے کے مجاز سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اسلام نے پہلی بار علم کا حصول ہر انسان کا فریضہ قرار دیا۔ اور اعلان کیا کہ علم کسی کی میراث نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ علم حاصل کریں خواہ وہ اُنھیں کہیں سے بھی ملے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق علم کسی کی اجارہ داری یا تخصیص نہیں، اور اسی نظریے کی وجہ سے علمی دنیا میں ایک عظیم انقلاب آ گیا۔ مسلمانوں نے فرض جان کر ہر شعبۂ علم پر توجہ دی اور اس میں معتدبہ اضافہ کیا۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے متعلق اسلام کے ابتدائی دور میں ہی واضح علم اور نظریات پیش کر دیے گئے، حالاں کہ اس سے قبل بعض چالاک لوگ جنھیں سورج گرہن یا چاند گرہن کے بارے میں علم ہوتا تھا، عام لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھاتے اور اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چند صدیوں میں دنیا بھر میں جتنے سماجی اور سیاسی انقلابات رونما ہوئے ان کا سرچشمہ وہی ذہنی آزادی ہے جو اسلام کی اس تعلیم کا نتیجہ ہے۔

قرآن مجید میں حکمت (سائنس) کو کتنا درجہ دیا گیا ہے اس کا اندازہ قرآن پاک کے اس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

من یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرًا۔

اسلام کے نزدیک علم تمام انسانوں اور تمام دنیا کا ہے۔ اور یہ جو آجکل علوم شرقیہ اور علوم غربیہ کا تصور پیدا ہو گیا ہے اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلام نے ہر علم کو قابل تحصیل قرار دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑے بڑے اصحاب علم گزرے ہیں اور انھوں نے مختلف علوم وفنون میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں یہاں تک کہ جدید سائنس کی بنیاد انہی کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کے عظیم علمی کارناموں کی تفصیل کا یہ وقت نہیں۔ تاہم میں بتانا چاہتا ہوں کہ خود مغربی مؤرخین اور محققین اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ چناں چہ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جارج سارٹن نے اپنی کتاب "انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس" کی پہلی دو جلدوں میں مسلم علما کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک دو باتوں کا ذکر اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ان سے آج کل کے عوام تو کجا علما بھی واقف نہیں ہیں۔ مثلاً نصیر الدین محقق طوسی نے جو زمانۂ وسطیٰ کے بڑے جید عالم تھے، اقلیدس کے متوازی خطوط والے مفروضے کی تنقید کی

اور بتایا کہ یہ مفروضہ اس قدر بدیہی نہیں ہے جیسا کہ اقلیدس کے دوسرے مفروضے ہیں۔ اس کے کئی صدیوں بعد انیسویں صدی میں یورپ کے ریاضی داں BOLYAI اور LOBATCHEWSLY نے اس تنقید کو دہرایا اور یہیں سے نااقلیدسی ہندسہ (Non-Euclidean Geometry) کی ابتدا ہوئی جو آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت میں ریاضیاتی بنیادوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بطلیموس نے زمین کو ساکن قرار دیا تھا اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کوپرنیکس نے پندرھویں صدی میں پہلی مرتبہ زمین کی حرکت کا تصور پیش کیا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کوپرنیکس سے کوئی چار سو سال قبل ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب "قانون مسعودی" میں زمین کی حرکت کو بیان کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں جو ۱۹۳۹ء میں رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں شائع ہوا تھا اس امر کو تفصیل سے پیش کیا ہے اور البیرونی کے اصل عربی منقولے کو بھی نقل کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بطلیموسی نظام کے خلاف خود مسلم علما نے ایسے تصورات پیش کیے ہیں۔

اسی طرح خیال کیا جاتا ہے کہ قوتِ تجاذب کا تصور سب سے پہلی مرتبہ نیوٹن نے سترھویں صدی میں پیش کیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ریاضیاتی نظریے کا تعلق ہے اس کے انکشاف کا سہرا نیوٹن ہی کے سر ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم علما کو نیوٹن سے کوئی پانچ سو سال قبل تجاذبی قوت کے عام تصور سے واقفیت تھی۔ چناں چہ مولانا جلال الدین رومی نے بھی اپنی مشہور و معروف مثنوی میں اس کو پیش کیا ہے۔

ان کی مثنوی کے چند اشعار آپ کے گوش گزار کیے جاتے ہیں:

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش — جفت جفت و عاشقانِ جفتِ خویش
ہست ہر جزوے بہ عالم جفت خواہ — راست ہمچوں کہربا و برگِ کاہ
آسماں گوید زمین را مرحبا — با توام چوں آہن و آہن ربا
گفت سائل چوں بماند ایں خاکداں — در میانِ ایں محیطِ آسماں
ہمچو قندیلے معلّق در ہوا — نے براسفل می رود نے بر علا
آں حکیمش گفت کز جذبِ سما — از جہاتِ شش بماند اندر ہوا
چوں ز مقناطیس قبہ ریختہ — درمیاں ماند آہنے آویختہ

ہماری بدقسمتی کہ ہم نے بعد میں علم و حکمت کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا، اور اب تو یہ

حالت ہو گئی ہے کہ ایک ہزار سال قبل ہمارے آبا و اجداد جو کام کر چکے تھے وہ بھی ہم نے غیروں کے توسط سے جانے اور ہم گھاٹے میں رہ گئے۔ اس سلسلے میں اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وقت کی تنگی کے باعث یہ کام کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنے آبا و اجداد کے کارناموں پر نظر رکھنی چاہیے اور ان کے نقش قدم پر چل کر تحقیق اور ریسرچ کے کاموں میں آگے بڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ سارا علم ہمارا علم ہے۔ خدا کا ارشاد بھی یہی ہے اور انسانیت کی بھلائی بھی اسی میں ہے۔

شامِ ہمدرد۔ راولپنڈی
یکم فروری ۱۹۶۶ء

خان محمد علی خان

آج کی "شامِ ہمدرد" کے مہمانِ خصوصی اور مہمان مقرر جناب خان محمد علی خان صاحب ہیں۔ میں آپ کی طرف سے اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی جانب سے اِن کو خوش آمدید کہتا ہوں، اور اِن کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود "شامِ ہمدرد" سے خطاب قبول فرمایا۔

جناب خان محمد علی خان صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ایک علم دوست خاندان کے فرد ہیں اور سماجی خدمات کے لیے معروف۔ اِس پر مستزاد یہ کہ جناب خان صاحب حکومتِ مغربی پاکستان کے ایک وزیر ہیں اور اِن کے سپرد محکمۂ صحت ہے جو بہ ظاہر ایک آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بڑی اہمیت اور نزاکت اپنے میں رکھتا ہے۔ اگر عمیق غور کیا جائے تو کسی ملک کے لیے تعلیم و صحت میں دو اہم ترین ضرورتیں قرار دی جا سکتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ملک کی ترقی کو آج کل اُس کی زراعتی پیداوار کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ جو ملک صنعت کے میدان میں پوری تیزی سے بھاگ رہا ہو ہم اُس کو ترقی یافتہ کہنے لگتے ہیں۔ ہم ترقی کے لیے تحقیق و تجسس کی راہیں کھول سکتے ہیں، اور ہم چاند پر پہنچ جانے کا قصد و عزم کر کے اپنی ترقی ظاہر کر سکتے ہیں، لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ صحت و تعلیم کے بغیر یہ سب کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں تو اس رائے کا ہوں کہ تعلیم و صحت سے صرفِ نظر کر کے ہم ہرگز کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ میری رائے میں مناسب اور ضروری یہی ہے کہ ہم مسئلہ صحت اور مسئلہ تعلیم پر غائر نظر ڈالیں اور صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔

آج کی تقریر کا موضوع "صحتِ عامّہ ہے"۔ مجھے یقین ہے کہ مہمان مقرر اس موضوع پر جو بھی

ارشاد فرمائیں گے اس کا تعلق پاکستان کے مسائل صحت سے ہو گا، اور ان کے ارشادات ہمارے ملک کے نہایت پیچیدہ مسائلِ صحت کے حل میں مددگار ہوں گے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہم پاکستان میں صحتِ عامّہ کے معیارات کو بلند کرنے میں اُن ممالک کو پیشِ نظر رکھ سکتے ہیں جو ہم سے آگے ہیں۔ لیکن اپنی تہی دامنی کو، جو صدہا سال کی غلامی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، دور کرنے کا صرف یہی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ ہم مغرب کو مثال بنائیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنے حالات کا اپنے حالات کی روشنی میں جائزہ لینا چاہیے۔

ہم کو پوری دیانت داری کے ساتھ یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم نے "صحتِ عامّہ" کے باب میں جو بھی اب تک اقدامات کیے ہیں وُہ بہت کم ہیں۔ میرے نزدیک ملک کی ضرورت کے لیے دواؤں کی چند فیکٹریاں قائم کر دینا، یا ہسپتال تعمیر کر دینا حفظِ صحت عامّہ کی مکمل تعریف نہیں ہے، اس سے کہیں زیادہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے عوام کو صحت کی اہمیت اور صحت مند رہنے کی ضرورت سے آگاہ کریں۔ ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ آج کی "شامِ ہمدرد" اس طرف ایک قدم کا سبب بنے گی۔

اس دورِ جدید میں طب و جراحت نے یقیناً بڑی ترقی کی ہے۔ اس کی تعریف میں کسی قسم کا بخل یقیناً ناانصافی ہو گی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ہم اپنے ملک سے ازالۂ مرض کے لیے مغرب کی ترقی پر ہی بھروسا کر کے بیٹھ جائیں اور اپنے فکر و عمل کو اس کی جدت پر قربان کر ڈالیں۔

مَیں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اس ترقی کی دوڑ میں ہم میں حرکت پیدا ہونی چاہیے۔ اور ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہم پاکستان کے ذرائع و ذخائر کا کس حد تک اور کس طرح استعمال کریں کہ ایک طرف ہمارا ملک خود کفیل ہو جائے اور دوسری طرف ہم دنیائے طب و سائنس کو بھی مالا مال کر سکیں۔

یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج وہ ماحول پیدا ہو چکا ہے کہ طبِ مشرقی پر فرسودگی کی تعریف صادق نہیں آتی۔ ہمارے ملک میں اب بالعموم تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس طب کے بے اندازہ ذخائر سے ہم اپنے ملک کا مسئلۂ صحت حل کرنے میں بڑی مدد لے سکتے ہیں۔ بڑی دل چسپ بات ہے کہ مغرب کو بھی آخر کار ضرورت پیش آئی ہے کہ وہ نباتات میں علاج و شفائے امراض تلاش کرے۔ ہمیں قطعی غور کرنا چاہیے کہ ہم تحقیق کے اس میدان میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ ہم حکیم، ڈاکٹر اور سائنس دان کا اتحادِ ثلاثہ قائم کر کے اپنے ملک کی سب سے بڑی خدمت کریں گے۔ صرف یہ ہی اتحادِ ثلاثہ ہمارے ملک کو طب و

ادویہ میں خود کفیل بنا سکتا ہے۔ اور اس طرح ہم بڑی خوبی کے ساتھ اپنے مسائل صحت کو حل کر سکتے ہیں۔

دوسری طرف ہمیں اُصولِ حفظِ صحت کے پرچار پر توجہ کرنی چاہیے اور ہمیں خصوصیت کے ساتھ اس کا جائزہ لینا چاہیے کہ ریڈیو اور فلم اس میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ دونوں نہایت مضبوط ذرائع صحت عامہ کے معیارات کو بلند کرنے میں ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔

حکیم محمد سعید

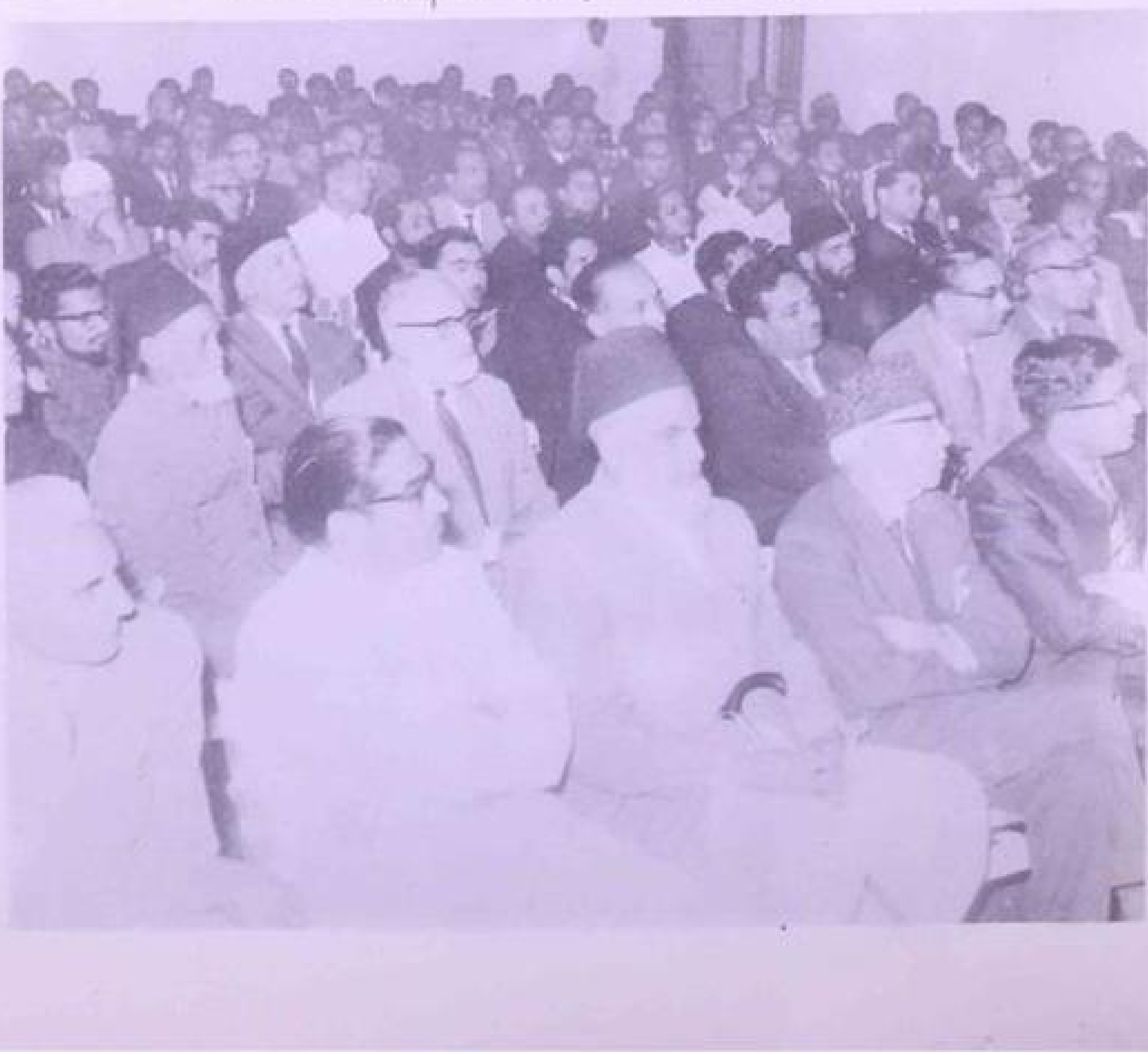


جناب حکیم احمد شجاع، شام ہمدرد،
لاہور، ۴ر مئی ۱۹۶۵ء



جناب سیّد عابد علی عابد، شام ہمدرد،
لاہور، یکم اپریل ۱۹۶۵ء

سامعین شام ہمدرد، لاہور، یکم اپریل ۱۹۶۵ء

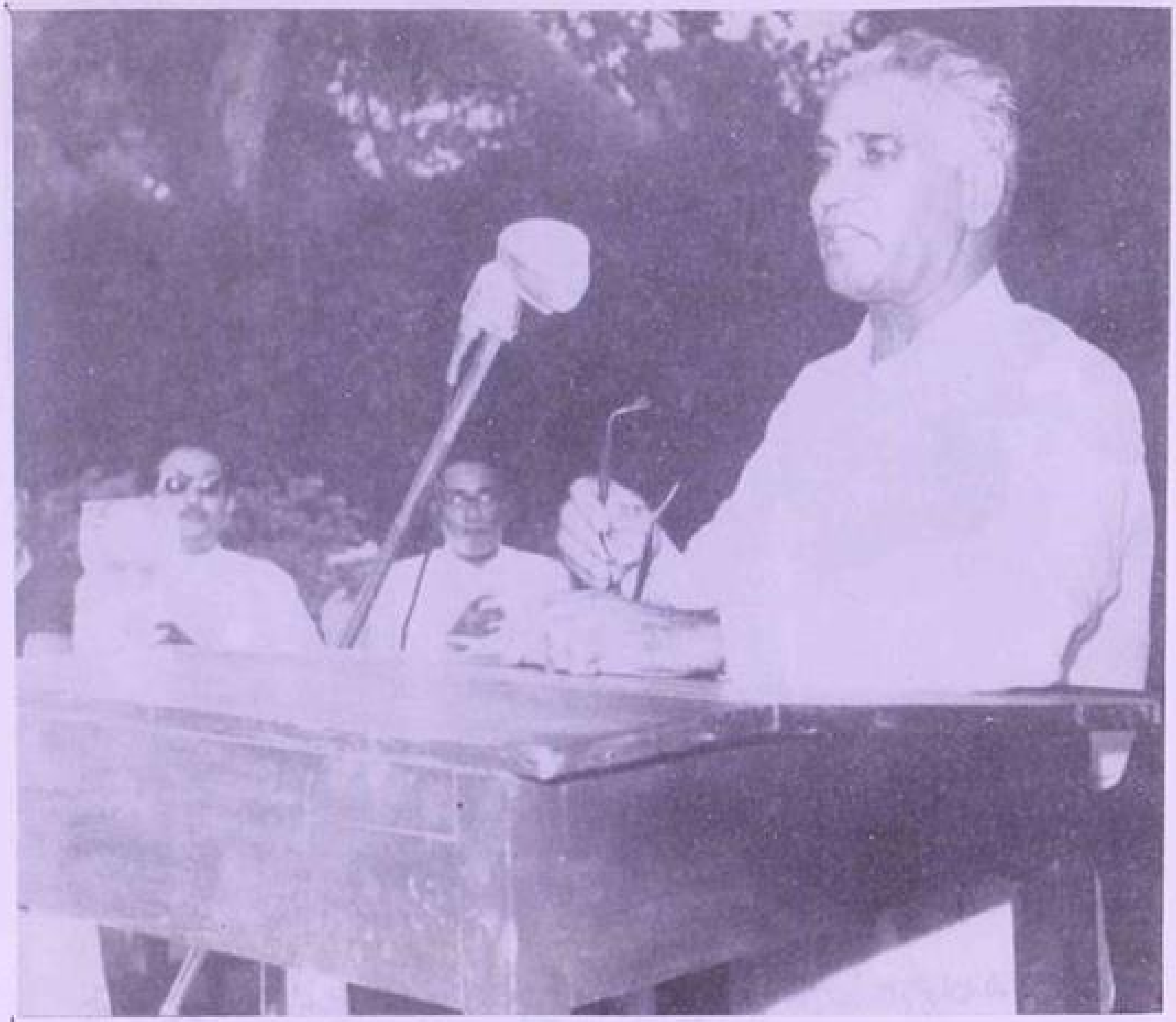




جناب چوہدری نذیر احمد خاں (بائیں) - شام ہمدرد، لاہور، ۳ر جون ۱۹۶۵ء

جناب ملّا واحدی، شام ہمدرد، کراچی، ۱۰ر جون ۱۹۶۵ء





جناب اے۔ ڈی۔ اظہر، شام ہمدرد، لاہور، یکم جولائی ۱۹۶۵ء

جناب جسٹس قدیرالدین احمد، شام ہمدرد، کراچی، ۱۰ر جولائی ۱۹۶۵ء

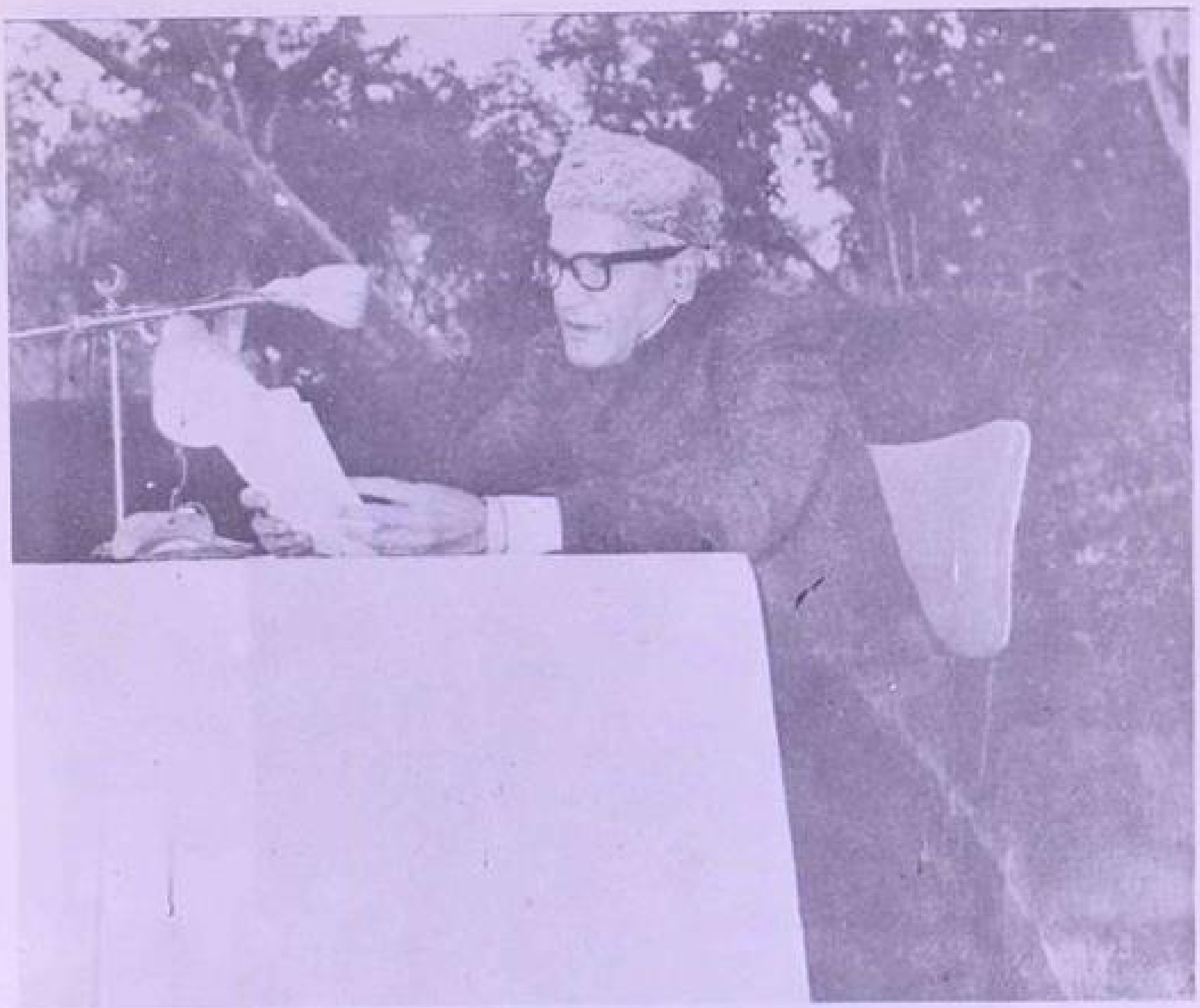




جناب ڈاکٹر محمد اجمل، شام ہمدرد، لاہور، ۲ر ستمبر ۱۹۶۵

جناب جسٹس انوار الحق، شام ہمدرد، لاہور، ۴ر نومبر ۱۹۶۵ء





مولانا رئیس احمد جعفری، شام ہمدرد، لاہور، ۲ر دسمبر ۱۹۶۵ء

مولانا کوثر نیازی، شام ہمدرد، لاہور، ۶ر جنوری ۱۹۶۶ء






جناب این۔ اے۔ فاروقی، جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور جناب حکیم محمد سعید
شام ہمدرد، راولپنڈی، یکم فروری ۱۹۶۶ء

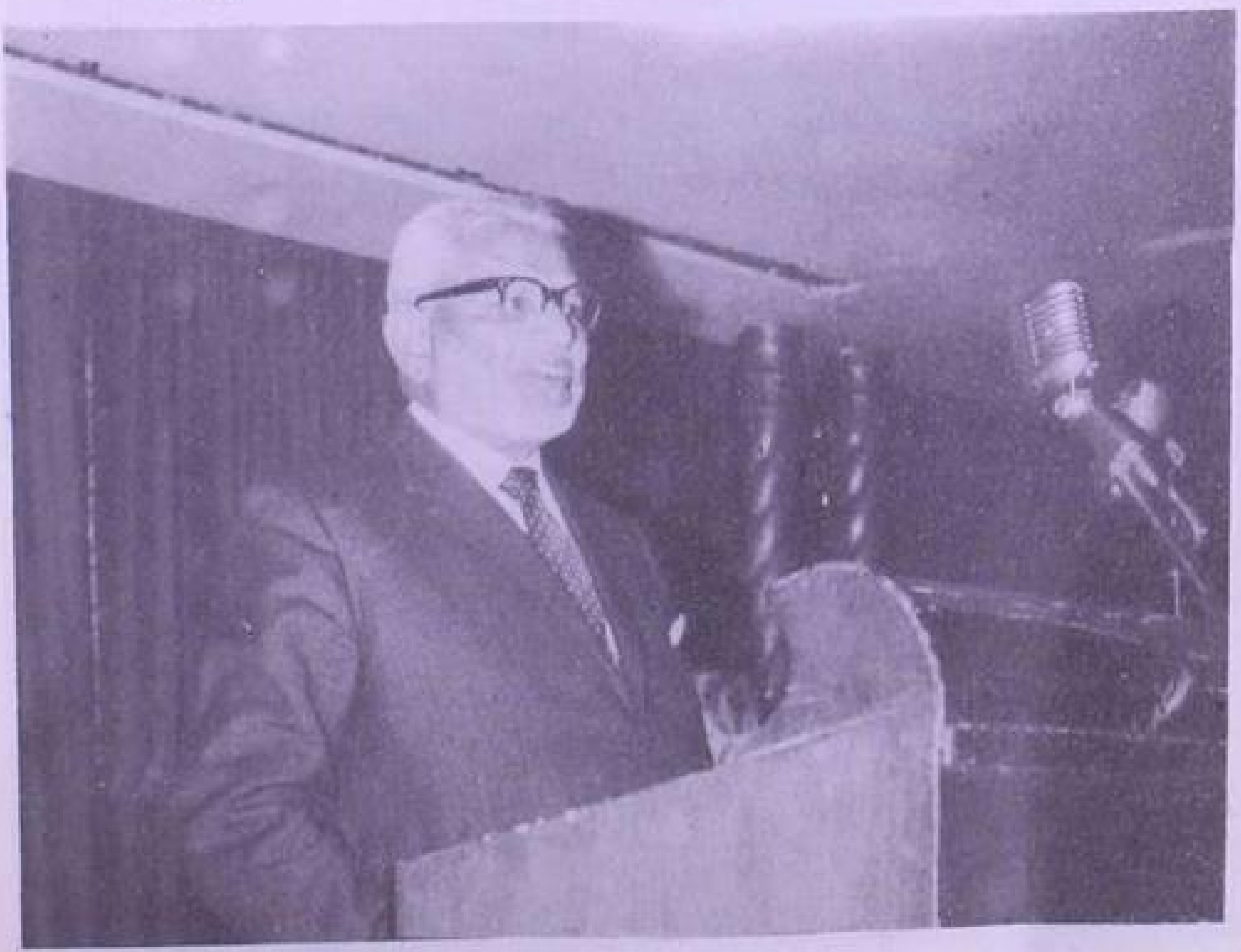
جناب خان محمد علی خان ہوتی، شام ہمدرد، لاہور، ۳ فروری ۱۹۶۶ء

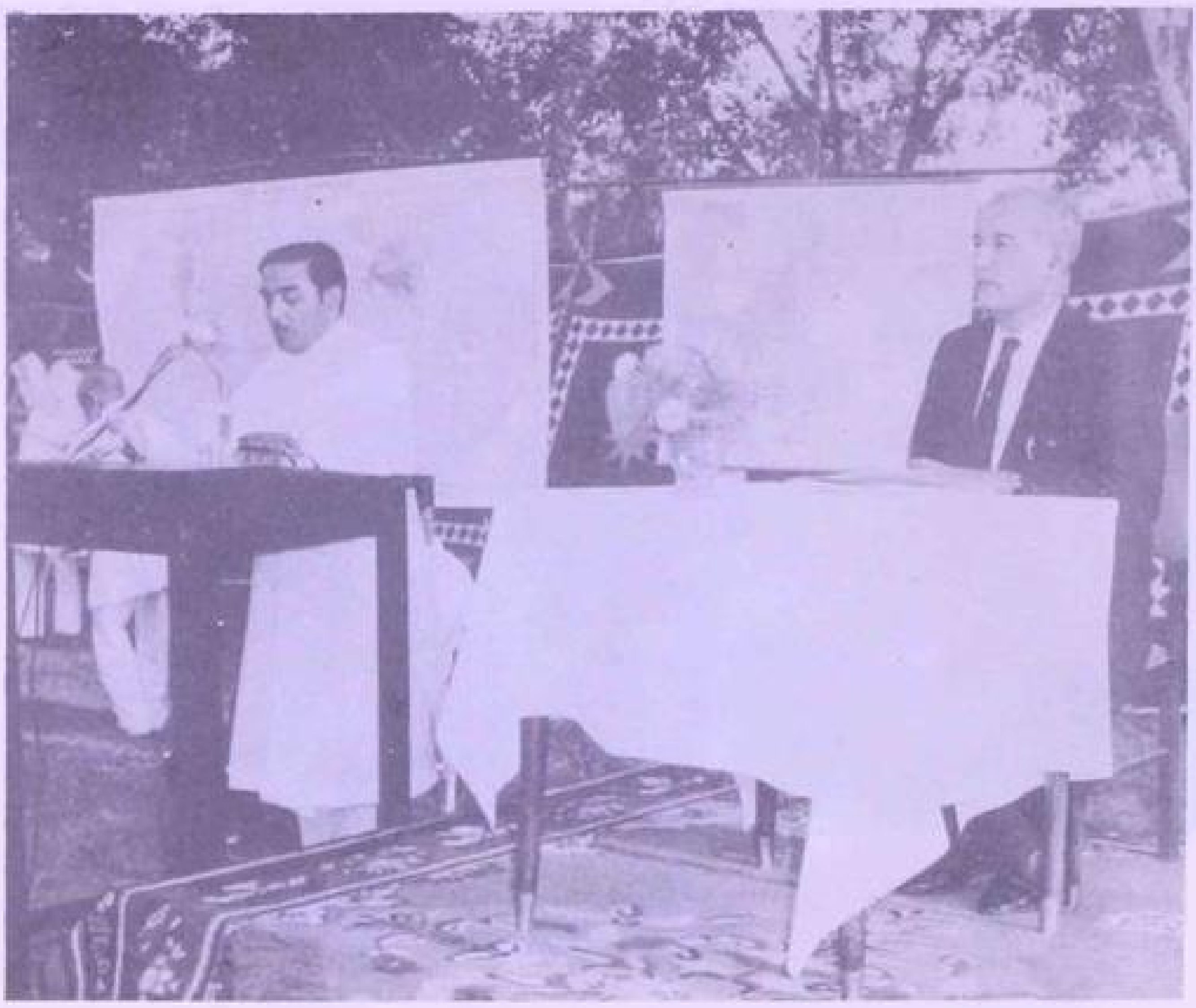




جناب ڈاکٹر لُوچی چن ، شام ہمدرد ، لاہور، ۳ر مارچ ۱۹۶۶ء

جناب پروفیسر میاں افضل حسین ، شام ہمدرد ، لاہور، ۷ر اپریل ۱۹۶۶ء





جناب ڈاکٹر قاضی سعید الدین (دائیں) شام ہمدرد، لاہور، ۲؍جون ۱۹۶۶ء

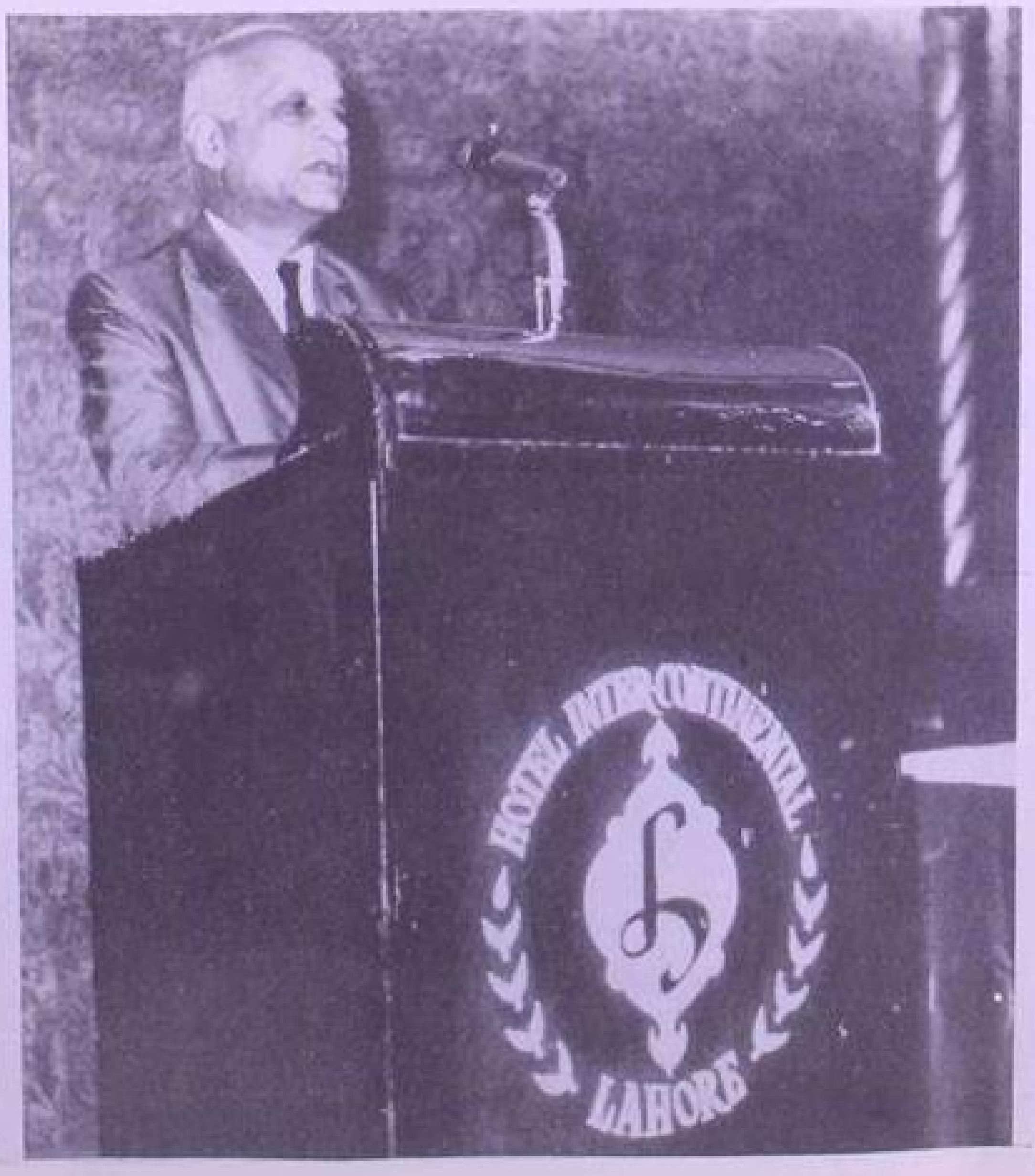
خانم مریم بہنام، شام ہمدرد، لاہور، ۵؍مئی ۱۹۶۶ء





جناب پروفیسر خواجہ محمد اسلم، شام ہمدرد، لاہور، ۷؍ جولائی ۱۹۶۶ء

جناب جسٹس ایس۔اے۔ رحمٰن، شام ہمدرد، لاہور، ۷؍ جولائی ۱۹۶۶ء





جناب سید محمد قاسم رضوی، شام ہمدرد، راولپنڈی، ۳۰ر اگست ۱۹۶۶ء

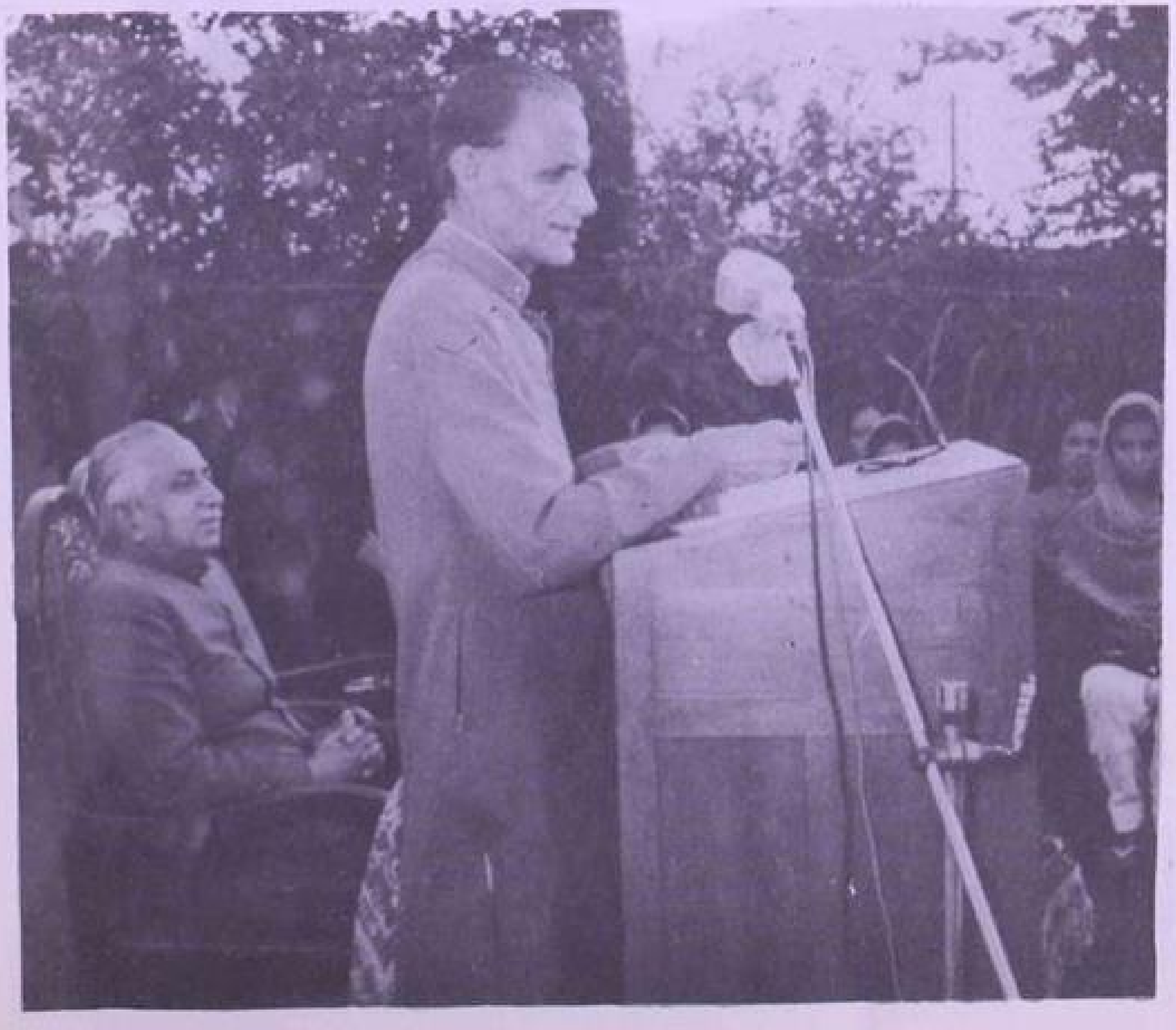
جناب ملک خدابخش بچہ، شام ہمدرد، لاہور، ۴ر اگست ۱۹۶۶ء





جناب لیفٹننٹ جنرل بختیار رانا ، شام ہمدرد ، لاہور ، یکم ستمبر ۱۹۶۶ء

جناب رئیس امروہوی ، شام ہمدرد ، کراچی ، ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء





جناب بریگیڈیر گلزار احمد، شام ہمدرد، راولپنڈی، ۴؍اکتوبر ۱۹۶۶ء

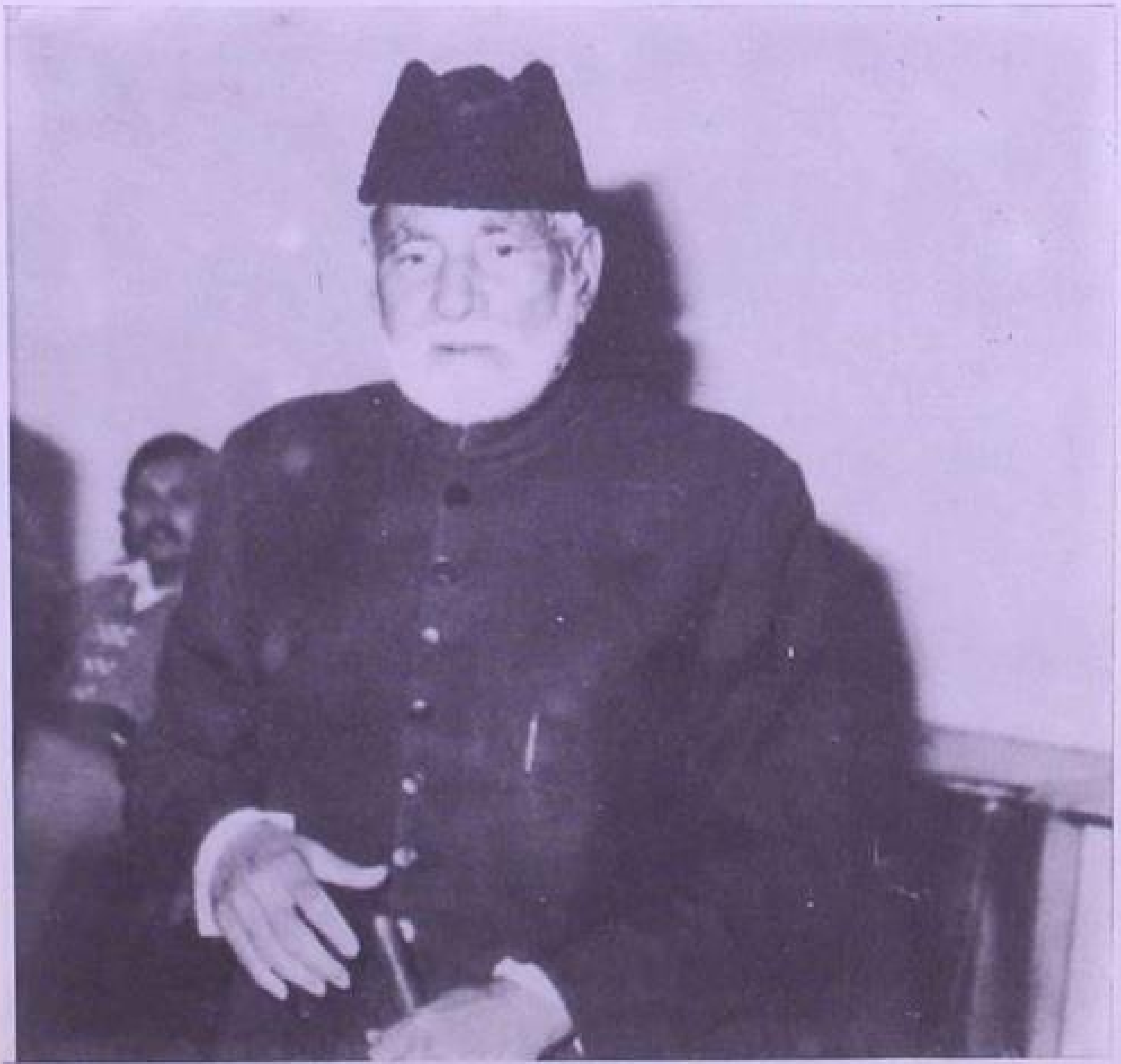
جناب محمد یٰسین وٹو، شام ہمدرد، لاہور، ۶؍اکتوبر ۱۹۶۶ء





جناب سید ہاشم رضا (دائیں)، شام ہمدرد، کراچی، ۱۰ نومبر ۱۹۶۶ء

مولانا محمد سعید، شام ہمدرد، راولپنڈی، ۲۹ نومبر ۱۹۶۶ء





جناب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، شام ہمدرد، لاہور، یکم دسمبر ۱۹۶۶ء

جناب حکیم محمد سعید اور جناب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم



صحّت عامہ

جناب محمد علی خاں صاحب
وزیر صحت ۔ مغربی پاکستان

صحتِ عامہ کا تاریخی جائزہ لینے اور صحتِ عامہ کے اصول پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کے لیے شامِ ہمدرد کی تقریب ایک بہترین ماحول ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے لیے یہ موقع فراہم کیا۔

صحتِ عامہ ہماری قوم کے بنیادی مسائل میں سے نہایت ضروری مسئلہ ہے جو قومی توجہ کا محتاج ہے۔ انسان کے اجتماعی شعور کے مطابق ہی صحتِ عامہ کے تصوّر نے ترقی کی ہے، اور ہزاروں سال کی جدّوجہد کے بعد اُس نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ سچ پوچھیے تو عصرِ حاضر کی طبّی عمارت ان بنیادوں اور ستونوں پر قائم ہے جو مسلمانوں نے اپنے عہد میں استوار کیے تھے۔ اسلام سے قبل طبّ نے ایک فن کی ابتدائی شکل تو اختیار کر لی تھی لیکن طبّ کو باقاعدہ ایک تجرباتی علم یعنی سائنس بنا کر عوام کی بہتری کے لیے مسلمانوں ہی نے استعمال کیا۔ طبّ کو رفاہِ عامہ کا ایک نہایت مفید ادارہ بنا دیا۔ اس بارے میں یورپ والے چاہے کچھ کہیں ہمیں مکمل ذہنی آزادی کے ساتھ اس مسئلے کا تاریخی جائزہ لینا چاہیے کیوں کہ اسی صورت میں ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اس مسئلے کی وسعت میں ہماری روایات کیا ہیں۔ جب انسان نے آج سے ہزاروں سال قبل جنگل کی زندگی کو خیرباد کہتے ہوئے تاریخ کے مہذّب دور میں قدم رکھا تو اس وقت اسے طبّ اور صحتِ عامہ کا شعور نہ تھا۔ وہ عناصرِ قدرت کی مہیب قوّتوں سے خوف زدہ تھا۔

سنسان بیابانوں، خاموش جنگلوں اور خوف ناک گھاٹیوں نے اس پر ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ رعد و برق کی گھن گرج سے لرزہ براندام ہو کر وہ غاروں میں چھپ جاتا تھا۔ وہ نیچر کے طاقت ور ماحول سے مغلوب تھا اس لیے موت اور بیماری کو بھی وہ کسی قہرمانی طاقت کی کارفرمائی خیال کرتا تھا۔ نئے پتھر کے زمانے کے قدیم غاروں اور پتھر کے ہتھیاروں سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ صحت کے اصولوں اور بیماریوں کے علاج سے واقف نہیں تھا۔ نیچر اس کی معالج تھی۔ سادہ غذا سے جو قوّتِ مدافعت پیدا ہوتی تھی وہ اس کی محافظ تھی جنگل کی سادہ زندگی اور تازہ آب و ہوا اس کے لیے صحت بخش ماحول پیدا کر دیتی تھی۔ ورنہ صحت اور بیماری کے معاملات میں عقل کو استعمال کرنا اس نے ابھی نہیں سیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ بیماریوں اور تمدّنی تقاضوں نے اس کے طبّی ذہن کو بیدار کر دیا۔

دریائے نیل، دجلہ و فرات اور دریائے سندھ کے کناروں پر اس لے زراعتی دریائی تہذیبوں کی ابتدا کی اور ان تہذیبوں کو فروغ دیا۔ دریائے نیل اور دجلہ و فرات کی تہذیبوں کی تفصیلات کا ہمیں علم ہو چکا ہے۔ دریائے سندھ کی تہذیب ابھی پردۂ راز میں ہے۔ موئن جو دڑو کے آثارِ قدیمہ سے اس تہذیب کا مزاج تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے لیکن اس کی تاریخ کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں۔ یہ فیصلہ کُن بات ہے کہ یہ تینوں مذکورہ تہذیبیں زراعتی تہذیبیں ہیں۔ زراعت کا انحصار صرف عناصرِ قدرت پر ہے۔ موسمی بارشوں اور دریا کی طغیانیوں سے اس کا تعلق ہے۔ انسانی قوّتِ متخیلہ کی کرشمہ سازی سے نیچر کی یہ مہیب قوّتیں دیوی دیوتاؤں کی شکل اختیار کر گئیں۔ ان دیوتاؤں سے تعلق قائم کرنے کے لیے پروہتوں کی جماعتیں وجود میں آئیں۔ قربانی کی رسمیں بنیں جن کو یہ پروہت سرانجام دیتے تھے۔ یہ اصنام پرستی اساطیر اور دیومالا کا دور ہے۔ ہر ایک قوم نے اپنے مخصوص ماحول کے مطابق دیوتا بنا لیے اور ان کے نام رکھ لیے گو ان کے ساتھ ساتھ ان کے عقب میں ایک اور قوّت کا احساس بھی انسان کو رہا لیکن پروہت اس کی زندگی پر چھا گئے تھے۔ اس زمانے میں پروہت جہاں قربانی کی رسمیں ادا کرتے تھے وہاں جادو اور ٹوٹکوں سے بیماری پیدا کرنے والی بدروحوں کے اثرات کو بھی دور کرتے تھے۔ آج کل بھی پس ماندہ لوگوں میں جادو اور ٹوٹکوں کا جو رواج پایا جاتا ہے یہ اُس زمانے کے باقیات میں سے ہے۔ اس زمانے میں صرف جادو کی قوّت کو بیماری کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا، دوا کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور نہ بیماریوں کی اصل وجہ ابھی معلوم ہوئی تھی۔ جڑی بوٹیوں یا مختلف غذاؤں کے استعمال سے جب بیماری میں افاقہ ہو جاتا تھا تو اسے بھی ان ٹوٹکوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جادو کا بہت زور تھا۔ ان پروہتوں

میں سے ہی بعض مہم جو لوگ مقتدر ہو گئے اور بادشاہ بن گئے۔ بعض اوقات ان کو دیوتاؤں کا درجہ بھی دے دیا جاتا تھا۔ فرعون اور نمرود اس دور کے بادشاہ ہیں۔ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون نے اپنے جادوگر ہی بلائے تھے۔ فرعون کی خدائی سطوت اور جادوگروں کے جوشِ عظمت پر حضرت موسیٰ نے ضربِ کاری لگائی تھی۔ اُن سے بہت عرصہ قبل حضرت ابراہیم وادیٔ فرات میں دیومالا بُت پرستی کے خلاف جہاد کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ اُنھوں نے توحید کا جو عظیم سلسلہ شروع کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سلسلے کے ایک عظیم فرد ہیں۔ اُنھوں نے انسانی عقل کو بیدار کیا اور انسان نے نوامیسِ فطرت پر غور شروع کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بیمار ہوتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے شفا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جادو ٹونوں سے شفاء حاصل نہیں ہوتی بلکہ صرف اللہ کے بنائے ہوئے سچے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے سے صحت حاصل ہوتی ہے اور اس کی پیدا کی ہوئی دواؤں سے شفا ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادو، توہم پرستی اور بت پرستی سے انسانی ذہن کو آزاد کیا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے طب کے عظیم فن اور صحتِ عامہ کے اصول کی ابتدا ہوتی ہے۔

مصر اور میسوپوٹیمیا کی تہذیبوں کے تخلیقی رجحانات سے یونانی متاثر ہوئے اور اُنھوں نے انسانی صحت اور طب کے اصول مرتب کیے۔ آج سے اڑھائی ہزار سال قبل یونانیوں کی ریاست ہائے بلدیہ میں خواہ وہ یونان میں واقع تھیں یا ایشیائے کوچک میں علم کے حصول کے لیے ایک عظیم رجحان پیدا ہو چکا تھا۔ ایتھنز کا شہر تو بہت ممتاز تھا جس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم فلاسفر پیدا کیے۔ اس عملی رجحان نے طب کے میدان میں بقراط، اور جالینوس کو پیدا کیا۔ بقراط کو تو طب کا باپ تصور کیا جاتا ہے۔ ان طبی اصولوں سے صرف یونانی خواص ہی استفادہ کرتے تھے عوام اور غلام ان سے فائدہ نہیں حاصل کر سکتے تھے، اس لیے طب کا فن صحتِ عامہ پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بقراط اور جالینوس اس انداز کے طبی مفکر ہیں کہ وہ بالکل موجودہ دَور کے مفکر معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے ٹونے ٹوٹکوں سے قطع نظر کرتے ہوئے طب کو ایک فن کی حیثیت دی۔ انسانی جسم اور اس کی بیماریوں پر غور کیا۔ تشخیص کے اصول مرتب کیے۔ دوائیں تجویز کیں۔ یہ ایک بہت ہی بڑا قدم ہے جو اُنھوں نے اُٹھایا۔ انسانیت ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی لیکن اپنے اس اقدام سے وہ صحتِ عامہ کو متاثر نہیں کر سکے۔ سکندرِ اعظم کی وفات کے بعد اس کا جرنیل بطلیموس مصر پر قابض ہُوا۔ وہ بھی سکندرِ اعظم کی مانند ارسطو کا شاگرد تھا۔ جب وہ مصر کا بادشاہ بنا تو اُس نے علم کو بہت فروغ دیا۔ سکندرِ اعظم نے پرندوں اور جانوروں پر تجربات کے لیے ارسطو کو لاکھوں روپیہ دیا تھا۔ بطلیموس نے بھی اسکندریہ

میں ایک عظیم علمی ادارہ، لائبریری اور عجائب گھر تعمیر کیا۔ اس علمی مرکز نے فلسفہ، فلکیات اور فنِ طب میں عظیم الشان اساتذہ پیدا کیے۔ ہیروفیلس، جو عمل جراحی اور اناٹومی کا زبردست ماہر تھا یہیں پیدا ہوا۔ طب میں بہت ہی ترقی ہوئی۔ بطلیموس نے افریقہ کے اس شہر میں علم کی ایک ایسی بنیاد قائم کی اور شمع جلائی جس نے سارے مشرق کو روشن کیا۔ اسکندریہ کے علوم بھی صحیح معنوں میں موجود سائنٹفک دور کی ابتدا ہیں اور طبِ یونانی نے بھی ابتدائی منازل اسی شہر میں طے کی ہیں۔ اسکندریہ کے طبی علم میں ایک بنیادی خامی تھی یعنی وہ کیمسٹری یعنی علم کیمیا کو پیدا نہ کر سکا۔ طب اور کیمسٹری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسکندریہ نے کتابیں پیدا کیں، لیکن اس سے صرف اُمرا اور شاہی خاندان کے لوگ استفادہ کر سکتے تھے اس لیے اسکندریہ کی طب عوامی طب نہیں تھی۔ تاریخ قدیم میں صرف ایک منفرد مثال ہے جس میں فنِ طب اور عوام کا تعلق قائم ہوا۔ اشوکِ اعظم نے ہندستان میں پبلک باغ اور عوامی ہسپتال بنوائے جن سے عوام بغیر ذات پات کی تفریق کے استفادہ کر سکتے تھے۔ لیکن ہمیں علم نہیں کہ ان ہسپتالوں میں کس فنِ طب کے مطابق علاج ہوتا تھا۔ آیورویدک کا طریقہ تھا یا یونانی طریقہ علاج تھا اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ ممکن ہے طبِ یونانی رائج ہو کیوں کہ سکندرِ اعظم کے حملے کی وجہ سے شمالی ہندستان یونانی تہذیب سے متاثر ہو چکا تھا۔ اشوک کی رگوں میں بھی یونانی خون تھا۔ اشوک بندوسار کا بیٹا تھا اور بندوسار کے متعلق غالب خیال یہ ہے کہ یہ چندر گپت کی اس رانی کے بطن سے تھا جو سیلوکس کی بیٹی تھی۔ اس کے بعد رومیوں کا دور آیا وہ جابر اور قاہر حکمران تھے۔ انھیں طاقت ور سے محبت تھی۔ کمزوروں اور بیماروں کے ساتھ انھیں کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔ چناں چہ انھوں نے جنگی کھیلوں کے لیے اکھاڑے اور نہانے کے لیے حمام بنوائے اور ہسپتال نہیں بنوائے۔ روم نے جب عیسائیت کو قبول کیا اور رومی کلیسا رومی عظمتِ رفتہ کا جانشین بنا تو اس کلیسا نے بھی صحتِ عامّہ اور علم کی ترقی کی طرف کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی۔ جسٹینین اوّل ایک عظیم عیسائی شہنشاہ تھا۔ یہ قسطنطنیہ کے سینٹ صوفیہ کا بانی ہے۔ اس نے عیسائیت کی حمایت میں رومی سلطنت کے اندر یونانی علوم کے سارے اسکول بند کروا دیے تھے اور یونانی طب کا دیا بھی گل کر دیا تھا، یہاں تک کہ یونان میں ایتھنز کے مقام پر جو افلاطون کے زمانے سے اکیڈمی اور اسکول چلا آتا تھا اسے بھی چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں بند کروا دیا۔ شہنشاہ جسٹینین کے اس اقدام سے یونانی علوم کا ستارہ غروب ہو گیا اور سارے یورپ پر جہالت کی تاریکیاں چھا گئیں۔ کہیں کہیں یونانی علوم اور فنِ طب کی کتابیں تو محفوظ رہ گئی تھیں لیکن وہ شجاع انسان دنیا سے

اُٹھ گئے تھے جو علم کی روایتوں کو دنیا میں قائم کیے ہوئے تھے۔ جو شخص اس سلسلے میں جرأت کا اظہار کرتا تھا اس پر اتنا ظلم روا رکھا جاتا تھا کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد صدیوں تک طِب اور صحتِ عامّہ کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ ایران کی بھی یہی حالت تھی۔ اردشیر نے زرتشت کے قدیم ایرانی مذہب کا احیا کیا تھا، آتش کدے بنوائے تھے اور پجاریوں کی جماعتیں معرضِ وجود میں آئی تھیں۔ آتش کدوں کی قربان گاہوں پر مقدس آگ جلتی رہتی تھی لیکن انھوں نے اردشیر کو صلیب دیا تھا اور اس کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ انسان دوست تحریک کو سختی سے دبا دیا گیا تھا اس لیے ایران کی سرزمین میں طبّی، رفاہی اور عوامی اداروں کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں ایران اور روم دونوں اقتدار کے لیے نبرد آزما ہوئے۔ جہاں جنگ و جدل کا بازار گرم تھا۔ جہالت اور پس ماندگی کی قوتیں مہذّب دنیا پر غالب آچکی تھیں۔ خیال یہی تھا کہ انسانیت کا سفینہ اس بھنور سے کبھی نہ نکل سکے گا اور اقوامِ عالم ظلم و بربریت، جہالت اور پس ماندگی کا ہمیشہ کے لیے شکار ہو جائیں گی لیکن تاریخ کے اس نہایت نازک موقع پر صحرائے عرب میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے گرتی ہوئی اور برباد ہوتی ہوئی انسانیت کو تباہی سے بچا لیا۔ آپؐ نے دینِ اسلام کے ساتھ ہی ایک تہذیب دنیا کو دی۔ آپؐ کے ماننے والے دنیا میں ہر جگہ غالب آگئے۔ جہالت کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ اسپین سے لے کر ہندستان اور چین تک علم کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ علمِ طب نے بھی بہت فروغ حاصل کیا اور اس کے ڈانڈے صحیح معنوں میں صحتِ عامّہ سے مل گئے۔

اسلام جہاں ایک عوامی اور رفاہی معاشرہ پیدا کرتا ہے وہاں صحتِ عامّہ کا خیال رکھنا بھی اس کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے۔ قرطبہ، بغداد، سمرقند، بخارا اور دہلی علوم و فنون کے مرکز بن گئے۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی تعلیمات نے انسانی ذہن کو آزاد کیا۔ مسلمانوں نے یونانی علوم کی سرپرستی کی اور ان میں اضافہ کیا اور ان علوم و فنون کو انسانوں کے لیے بنایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے۔ آپؐ نے اپنے نمونہ سے صحت کے اصولوں پر عمل کر کے بتایا۔ صحابہ کرام نے آپؐ کے پاک نمونہ پر عمل کیا۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک طبیب مدینہ آیا۔ کچھ عرصہ ٹھہر کر وہ واپس چلا گیا اور اس نے بتایا کہ مسلمانوں کو طبیب کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ صحت کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں، بدن کو صاف رکھتے ہیں، مکانوں کی صفائی کرتے ہیں، کھانا اس وقت کھاتے ہیں جب بھوک لگے، زیادہ سیر ہو کر کھانا نہیں کھاتے، ان سب باتوں کا

خیال رکھنے کی وجہ سے وہ بیمار نہیں ہوتے۔ حضرت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ کو آپؐ کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے حفظِ صحت کے اصولوں کا مکمل شعور تھا۔ حضرت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کو وبائی علاقوں میں داخل ہونے سے اور وبائی امراض سے متاثرہ علاقہ کے لوگوں کو دوسرے علاقوں میں جانے سے منع فرمایا ہے۔

مسلمانوں نے جب مشرق و مغرب کے ممالک کو فتح کیا تو صحتِ عامّہ کے اصول کو فروغ دیا۔ بوعلی سینا اور رازی جیسے عظیم الشان طبیب پیدا کیے۔ مسلمانوں نے کیمسٹری کے اصولوں کے مطابق دوائیں تیار کیں۔ ساری دنیا میں شفاخانوں کا جال پھیلا دیا۔ انسان دوست طبیب پیدا کیے جو نہایت شفقت اور محبت کے ساتھ انسانوں کا علاج کرتے تھے۔ طِبّ یونانی جس کی حیثیت ایک فن کی تھی اسے مسلمانوں نے تجرباتی رنگ دے کر ایک سائنس بنا دیا۔ مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں طِبّ اور صحتِ عامّہ کی سب سے بڑی خصوصیت جو ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ عوام سے علاج اور دوائیوں کا معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ مفت علاج کیا جاتا تھا۔ حکومت طبیبوں اور رفاہی اداروں کی سرپرست تھی۔ عربوں کے شفاخانے بالکل اصولِ صحت پر تعمیر ہوئے تھے اور ہمارے آج کل کے شفاخانوں سے بہتر تھے، کیوں کہ یہ شفاخانے بہت ہی وسیع ہوا کرتے تھے۔ ان کے اندر ہوا اور پانی بہ کثرت پہنچایا جاتا تھا۔ الرازی سے جس وقت کہا گیا کہ بغداد میں سب سے زیادہ اچھی آب و ہوا کے مقام کو تجویز کرے تاکہ اس جگہ شفاخانہ تعمیر کیا جاسکے تو اس نے جس طریق سے مختلف مقامات کا امتحان کیا اس کو آج کل کے متعدّی امراض کے طبیب بھی قبول کریں گے۔ اس نے گوشت کے ٹکڑے شہر کے مختلف مقامات پر لٹکا دیے۔ جس مقام پر سب سے زیادہ دیر میں گوشت سڑا اس جگہ کو اچھی آب و ہوا کا مقام سمجھ کر انتخاب کیا۔

اسپین اور سسلی میں عربوں نے نہایت ہی اعلا درجے کے شفاخانے بنوائے۔ فنِ طِبّ اور صحتِ عامّہ کے اصول نے بہت ترقی کی۔ یورپ کے طلبہ آکر یہاں سے علمِ طِبّ حاصل کرتے تھے اور یورپ میں جاکر عربوں کے اصولوں کے مطابق لوگوں کا علاج کرتے تھے۔ اس زمانے میں عرب مسلمان دُنیا کے رہنما تھے۔ اسپین، سسلی اور جنوبی اٹلی کے ذریعہ سے عربوں کے علوم مغرب میں پھیلے۔ یونانیوں کی طِبّ خیالی اور منطقی تھی، عربوں نے اس کو عقلی اور تجرباتی یعنی سائنٹفک بنایا۔ عرب دُنیا کے پہلے سائنس داں طبیب ہیں۔ سائنس کے بانی عرب ہیں۔ سائنس کا جدید راستہ عربوں نے دریافت کیا ہے۔ ہریفولٹ اپنی تصنیف تعمیرِ انسانیت کے صفحہ ۲۶ پر لکھتا ہے:

"عربی تہذیب یعنی مسلم قوم کی طرف سے سائنس موجودہ دُنیا میں ایک مہتم بالشان اضافہ ہے۔ یہ عربی تہذیب ایک درخت کی مانند ہے جس کے پھل بتدریج پک کر

سب مسلمانوں کی ایجادیں ہیں۔ اسپین اور سسلی میں مسلمانوں نے سائنس اور طِب کو بہت ترقی دی۔ عوام کے لیے شفاء خانے نہایت وسیع پیمانے پر قائم کیے۔ جڑی بوٹیوں اور علم نباتات کے ضمن میں تجربات کیے اور ان تجربات سے طِب کی معلومات میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ اس سلسلے میں ابن بیطار اندلسی کے علمی کارنامے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ مغرب کے طول و عرض میں اس وقت جو سائنس اور طِب کی حیرت انگیز ترقی نظر آتی ہے اس کے بانی مسلمان ہیں۔ اگر مسلمان اس سائنس کو ایجاد نہ کرتے اور اس کے بنیادی اصول مرتب نہ کرتے تو آج دنیا میں سائنس کی یہ حیرت انگیز ترقیاں نہ ہوتیں۔

طِب کے سلسلے میں بارہا سائنسی علوم کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں طِب کا عالم سارے علوم کا عالم ہوتا ہے جس میں مذہبی علوم بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے طبیب کو حکیم کہنا شروع کیا اور طِب کو حکمت کا نام بھی دینے لگے۔ ان جملہ علوم نے اسپین اور سسلی میں بہت فروغ حاصل کیا۔ اسپین اور سسلی کی یونیورسٹیوں سے یورپ والوں نے مسلمانوں کے علوم کو حاصل کیا اور لاطینی عیسائیت کے اندر عربی علوم پھیل گئے۔ اور عربی طِب جسے مسلمان ہمیشہ یونانی طِب کے نام سے موسوم کرتے رہے اس نے یورپ کو متاثر کیا۔ سارے یورپ میں عربوں کا طریقۂ علاج رائج ہو گیا۔ یہ طریقۂ علاج اسلامی ہے۔ محض اسلاف پرستی کے طور پر ان واقعات کو یاد نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں ان شاندار روایات کو بنیاد بنا کر آئندہ ترقی کی عمارت کی تعمیر کرنی چاہیے۔

برِصغیر میں طِب کے سلسلے میں ہماری شاندار روایات موجود ہیں۔ خاندان شریفی کی خدمات نہایت ہی قابلِ قدر ہیں۔ ان روایات اور خدمات کو ملا کر ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ ہمارے سامنے ایک زبردست نصب العین ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے احساس فرض اور محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔ طِب کا فن پہلے بھی موجود تھا۔ ہمارے اسلاف نے اسے صحتِ عامّہ کا سائنٹفک اصول بنایا۔ صحتِ عامّہ قوموں کا بنیادی مسئلہ ہے، کیوں کہ یہ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے۔ پاکستان سب سے بڑی اسلامی جمہوری مملکت ہے۔ موجودہ حکومت نے صحتِ عامّہ کے سلسلے میں جو منصوبہ بندیاں اور اقدامات کیے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ رفاہِ عامّہ کا عظیم نصب العین ہمارے سامنے ہے۔ طِب اور صحتِ عامّہ کا یہ ایک اجمالی جائزہ ہے جو اس مجلس کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی پس منظر ہے جس سے ہم کو یہ اندازہ ہو سکا ہے کہ اسلامی تعلیمات نے صحتِ عامّہ کے کن اصولوں کو ابھارا تھا۔ مسلمانوں نے خصوصاً عرب مسلمانوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں کیسی خوبی اور ذمے داری کے ساتھ ان سنہرے اصولوں

تیار ہوتے ہیں۔ اندلسی عربوں کے صفحۂ ہستی سے نابود ہونے کے کافی عرصہ بعد سائنس کا وہ عبقریت جس کو عربی ثقافت نے جنم دیا تھا اپنی بلوغت کو پہنچا۔ صرف سائنس سے ہی موجودہ یورپ میں زندگی پیدا نہیں ہوئی بلکہ مغربی تہذیب میں مسلم قوم کی تہذیب کے بہت سے اثرات کارفرما ہیں۔ مغربی تہذیب میں ابتدائی دمک تو عربوں کی تہذیب سے ہی پیدا ہوئی تھی۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ سائنس کے بانی مسلمان ہیں۔ سائنٹفک طِب کی ابتداء بھی مسلمانوں نے کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عرب مسلمان اسلام کے حقیقی مزاج کو سمجھتے تھے۔ علوم و فنون اور تہذیب اور تمدّن میں اعلا اور مفید ترقّی کو پسند کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اسلام علم دوست اور ترقّی پسند معاشرہ پیدا کرتا ہے جو علم انسان کے لیے مفید ہے اور اس کی تہذیب و ترقّی میں مدد دیتا ہے اسے اختیار کرنا چاہیے۔ صرف اس بات کو نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے اور اسلام کے بنیادی اصولوں کا خلاصہ بھی تو توحیدِ الٰہی اور وحدتِ نسلِ انسانی کے سوا کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ تمھارے لیے مسخّر کر دیا گیا ہے۔ نیچر کی قوتوں کی تسخیر کرو اور ان کو انسان کے لیے مفید بناؤ۔ قرآن کی تعلیم کا یہ نقطہ سائنس کی ابتدا ہے۔ اس کائناتی شعور سے مسلمانوں نے سابقہ علوم میں سائنس کا رنگ بھرا اور ان علوم کو تجرباتی بنایا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کا زمانہ مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا زمانہ تھا۔ اسلامی اصولوں کو اجتماعی زندگی میں ڈھالنے اور اُن کے مطابق ایک مثالی معاشرہ پیدا کرنے کا زمانہ تھا۔ بنوامیّہ کا زمانہ تسخیر اُمَم اور فتوحات کا زمانہ ہے۔ بنوعباس کے زمانے میں علمی تخلیق اور پرانی کتابوں کے ترجمے کا کام شروع ہُوا۔ عباسی خلیفہ المامون نے ۸۳۰ء میں بغداد کے مقام پر بیت الحکمت قائم کیا جو ایک علمی ادارہ، کُتب خانہ اور رصدگاہ پر مشتمل تھا۔ اس بیت الحکمت میں یونانی، سنسکرت، سریانی اور پہلوی کتابوں کے ترجمے کیے گیے۔ اس عظیم علمی ادارے نے مسلمانوں کو طِبّ، منطق، الجبرا و المقابلہ، ہیئت، اقلیدس اور کیمسٹری جیسے بنیادی علوم سے روشناس کیا۔ عیسائیت کے فروغ سے جو علوم صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے تھے مسلمانوں نے ان علوم کو ازسرِنو زندہ کیا اور ان کو ترقّی کی راہوں پر ڈالا۔ اس کے بعد ان جملہ علوم میں اتنی ترقّی ہوئی کہ اس ترقّی کو دیکھ کر مسلمانوں کا سر فخر سے اُونچا ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں نے سب علوم میں انکشافات۔ انکشافات کے اصول اور طبیعیات میں آلاتِ جرِ ثقیل ایجاد کیے۔ کیمیائی مرکبات، الکحل، شورے اور گندک کے تیزاب اور عرق کشی کے طریقے دریافت کیے، کاغذ بنایا، جہاز رانی میں قطب نما کا استعمال

کو عملی جامہ پہنایا۔ یونانیوں کے فنِ طِب کو زندہ کیا اور اپنے مخصوص تجرباتی انداز سے اسے سائنس بنا دیا اور اس سائنس کو صحتِ عامّہ اور رفاہِ عامّہ کا عظیم الشان ادارہ بنا دیا، اور عالمِ اسلام میں مثالی قسم کے شِفاخانے قائم کیے جن سے انسان مذہب و مِلّت کی تمیز کے بغیر فائدہ اُٹھاتے تھے۔ دنیا میں صفائی اور صحتِ عامّہ کا صحیح شعور پیدا کیا اور طبیبوں میں انسانی اور عوامی رجحانات پیدا کیے۔ ان کے دلوں میں انسانوں کی بے لوث خدمات کے جذبے کو اُبھارا۔ ساری دنیا میں آج آپ کو صحتِ عامّہ کا جو احساس اور شعور نظر آتا ہے اس کے بانی مسلمان ہیں مسلمانوں نے ایسے انسان دوست اور بلند اخلاق طبیب پیدا کیے کہ ابھی تک ان کے تذکرے ہماری روایات میں موجود ہیں۔ کوئی شہر اور کوئی بستی ایسی نہیں جہاں کوئی ایسا مسلمان طبیب نہ گزرا ہو جس کے حیرت انگیز اور مُعجزہ نُما علاجوں کی داستانیں اس علاقے میں مشہور نہ ہوں۔ ہم ان سب عظیم روایات کے امین ہیں۔ ہمیں ان روایات کو جدید سائنٹفک انداز سے زندہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں حکومت پاکِستان نے جو اقدامات کیے ہیں ان اقدامات سے ہمارے نصب العین کی نشان دہی ہوتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں طِب اور صحتِ عامّہ سے متعلقہ شعبوں اور پروگراموں میں سخت بدنظمی پیدا ہو گئی تھی اور ہیلتھ سروسز کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ لوگوں کی ضروریات کے مقابلے میں ڈاکٹروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی صوبہ میں صرف کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج تھا جس میں ضروریات کا کچھ ساز و سامان موجود تھا۔ کراچی کا ڈو میڈیکل کالج تعمیر کے ابتدائی دَور میں گزر رہا تھا۔ اس وقت خدا کے فضل و کرم سے صوبہ میں چھ میڈیکل کالج موجود ہیں۔ جن میں سے ہر سال چھ سو طالب علم فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ڈینٹل کالج بھی ہے جس میں طلباء کو ڈینٹل سرجری کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ہماری قومی انقلابی حکومت صحتِ عامّہ کی طرف غیر معمولی توجّہ مبذول کر رہی ہے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں دیہات میں بھی دیہی مراکزِ صحت قائم کیے جائیں گے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں دیہی مراکزِ صحت کی تعداد بہت بڑھا دی جائے گی جن میں سے ہر ایک مرکز پچاس ہزار نفوس پر مشتمل آبادی کی خدمت کرے گا۔ اس منصوبے میں صحتِ عامّہ کے عوامی پروگرام کو بہت ہی اہمیّت دی گئی ہے۔ انسدادِ ملیریا کے پروگرام پر بھی نہایت تن دہی سے عمل ہو رہا ہے۔ یہ پروگرام اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا گیا ہے کہ ملک سے ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۵ء تک ملیریا کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔ یہ پروگرام ۱۹۶۷ء تک پورے ملک پر محیط ہو جائے گا۔ تپ دق کے انسداد کے لیے بھی زبردست کوشش ہو رہی ہے۔ صوبے میں اس وقت بی سی جی ٹیکہ کاری کے ۲۰ یونٹ اور ۸۵ فری ٹی بی کلینک کام کر رہے ہیں اضافی طبّی عملہ جس میں نرسیں اور ہیلتھ ٹیکنیشنز شامل ہیں ان کی تعداد کو چوتھے پنج سالہ منصوبے میں بڑھا دیا جائے گا تیسرے پنج سالہ منصوبے میں علاج کے پروگرام کو اور وسیع کر دیا جائے

گا۔ ہماری حکومت کا نصب العین یہ ہے کہ طبی تعلیم کو عام کر کے زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر بنائے جائیں اور رفاہی طبی اداروں کا ملک میں جال بچھا دیا جائے۔ یہاں تک کہ یونین کونسل میں ایک ہیلتھ سنٹر قائم ہو جائے اور ملک کے ہر ایک ضرورت مند فرد کے لیے جائز طبی امداد مہیّا کی جائے۔ بیماری اور وبا اس ملک سے بالکل ختم ہو جائے اور ہماری قوم ایک نہایت ہی صحت ور قوم بنے جو ترقی یافتہ ہو۔ جہاں معیارِ زندگی بلند ہو جو اسلام کی شاندار روایات کا حامل ہو۔ طبِ یونانی بھی ہماری روایات میں سے ایک روایت ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے اس کے ذریعہ سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ یہ طب ہماری آب و ہوا اور ہمارے مزاج سے بالکل مطابقت رکھتی ہے۔ اطباء کو چاہیے کہ اس کو عصری سائنسی معیار کے مطابق مزید ترقی دیں اور اس ملک میں اسے صحت عامّہ کا بڑا ذریعہ بنا دیں۔

انگریزی کی ایک مشہور مثل ہے جس کا مطلب ہے پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ اس مثل کی روشنی میں ہمارے سامنے علاج معالجہ کے بہت سے خطوط ابھر کر آجاتے ہیں۔ اس سے یہ استخراج ہوتا ہے کہ بیماریوں کے تدارک کے لیے انسان کو اپنی فکری اور عملی کوششوں کو زیادہ تر بروئے کار لانا چاہیے۔ موسم کے تغیّر و تبدّل سے بھی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

صحتِ عامّہ کو برقرار رکھنے اور بہتر خطوط پر استوار کرنے کے لیے حکومت نے ایک ایسا جامع پروگرام نافذ کیا ہے جس سے اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی روک تھام ہو سکے گی اور کاروباری حلقوں میں دیانت داری اور اخوّت کی ایک صالح فضا پیدا ہو سکے گی۔ اس سے ہمارے عوام کو یہ بھی فائدہ ہوگا کہ وہ صحت کی بنیادی ضرورتوں کو اشیائے خوردنی کی صورت میں بہتر طور پر حاصل کر سکیں گے۔ خوراک زندگی کی بقا اور جسم کی بناوٹ اور تعمیر کے لیے ایک اساسی چیز ہے۔ خالص غذا سے بیماریوں کا سدِّ باب بھی ہوتا ہے اور انسان اپنی آسودگی اور خوش حالی کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ وہ ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل بھی کرتا ہے اور ایک نئی اور فعال پود کو پروان چڑھاتا ہے۔

حکومت نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اس قانون کو نافذ کیا ہے اب ہمارے سیاسی لیڈروں، اخبار نویسوں، مدیروں اور بنیادی جمہوریتوں اور دوسرے فلاحی اور سماجی اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی اس قانون کی نشر و اشاعت میں سرگرم حصّہ لیں۔ تاکہ عوام کو ذہنی اور شعوری طور پر اس سطح پر لایا جا سکے کہ وہ اپنی صحت کا ہر لمحہ خیال رکھیں اور صحتِ عامّہ کے اصولوں پر بھی ہمیشہ کاربند رہیں۔ اس میں ان کی اور قوم کی بھلائی ہے۔

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۳ر فروری ۱۹۶۶ ش

ڈاکٹر لو۔چی۔چُن

"شامِ ہمدرد" آج بڑی خصوصیت کی حامل ہے۔ آج ہم یہاں پہلی بار ایک عظیم ملک اور پاکستان کے بہت اچھے دوست چین کے نمائندگانِ طب وصحت کا استقبال کر رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے انجمن ترقی طب کی دعوت پر عوامی جمہوریہ چین نے ایک پنج رکنی طبّی وفد پاکستان بھیجا ہے۔ میں آپ کی طرف سے اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن اور خود اپنی جانب سے اس پنج رکنی طبّی وفد کے قائد جناب پروفیسر ڈاکٹر لو۔چی۔چُن اور اراکین ڈاکٹر ہوسن چنگ، ڈاکٹر چیانگ چن ہوا، لیڈی ڈاکٹر ین چین من اور ڈاکٹر یانگ چن شن کا پاکستان میں پُرجوش استقبال کرتا ہوں اور "شامِ ہمدرد" میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر لو۔چی۔چُن، قائد وفد، کا شمار چین کے بڑے سرجنوں میں ہوتا ہے۔ یہ طب جدید کے ماہر ہیں۔ اس خصوصیت کے باوجود اپنی عظمت کو چار چاند لگانے کی خاطر نہیں بلکہ چین کے بڑے پیچیدہ مسئلہ صحت کو حل کرنے کے لیے انھوں نے تحقیق و ریسرچ کے لیے قدیم طب چین کو چُنا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب چین میں آزادی کا آفتابِ عالم تاب طلوع ہو چکا تھا، اور اس کی تابناک روشنی میں جنگِ آزادیٔ چین کے فاتح اور اہل فکر و نظر چاروں طرف اپنے ماحول کا بھرپور جائزہ لے رہے تھے، اور حقیقتاً آزادی کی یہی وہ روشنی ہے جس میں چشمِ بینا عیب و ہنر، اچھائی اور برائی، مدّوجزر اور نشیب و فراز اور نیک و بد سب کچھ دیکھ سکتی ہے۔ اور یہی وہ نظر ہوتی ہے کہ جو اگر چیزوں کو ان کے صحیح خدو خال میں دیکھ لے تو تعمیر ملک و ملّت کی راہیں کھل جاتی ہیں، فکرِ قوم جوان ہو جاتی ہے اور یکسانیت فکر توانائی ملّت کا سبب بن جاتی ہے۔

ماضیٔ قریب میں مشہور شخصیت نپولین بونا پارٹ نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ "جب چین بیدار ہو گا تو دنیا کو ہلا کر رکھ دے گا۔"

"When China moves, she will move the world".

غالباً دنیا کی کئی قومیں نپولین کے اس قول کی صداقت پر یقین رکھتی تھیں، اس لیے اُن کی بڑی کوشش یہ رہی کہ چین کو ہر اعتبار سے کم زور اور نحیف بنائے رکھا جائے، اور انھوں نے ایسا کیا، لیکن دوسری طرف چین میں ماؤزے تنگ اور ان کے ساتھی آزادیِ ملک کا بیڑا اُٹھا چکے تھے۔

یہ داستان اتنی ہی طویل ہے جتنی طویل جدّوجہد آزادی۔ میں اس وقت جس نکتے پر آپ کی توجہ مرکوز کرانا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب سرفروشانِ چین چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں غیر ملکی تسلط سے قطعی چھٹکارا حاصل کر چکے اور سنہ ۱۹۴۹ء میں چین پر چینیوں کی حکومت قائم ہو گئی تو اُس وقت وہاں صورتِ حال یہ تھی کہ سامراجیوں نے طبِ چینی کی پریکٹس کو ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ چین کے پانچ لاکھ سے زیادہ قدیم اطبا ایک نسخہ نہیں لکھ سکتے تھے اور عظیم چین کے عظیم ذخائر نباتات اور بے اندازہ قدیم فارمولوں سے قطعاً استفادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکی تسلّط و اقتدار نے تجارتی اغراض اور اپنے مفادات کے لیے ایسا کیا تھا۔ ضرور انھوں نے اپنی رفیع الشان دواساز فیکٹریوں کی کثیر پیداوار کو کھپانے کے لیے ایسا کیا ہوگا، لیکن ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس کثیر پیداوار کو چین میں کھپانے کے لیے گوروں کے چند ہسپتال ہرگز کافی نہ تھے، اور اس پیداوار کو کھپانے کے لیے پادریوں کے علاوہ وہاں کوئی دوسری طاقت نہیں تھی، تو پھر طبِ چینی کے پانچ لاکھ عاملین کیوں معطّل کیے گئے تھے؟ ذخائرِ نباتات کے استعمال کو کیوں ممنوع قرار دیا گیا تھا؟ طبِ چینی کے بے مثل خزانوں کو کیوں دفن کیا گیا تھا؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ چین کے مسئلۂ صحت کو الجھانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا، اور ضرور ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ چینی عوام جو صرف طبِ چین سے اپنے امراض کا علاج کر سکتے تھے اس سے محروم کر دیے جائیں اور اس طرح بیماریاں ان کو نزار و نزار بنائے رکھیں اور غیر ملکی تسلّط و اقتدار کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے اور چین کبھی اپنا سر بلند نہ کر سکے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ تاریخِ انسانیت کی یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے اور بڑی المناک حقیقت ہے۔ اگر ماؤزے تنگ اور ان کے ساتھیوں کی کوششیں بارآور نہ ہوتیں اور چین آزاد نہ ہوتا تو چین میں کروڑوں لوگ صرف اس لیے مر جاتے کہ ان پر طبِ چینی حرام کر دی گئی تھی۔

ہر سمجھ دار قوم اپنے عوام کی صحت و تعلیم پر سب سے پہلے توجہ کرتی ہے۔ آزادی کے بعد چیئرمین ماؤزے تنگ نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ طبّ چینی کی بحالی تھا۔ پانچ لاکھ حاملینِ طبِّ چینی کو پریکٹس کرنے کی آزادی دے دی گئی۔ طبّ چینی کے بند ہسپتال کھول دیے گئے۔ اندازہ لگایئے کہ ان پانچ لاکھ اطبا نے کتنے کروڑ آبادی کو علاج کی سہولتیں بہم پہنچائی ہوں گی! میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اگر چیئرمین ماؤزے تنگ یہ فیصلہ نہ کرتے تو چین کے عوام کس طرح صحت مندرہ سکتے تھے؟ ان کے درد کی دوا کیا ہوتی؟

اس بحالی کے بعد چیئرمین ماؤزے تنگ نے ہدایت جاری کی:

"مل جاؤ اے طبّی کارکنان! جوان اور بوڑھے، چینی اسکول کے اور مغربی اسکول کے، اور دونوں مل کر ایک مضبوط محاذ بناؤ جو عوام کی صحت کے کاموں کی ترقی کے لیے کوشاں ہو"

دراصل یہ ہدایت ہی وہ نقطۂ آغاز ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف جدید و قدیم معالجین میں اشتراکِ عمل پیدا ہوا اور اس کے بعد سارے ملک کے ہسپتالوں میں طبّ چینی اور طبّ جدید کے برابر برابر ونگ قائم کر دیے گئے اور قدیم طبّی تعلیم گاہوں میں طبّ جدید کی تعلیم کو اور جدید طبّی درس گاہوں میں طبّ چینی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا۔ اس عمل کا اور اس صحتِ فکر کا اور قدیم و جدید کے اس اشتراک کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو شفائے امراض کم و بیش یقین کی حد تک پہنچ گئی اور دوسری طرف تحقیق و ریسرچ کے دروازے کھل گئے اور پھر سائنس دانوں کے لازمی تعاون سے طبّ چینی نے دنیائے طبّ کو ایسے جواہر عطا کیے کہ باید و شاید۔

صاحبو!

اس وقت چین کی بڑی بڑی لیبورٹریوں میں سائنس دان تحقیق و تجسّس میں مصروف ہیں اور قدیم طبّ چینی کا سلسلہ عطا برابر جاری ہے۔

حکیم مستند، ڈاکٹر اور سائنس دان کا یہی وہ اتحاد ثلاثہ (Trimvirate) ہے اور یہی وہ متوقع تنظیم ہے جس کے لیے میں گزشتہ دس سال سے جدّوجہد کر رہا ہوں۔ میں اس میں یقین کامل رکھتا ہوں اور یقین محکم کہ پاکستان میں اس اتحاد ثلاثہ کی بڑی شدید ضرورت کو پورا کیے بغیر دنیائے طبّ میں ہم کوئی اضافہ (Contribution) نہیں کر سکتے اور نہ ہم اس کے بغیر خود کفالتی کا مقصدِ اہم حاصل کر سکتے ہیں۔

میں معذرت خواہ ہوں کہ میری بات طویل ہو گئی لیکن اتنی بات کہے بغیر میں عوامی جمہوریۂ چین کے اس وفد کا حقیقی تعارف آپ سے نہیں کرا سکتا تھا۔ میں نے ابھی قائدِ وفد ڈاکٹر لُو۔ چی۔ چُن کا تعارف کراتے ہوئے آپ کو بتایا ہے کہ وہ طبّ جدید کے علم بردار ہیں،

مگر انھوں نے اپنی توجہات طبِ چینی پر مرکوز کی ہیں۔ اس میدان میں تنہا وہی نہیں ہیں بلکہ ہزاروں چینی ڈاکٹر ایسے ہیں جو شب و روز طبِ چینی میں ریسرچ اور تحقیق میں مصروف ہیں اور اس طب کو انسانیت کے لیے مفید و موثر بنانے میں منہمک ہیں، اور ہزارہا چینی طبیب ایسے ہیں جو خود کو جدید طب سے بہرہ مند کر رہے ہیں۔ یہ اس امتزاج اور اس اشتراک عمل ہی کا تو نتیجہ ہے کہ چین جیسے عظیم ملک نے اپنے نہایت پیچیدہ مسئلۂ صحت کو حل کر کے رکھ دیا ہے، اور ادویہ کے باب میں وہ اس قدر خود کفیل ہے کہ آج اسے کسی ملک سے ایک پیسے کی دوا منگوانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ صحتِ فکر ہی کا نتیجہ ہے کہ چین کا اکیوپنکچر (Accupuncture) کا طریق علاج، جس کی ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر بنگ سن منگ ہمارے درمیان موجود ہیں، یورپ بھر میں ایک مفید علاج کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے اور جرمنی اور فرانس میں اس چینی طریق علاج کے متعدد اور بڑے بڑے شفا خانے کھل چکے ہیں اور اس کی افادیت پر جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بڑی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جناب والا! یہ وہی طریق علاج ہے جس کو کل ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ یہی وہ طریق علاج ہے کل جس کا یورپ مذاق اڑاتا تھا۔ مگر ان انسانیت دوست چینیوں نے نہ جبر کی پروا کی اور نہ استہزا کی۔ برابر تحقیق میں مصروف رہے اور آج یہ بڑے فخر کے ساتھ اکیوپنکچر کی افادیت کی سائنٹی فک توجیہات کر سکتے ہیں۔ تین ہزار سال پرانا۔ فرسودہ۔ دقیانوسی۔ آؤٹ آف ڈیٹ۔ ان سائنٹی فک طریق علاج آج سائنس کا درجہ رکھتا ہے۔ خواتین و حضرات اور صاحبانِ فن! آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ لگن، انسانی خدمت کی خواہش اور سعی پیہم ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک قومی ورثہ جدت پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے سے بچ گیا۔

الحمدللہ پاکستان بھی اپنی ایک قومی طب رکھتا ہے اور پاکستانی اپنے قدیم طریق علاج کو اپنی شان دار تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہ طریق علاج جس کو ہم طبِ مشرقی کہتے ہیں ہزاروں سال پرانا ہے، لیکن اس قدامت کے باوجود اس میں پوری تازگی ہے اور طبِ مشرقی زندگی و توانائی سے بھرپور ہے۔ ایک طویل مدت تک اس کا زندہ رہنا اور کم و بیش دو سو سال تک غیر ملکی اقتدار کے سوتیلے سلوک کو برداشت کر لینا اس طب کی جان داری پر دال ہے۔ اور یہ بات خود اپنی جگہ اس کی افادیت و شفا بخشی کا ٹھوس ثبوت ہے۔ اگرچہ یہ طب برِ صغیر پاک و ہند کے دورِ غلامی میں بھی خلافِ قانون قرار نہیں دی جا سکی اور آزادی کے بعد اس کو قانونی پابندی کے چنگل سے نجات دلانے کی ضرورت

نہیں پیدا ہوئی لیکن غلامی میں قوموں کا مزاج بدل جاتا ہے اور ہمیں اس مزاج کو ترک کر کے اپنے آپ میں آنے کے لیے قدرتی طور پر وقت درکار تھا۔ یہ وقت ہمیں دینا پڑا۔ ذہنی طور پر بانیٔ تصورِ پاکستان علامہ اقبال اور بانیٔ پاکستان قائدِاعظم کے افکار و نظریات قوم کے سامنے تھے اور یہی نظریات قوم کے لیے رہنما بنے۔ بعض وجوہ سے پچھلے ادوار میں یہاں طبِ مشرقی کو حکومت کی اتنی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی جتنی ہونی چاہیے تھی اور جتنی مسئلہ صحت کو بالکلیہ حل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ تاہم یہ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اب ہماری حکومت نے اس طب کی سرپرستی کی ابتدا کر دی ہے اور تحقیق و ریسرچ کی سہولتوں کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اب بہت جلد ہم اس مفید ترین علم کے سرچشموں سے چشمہ صحت کو رواں دواں کر سکیں گے۔

سنہ ۶۳ش میں انجمن ترقی طب کے وفد نے چین میں بہت کچھ دیکھا اور قدیم طب سے کام لینے اور اس کو جدید طب کے ساتھ ہم آہنگ کر کے مسئلہ صحت کو حل کرنے کے طریقوں کو عملاً دیکھا، سمجھا اور سیکھا۔ یہاں واپس آکر اہلِ وطن کے سامنے بھی پیش کیا۔ اپنی حکومت کے قابلِ احترام ارکان کو بھی اپنے نتائج مطالعہ و مشاہدہ سے آگاہ کیا گیا۔ ہماری حکومت کے تعاون سے اب ہم اس سلسلے میں اپنے عزائم کو پہلے سے بہت بلند پاتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔

مَیں اب آپ کا مزید وقت لینا نہیں چاہتا اور ایک بار پھر اپنے مہمانانِ گرامی، فاضل ارکان وفد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مَیں مہمانانِ خصوصی کے علاوہ اپنے برادرانِ فن، میڈیکل ایسوسی ایشن کے معزز ارکان اور اہلِ علم و سائنس اور جملہ خواتین و حضرات کا بھی دل سے ممنون ہوں جنھوں نے اس شامِ ہمدرد میں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ نیز مَیں اس موقع پر بہ حیثیت سکریٹری جنرل انجمن ترقی طب، ہمدرد وقف کا بھی شکر گزار ہوں کہ منتظمین ہمدرد نے اس شامِ ہمدرد کو انجمن کے مہمان وفد کے لیے مخصوص کیا۔

"شامِ ہمدرد" کی تعمیر ملک و ملت کی کوششوں میں اس سے ضرور مدد مل سکتی ہے کہ ہم یہ بھی سنیں کہ ہمارے دوست ممالک تعمیر ملک و ملت کے لیے کس قسم کی اور کس انداز کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے مسائل سے پوری طرح واقف ہوں اور اس واقفیت کو درجہ یقین حاصل ہو تو ہم دوسروں کے مشاہدات اور تجربات سے اپنے حالات کی روشنی میں اور زیادہ صحت کے ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اس وفد کی میزبان انجمن ترقی طب ہے لیکن درحقیقت ہمدرد ہی میزبان

ہے۔خود انجمن بھی طب کی جو خدمات انجام دے رہی ہے وہ ہمدرد کی سرپرستی اور مالی تعاون کے بغیر ممکن نہ تھیں۔دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہمدرد وقف ہی وہ بنیادی ادارہ ہے جو ترقی طب کے لیے انجمن کے موسس کی حیثیت رکھتا ہے۔ہمدرد نصف صدی سے زیادہ عرصے سے چند متعین اور واضح مقاصد کے لیے سرگرم عمل ہے:

(۱) طب مشرقی کے سلسلے میں اس قیمتی خزانے اور ورثے پر تحقیقات کرنا جو طب کے قدیم فضلا جیسے ابن سینا، رازی، ابن رشد، زہراوی، ابن بیطار، جابر بن حیان، حکیم عبدالمجیدؒ اور حکیم اجمل خانؒ نے چھوڑا ہے۔

(۲) پاکستان کے دونوں بازوؤں کے دور دراز حصوں میں جہاں معمولی طبی سہولتیں بھی دستیاب نہیں ہیں آفت زدہ انسانوں کی خدمت کرنا۔

(۳) پاکستان کی کثیر نباتی دولت سے استفادہ کرنا۔

ان مقاصد کی تکمیل کی جدوجہد ہی انجمن ترقی طب کی وجہ تخلیق ہے۔اب میں فائد وفد جناب ڈاکٹر لو۔چی۔چن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے ارشادات سے ہمیں نوازیں۔

نوٹ:۔اس افتتاحی تقریر کا ترجمہ چینی زبان میں بھی راقم الحروف نے پیش کیا۔ راقم الحروف کی چینی زبان میں یہ پہلی تقریر تھی جو ۴۵ منٹ جاری رہی۔

حکیم محمدؐ سعید

چین اور پاکستان

جناب ڈاکٹر تو۔ چی۔ چن
صدر ادارہ تحقیقات طبیہ پیکنگ۔ چین

پاکستان نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ جارحیت کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں، اور جنگ ہتھیاروں سے نہیں افراد کے بل بوتے پر لڑی جاتی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان حالیہ جنگ نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ پاکستانی عوام قلت میں ہونے کے باوجود خوب جانتے ہیں کہ اپنی آزادی کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے۔

پاکستان اور چین دوستی کے پرانے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان ثقافتی اور اقتصادی تعلقات کی پرانی تاریخ موجود ہے۔ یہ تعلقات عارضی طور پر سامراجیوں کے حملے اور حکومت کی وجہ سے رکے رہے۔ لیکن چین اور پاکستان دونوں نے آزادی حاصل کی اور اب دونوں ملک تعمیر میں مصروف ہیں۔

ہماری دوستی خلوص پر مبنی ہے۔ ہم بھائی بھائی ہیں، اور ہمیں کسی طرح بھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے حالیہ دورۂ پاکستان کے دوران ہمارا وفد جہاں بھی گیا ہم نے یہی دیکھا کہ پاکستانی اپنے وسائل اور کوششوں سے تعمیری کاموں میں مصروف ہیں۔ درۂ خیبر کو دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ پٹھان پرانے ہتھیاروں سے بھی سامراج کے خلاف لڑتے رہے۔

پاکستان اور چین امن پسند ممالک ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ امن دوسروں کا عطیہ نہیں ہے۔ چین کے عوام نے بھی وقت پڑنے پر پاکستان کی مکمل حمایت کی رسم اتحاد کی

اب حمایت کرتے ہیں۔ آئندہ کریں گے اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

پاکستان اور چین کی مضبوط دوستی نے دونوں ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے کا ایسا بھائی بنا دیا ہے۔ جو ایک دوسرے پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ اسی دوستی کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اور اب یہ دوستی کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔ پاکستان کے عوام چین کی دوستی پر اعتماد کر سکتے ہیں، کیوں کہ ہم قول کے پکے اور حق و صداقت کے پرستار ہیں۔

آزادی کی جنگ جیتنے کے بعد پاکستان کو ایک اور جارحیت کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن پاکستانی قوم نے انتہائی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس جارحیت کو پسپا کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں ہتھیار نہیں بلکہ لوگوں کا عزم، مقصد کی سچائی اور انصاف کی فتح ہوتی ہے۔ پاکستانی قوم کی بہادری اور جرأت مندی قابلِ تحسین ہے۔

امن کسی سامراجی قوت کا تحفہ نہیں، بلکہ امن کے حصول کے لیے جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اور چین اس کے لیے جد و جہد کر رہا ہے۔ چین اور پاکستان کے عوام امن پسند ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی انصاف کے اصولوں کے لیے حمایت کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ضرورت کے وقت چین نے پاکستان کی پوری حمایت کی۔ یہ باہمی حمایت جارحیت کو کچلنے کے لیے تھی۔ یہ باہمی حمایت آئندہ بھی انصاف کے حصول کے لیے قایم رہے گی۔ اور آئندہ بھی ہم ہمیشہ انصاف کی حمایت کرتے رہیں گے۔

چین اور پاکستان کی دوستی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اور دونوں ملکوں کے عوام کو اب کوئی بیرونی طاقت ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتی۔ چین کے عوام قابلِ اعتماد اور اپنے قول کے پکے ہیں۔ اور وہ ہر قسم کی جارحیت کے خلاف پاکستان کی امداد و حمایت کرتے رہیں گے۔

طبی میدان میں پاکستان اور چین کے درمیان زیادہ تعاون کی ضرورت ہے۔ عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے علاج کے دونوں طریقے ضروری ہیں۔ اگر پاکستان اور چین کے اطباء اور ڈاکٹر ایک دوسرے کے تجربات کا تبادلہ کریں تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ اور دونوں ملکوں کے تعلقات اور مضبوط ہوں گے۔ مجھے حکیم محمد سعید کے نقطۂ فکر سے اتفاق ہے۔ وہ اور اُن کے ساتھی چین میں خود ایک ماہ رہ کر چین میں طب کے میدان کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اُن کی چینی زبان میں تقریر نے ہم کو نہ صرف آج حیرت زدہ کیا ہے بلکہ اُن کی بات اور اُس کے

مفاہیم کا ہم نے بھرپور ادراک کیا ہے۔ ہم نے طبِّ چینی اور طبِّ مغربی کے درمیان ارتباط کی راہوں کو ہموار کر کے طبِّ چینی کو جدید نظریات سے نہیں بلکہ جدید انکشافات و اکتشافات سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ہمارے چین میں جدید اور قدیم کی کوئی آویزش نہیں ہے ہم دونوں مکتبۂ فکر کے حاملین یکسانیت و یگانگت کے ساتھ نہ صرف ترقی طب میں مصروف ہیں بلکہ اپنے عوام کی خدمت چیئرمین ماؤزے تنگ کی رہ نمائی میں کر رہے ہیں۔ ہم نے دونوں ٹانگوں پر چل کر یہ مقصد حاصل کیا ہے۔

شامِ ہمدرد، لاہور
۳ رمارچ ۱۹۶۶ش

جمعرات ۳ مارچ ۶۶ء کو پارک لگژری ہوٹل میں چین کے طبی وفد کے اعزاز میں "شامِ ہمدرد" منعقد ہوئی۔ اس موقع پر خان محمد علی خان وزیر صحت نے جو تقریر کی اس کا مکمل متن حسبِ ذیل ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ آج شامِ ہمدرد میں ہمارے درمیان ہمارے عظیم ہمسایہ ملک، عوامی جمہوریہ چین، کا ایک طبی وفد بھی موجود ہے۔ اس کی موجودگی ہمارے ثقافتی، تعلیمی، طبی اور دوسرے مخلصانہ رشتوں کی گواہ ہے۔ چین سے ہمارے نہایت گہرے تعلقات ہیں اور نہایت خوش گوار۔ حالیہ جنگ میں چین نے جو ہماری اخلاقی مدد کی ہے وہ تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے طبی وفد اگر ایک دوسرے ملکوں میں آتے جاتے رہیں تو اس سے فکر و عمل پر ایک گہرا اثر پڑے گا۔ اور طب جدید اور طب قدیم کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔

چین اور پاکستان میں ایک اور بھی قدر مشترک ہے کہ دونوں ملکوں کی جغرافیائی ہیئت یعنی زمینوں کی ساخت، پہاڑوں کے سلسلے، دریاؤں کی وسعت اور روانی، زرخیز زمین، اونچے نیچے ٹیلے اور حسین وادیاں ایک ہی جیسی ہیں، اور یہاں ایسے خطے موجود ہیں جن کی آب و ہوا اور موسمی اثرات چین کے بھی خطوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے دونوں ملکوں کی پیداوار میں بھی ایک قسم کی مماثلت سی پائی جاتی ہے۔ بہت سی جڑی بوٹیاں اور بہت سی خودرو جھاڑیاں ایک ہی جیسی دونوں ملکوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان جھاڑیوں کی چھال اور جڑی بوٹیاں ہماری دواؤں کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ طب نے ہر دور میں ان سے بہت زیادہ کام لیا ہے اور بنی نوعِ انسان کی انتہائی خدمت کی ہے۔ ان جڑی بوٹیوں کے علاوہ بہت سی خودرو نباتات ایسی بھی ہیں جو فقط پاکستان میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور چین میں پیدا نہیں ہوتی ہیں بہت سی ہیں جو چین میں پیدا ہوتی ہیں اور پاکستان میں نہیں پائی جاتیں۔ ان سے دونوں ملکوں کو بھرپور فائدہ اٹھانے کا ایک

وسیلہ ہاتھ آتا ہے کہ ہم ان کا آپس میں تبادلہ کریں اور اپنے اپنے ملکوں میں ان کی کاشت کریں تاکہ ان سے دونوں ملکوں کے عوام کو بالخصوص اور حکمت کو بالعموم فائدہ پہنچے۔

عوامی جمہوریہ چین نے طب چینی کو نئے سرے سے منظم کر کے اسے کافی فروغ دیا ہے۔ آج اس ملک میں ہم طب چینی کو طب جدید کے پہلو بہ پہلو عوام کی خدمت میں سرگرم عمل پاتے ہیں۔ چین میں بھی دیسی طب کو کس مپرسی کی حالت سے گزرنا پڑا تھا، لیکن وہاں کی انقلابی حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے طبی نظام میں خوش گوار تبدیلی پیدا کی جس کے سبب وہاں کے اطبا کا وقار بڑھ گیا اور انھیں طب کے میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع میسر آئے۔

پاکستان میں بھی دیسی طب کا مستقبل درخشاں ہے۔ حکومت اس طب کی افادی حیثیت کو تسلیم کر چکی ہے۔ اطبا کی رجسٹریشن کا قانون نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت مستند اطبا رجسٹریشن کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ مستند تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آئے گا اور اتائیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اطبا کو چاہیے کہ وہ اپنے طریق علاج کو عصری سائنسی معیار پر لائیں۔ تحقیق و تجسس کا سلسلہ جاری رکھیں، کیوں کہ ریسرچ کے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ تحقیق ہی کسی فن کی جان ہوتی ہے۔ جب تک ہم کسی فن میں اپنا انہماک نہیں دکھائیں گے فن کوئی ترقی نہیں کر سکے گا اور نہ اس سے عوام کو کوئی خاص فائدہ پہنچ سکے گا۔

عوامی جمہوریہ چین کے طبی وفد نے ہمارے لیے ایک نہایت اعلا موقع اور رابطہ پیدا کر دیا ہے کہ ہم اپنی علمی روایات کا احیا کریں جو چین کی قدیم ثقافت کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کے تجربات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس کے علاوہ اشتراک و تعاون کے ایسے راستے نکالیں جن سے وہ ہمارے طبی تجربات سے فائدہ حاصل کر سکیں، کیوں کہ ہماری طب بھی ایک زمانے میں عظمتوں کو چھو چکی ہے اور عوام کو وسیع پیمانے پر فائدہ پہنچا چکی ہے۔

چین اور پاکستان کو چاہیے کہ طب کے میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور اس تعاون سے ایک ایسے نظامِ طب کو رواج دینے کی کوشش کریں جو اس برعظیم کے غریب ایشیائی عوام کے لیے ارزاں بھی ہو اور ان کے مزاج کے موافق بھی ہو۔ اگر اس جہت میں ہمیں کامیابی ہوئی تو

یہ ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔
آخر میں میں اپنی طرف سے اور آپ حضرات کی طرف سے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ یہاں تشریف لائے۔ اور امید کرتا ہوں کہ ان کے موجودہ دورے سے چین اور پاکستان کے درمیان مشترکہ طبّی تحقیق کی راہیں ہموار ہوں گی۔

میاں افضل حسین

"شامِ ہمدرد" میں فاضل، نامور، اور گراں قدر ہستیاں تشریف لائی ہیں اور اسے وقیع اور وقیع تر بناتی رہی ہیں۔ آج کی "شامِ ہمدرد" کو مُلک کے بزرگ سائنس دان جناب میاں افضل حسین صاحب نے موقّرِ و مُفتخر فرمایا ہے۔ اس عنایت اور توجّہ کے لیے ہم سب ان کے ممنون ہیں اور شکر گزار۔

اَفضلُ الاشغال۔ خِدمتُ النّاس

اگر ہم جناب میاں افضل حسین صاحب کی ۷۷ سالہ زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ بھی ڈالیں تو ہم اِسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ انھوں نے انسان اور علوم کی خدمت کے لیے خود کو وقف رکھا ہے۔ اُن کی پوری زندگی میں ہم علم و ہنر کو کارفرما پائیں گے۔ ان کا پورا اکیڈمک کیریئر شان دار کارناموں سے پُر ہے۔ اور ان کی ذات سے مُلک و مِلّت کو یقیناً بڑا فائدہ پہنچا ہے، اور آج بھی ہم ان کے علم و تجربہ سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

"قرآن اور سائنس" یقیناً بڑا افضل موضوع ہے جسے جناب میاں صاحب نے آج "شامِ ہمدرد" میں تقریر کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ ساتھ ہی یہ موضوع مختلف اعتبارات سے بڑا نازک بھی ہے، لیکن اگر ہم اس میں یقین کامل رکھیں کہ اسلام سائنسی تحقیقات کا مُخالف نہیں ہے بلکہ زبردست حامی ہے اور یہ کہ صرف قرآن ہی ساری مذہبی کتابوں میں وہ منفرد کتاب ہے جو امرِ حق کی دریافت میں مَظاہرِ قدرت کے بے لوث مُطالعہ کی دعوت دیتی ہے تو بات نہایت صاف ہو جاتی ہے، اور اب صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ہم توضیحات اور توجیہات میں غلطیاں نہ کریں۔

پروفیسر میاں افضل حسین سنہ ۱۸۸۹ء میں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جامعۂ پنجاب سے حیوانیات میں بی۔ ایس۔ سی آنرز اور سنہ ۱۹۱۳ء میں اسی مضمون میں

ایم۔ ایس۔ سی کیا۔ بعد میں انھوں نے کرائسٹ کالج کیمبرج میں داخلہ لے لیا جہاں انھوں نے نیچرل سائنس کا بہ غور مطالعہ کیا اور حیوانیات میں فرسٹ کلاس آنرز کیا۔ سنہ ۱۹۱۴ش سے سنہ ۱۹۱۶ش تک وہ کرائسٹ کالج کے فاؤنڈیشن اسکالر اور بیچلر اسکالر رہے۔ سنہ ۱۹۱۶ش میں کیمبرج یونیورسٹی نے حیوانیات کا فرانک اسمارٹ پرائز عطا کیا۔ بعد میں انھوں نے تحقیقی کام کے صلے میں چارلس ڈراوِن انعام بھی حاصل کیا۔

میاں افضل حسین نے تین سال تک کیمبرج یونیورسٹی، نیچرل ہسٹری میوزیم ساؤتھ کنگسٹن لندن، امپریل کالج آف سائنس، لندن اور وکٹوریہ یونیورسٹی، مانچسٹر میں حیوانیات اور حشرات پر تحقیقی کام انجام دیے۔ بعد میں ان کے کالج، رائل سوسائٹی، لندن اور کیمبرج یونیورسٹی کے بالفور ریسرچ فنڈ نے انھیں بہ حیثیت ریسرچ اسکالر شان دار خدمات انجام دینے پر وظائف دیے۔ بعد میں پروفیسر افضل حسین کیمبرج یونیورسٹی کے اسکول آف زولوجی میں ڈیمانس ٹریٹر کے عہدے پر مامور کر دیے گئے۔

جنوری سنہ ۱۹۱۹ش میں وہ امپیریل ایگریکلچرل سروس میں شامل ہو گئے اور امپیریل کالج ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پوسا میں بہ حیثیت ماہر حشرات (اینٹومولوجسٹ) فرائض انجام دینے گئے۔ اسی سال ستمبر میں وہ حکومت پنجاب کے اینٹومولوجسٹ اور پنجاب ایگریکلچرل کالج لائل پور میں حیوانیات و حشریات کے پروفیسر مقرر کر دیے گئے۔ سنہ ۱۹۳۲ش میں وہ اس کالج کے پرنسپل ہو گئے اور سنہ ۱۹۳۸ش تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بنا دیے گئے۔ کئی سال تک شعبہ زراعت کے ڈین اور سنڈیکیٹ کے رکن رہے۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور تین سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ پروفیسر صاحب نے یونیورسٹی میں کئی توسیعی منصوبوں پر کام کیا، متعدد اصلاحات کیں۔ انھوں نے فنونِ لطیفہ و موسیقی، شماریات اور صحافت کے شعبے قائم کیے اور جغرافیہ، فارمیسی اور سماجیات کے شعبے قائم کرنے کے سلسلے میں پہل کی۔

پروفیسر صاحب کا شمار چوٹی کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے زراعت اور اس کی تحقیق کے ہر شعبے میں شان دار خدمات اور کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ وہ واحد شخص ہیں کہ جنھوں نے برِ صغیر میں ٹڈی دلوں پر قابو پانے پر ریسرچ کی۔ یہ ان کی تحقیق کا ثمر ہے کہ برِ صغیر میں ٹڈی دلوں پر قابو پانے اور کپاس اور گنے کی فصلوں کو کیڑا لگنے سے بچانے کے سلسلے میں مفید نتائج برآمد ہوئے۔

غیر منقسم ہندستان میں پروفیسر افضل حسین نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز کے فاؤنڈیشن

فیلو انسٹی ٹیوٹ کی کونسل کے رکن اور نیشنل اکیڈمی آف سائنسز کے فیلو رہے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۲۲ اور ۱۹۳۶ش میں انڈین سائنس کانگریس کے زرعی اور حشراتی شعبوں کے اجلاس کی صدارت کی اور بورڈ آف ایجوکیشن کی مرکزی مجلسِ مشاورت اور امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے مشاورتی بورڈوں میں مختلف یونیورسٹیوں کی نمائندگی بھی کی۔

پروفیسر افضل حسین نے سنہ ۱۹۳۵ش میں مصر میں ٹڈی دلوں کے خاتمے کی بین الاقوامی کانفرنس، سنہ ۱۹۳۸ش میں جینوا میں بین الاقوامی ادارۂ محنت کی مستقل زرعی کمیٹی اور سنہ ۱۹۴۴ش میں مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کی زرعی کانفرنس میں ہندستان کی نمائندگی کی۔

سنہ ۱۹۴۴ش میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد اُس وقت کی حکومت بنگال نے ان کی خدمات مستعار لے لیں اور زراعت کے محکموں کی تنظیمِ نو کا کام انھیں سونپ دیا۔

جولائی سنہ ۱۹۴۴ش سے اگست سنہ ۱۹۴۵ش تک وہ قحط سے متعلق تحقیقاتی کمیشن کے لیے رکن بھی رہے۔

حکیم محمد سعید

قرآن حکیم اور سائنس

پروفیسر میاں افضل حسین

قرآن حکیم اگرچہ سائنس کی کتاب نہیں ہے تاہم قرآن انسان کو کائنات کے سربستہ رازوں، اس کی ابتداء، اور وقت اور فضا کے ربط وضبط کا مشاہدہ اور اس میں غور و خوض کرنے کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ اس میں بے شمار قدرتی مناظر کے بارے میں متعدد حوالہ جات موجود ہیں بہ مطابق آیۂ شریفہ

"کیا ان لوگوں نے جو کافر ہیں نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین شروع میں اجتماعی صورت میں تھے، پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا۔" (انبیا ۲۱/۳۰)

کلامِ پاک میں سورج، چاند اور ستاروں کا بھی ذکر ہے جو اپنے اپنے مداروں میں معینّہ قوانین کے مطابق، مخصوص اوقات میں گردش کرتے ہیں۔ آیۂ:

الشمس والقمر بحسبان ۝ سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں (الرحمٰن ۵)
نیز فرمایا۔ "بس میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے محلِ وقوع کی اور بلاشبہ وہ ایک زبردست قسم ہے اگر تم سمجھو" (واقعہ ۷۵، ۷۶)

شہابِ ثاقب فضا میں متواتر تیرتے رہتے ہیں۔ زمین جب ٹھنڈی ہو گئی تو اللہ تعالٰے نے اُس پر پہاڑ بنائے۔ زمین کی تہیں مختلف رنگوں کی ہیں جو ان کی کیمیائی حالت ظاہر کرتی ہیں۔ پانی جب منجمد ہُوا تو بارش برسنے لگی۔ ندّی نالے بارش کا پانی بہا کر گہری کھائیوں میں لے گئے۔ اور اس طرح سمندر معرضِ وجود میں آئے۔ پانی کہیں میٹھا ہے کہیں کھاری، ہوائیں

بادلوں کو اُڑا کر دُور دُور لے جاتی ہیں اور اِس طرح سبزہ زار اور مختلف اقسام کے پھلوں کے لیے پانی مہیا کرتی ہیں۔ مادہ حیات پانی اور مٹی سے بنایا گیا ہے۔ مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ پیدا کرنے کا عمل کارفرما ہے۔ تمام زندہ اقسام کے نزد مادہ (آیۂ) "وہ بھی جس کا آپ کو علم نہیں" عدم سے وجود میں آئے۔ صورت شکل میں ایک جیسے اور مختلف نباتات اور حیوانات پیدا ہوئے۔ نباتات اور حیوانات کے جملہ اقسام کی تعداد اربوں تک پہنچ جاتی ہے۔ بیجوں میں مادہ حیات کے ننھے ذرات نشوونما پاکر بڑے بڑے تن آور درخت بن جاتے ہیں۔ ماں کے پیٹ میں ایک ناچیز جرثومہ انسانی شکل وصورت اختیار کر لیتا ہے فرمایا ہے (آیۂ) "بلاشبہ چوپایوں میں تمھارے لیے غور و فکر کا مقام ہے کہ جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہے گوبر اور خون کے درمیان میں سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوش گوار ہے" (النحل ۶۶)۔

یہاں ایک حیرت انگیز بائیو کیمیائی عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے چوپائے جو چارہ کھاتے ہیں دُودھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں تین سو کے قریب ایسی آیات ہیں جن میں مختلف النوع مناظر قدرت کا بیان ہے جو کل کائنات سائنس پر محیط ہیں۔ اکثر تاکید کے طور پر ان آیات کا بار بار ذکر کیا گیا ہے آیۂ:

"اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن کے پاس سے وہ اپنا منہ پھیر کر گزرتے رہتے ہیں" (یوسف ۱۰۵)

ایسے کون سے شخص ہوں گے جو آیات خداوندی سے منھ پھیر کر گزر جاتے ہیں یقیناً سائنس داں تو اس زمرہ سے تعلق نہیں رکھتے۔

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا اس نے قدرت کے سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ آج بھی دنیا کے ہر حصے میں سائنس کے لاکھوں طلبہ قدرت کے سربستہ رازوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے میں منہمک ہیں۔ اُن کا یہ فعل اعلا درجے کی نیکی ہے کیوں کہ حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ "آفریدگار کی صنعت کاری پر ایک گھنٹے کا غور و فکر ستّر سال کی عبادت سے بہتر ہے" (حدیث) حافظ شیرازی نے کہا ہے ؎

برگ درختان سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

آیئے ہم بھی تھوڑی دیر کے لیے کائنات خداوندی میں غور و فکر کر کے ان پاک

لوگوں کی ہم نشینی کا شرف حاصل کریں :۔

ترجمہ آیاتِ شریفہ

ان آیات میں قدرت کے اہم ترین قانون کا ذکر ہے :۔

(۱) اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اور جس وقت (جس دن جس آن) وہ کہتا ہے کہ ہو جا۔ وہ ہو جاتا ہے۔ (۶/۷۳، الانعام)

(۲) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے ارض و سمٰوات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں معدوم کر دے اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق پیدا کر دے۔ (۱۴/۱۹، ابراہیم)

(۳) اور ہم نے ارض و سمٰوات کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کو پیدا ہی حق کے ساتھ یعنی درستی کے ساتھ کیا ہے۔ (۱۵/۸۵، الحجر)

(۴) اس نے ارض و سمٰوات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ (۱۶/۳، النحل)

(۵) اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے یوں ہی کھیل پیدا نہیں کیا۔ (۲۱/۱۶، الانبیاء)

(۶) اللہ نے زمین و آسمان کو بالحق پیدا کیا ہے۔ یقیناً اسی میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (۲۹/۴۴، العنکبوت)

(۷) کیا یہ لوگ خود اپنے اندر (نفوس میں) غور نہیں کرتے! اللہ نے ارض و سمٰوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بالحق پیدا کیا ہے۔ اور ایک وقت معیّن تک کے لیے (۳۰/۸، الروم)

(۸) اور ہم نے ارض و سمٰوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اسے یوں ہی باطل نہیں پیدا کیا۔ ایسا تو ان لوگوں کا ظن ہے جو کفر کرتے ہیں۔ (۳۸/۲۸، ص)

(۹) اس نے ارض و سمٰوات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ وہ رات کو دن (کی چادر میں) اور دن کو (رات کے تعاقب میں) ڈھانپ دیتا ہے۔ اور چاند اور سورج کو اپنے تابع فرمان رکھے ہوئے ہے۔ ہر شے ایک وقت معیّن تک چلتی رہے گی۔ (۳۹/۵، الزمر)

(۱۰) اور ہم نے ارض و سمٰوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اسے یوں ہی کھیل تماشا پیدا نہیں کیا۔ یہ تو بالکل با مقصد پیدا کیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے (۴۴/۳۸، الدخان)

(۱۱) اللہ نے ارض و سمٰوات کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ تمام نفوس کو ان کے اعمال کا بدلہ

دیا جا سکے۔ ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ (۴۵/۲۲، الجاثیہ)

(۱۲) ہم نے ارض و سموات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے صرف حق کے ساتھ پیدا کیا، اور ایک وقت معین کے لیے۔ (۴۶/۳، الاحقاف)

(۱۳) اللہ نے ارض و سموات کو بالحق پیدا کیا۔ (۴۴/۳۹، الدخان)

(۱۴) کیا نگاہ نہیں کی آسمان پر جو اُن کے اُوپر ہے؟ کیسا ہم نے اس کو بنایا؟ اور رونق دی۔ اور اس میں کوئی سقم نہیں۔ (۵۰/۶، ق)

(۱۵) وہ ذات جس نے سات (یا متعدد) آسمان درجہ بہ درجہ پیدا کیے۔ تم خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی چوک یا خلل نہیں پاؤ گے۔ ذرا (بہ نگاہ تعمق غور سے دیکھو کیا کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ ہاں دوبارہ نگاہ دوڑاؤ (اور تلاش کرو کہ کوئی سقم نظر آتا ہے) تمھاری کوششوں کے باوجود نگاہ ناکام و نامراد کھسیانی ہو کر (فاتحانہ چشم کی طرف) لوٹ آئے گی (اور کہیں کوئی سقم نہ پا سکے گی (۶۷/۳، الملک)

ایک سائنس دان سے بہتر کون اس حق کو سمجھ سکتا ہے۔

حاصل کلام آسمانوں اور زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے حقیقتِ قطعی پر مبنی ہے اور ان میں کوئی سقم یا انحراف نہیں ہے۔ سب سخت قانون کے تحت ہیں۔ سائنس کا واحد مقصد یہ ہے کہ قوانین قدرت کو آشکارا کر کے اس حقیقت کو واشگاف کیا جائے۔ اس قسم کی تحقیق کے لیے کوئی بھی موضوع چھوٹا یا بڑا ایسا نہیں ہے جس کو بھول جائیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک طرف تو چھوٹے ذرّے کا تجزیہ کر کے اور یہ معلوم کر کے کہ مادہ کا ایک چھوٹا ذرہ ایٹم کے دو چھوٹے ذرّے ہیں اور ایٹم اپنے اندر کتنی عظیم توانائی رکھتا ہے اس کی ساخت کا مشاہدہ کیا گیا ہے، اور دوسری طرف انسان نے اپنی خود ساختہ نہایت پیچیدہ مشینوں کو آسمان پر ہزاروں اور لاکھوں میل دُور بھیج کر فضا کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ اور وہ بذات خود فضا میں داخل ہو گیا ہے۔ چاند پر اس کی مشین جا پہنچی ہے اور زہرہ کے پاس سے گزر چکی ہے۔ اب چاند اور شاید دوسرے سیاروں پر اترنے کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ وہ وقت دُور نہیں کہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

ایسی دوربینیں ایجاد کی گئی ہیں جو اجسام فلکی کو اربوں اور کھربوں میل دُور سے دیکھ سکتی ہیں۔ عنقریب مسلسل مشاہدات کے لیے فضا میں اسٹیشن قائم کیے جائیں گے۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا ہے اور اس سے بھی زیادہ اس لیے ممکن ہو سکے گا کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان ہے حقیقت پر مبنی ہے"، "قانون کے تابع ہے" قوانین اسی صورت میں

اختراع کیے جا سکتے ہیں جب نظم و ضبط محکم ہو۔

گیلیلیو نے اپنی بھدّی سی دُوربین میں جو کچھ دیکھا اس سے وہ متاثر ہو کر چلّا اٹھا "کہ قدرت کی عظیم کتاب ریاضی کی زبان میں لکھی گئی ہے۔" مزید انکشافات سے اُس کے قول کی تصدیق ہو گئی ہے اور حیرت انگیز ترقی ہوئی اور ہو رہی ہے۔ سر جیمز کہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"۔ ۔ ۔ کائنات کا (عظیم معمار) احسن الخالقین، اپنی تخلیق کی باطنی شہادت سے خالصتاً ایک ریاضی دان معلوم ہونے لگا ہے۔"

اتنی محیّر العقول ترقیوں کے باوجود سائنس دان اپنا سرِ نیاز اُسی کے حکم کے آگے خم کرتے ہیں۔ آیۃ: "اور نہیں دیا گیا تم کو علم مگر تھوڑا (بنی اسرائیل ۸۵)

پیٹرک مُور اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے:

"فضائے آسمانی میں کتاب العلم ہمارے سامنے کھلی رکھی ہے، لیکن ہم اس کی ورق گردانی نہیں کر سکتے۔ ابھی تک ہم پہلے باب کا پہلا فقرہ ہی پڑھ سکے ہیں اور اُس کا بھی مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچانے اور اللہ عزّ و جل کا نام سر بلند کرنے کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسری طرف سائنس داں کی ہمت اور حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے جب وہ کہہ دیتا ہے کہ سائنس کی لغت میں ناممکن لفظ نہیں ہے۔

انسانی معاشرتی نظام کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا کیسی ہی صورت میں ہوئی ہو، اس سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ انسان نے اپنے آپ کو اس طرح ڈھال لیا ہے کہ وہ ہر اس چیز سے جو اس کے فہم سے بالا ہو غیب سے اطمینان قلب حاصل کرتا ہے۔ کسی نظریۂ حیات (آئڈیالوجی) کے بغیر کوئی سوسائٹی تادیر قائم نہیں رہ سکتی نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

آج انسانی زندگی پر سائنس کا اثر اتنا سریع ہو جانے کی وجہ سے سائنس نے نہایت بلند اور باوقار مقام حاصل کر لیا ہے۔ سائنس کے نتائج کے بڑھتے ہوئے استعمال نے انسانی ماحول کو یکسر تبدیل کر دیا ہے اور اس کے تصورات کو متاثر کر دیا ہے۔ گویا سائنس انسانی تخیل پر حاوی ہو رہی ہے۔

اس وقت ایسا موقع درپیش ہے کہ دو عناصر، مذہب اور سائنس، انسان کی قسمت کے مستقبل سے گہرے طور پر وابستہ ہو گئے۔ دونوں کی متحدہ مساعی انسانی بہبودی کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ دونوں میں سے صرف ایک ناکافی ہے۔ اس وقت دینی تحمل اور بردباری کی ضرورت ہے۔ مذہب اور سائنس کی تنگ نظری بالآخر عدم موافقت اور تخریب پیدا

کرتی ہے۔

صدرِ مملکت محمد ایوب خان نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے: انھوں نے فرمایا ہے۔

"اگر ہم تنگ نظری سے کام لیں اور فرسودہ راہوں پر گامزن رہیں تو آنے والی نسلیں اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گی، ٹھیک اسی طرح جس طرح اقوامِ مغرب اپنے مذاہب سے دُور ہو گئی ہیں۔" انھوں نے انتباہ کیا: "میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ عمل شروع بھی ہو چکا ہے۔"

حال ہی میں سرسینہ میں عُرس کے موقع پر انھوں نے خطاب کرتے ہوئے ایک بار پھر اس بات پر زور دیا کہ علومِ مذہبی کا علومِ سائنس سے امتزاج قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن ہونے اور نیز دنیائے جدید کا ہم پلّہ بننے میں مددگار ثابت ہوگا۔

اس بات کی اشد اور فوری ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کا جدید سائنس کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے اور اس کے محاسن کو سراہا جائے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ جب قدرت کے مظاہر کو جن کا قرآن شریف میں ذکر ہے سائنس کی زبان میں منتقل کر لیا جائے۔

صرف یہی صورت ہے جس سے اسلام اور سائنس میں باہمی مفاد کے لیے ربط پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح بنی نوعِ انسان کو مناسب راہ ہدایت حاصل ہو سکتی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو حضرات مذہبی علوم پر عبور رکھتے ہیں۔ سائنس سے نفرت کرتے ہیں اور بہت سے اِسے خلافِ مذہب تصور کرتے ہیں۔

مدارس میں پڑھائی جانے والی اسلامی دینیات کی کتابوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس کا اُن میں کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات ایسی باتیں لکھی جاتی ہیں جو سائنس کی معلومات کے برعکس ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حضرات بھی جو ہماری یونیورسٹیوں سے اسلامیات کی ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرتے ہیں سائنس کے بنیادی اصولوں سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔

ہمارے اسلامی تحقیقاتی اداروں نے بھی ابھی تک قرآن حکیم کا جدید سائنس کی روشنی میں مطالعہ کرنے کے لیے کوئی حوصلہ افزا اقدام نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مساجد کے منبروں سے اکثر حیران کن معجزات کی تفاصیل سُن کر دُکھ محسوس ہوتا ہے۔ اس سے تعلیم یافتہ نوجوان لازمًا مذہب سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ اس ماحول میں جب اسلام اور سائنس اس قدر دُور ہیں مطالبہ بار بار کیا جا رہا ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام کو مذہبی رنگ دیا جائے، اور یہ کہ اسلامی تعلیم پرائمری جماعت سے لے کر اعلیٰ مدارج تک ہر مرحلے پر لازمی کر دی جائے۔ اوّلًا

اس مطالبے میں کوئی جدت نہیں ہے۔ برِ صغیر میں تعلیم کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک مستقل رجحان ہے۔ انگریزوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں تمام سرکاری مدارس اور کالجوں میں تعلیم لادینی اصولوں پر رائج کی تھی۔ پھر بھی تمام عیسائی مشنری مدارس اور کالجوں میں انجیل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فرقہ وارانہ اداروں میں، جنہیں ہندو، سکھ اور مسلمان چلاتے تھے، ہر جماعت میں مذہبی تعلیم لازمی تھی۔ ان اداروں میں مذہبی تعلیم کا مضمون مروجہ نصاب پر مستزاد تھا۔ انگریزوں کی آمد سے پیشتر بھی مدرسے اور پاٹھ شالے جاری تھے جو خالصتاً مذہبی ادارے تھے۔ اسلامی اداروں میں دینیات اور عربی اور فارسی اور اُردو کے علاوہ کوئی اور مضمون نہیں پڑھائے جاتے تھے۔ ایسی درس گاہوں میں سائنس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چناں چہ ایسے اداروں کے فارغ التحصیل مسلمان امام اور علما سائنس کی تعلیم سے محض بے بہرہ رہے اور مسلمانوں کو پیچھے رکھا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ طریقہ ابھی تک رائج ہے۔

ہمارے حصولِ آزادی کے بارہ ہفتے کے اندر آخر نومبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی پہلی ایجوکیشنل کانفرنس بمقام کراچی منعقد ہوئی جس میں اسلامیات کی تعلیم کا سوال سامنے لایا گیا۔ اور قرار پایا کہ "مدارس میں اسلامیات کی تعلیم مسلمان طلبہ کے لیے لازمی قرار دی جائے۔ اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کے لیے اسلامیات کی جماعتوں میں حاضری لازمی قرار دی جائے۔ دوسری اقوام کے لیے اگر وہ چاہیں تو اپنے اپنے مذاہب کے بارے میں بھی یہی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔"

کراچی یونیورسٹی میں آرٹس یعنی فنونِ لطیفہ اور کامرس یعنی تجارت وغیرہ کی فیکلٹی کے انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کے امتحانات کے لیے اسلامیات کی تعلیم کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے، لیکن سائنس کے طلبہ کے لیے صرف انٹرمیڈیٹ تک لازمی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں میں یہ لازمی نہیں بلکہ اختیاری مضمون ہے۔ اور بعض یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی علاحدہ فیکلٹی ہے۔ تمام یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا مضمون ایم۔ اے تک پڑھانے کے لیے انتظامات موجود ہیں۔ اس مضمون کے معلّم عام طور پر وہی ہوتے ہیں جنھوں نے سائنس باقاعدہ طور پر نہیں پڑھی ہوتی۔ لہٰذا دورانِ تدریس علمِ سائنس اسلامیات کی تعلیم پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

پہلی جماعت سے لے کر ڈگری کے امتحان تک اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دینے کے متعلق اسلامی نظریاتی کمیٹی (اسلامک آئیڈیالوجی کمیٹی) کی سفارشات جن کا ذکر اخبارات میں تھا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اس بات کا جائزہ

لیں کہ ان مختلف طریقہ ہائے تعلیم کا ماحصل کیا ہے۔ اس وقت مکمل تحقیقات کی ضرورت ہے۔ دوسرے ملکوں میں مذہب اور تعلیم حاضرہ کے اثرات پر غور وخوض کیا گیا ہے اور تحقیقات کی گئی ہیں۔ کیا اقبالؔ نے ٹھیک نہیں کہا تھا:

نہ کتابوں سے نہ کالج کے اثر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کیا ہمارے اسلامیات کے مروجہ طریقۂ تعلیم سے ہمارے نوجوان مرد اور عورتیں بہتر مسلمان ثابت ہو رہے ہیں یا وہ اسلام سے دُور ہٹ رہے ہیں؟ ہمارا اسلامیات کا مروجہ طریقۂ تعلیم کس حد تک اس رجحان کی پیداوار کا ذمے دار ہے جس کی طرف ہمارے صدر نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا ہے۔

ایک شدید خطرہ لاحق ہونے کا ڈر ہے۔ جس سے سائنس اور مذہب کے لیے خطرناک نتائج رونما ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات سائنس کا اشتراکی فلسفہ (Communist Philosophy of Science) اور بعض سائنس کا عیسائی فلسفہ اور بعض دیگر حضرات اس کے مقابلے میں سائنس کے اسلامی فلسفہ Islamic Philosophy of Science) کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن کا دعوا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات پر سائنس کو چلانا چاہیے۔ نعرہ بازی سے عقلی انداز فکر ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس معاملے پر انتہائی توجہ سے غور وخوض کی از حد ضرورت ہے۔

بعض حد سے زیادہ جوشیلے حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں سائنس کے مضامین کے لیے تمام جماعتوں کی درسی کتابیں سائنس کے اسلامی فلسفہ کو پیش نظر رکھ کر ازسر نو تصنیف کی جائیں، اور پاکستان کی تمام یونیورسٹیاں "جہاں تک سائنس کی تدریس کا تعلق ہے" اسی کی تقلید کریں۔ سائنس بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا اپنا فلسفہ ہے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کس نوع کے علوم ریاضی، طبیعات، کیمیا، نباتات، جمادیات، طبقات الارض اور علوم ہیئت ہوں گے جن کی بنیاد اسلامی فلسفے پر رکھی جائے گی۔ سائنس کا صرف ایک ہی نظریہ ہے اور وہ ہے سچائی اور صرف سچائی کی تحقیق وجستجو۔ لہٰذا سائنس کسی نظریۂ حیات کے تابع نہیں ہو سکتی۔

کئی مقامات پر سائنس ایسے ایسے کئی حادثات سے دوچار ہو کر جاں بر ہو چکی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ڈاروِن کا نظریۂ ارتقا پڑھانا

ممنوع تھا۔ گزشتہ دنوں سوویٹ بائیلوجی سینکو کے ماتحت (MICHURIN) میچورین کے نظریۂ وراثت کی وجہ سے نامزد ہوئی۔ لیکن تھوڑی مدت کے بعد کم ہو گئی۔ آزادیٔ خیال ہی صرف ایسا فلسفہ سائنس ہے جسے دوام حاصل رہے گا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ جوں جوں انسانی علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اُس کے حدود میں توسیع ہوتی جاتی ہے مسلمہ خیالات اور تصورات کا قلعہ مسمار ہوتا جارہا ہے۔ سائنس کی کامیابی یقینی بات ہے۔ یہ بڑھتی جائے گی۔

آخر میں میں ہمدرد کے منتظمین کو مخلصانہ مشورہ پیش کرتا ہوں کہ وہ ایسے منفرد مفکرین کو ایک جگہ اکٹھا کریں جن کے خیالات میں اُپج ہو اور جو موجودہ رجحانات کا جائزہ لے کر مرض کی تشخیص کریں اور مناسب علاج تجویز فرمائیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

شامِ ہمدرد

۷راپریل ۱۹۶۶ء ش

جناب لفٹیننٹ جنرل شیخ محمد افضل فاروقی

مَیں "شامِ ہمدرد" کے مہمان مقرر جناب لیفٹیننٹ جنرل شیخ محمد افضل فاروقی کو بصمیمِ قلب خوش آمدید کہتا ہوں، اور اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے ازراہِ کرم ہماری دعوت کو قبول فرمایا، اور "شامِ ہمدرد" کو خطاب فرمانا منظور فرمایا۔

جناب محترم فاروقی صاحب دُنیائے طبّ کی ایک نہایت اہم شخصیت ہیں، اور مبلغینِ علم و حکمت میں اُن کا ایک خاص مقام ہے۔ یہ ایک ماہرِ فنِ طبّ ہیں اور امراضِ چشم میں اُن کو تخصّص حاصل ہے۔ ایک بہادر فوجی کے عظیم کردار کے ساتھ اِن کو علم و ادب سے بڑا لگاؤ ہے۔ ادیب بھی ہیں اور انشا پرداز بھی۔ اُردو، انگریزی، عربی، فارسی، پشتو، گجراتی سب زبانیں خوب جانتے ہیں، خوب بولتے ہیں۔ مگر اُردو سے ان کو شغف ہے، دلی محبّت ہے، لگاؤ ہے۔ اس لیے آج وہ اُردو ہی میں خطاب فرمائیں گے۔

جناب شیخ فاروقی صاحب سابق پنجاب کے ایک حسین شہر گجرات کے رہنے والے ہیں جہلم کے ہائی سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد اعلا تعلیم کے لیے لیورپول (برطانیہ) چلے گئے جہاں سے ۱۹۱۷ء میں آپ نے ڈاکٹری اور امراضِ چشم کے معالج کی حیثیت سے خاص سند حاصل کی لیورپول میں اپنی تعلیم کے دوران آپ نے جنگِ عظیم اوّل کے دوران مہاتما گاندھی کی معیت میں تین ماہ تک رضاکارانہ خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۱۷ء میں ہی آپ انڈین میڈیکل سروس میں شامل ہو گئے اور آپ کی پہلی تقرری پونا میں ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں آپ نے ایم۔ ڈی اور ۱۹۲۴ء میں ایف۔ آر۔ سی۔ ایس۔ کے امتحانات پاس کیے۔ آپ کی اعلا قابلیت کے اعتراف کے طور پر آپ کو سول اور فوجی امتحانات کی اعلا کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران آپ نے اندرونِ ملک اور مشرقِ وسطیٰ اور ایران وغیرہ میں اعلیٰ فوجی عہدوں پر کام کیا اور بتدریج ترقی کرتے رہے۔ تہران میں اپنے قیام کے دوران

جناب فاروقی صاحب نے اقبال سوسائٹی قائم کی جس کے ایک رکن ایران کے ملک الشعرا بہار بھی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پہلے کچھ عرصہ ڈپٹی ڈائرکٹر میڈیکل سروسز رہے۔ اس کے بعد آپ کو میڈیکل سروسز پاکستان کا پہلا ڈائرکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں آپ ساڑھے سینتیس۳ سال کی شان دار سروس کے بعد لیفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جناب فاروقی صاحب کا جذبۂ خدمتِ خلق زیادہ زور پکڑ گیا۔ اور آپ نے نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۱ء میں اپنے پونا کے قیام کے دوران آپ نے ہندستان میں نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے لیے پہلی انجمن قائم کی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں مغربی پاکستان میں آپ نے ایک ایسی ہی جماعت ویسٹ پاکستان سوسائٹی فار دی بلائنڈ کے نام سے قائم کی۔ اس جماعت کا مقصد نہ صرف اندھوں کے لیے علاج و معالجے کی سہولتیں فراہم کرنا ہے بلکہ اندھوں کی بحالی اور فلاح و بہبود کے لیے بھی کام کرنا ہے جنرل فاروقی اس نیک نام سوسائٹی کے پہلے چیئرمین تھے۔ آج کل گورنر مغربی پاکستان جناب ملک امیر محمد خاں اس سوسائٹی کے صدر ہیں۔

ریٹائرمنٹ درحقیقت کوئی ایسی سزا نہیں ہے کہ انسان خود کو بے کار سمجھ بیٹھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حقائق سے آگاہ ہیں، اور زندگی کی قدر و قیمت سے واقف، وہ اپنے لیے بہترین مصروفیتیں پیدا کر سکتے ہیں، ایک نیا ماحول پیدا کر سکتے ہیں، ایک نئی دنیا آباد کر سکتے ہیں، اور ملک و ملت کے لیے خود کو بے حد مفید بنا سکتے ہیں۔ لوگوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے علم و عمل کی قوتوں سے بڑے کام انجام دیے ہیں۔ چناں چہ ہمارے مہمان مقرر نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے لیے ایک نہایت اہم میدان کو چُنا، اور وہ ہے نابیناؤں کی فلاح و بہبود۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے بے اندازہ مسائل ہیں سے "نابینائی" ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے مگر حق یہ ہے کہ نابینائی کے انسداد اور نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے اہم مسائل کے حل پر ہم نے بس برائے نام توجہ کی ہے۔ حد یہ ہے کہ ہم نے اس مسئلے کا ہنوز جائزہ تک نہیں لیا ہے۔

جناب جنرل فاروقی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ محترمہ اس میدان میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نوع کے کام اشتراکِ عمل اور شدتِ عمل سے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے جا سکیں گے۔

حکیم محمد سعید
۱۲ مئی ۱۹۶۶ء

جسم و جان

جناب لیفٹیننٹ جنرل شیخ محمد افضل فاروقی

گزشتہ اپریل کی شامِ ہمدرد میں مجھے شمولیت کا فخر حاصل ہوا۔ اس شام مقررِ مولانا کوثر نیازی صاحب تھے اور موضوعِ گفتگو تھا حج بیت اللہ اور اس کے تاثرات۔ مولانا کے طرزِ بیان نے سونے پر سہاگے کا کام کیا چوں کہ دو سال قبل مجھے بھی یہ سعادت نصیب ہو چکی تھی اور حج کے جملہ مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے اور ان کے تاثرات میرے دِل میں محفوظ تھے، مولانا صاحب کی سحر بیانی نے ان کو ایسا اُجاگر کیا کہ سبحان اللہ۔ تین روز تک اس کیف کی جگالی کرتا رہا اور ممکن تھا کہ یہ کیفیت عرصے تک جاری رہتی کہ چوتھے دن حکیم صاحب کی طرف سے دو صاحبان تشریف لائے اور آج کی شامِ ہمدرد میں کسی بھی مناسب موضوع پر بولنے کی دعوت دی اس دعوت نے مجھے عجیب کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔ اِدھر اپنی بے مائیگی کا خیال اُدھر اُس طِلسم کے ٹوٹ جانے کا ڈر جس سے میں اپریل کی شامِ ہمدرد کے وقت لطف اندوز ہوا تھا کئی ایک مجبوریوں کی بنا پر میں نے اس بوجھ کے اُٹھانے کی معذرت چاہی لیکن معزز نمائندگان کے اصرار نے بالآخر مجھے اقرار پر مجبور کر ہی دیا حکم حاکم اور مرگِ مفاجات سے تو میں بخوبی واقف تھا اب پتا چلا کہ حکم حکیم کی گرفت ان سے بھی سخت تر ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ مضمون کیا ہو؟ میری رائے ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ حکیم صاحب کا عندیہ بھی یہی ہے، کہ ان شام ہائے ہمدرد کی علتِ غائی محض نشستن و خوردن و برخاستن ہی نہیں بلکہ ان سے ایک مرتب اسکیم کے تحت دِل و دماغ کی تفریح، علم میں اضافہ اور خیالات

کو بلند کرنا مقصود ہے اس خیال سے میں نے مناسب مضمون چننے کے لیے دو تین روز کی مہلت چاہی۔

بہت سوچ بچار کے بعد ذرا میری جسارت بھی ملاحظہ ہو کہ مضمون چنا بھی تو کیا۔ "جسم و جان"۔ جس کی اطلاع حکیم صاحب کو پہنچا دی گئی بعد میں خیال آیا کہ جو عنوان میں نے مضمون کو دیا ہے بڑی حد تک مبہم ہے اور سامعین کے سامنے اُس تصویر کا ڈھانچہ پیش نہیں کرتا جو میں لفظوں میں ڈھالنے کا ارادہ رکھتا ہوں یا اس کی کوشش کروں گا سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی خبر نہیں کہ میری گفتگو کا موضوع کیا ہے اور کس طرح اس منزل کو طے کروں گا جس پر میں گام زن ہو رہا ہوں ؎

خبرم نیست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید (حافظ شیرازی)

خیال تھا کہ پچاس سال سے اس بحیطِ بے کراں میں غوطے لگاتا رہا ہوں شاید اتنی شناوری آگہی ہو کہ جس سے کسی غریق کو سہارا دینے کے قابل بن گیا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ کھُلی کہ پچاس غوطے لگاتا نہیں بلکہ غوطے کھاتا رہا ہوں اور جو علم حاصل کیا اس سے فقط یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی۔

فقط اس جسم خاکی ہی کے علم کے حصول کے تجسس میں بڑے بڑے جید متجسسین نے عمریں گزار دیں۔ اُن کی کوششوں کی بدولت اِس کے کل پرزوں کی ساخت و عمل کا علم تو کچھ حد تک مرتب ہو چکا ہے لیکن اس کی تکمیل تا حال باقی ہے۔ کوشش جاری ہے اور اس میدان کو آخر کار سر کر لینے کے امکانات کافی روشن ہیں لیکن جب ہم اس منزل سے گزر کر جان، انسانی دماغ، عقل و شعور اور اختیار اور ارادہ کی وادی میں قدم دھرتے ہیں تو ہمارا علم تصور اور خیال کی دلدل میں دھنس کر رہ جاتا ہے۔ سقراط اور افلاطون جیسے فلاسفروں نے بہت زور مارا ان کے بعد آج تک بڑے بڑے پنڈت اور سیانے اس بحر میں غواصی کرتے رہے لیکن دُرِ مراد حاصل نہ ہوا پر نہ ہوا۔

اب ذرا میری حماقت ملاحظہ ہو کہ یہ ہے مضمون، جس پر بولنے کے لیے آپ کے سامنے کھڑا ہوں، فی الواقع وحملها الانسان انه کان ظلوما جهولا۔ جس کی آوازِ بازگشت ہر ملک اور ہر زبان میں سنائی دیتی ہے۔

فارسی میں حافظ شیرازی کیا خوب صورت الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اُردو میں تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔

جو بارِ آسمان و زمین سے نہ اُٹھ سکا
تو نے غضب کیا دِلِ ناداں اُٹھا لیا

انگریزی میں اتنے ہی زوردار الفاظ میں کہا گیا ہے۔

The mountains shook, the sea rebelled, the earth and sky refused; But I, the maddest of them all rushed forth and bore the load.

خیر یہ تو ضروری گزارشِ احوالِ واقعی تھی۔ جس کو میں نے تمہیداً عرض کر دینا ضروری سمجھا تاکہ آپ کو بعد میں مایوسی نہ ہو۔

اب آمدم بر سرِ مطلب

ظاہر ہے کہ جب کسی مضمون کا عنوان سامعین کے سامنے پیش ہوتا ہے تو ان میں سے صاحبِ فکر اس مضمون کو ہر پہلو سے سوچنے لگتے ہیں اور پھر اس بات کے منتظر ہوتے ہیں کہ مقرر اس کے متعلق کیا کچھ کہے گا۔ میرا مضمون "جسم و جان" پر ہے۔ جو ہر ذی حیات کا جزو لاینفک ہے اور چوں کہ اس زمرے میں انسان بھی آتا ہے، اور میری گفتگو دراصل اسی پر ہوگی، اس لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے اس سوال پر کہ پہلا انسان کس طرح وجود پذیر ہوا اپنی معلومات کا اظہار کروں۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ اگر اس کی تخلیق کی سمجھ آگئی تو حیوانات اور نباتات کی پیدائش کا مسئلہ تو اس دُور دراز اور اَدق سفر کی ایک نزدیک تر اور آسان منزل ہے۔

اس سوال کا ایک جواب تو انسانی تفتیش کا ماحصل ہے۔ اور دوسرا مشعلِ ایمان کا نتیجہ اوّل الذکر اپنی تجسس اور تحقیق کے زور سے بہت سی منازل طے کر چکنے کے بعد ایک تیرہ مقام پر جا پہنچتا ہے۔ جہاں مقصد ایسا ناپید ہو جاتا ہے کہ وہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ؎

کسے نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمّا را

یہی تعلیم گوتم بدھ کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان پردوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش مت کرو کیوں کہ جوں جوں تم پردے اٹھاتے جاؤ گے توں توں پردے پر پردے تمھارے سامنے آتے چلے آئیں گے۔ اسی طرح بائبل کی تعلیم بھی علم تحقیق کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ عمر خیام نے دنیا کے آغاز اور انجام کے علم کی ایک نہایت اعلا مثال دی ہے۔ وہ دنیا کو ایک پرانی کتاب سے مشابہت دیتا ہے جس میں واقعات کی تاریخ قلم بند ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس کتاب کے شروع اور آخر کے ورق گھس گھس کر تلف ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

ما ز آغاز و ز انجامِ جہاں بے خبریم
اوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتاد است

علمِ اشیائے فطرت (Natural Science) کے رُو سے ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت روز بروز درجہ بہ درجہ نشو و ارتقا کی راہ پر گام زن ہے اور اس طرح ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ قانون کس کا ہے اور کہاں سے آیا؟ اس کا ان کے پاس کوئی خاطر خواہ جواب نہیں۔ یہ تبدیلیاں لکھو کھہا سال کے عرصے میں نئی شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ انھیں بے نقاب کرنے کے لیے کتابِ فطرت کے بکھرے ہوئے اوراق کے گہرے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جرثومۂ اولین (Protoplasm) کی ابتدا سمندر میں ہوئی جس سے اُس نے مناسب نمک یعنی سالٹ اخذ کیے اور پھر مٹی کی آمیزش سے اسے پیکر عطا ہوا جس کو خلیہ یعنی Cell کہتے ہیں۔ اس خلا میں ایک نوات (Nucleus) ہوتا ہے جو زندگی کے عظیم الشان امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ یہی نفسِ واحدہ زندگی کا آغاز تھا۔ یعنی واحد خلیہ (Unicellular) سے زیادہ خلیہ (Multi-cellular) زندگی پیدا ہوئی جو پھر مختلف نوعوں یعنی Species میں تقسیم ہوئی۔ سالہا سال گزر گئے اور ان پیکروں میں تبدیلیوں کا سلسلہ لامتناہی جاری رہا حتیٰ کہ تخلیق بذریعۂ تناسل کی منزل آپہنچی اور حیوانات کا ظہور ہوا۔ پھر یہ زندگی اسی طرح طول المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد انسانی پیکر میں جلوہ نما ہوئی۔

صد بہار آخر شد و ہر گُل بہ فرقِ جا گرفت

یعنی ہر نوع نے اپنی اپنی صورت اختیار کر لی اور اس صورت میں آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں اور ایک خاص اسکیم یعنی نقشے کے تحت بڑھتے چلے جائیں گے یا ناسازگاریٔ ماحول کی وجہ سے نابود ہو جائیں گے لیکن اس سلسلۂ کائنات میں جمود کا نام نہیں۔

پیکرِ انسانی میں خدائے عز و جل نے اپنی روح پھونک کر اس میں صفاتِ خداوندی ایک مقید یعنی Finite شکل میں بطور ممکنات ودیعت کر دیں، اور درجۂ حیوانات سے کہیں آگے بڑھا کر اس میں خدائی توانائی ڈالی۔ یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ اس میں سمع و بصر کے علاوہ احساسات آئے یعنی انسانی ذات Individuality آئی، شخصیت Personality آئی، درک و استدلال آیا اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر اسے اختیار و ارادے کا جوہر عطا ہوا۔ یہ تھا وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ۔ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ سب اس کے آگے جھک جائیں۔ سب جھکے الّا ابلیس، جس پر اُسے

خدا کی پھٹکار پڑی اور اس کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے انسان کو متوازن راہ سے بھٹکانے کی نابکار مشن سنبھالی مختصراً یہ ہے فرق مغربی سائنس والوں کی میکانکی نظریہ ارتقا (Theory of Organic Evolution) اور قرآنی نظریۂ ارتقا کا۔

بولا منصور کہ خدا ہوں میں
ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

دیکھیے قرآنی نظریہ کی روشنی میں انسانی تخلیق کا معمہ کس خوش اسلوبی اور وضاحت سے حل ہو جاتا ہے۔ آگے بڑھنے کی صلاحیت سب کو دی گئی ہے اور انسان کو تو محض طبعی ہی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی بھی صلاحیتیں بھی عطا ہوئی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کیسے انسان مادیات، نباتات حیوانات پر حاوی ہے۔ کس طرح وہ معمولی ذرے کا دل چیر کر اس میں سے خورشید کا لہو ٹپکا سکتا ہے۔ کیسے وہ پھلوں، پھولوں کا ذائقہ اور رنگ بدل سکتا ہے۔ کیسے ان کے حجم اور ان کی پیداوار میں نمایاں تبدیلیاں ظہور میں لا سکتا ہے۔ کیسے اس نے کوتاہ قامت چھوٹے بربری گھوڑوں سے قوی ہیکل برق رفتار، ڈاربی جیتنے والے گھوڑوں کی نسل پیدا کی۔ یہ سب کچھ اُن صفات کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائیں اور اس طرح اسے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا شرف بخشا نہ صرف زمین کی ہر شے کو اس کے تابع کیا بلکہ ابر و باد و مہ و خورشید و فلک کو بھی اس کی خدمت میں مصروف کار رہنے کا حکم دیا۔ جب انسان نباتات حیوانات میں نشو و ارتقا کی روح پھونک سکتا ہے تو اس کے سمجھنے میں کیا مشکل رہ گئی کہ خدائے عزّ و جل نے انسان میں اپنی روح پھونک کر اسے بھی ذی حیات سے متمیز کیا۔

اب آئیے ذرا عالم بالا سے نیچے اتر کر انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

جب انسانی نر و مادہ کے خلیے مدغم ہوتے ہیں تو شکم مادر میں اس نطفہ میں تبدیلیاں ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ جیسے ایک کوزہ گر کے ہاتھ میں مٹی کا گولہ تیزی سے مختلف شکلیں بدلتا ہے اسی طرح اس کی بھی شکلیں بدلتی چلی جاتی ہیں اور اس کے خطوط اور گوشے واضح ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک معیّن وقت پر استخوان، گوشت پوست، آنکھ، کان، ناک، دل و دماغ، شریان، اعصاب و دیگر اعضائے مکمل ہو کر انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ قافلۂ حیات کی اس منزل میں حیوانات بھی شامل ہیں۔

پیدائش سے پہلے جنین کی رہائش و خوراک Board and Lodging کا مکمل انتظام قدرت نے ماں کے اندر نہایت خوش اسلوبی سے کر دیا ہوتا ہے۔ پیدائش کے بعد بچے کو اندرونی خود مختاری بہت حد تک مل جاتی ہے جس کے لیے اس کے اپنے

جسم کے کل پُرزے تیار ہوتے ہیں اور اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی وہ ایک لمبا سانس لیتا ہے یا بلند گریہ کرتا ہے جس سے اُس کے پھیپھڑے ہوا سے بھر گئے اور ان میں باقاعدہ سلسلۂ مدوجزر شروع ہو گیا۔ اور انسانی انجن نے اپنا کام شروع کر دیا جو موت آنے تک جاری رہتا ہے۔ دل نے تو رحم مادر میں ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس گوشت کے پمپ نے خون کو تمام عمر، رات اور دن سوتے جاگتے رگوں میں دوڑایا۔

اور اس طریقہ سے ایک طرف تو جسم کے ہی کونے کھدرے کو خوراک بہم پہنچائی اور دوسری طرف اس کے اتلاف جمع کر کے تطہیر اور تصفیہ کے لیے پوست، گُردوں، جگر، پھیپھڑوں وغیرہ کے سپرد کیے۔ نظام انہضام (Digestive System) میں سادہ غذا کی تحلیل کا مادہ پیدا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اسے ہر قسم کی غذا کے تحلیل کی قدرت حاصل ہو گئی۔ آنکھوں نے دیکھنا، کانوں نے سننا، ناک نے سونگھنا اور زبان نے چکھنا شروع کر دیا۔ درد اور گرم و سرد کے احساسات پیدا ہو گئے۔ نظام اعصابی نے ابتدائی کام شروع کر دیا۔ پہلے تو صرف اس حصے نے جو انعکاسات Reflexes سے تعلق رکھتا ہے اور اس لیے خود محرک ہے، پھر نچلے طبقہ کے دماغ نے کام شروع کیا۔ آخر کار رفتہ رفتہ اس میں پختگی آئی پھر دماغ کا اوپر کا طبقہ پختہ ہوتا چلا گیا۔ جو صرف نوع انسانی کا حصہ ہے۔ اور جس کی وضاحت میں اوپر کر چکا ہوں۔

افلاطون کہتا ہے کہ انسان کی زندگی تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا نفس پرستی پر جس میں شہوانیت اور اشتہا شامل تھی۔ دوم وہ جو جرأت، حرارت اور حدّت سے وابستہ ہے۔ سوئم وہ جو عقل و شعور۔ اور درک و استدلال سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ چوں کہ یہ سوئم جزو وہ ہے جس سے انسان کتوں اور بندروں سے تمیز کیا جاتا ہے لہٰذا یہ حصہ تینوں حصوں میں اعلا اور اولیٰ ہے اور اس کا کام حکومت کرنا ہے۔ جزو دوئم کا کام احکامات کا اجرا ہے۔ اور جزو اوّل کا فرض جملہ احکامات کی اطاعت ہے۔ ان تینوں حصوں کی ہم آہنگی کا نتیجہ تقویٰ اور صلح اور ان میں خلل کا نتیجہ شرارت اور فساد ہے۔ اس کام کو Mind بھی کہتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کے جسم میں علالت اور ناراحت کیسے پیدا ہوتی ہے اور اس کے طریقہ علاج کے کیا اصول ہیں۔ اس وقت میرا روئے سخن متعدّی Contagious and Infections بیماریوں سے نہیں۔ ان میں تو ایک لحاظ سے انسان کا کوئی دخل نہیں۔ وبا پھیلی اور ان بیماریوں کے امکان لابد پیدا ہو گئے۔ میری مُراد اُن بیماریوں سے ہے جو انسان کے وجود میں اس کی اپنی بداعتدالیوں یا کشمکش حیات کے فشار سے پیدا ہوتی ہیں۔

یاد رہے کہ انسانی جسم میں خدا کی جانب سے دفاع، مرمت اور اصلاح کے انتظامات بھی ودلیعت کیے گئے ہیں۔ یعنی ایک ایسی مشینری موجود ہے جس کو Built in repair shops کہیے جو ہماری غلط کاریوں کے نتائج کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ علاوہ بریں جسم کا ہر جزو باقاعدہ طور پر نئے جنم لیتا رہتا ہے۔ بقول مولانا روم

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

اس سے مراد صرف نسلِ انسانی ہی نہیں بلکہ جسم انسانی بھی ہے۔ افلاطون کے مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ Mind حاکم ہے اور جسم اور اس کی خواہشات محکوم اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ یہ ان صفات خداوندی کا مرکز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونک کر انسان میں ڈالی یہ ناممکن ہے کہ انسانی جسم بیمار ہو اور اس کا Mind ناراحت نہ ہو۔

ارسطو کا کہنا ہے کہ دنیا میں جسم کے معالج بھی ہیں اور ذہن (Mind) کے معالج بھی۔ لیکن درحقیقت دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں تمیز بے معنی چیز ہے۔

ڈاکٹر ہانیمین" جو ہومیوپیتھی کا موجد ہے، کہتا ہے کہ ہر جسمانی مریض کی صحتیابی اس کے Mind کے علاج پر منحصر ہے۔ Mind کا علاج خاطر خواہ ہو گیا تو جسمانی تکلیف یقینی طور پر رفع ہو جائے گی۔

یہ تو آپ نے بھی اکثر سنا ہوگا کہ فلاں ڈاکٹر یا طبیب کے ہاتھ میں شفا ہے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ اس پر مریض کو اعتماد ہے اور اس کو یقین ہے کہ اس کا علاج اسے ٹھیک کر دے گا۔ اس سے اس کا Mind تو ٹھیک ہو گیا اور ساتھ ہی جسمانی صحت یابی کے امکان اجاگر ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ جسمانی مشین عام مشینوں مثلاً موٹر کار کی طرح نہیں جن میں نہ ہی جان ہے اور نہ ہی Mind انسان نے بنائی ہے وہ ان کے کل پرزوں کو سمجھتا ہے اور انہیں مرمت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن انسانی مشین ایک شے ہی اور ہے۔ اس کی نچلی سطح کے حصوں کی بھی ساخت اور فنِ عمل کا علم ہی ابھی تک نامکمل ہے۔ اوپر کی سطحوں کے حصوں یعنی Mind کا علم تو قیاس آرائی کی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔ البتہ یہ امر مسلمہ ہے کہ انسانی جسم پر ان کا پورا تسلط ہے۔ مولانا روم نے نہایت خوش اسلوبی سے اس امر کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:-

بادہ در جوشش گدائے جوشِ ماست
چرخ در گردش اسیر ہوشِ ماست

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو

یہاں ما سے مراد انسانی درک اور استدلال اور Mind ہے۔
علاوہ بریں تشخیص کی سائنس ادھوری اور نامکمل سائنس ہے جس میں امکان اور احتمال کو بہت حد تک دخل ہے۔ صحیح علم و دانش اللہ تعالےٰ کا نور ہے اس لیے صرف اسی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بائبل میں آیا ہے:

"If any of you lack wisdom let him ask of God who giveth all men wisdom and upbraideth not.

یعنی تم میں سے اگر کسی کو عقل و دانش کی کمی ہو تو اسے خدائے عزّ و جل سے مانگنی چاہیے جو سب کو بیکم و بخشش دیتا اور بے منت دیتا ہے (اسی مفہوم کو ایک عربی نے امام شافعیؒ اور ان کے استاد حضرت وکیعؒ کے درمیان ہونے والی گفتگو نظم کر کے یوں بیان کیا ہے ؎

شَکوتُ الیٰ وکیعٌ سوءِ حِفظی
فاوصانی الیٰ ترکِ المعاصی
فَاِنَّ العِلمَ نورٌ من الٰہٖ
وَنُورُ اللہ لا یُعطیٰ لِعاصی

میں نے وکیعؒ سے اپنے خراب حافظے کی شکایت کی انھوں نے نصیحت کی گناہ ترک کرو کیونکہ حافظہ علم ہے۔ اور علم اللہ کا نور ہے جو گناہ گار کو نصیب نہیں ہوتا۔ اور پھر علم بھی کس کا؟ خدا کے خلیفہ یعنی بنی نوعِ انسان اور اس کی بیماریوں کا! اس میں تو خدا کا براہِ راست تعلق ہے۔
مذکورہ بالا وجوہات اور اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہدایت ایزدی کے بغیر کوئی ڈاکٹر یا طبیب نہ مرض کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کا نسخہ "تیر یا تکہ" سے زیادہ حیثیت رکھ سکتا ہے دوسرے لفظوں میں دوا کے ساتھ جب تک دعا شامل نہ ہو مریض کی شفا کے امکانات دھندلے رہیں گے۔
معافی چاہتا ہوں میں نے آپ کا وقت بہت زیادہ لے لیا۔ یہ قصہ جسے میں نے چھیڑنے کی جسارت کی ہے بہت طولانی ہے۔ بہتر ہے کہ اسے اب ختم کر دوں۔
ہاں صرف ایک اصولی بات عرض کرنی باقی رہ گئی اسے چند لفظوں میں بیان کر دوں گا۔
مختلف طریقہ ہائے علاج، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، یونانی اور ایورویدک پر تنقیدی بحث بے سود ہے اس لیے اسے چھیڑنے کا میرا ہرگز ارادہ نہیں۔ اس سلسلے میں

کارلائل جو ایک بہت بڑے انگریزی مفکر تھے ایک اصول بتاتے ہیں جس کا میں سو فی صدی قائل ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک دیوار کھڑی کی جائے تو اگر اس کی بنیاد مضبوط ہو اس کی اینٹوں کی چنائی Plumb line (یعنی ڈوری اور سیدھ) کی جانچ کے مطابق درست نہ ہو تو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو جلدی گر جائے گی۔ برعکس اس کے اگر بنیاد مضبوط اور چنائی Plumb line کے عین مطابق ہو تو وہ دایم اور قائم رہے گی خواہ ثریا تک کیوں نہ پہنچ جائے۔ یہ امتحان ہر چیز کے پرکھنے کے لیے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ جو اتنے لمبے عرصے سے قایم ہے وہ ضرور حق پر مبنی ہوگا۔ جو حق پر مبنی نہیں وہ تھوڑی مدت میں بے کار ہو جائے گا۔ یہی حال طریقہ ہائے علاج کا ہے۔ کئی آئے کچھ دیر اُن کا چرچا رہا اور پھر بھول بھلا گئے۔ وہی باقی رہ گئے ہیں جو مذکورہ بالا تول میں پورے اترتے ہیں۔

بلکہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ ان چند باقی ماندہ طریقہ ہائے علاج کو جو اپنے زور بازو سے زندہ اور پائندہ ہیں انھیں تشویق اور تقویت دی جائے۔ اس کی حمایت وہی کر سکتا ہے جو جانتا ہے کہ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے۔

ایک لاعلاج بیمار کو اگر کوئی چیز ابھارے رکھ سکتی ہے تو یہ ہے کہ اسے امید کا کوئی نہ کوئی دروازہ کھلا دکھائی دیتا رہے۔ ایک طریقۂ علاج سے مایوسی کے بعد دوسرا، دوسرے سے تیسرا اور پھر سب سے بڑا دروازہ درگاہ ایزدی کا۔ جو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ جب تک کہ انسان مے کل من علیها فان پی نہیں لیتا۔

حکیم صاحب نے ہمدرد قائم کر کے رنجور انسان پر بڑا احسان کیا ہے کیوں کہ یونانی علاج کا دروازہ کھلے رکھنے کا سہرا ان کے سر ہے۔

اللہ کرے زورِ کرم اور زیادہ!

شامِ ہمدرد، راولپنڈی

۳۱ رمئی ۱۹۶۶ ش

ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد

آج شامِ ہمدرد کے مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر سعید الدین احمد صاحب کو میں آپ کی طرف سے اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ اور ان کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہماری دعوت قبول فرمائی اور شامِ ہمدرد کو خطاب فرمانا منظور فرمایا۔

جناب قاضی صاحب کی چہل سالہ خدمات نہایت شان دار ہیں۔ آپ نے انّیس سال علی گڑھ کالج میں تعلیمی خدمات انجام دیں اور اکیّس سال سے لاہور میں آپ کے علمی فیض کا چشمہ جاری ہے۔ یونیورسٹی کالج لندن میں بھی آپ آنرز کے طلباء کی رہ نمائی فرما چکے ہیں۔ برصغیر میں یہ اعزاز آپ ہی کو حاصل ہے کہ آپ جغرافیہ کے سب سے سینئر پروفیسر ہیں۔ اس وقت تک نہ صرف پاکستان کی یونیورسٹیوں بلکہ ہندستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں جغرافیہ کے شعبوں کے صدر آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ پنجاب یونیورسٹی میں Humanities اور سوشل سائنس کی فیکلٹی کے ڈین رہے ہیں۔

جناب قاضی صاحب کا تحریکِ پاکستان سے گہرا تعلق رہا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ہندستان کے مسلم عوام کو مسلم لیگ کا نقطۂ نظر سمجھانے اور پاکستان کی تحریک کو عام کرنے کا کام جن تین دانش وروں کے سپرد کیا تھا ان میں ایک جناب قاضی صاحب بھی تھے۔

جب ملک کی آزادی کا سوال پیدا ہوا تو مسلم لیگ نے اپنا جغرافیائی مطالبہ ریڈکلف باؤنڈری کمیشن کے لیے مرتّب کرنے کا مشکل اور اہم کام آپ کے سپرد کیا۔ آپ کو پاکستان جیوگرافیکل ایسوسی ایشن کا صدر ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ان خدمات کے علاوہ جناب قاضی صاحب ۱۹۶۴ء میں پہلی آل پاکستان جیوگرافیکل کانفرنس کے صدر منتخب

ہوئے تھے۔ کئی ایک بین الاقوامی اجتماعات میں جو ایشیا، یورپ، شمالی اور جنوبی امریکا میں ہوئے تھے جناب قاضی صاحب ان میں شریک ہوئے اور متعدد بار وہاں صدارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ اسی طرح آپ کو بین الاقوامی کونسل کا وائس پریذیڈنٹ ہونے کا فخر بھی حاصل ہے جو امریکا اور ایشیا کی جغرافیائی صورتِ حال کا مطالعہ کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

آپ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ کیمبرج، اوکسفرڈ اور مغربی جرمنی کی یونیورسٹیوں کی طرف سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کئی جویانِ علم کو آپ کے زیرِ نگرانی کام کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

آپ کو انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا جیسی مشہور و معروف کتاب کے لیے پاکستان کی طرف سے اپنی پسند کے تحقیقاتی مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی تھی جو بجائے خود ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ آپ نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لیے بھی بہت سے مضمون لکھے ہیں۔ پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں آپ کے بہت سے علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ آپ اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نیشنل اٹلس بورڈ کے ڈائریکٹر بھی ہیں جو پاکستان کا بڑا جامع اور تفصیلی اٹلس تیار کرے گا۔

حکومتِ پاکستان نے ۱۹۶۵ء میں آپ کو قابلِ قدر جغرافیائی خدمات کے اعتراف میں ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے نوازا تھا۔

جناب قاضی صاحب کی تقریر کا موضوع "پاکستان کی جغرافیائی اہمیت" بڑا نازک اور اہم ہے۔ ایک جغرافیہ دان کا مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ پاکستان کے حدود اربعہ کیا ہیں اور نقشۂ ارض پر کس جگہ واقع ہے، بلکہ جغرافیہ دان مطالعۂ جغرافیہ کو مجموعۂ مسائل و سوالات سمجھتا ہے اور دنیا کے متعدد و مختلف ممالک کے مابین بڑے بڑے اختلافاتِ قومی و ارضی کی روشنی میں سوالات کے جوابات پیش کرتا ہے۔ پاکستان سطحِ ارض پر ایک نئے ملک کے طور پر نمودار ہوا ہے اس لیے اس کا جغرافیائی مطالعہ مشکل تر ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ جناب ڈاکٹر قاضی سعیدالدین صاحب کو اپنے موضوع پر کمال حاصل ہے اور وہ آپ کو پاکستان کی جغرافیائی اہمیت سے بخوبی واقف کرائیں گے۔

محمد سعید

سرزمینِ پاکستان اور اس کی جغرافیائی اہمیت

جناب ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد (ستارۂ امتیاز)

میں حکیم محمد سعید صاحب کی اس علم نوازی کی بڑی قدر کرتا ہوں کہ وہ ہر مہینے تکلیف اٹھاکر اس قسم کی نشست کا موقع فراہم کرتے ہیں جس سے علم پسند حضرات ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوسکیں۔ آج میری عزت افزائی کی گئی ہے۔ اس طور پر کہ میں ایسے ذی فہم اور صاحب علم حضرات پر مشتمل مجلس کو خطاب کروں۔ مجھے انتہائی مسرت ہے، اور میں حکیم صاحب کا نہایت ہی ممنون ہوں کہ مجھے آپ حضرات سے تبادلۂ خیالات کا موقع عنایت فرمایا ہے۔

یہ حکیم صاحب کی انتہائی نوازش تھی۔ کہ وہ مجھے "شامِ ہمدرد" میں شرکت کے لیے مدعو فرماتے رہے ہیں اور میری بدقسمتی یہ تھی کہ مختلف مصروفیات کی وجہ سے اس میں شرکت سے قاصر رہتا تھا۔ گزشتہ ماہ پہلی بار میں نے "شامِ ہمدرد" میں شرکت کی۔ اس موقع پر محترمہ خانم بہنام صاحبہ کی تقریر نہ صرف بصیرت افروز تھی۔ بلکہ زبان کے اعتبار سے بھی اتنی ستھری اور شستہ تھی کہ ہم سب اس سے کافی لطف اندوز ہوئے اور ہماری وہ شام نہایت ہی اچھی گزری۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میری آج کی گفتگو کا موضوع ہے "سرزمین پاکستان اور اس کی جغرافیائی اہمیت"، میں نے یہ مضمون محض اس لیے نہیں چنا کہ میں جغرافیہ کا پروفیسر ہوں، بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ میرا تحریکِ پاکستان سے گہرا تعلق رہا ہے۔ میں

لاہور ۱۹۴۵ء میں آیا جب کہ پاکستان کی تحریک بڑے زور شور سے جاری تھی۔ اِس سے پہلے بھی جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تھا تو وہاں میرا تحریکِ پاکستان کے ساتھ نہایت قریبی تعلق رہا ہے۔ پاکستان کا تخیّل میرے لیے ایک عقیدہ اور اُس کی سالمیت اور ترقی ایک خواب کی تعبیر ہے۔ جہاں تک پاکستان کے بنیادی جغرافیائی حقائق کا تعلق ہے وہ آپ کو میری چھوٹی سی کتاب A Geography of Pakistan میں مل جائیں گے جسے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے انگریزی زبان میں شائع کیا ہے۔ میں اس وقت اِس کے چند اہم پہلوؤں کو آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے پاکستان ۱۹۴۷ء میں معرضِ وجود میں آیا۔ ہمیں ایک ایسی مملکت ورثے میں ملی جو دنیا میں ایک لحاظ سے بے نظیر ہے۔ یہ ملک دو حصّوں میں اس طور پر بٹا ہوا ہے کہ ان کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا ایک ایسا فاصلہ حائل ہے جو اس ملک کا حصّہ ہے جس سے ہمارے تعلقات کچھ خوش گوار نہیں رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک اس طرح منقسم نہیں ہے۔ تقسیم کے وقت اس ملک میں باشندوں کی تعداد سات کروڑ پچاس لاکھ تھی۔ اِس میں سے چار کروڑ مشرقی پاکستان میں تھے۔ اور ساڑھے تین کروڑ مغربی پاکستان میں۔ مشرقی پاکستان کا کل علاقہ پچپن ۵۵ ہزار مربع میل پر مشتمل تھا، اور مغربی پاکستان کا رقبہ تین لاکھ مربع میل سے زائد تھا۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں، جو رقبے کے لحاظ سے کل کا صرف ⅙ تھا۔ پاکستان کی ۵۵٪ حصّہ میں آبادی رہتی تھی۔ مغربی پاکستان میں ہم تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو غیر مسلموں نے دبا رکھا تھا۔ ان کو تقسیم سے پہلے نہ تو انتظامیہ سے زیادہ متعلق رکھا گیا تھا اور نہ ہی معاشی امور سے۔

اُس وقت جب ہم بنگال کے متعلق گفتگو کرتے تھے تو ہمارا مقصود بنرجی، چٹرجی یا مکرجی ہوتا تھا۔ یعنی کوئی غیر مسلم۔ اور ہمارے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں تھی کہ ملک کے اِس حصّے میں مسلمان بھی اتنی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ساری ملازمتوں اور معاشی مساعی میں ہم یہ دیکھتے تھے کہ وہاں کے مسلمان نہایت پس ماندہ تھے۔ چناں چہ جب انھیں آزادی نصیب ہوئی تو اُس وقت مشرقی پاکستان والے کئی حیثیت سے ہم سے کافی پیچھے تھے۔ ہمیں ان بھائیوں کو ترقی کی راہوں پر اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھنا تھا۔

اِس حقیقت کے باوجود کہ ہمارے دونوں حصّوں کے درمیان دُور دراز کا فاصلہ واقع ہے ہمارے پاس وحدتِ مقصد جیسی بیش بہا چیز موجود تھی۔ ہم مذہب، روایات

اور فکر کے اعتبار سے ایک تھے۔ اسی بات نے اب تک ہمیں ہم رکاب رہنے میں مدد دی ہے۔

پاکستان کے دونوں حصوں میں قدرتی ماحول اور ثقافت کا فرق تو ضرور پایا جاتا ہے لیکن حقیقتاً یہ بات باعثِ تقویت ہے۔ فرق کچھ اس عنوان سے واقع ہوا ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ چناں چہ فرق کی نوعیت کے اعتبار سے ہمارے ملک کے دونوں حصے دنیا میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے صرف زراعت ہی میں نہیں بلکہ ساری اقتصادی ترقی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مختلف جغرافیائی ماحول میں ہی مختلف اشیا پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمارا مغربی حصہ گرم و خشک ہے اور مشرقی حصہ گرم اور مرطوب۔ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالنے سے ہم یہ جانتے ہیں کہ گرم و خشک علاقے والے ممالک عام طور پر پس ماندہ ہیں۔ بہت سے حصے ریگستانی ہیں۔ نہ تو ان کے پاس ترقی کرنے کے وسائل ہیں اور نہ ہی پانی کی بہم رسانی ضرورت کے مطابق ہے مگر مغربی پاکستان میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے دریائے سندھ اور اس کے معاونوں سے نوازا ہے جن میں سارے سال پانی رہتا ہے۔ یہ مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب کے میدان کے پوری وسعت میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ان میں پانی کی کثیر مقدار ہوتی ہے۔ جس سے نہروں کے ذریعے آب پاشی ہوتی ہے۔ خشکی کے باوجود اس خطۂ ارض کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ غرض کہ ہمارا مغربی پاکستان ایک دولت آفریں علاقہ ہے جس میں کوہ ہمالیہ سے نکلنے والے بڑے بڑے دریاؤں نے ہمارے لیے بارش کی کمی کا بدل پانی کی بہتات میں مہیا کیا ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کے خشک ملکوں میں اگر کوئی ملک پاکستان کی کسی حد تک برابری کر سکتا ہے تو وہ مصر ہے۔ لیکن وہاں بھی پانی کی بہم رسانی محدود ہے۔ دریائے نیل سے سیراب ہونے والا علاقہ اس کے ساتھ ساتھ دس سے پندرہ میل تک چوڑی وادی تک محدود ہے۔ لیکن ہمارے مغربی پاکستان کے شمال میں ان تمام بڑے معاون دریاؤں کے پھیلے ہونے سے ہم کو کافی وسیع علاقے میں پانی کی بہتات ملتی ہے۔

مشرقی پاکستان بھی اسی طرح ایک خوش نصیب خطۂ ارض ہے۔ وہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ اصولی طور پر اچھی بارش اور زرخیزی کا آپس میں بیر ہوتا ہے۔ جہاں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں زمین کو زرخیز بنانے والے مٹی کے اجزا پانی کے ساتھ بہہ جایا کرتے ہیں۔ اس کلیہ کے مطابق اگر ہم خیال کریں تو مشرقی پاکستان کو بارش کی کثرت کی وجہ سے کچھ زیادہ زرخیز علاقہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ہم پر بہت مہربانی

کی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بارش کی کثرت کے باوجود مشرقی پاکستان کا شمار نہایت ہی زرخیز خطوں میں ہوتا ہے۔ یہ زرخیزی اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ہر سال دریاؤں میں سیلاب آتا ہے۔ جتنی دور تک اِس کی رسائی ہوتی ہے۔ سیلابی مٹی چھوڑ جاتا ہے۔ اس طرح سال بہ سال زرخیز مٹی کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ چناں چہ بارش کی کثرت کے باوجود زمین کی زرخیزی پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ اور وہ برقرار رہتی ہے۔ اِس سلسلے میں یہ بتانا مناسب ہوگا۔ کہ مشرقی پاکستان میں پٹ سن ایک قیمتی زرعی پیداوار ہے۔ یہ اس اعتبار سے خصوصاً اہم ہے کہ اس سے بہت ہی سستا ٹاٹ اور بوریاں بنتی ہیں جن میں زرعی پیداوار کو بھر کر بآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکتا ہے۔ پٹ سن کی کاشت کے لیے زرخیز مٹی کی ضرورت ہے۔ اگر سال بہ سال مشرقی پاکستان کی زمین میں طغیانی کے ساتھ قدرتی طور پر زرخیز مٹی جمع نہ ہوتی رہے تو ٹاٹ بوریاں سستی نہیں بن سکتیں۔ کھاد کا استعمال کر کے پٹ سن اگانا ٹاٹ بوریوں کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ چناں چہ پٹ سن کو بغیر کھاد کے اگانے میں ہی فائدہ ہے۔ اگر ٹاٹ بوریوں کی قیمت زیادہ ہو جائے تو دنیا کے بازار میں کینوس اور دوسری چیزوں کے مقابلے میں اس کی خریداری بند ہو جائے۔ ٹاٹ بوریوں کی قیمت کم رہنے ہی میں اس کی دنیا میں مانگ ہے۔ اس طرح قدرتی زرخیزی کی بدولت پٹ سن کی کاشت مشرقی پاکستان کی خوش حالی کی ضامن ہے۔ الغرض ہمارے ملک کے جو دو حصّے ہیں ان دونوں میں خدا کے فضل و کرم سے زمین زرخیز ہے۔ دونوں میں اپنے اپنے قدرتی ماحول کے لحاظ سے بڑی پیداوار ہوتی ہے۔

اگر ہم مغربی پاکستان کے نقشے پر نظر ڈالیں تو ہم یہ بات پاتے ہیں کہ تقریباً نصف علاقہ میدانی ہے اور بقیہ یا تو سطح مرتفع (پلیٹو) ہے۔ یا پہاڑی۔ ہمارے میدانی علاقے کو زرخیزی کے علاوہ ساخت کے لحاظ سے بھی قدرت نے نہایت دل چسپ بنایا ہے۔ یہ میدان کئی دوآبوں پر مشتمل ہے جس کا ڈھال ایسا ہے کہ نہروں کے ذریعے پانی کی تقسیم نہایت آسان ہو جاتی ہے۔ دوآبے کی بالائی سطح پر جنوب مغرب کی طرف نہروں کے لیے نہایت اچھا ڈھال ہے۔ پھر ان نہروں کی شاخوں کے لیے دوآبے کے دونوں بازوؤں کی طرف بھی ڈھال اچھا ہے۔ دوآبوں کی زمین کی اس ساخت کی وجہ سے دریاؤں کے درمیان پانی کی تقسیم نہایت آسان ہو جاتی ہے۔ جہاں پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں۔ وہاں بند آسانی سے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دریاؤں کے راستوں میں بھی دوسرے ایسے مقامات ہیں جو بند اور بیراج کی تعمیر کے لیے نہایت مناسب ہو سکتے ہیں۔

اِس طرح سندھ کے علاقے میں کلسی چٹانوں (لائم سٹون) کی پہاڑیاں کئی جگہ دریائے سندھ کے راستے تک آگئی ہیں۔ یہ دریا ان کو کاٹتا ہوا گزرتا ہے۔ ایسے مقامات پر گدو بیراج، سکھر بیراج اور غلام محمد بیراج بنائے گئے ہیں جہاں سے نہریں نکلتی ہیں۔ کلسی چٹانوں کے مضبوط کنارے اگر دریائے سندھ کے رہ گزر میں نہ ہوتے تو ان بیراجوں کا بنانا مشکل ہو جاتا۔ ان ساری قدرتی سہولتوں کی وجہ سے ہمارے مغربی پاکستان میں ایک ایسا عمدہ نظام آب پاشی ممکن ہو سکا ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ ہمارے میدان کی تحتی (اندرون زمین کی) ساخت کی وجہ سے کچھ دقتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ گو نقشے پر یہ میدان بہت ہموار معلوم ہوتا ہے لیکن یہ پتا لگایا جا چکا ہے کہ اس کے نیچے ایک زمین دوز پہاڑی سلسلہ ہے جو دہلی کے پاس جنوب مشرق سے شمال مغرب کی جانب جاتا ہے۔ اور سرگودھا کے قریب کیرانہ پہاڑوں میں نمودار ہوتا ہے۔ اِس کا اثر یہ ہے کہ ہمالیہ کے نیچے دریاؤں اور نہروں کا وہ پانی جو زمین کے اندر ہی اندر بہتا ہے اس کے خلاف یہ پہاڑ سدِّ راہ بن جاتا ہے اور پانی اس سے رک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس طرح برابر پانی جمع ہونے سے میزاب بلند ہو گئی ہے۔ اِس کی وجہ سے دو بڑے قومی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن سے ہم آج کل دوچار ہیں وہ ہیں یعنی سیم اور تھور۔ بہرحال سیم اور تھور جس کے زیر اثر کافی علاقہ آ چکا ہے، کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر ہم گزشتہ صدی کے گزٹ پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ گزٹوں میں ان مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات اُس وقت اتنی تشویشناک نہیں تھی جتنی آج ہے۔ نہری آب پاشی میں توسیع کی وجہ سے پانی زمین میں خوب جذب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے زمین دوز پانی کی سطح بہت اونچی ہو جاتی ہے اور سطح زمین پر پہنچ کر سیم کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ میں نے جگہ جگہ خود مشاہدہ کیا ہے۔ اور آپ صاحبان نے بھی ملاحظہ کیا ہوگا کہ میزاب اونچی ہونے والے علاقوں میں نہ صرف سیم اور تھور ہی پھیل گئی ہے بلکہ سڑکوں اور عمارات کو بھی بڑا نقصان پہنچا ہے سڑکیں اوپر اٹھ گئی ہیں، اُن پر چلنے والی موٹریں اچھلتی ہیں۔ کارخانوں کی عمارتوں کے فرش اُٹھ گئے ہیں اور بے کار ہو گئے ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ ہر پانچ منٹ میں سیم اور تھور کی وجہ سے ایک ایکڑ زمین زراعتی استعمال سے نکل جاتی ہے۔ غرض جہاں ہمیں آب پاشی سے خوش حالی نصیب ہوئی ہے وہاں اس کی وجہ سے یہ مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے جس کا ہمیں مناسب طور پر جلد از جلد کوئی مداوا تلاش کرنا ہے۔ اس مسئلے کے حل کرنے کے لیے نل کنوئیں بنائے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پانی کے نکاس کے لیے نالیاں بنائی جا رہی ہیں۔

لاہور کے قریب ہی واپڈا والوں نے ایک تجربہ کر کے بتایا ہے کہ نل کنوؤں کی وجہ سے زمین کے نیچے آبی سطح کو کافی نیچے کیا جا سکتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے بہت سی سیم زدہ زمین جڑانوالہ اور دوسرے علاقوں میں قابلِ کاشت بنائی گئی ہے۔ شور ریت دوسرا مسئلہ ہے۔ نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے اور وہ شوری عمل سے اُوپر آجاتا ہے۔ اور جب پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے تو نمک باقی رہ جاتا ہے۔ نتیجے میں کافی بڑے علاقے شور ریت کی وجہ سے زراعت کے لیے بے کار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں تہران میں شور ریت کے مسئلے پر ایک سیمنار ہوا۔ جس میں مجھے بھی شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ دوسرے وفود کے ساتھ وہاں الجزائر اور روس کے مندوبین بھی تھے۔ ان لوگوں نے بھی اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دوسرے طریقے سے الجزائر میں کافی وسیع علاقوں میں شور پایا جاتا ہے۔ اُنہوں نے فصلوں کی ایسی قسمیں دریافت کی ہیں جو ایسی زمینوں میں نہایت اچھی طرح اُگ سکتی ہیں۔ اسی طرح روسی مندوب نے ہمیں تصاویر کے دو طرح کے سلائیڈ دکھائے جن میں کپاس کی فصل کو زرخیز اور شور زدہ زمینوں میں الگ الگ اُگایا گیا تھا۔ ان تصاویر سے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ شور زدہ زمین والی فصل اچھی زمین کی فصل سے بھی بہتر ہے۔ لہٰذا ہمارے محکمۂ زراعت کے لیے غالباً اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ نل کنویں اور نکاسی نالیوں کے روایتی بازیابی کے طریقوں کے علاوہ فصلوں کی ایسی قسمیں بھی دریافت کریں جو مختلف شور زدہ علاقوں کے لیے موزوں ہوں۔

مغربی پاکستان کے دریاؤں میں، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، پانی کی کثیر مقدار ہوتی ہے۔ تخمینہ یہ ہے کہ تقریباً ۱۶۱٫۴ کروڑ ایکڑ فیٹ پانی سال کے دوران ان دریاؤں میں بہتا ہے۔ اس ۱۶۱٫۴ کروڑ فیٹ ایکڑ پانی کا کم و بیش ۹٫۶ کروڑ فیٹ زمین میں جذب ہونے سے اور تبخیر کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ ۶٫۱ کروڑ ایکڑ فیٹ بہہ کر بحیرۂ عرب میں چلا جاتا ہے اور صرف ۳٫۱ کروڑ ایکڑ فیٹ یعنی ایک چوتھائی فصلوں کے استعمال میں آتا ہے۔ اس طرح ہمارے پانی کی خاصی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔ دریائے سندھ اکیلا ہی پانی کی اتنی مقدار کا حامل ہوتا ہے جو سارے دوسرے دریاؤں کے مجموعی مقدار سے زیادہ ہوتی ہے اگرچہ ہم نے دریاؤں کے اُوپر بیراج بنا لیے ہیں لیکن پھر بھی ابھی تقریباً ۶٫۱ کروڑ ایکڑ فیٹ پانی سالانہ ضائع ہو جاتا ہے جس کو مصرف میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دریائی پانی کے سلسلے میں آپ کی توجہ ایک اور اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا تو اُس وقت ایک عدالت خصوصی بھی قائم کی گئی تھی جس کا کام پاکستان اور ہندستان کے درمیان اُن اختلافات کا تصفیہ کرنا تھا جو تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو اِس خصوصی عدالت کی معیاد ختم ہوگئی۔ اِس عدالت خصوصی کی معیاد ختم ہونے پر دوسرے ہی دن ہندستان نے نہری پانی بند کر دیا اور ہماری فصلیں خشک ہو کر رہ گئیں۔ اس مسئلے کے حل کی خاطر کئی سال تک گفت و شنید ہوتی رہی اور آخر کار عالمی بنک کی مدد سے پانی کی تقسیم کے متعلق فیصلہ ہوا۔ جو معاہدہ آب نہری میں منضبط ہے۔ یہ جھگڑا بلا وجہ پیدا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ کھڑا ہی نہ ہوتا اگر حد بندی بین الاقوامی دریاؤں کے روایتی انداز کے مطابق کی جاتی اور اس میں نہری نظام کو مدِ نظر رکھا گیا ہوتا۔ خطِ حد کو دریائے ستلج کے بیچ سے گزرنا چاہیے تھا، وہاں تک جہاں یہ بیاس سے ملتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اِس خطِ حد کو اس طرح کھینچا گیا کہ جہاں ستلج پاکستان کی حد میں داخل ہوتا ہے۔ وہ علاقہ ہندستان کے حصے میں دیا گیا۔ لہذا ہندستان نے دریائے ستلج پر اس جگہ بند باندھ کر اس کے پانی پر قابو پا لیا۔ اگر خطِ حد دریائے ستلج کے بیچوں بیچ گزرتا اور دریا اس مقام پر پاکستان اور ہندستان دونوں کے قبضے میں ہوتا تو نہری پانی کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر خطِ حد روپڑ ہیڈ ورکس تک دریائے راوی کے بیچ سے گزرتا تو اس کی وجہ سے ہماری بالائی باری دوآب کی نہریں محفوظ ہو جاتیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ مشرقی پاکستان اور برما کے درمیان دریائے نّاف میں حد بندی کی لائن اِسی طرح اس کے بیچوں بیچ سے کھینچی گئی ہے۔ تقسیم کے وقت ایک اور بڑا مسئلہ پیدا کر دیا گیا۔ جب رڈکلف کی سربراہی میں سرحدی کمیشن کا تقرر ہوا تو اصولِ تقسیم اور حد بندی یہ تھا کہ صوبہ پنجاب کو آبادی کی اکثریت کی بناء پر پاکستان اور ہندستان میں تقسیم کیا جائے۔ اس حد بندی میں مقامی ضروریات کے لحاظ سے صرف تھوڑی بہت ہی ترمیم کی جا سکتی تھی۔ چناں چہ وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی پاکستان کو ملنے تھے۔ اور باقی ہندستان کو۔ ضلع گورداس پور جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، نہایت ہی اہم ضلع تھا۔ یہ پاکستان کو ملنا چاہیے تھا۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اِس سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی بہت ہی کم اکثریت ہے اِس لیے یہ پورا ضلع پاکستان کو نہیں دیا جا سکتا۔ چناں چہ گورداس پور کے ضلعے کو تقسیم کر دیا گیا۔ اور پٹھان کوٹ، کی ہندو اکثریت کی تحصیل ہندستان کے حوالے کر دی گئی۔ اِس تحصیل کے ذریعے ہندستان اور کشمیر کے درمیان رابطہ نہ ہوتا، اور پھر ہندستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا سوال پیدا

ہی نہ ہوتا۔ پٹھان کوٹ ہندستان کو دے کر اور کشمیر اور ہندستان کے درمیان براہ راست رابطہ قائم کر کے کشمیر کو موقع دیا گیا کہ وہ ہندستان کے ساتھ الحاق کر سکے۔ اس طرح ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہمیں ورثہ میں ملا جس کا حل ہم ابھی تک تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ جان بوجھ کر پیدا کیا گیا تھا۔ تاکہ ہندستان اور پاکستان آپس میں جھگڑتے رہیں اور اس کے حل کے لیے مغرب کے دستِ نگر رہیں۔

جب ہم مشرقی پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک دوسرا منظر نظر آجاتا ہے۔ اگر ہم مشرقی پاکستان کے اوپر پرواز کریں تو ہمیں سینکڑوں دریاؤں کا ایک جال سا بچھا نظر آتا ہے، اور برسات کے موسم میں یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا ہم کسی خشکی کے حصے پر پرواز کر رہے ہیں یا سمندری حصے پر۔ سینکڑوں میل زمین پانی کے اندر ڈوبی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے شمال میں آسام کی پہاڑیوں میں مون سون سے بے حد بارش ہوتی ہے۔ وہاں ایک دن میں ۲۵" سے ۳۰" بارش کوئی زیادہ غیر معمولی بات نہیں۔ خود ہمارے ضلع سلہٹ کے ایک مقام پر ڈھائی سو انچ سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔

ہمارے لیے مسئلہ یہ ہے کہ اس سارے پانی کا جو مشرقی پاکستان میں برستا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ جو آسام کی پہاڑیوں سے آتا ہے کیا کیا جائے۔ جگہ جگہ چھوٹی بڑی جھیلیں بن گئی ہیں۔ جن کو بھیل کہتے ہیں۔ یہ صوبے بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر آپ کو برسات کے موسم میں دیہی علاقے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہو تو آپ کو کشتی کے ذریعے جانا پڑے گا۔ کھیتوں میں بھی پانی بھر جاتا ہے اور اس میں مچھلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے بہت مختلف ہے۔ یہ ایک سیلاب زدہ علاقہ ہے، ایک بہت بڑا ڈیلٹا ہے جو سمندر سے اوپر کی طرف بڑھتا چلا گیا ہے۔ اس وسیع ڈیلٹا میں دریا اپنے اپنے فرش کی تعمیر میں مصروف ہیں جس کی وجہ سے سیلاب آتا رہتا ہے۔ راستے میں جگہ جگہ مٹی جمع ہو جانے سے دریا برابر اپنے راستے بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی پرانی گزرگاہوں میں جھیلیں بن جاتی ہیں۔

مشرقی پاکستان میں کل ۵۴ ہزار میل رقبے میں سے قریب تین ہزار مربع میل میں زمین پانی کے اندر رہتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں مال گزاری کے خاص طور پر ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ جن میں دریاؤں کے بدلتے ہوئے راستوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ ایسے ماحول میں ظاہر ہے وہاں کے لوگوں کا طرزِ حیات بھی ہم خشک علاقے میں رہنے والوں سے مختلف ہو گا۔ وہاں نہ صرف بارش زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ ہوا میں رطوبت بھی خوب

رہتی ہے۔ ہماری برسات جیسی وہاں کی مرطوب گرمی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اِس لیے لوگ وہاں جسمانی اعتبار سے اتنے طاقت ور نہیں ہوتے۔

شروع میں مَیں نے آپ سے پٹ سن کی فصل کا تذکرہ کیا تھا۔ اِس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ کافی نئی مٹی ہر سال جمتی ہے۔ دوسرا پہلو یہ کہ ایک بنگالی ہی ایسے سخت سیلاب نُما حالات میں کام کر سکتا ہے۔ وہ کمر تک پانی میں کھڑا ہو کر کام کرتا ہے۔ جسم پر مشکل سے ایک لنگی ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ پٹ سن کا ریشہ علاحدہ کرنے کے لیے اس کی ڈنڈیوں کو بھگونا ہوتا ہے تاکہ چھال پھول جائے۔ پانی میں پڑا رہنے سے اِس میں کافی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک بنگالی کے سوا اور کوئی مزدور ایسے حالات میں کام نہیں کر سکتا۔ پھر مزدوری کیا؟ مشکل سے پانچ چھے رُپے ہفتہ! ایک اور چیز جو مشرقی پاکستان کے جغرافیائی حالات میں شامل ہے۔ وہ وہاں کے گرج طوفان ہیں جنھیں Norwesters کہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے نہ صرف خوب بارش ہوتی ہے بلکہ نقصان بھی بہت ہوتا ہے۔ ان طوفانوں میں ہوا کی رفتار بڑی تیز، تقریباً سو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ اس کے زور سے درخت اکھڑ جاتے ہیں، مکانات گر جاتے ہیں اور ٹین کی چھتیں اُڑ جاتی ہیں۔ یہ طوفان گرمیوں میں آتے ہیں۔ ان سے بارش مارچ کے مہینے سے شروع ہو جاتی ہے۔ ان طوفانوں سے بارش کے زمانے کو چھوٹی برسات کہتے ہیں۔ کبھی کبھی مشرقی پاکستان کے ساحلی علاقے میں خلیج بنگال سے بڑے بڑے سائیکلون آتے ہیں جن سے مدّ و جزر پیدا ہوتا ہے اور بڑی بڑی لہریں پیدا ہوتی ہیں جو ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ گاہے بہ گاہے اِن کی زد سے انسانوں اور مکانوں کو بڑا نقصان ہوتا ہے۔ بارش کا خاص موسم جولائی سے ستمبر تک رہتا ہے۔ اس وقت مون سون ہوائیں چلتی ہیں اور چھوٹے بڑے سائیکلون بھی آتے ہیں۔ بارش کا موسم وہاں ستمبر ہی میں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اِس کے بعد بھی اکتوبر نومبر تک رہتا ہے۔ ان دونوں مہینوں میں گاہے بہ گاہے خلیج بنگال سے مداری طوفان آتے رہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں صرف دسمبر، جنوری اور فروری کے مہینے خشک ہوتے ہیں۔ ان دنوں میں موسم خوش گوار ہوتا ہے۔

مغربی پاکستان میں بھی گرمیوں میں گرج طوفان آتے ہیں۔ مون سون آنے سے قبل مئی اور جون کے مہینوں میں ان طوفانوں کی وجہ سے مغربی پاکستان کے اندرونی حصّوں میں کچھ بارش ہو جاتی ہے۔ ان گرج دار طوفانوں کے علاوہ آندھیاں بھی آتی ہیں۔ ان آندھیوں کے طوفانوں میں کبھی کبھی اتنی گرد ہوتی ہے کہ اندھیرا چھا جاتا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس

لیے گرج طوفان کو اندھیری بھی کہتے ہیں۔ لیکن اِن اندھیریوں کا ایک اطمینان بخش پہلو یہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب آندھی آتی ہے تو اس کے بعد موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور ہمیں دو ایک روز گرمی کی سختی سے نجات مل جاتی ہے۔ اکثر آندھیوں کے بعد تھوڑی بہت بارش بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی بارش کے بعد ژالہ باری بھی ہوتی ہے۔ گزشتہ مہینے لاہور کے کچھ حصوں میں اسی طرح اولے پڑے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوا میں خاک موجود ہوتی ہے۔ اس کے ذرّوں کے گرد بخارات آسانی سے ٹھنڈے ہو کر پانی اور اولے بن جاتے ہیں۔

جاڑے کے موسم میں جب کہ مشرقی پاکستان میں موسم خشک ہوتا ہے۔ ہمارے مغربی پاکستان میں گاہے بہ گاہے مغرب سے سائیکلونی طوفان آتے رہتے ہیں۔ جنھیں ہم مغربی طوفان کہتے ہیں۔ ان کی بدولت بعض علاقوں میں خاصی بارش ہو جاتی ہے خصوصیت کے ساتھ ہمارے مغربی پاکستان کے شمالی حصوں میں بارانی بارش کا دار و مدار زیادہ تر ان ہی مغربی طوفانوں کی بارش ہوتا ہے، اور ظاہر ہے زراعت کے لیے یہ طوفان بڑے خوش آئند ہوتے ہیں۔

مسائلِ معیشت

اب میں اپنے ملک کی معیشت کی طرف آتا ہوں۔ زراعت کے لحاظ سے ہمارا ملک نہایت ہی خوش قسمت ہے۔ یہاں ہم دونوں حصوں میں ملا کر ہر قسم کی فصل پیدا کر سکتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں ہم ایسی فصلیں اُگاتے ہیں جو شدید اور خشک آب و ہوا میں خوب پنپتی ہیں، اور مشرقی پاکستان میں ایسی فصلیں اگاتے ہیں جو مرطوب آب و ہوا میں پروان چڑھتی ہیں۔ ہمارے پاکستان میں کل ۶،۲ کروڑ ایکڑ زمین زیرِ کاشت ہے۔ ۴½ کروڑ ایکڑ مغربی پاکستان میں اور تقریباً دو کروڑ ایکڑ مشرقی پاکستان میں۔ مغربی پاکستان کے ساڑھے چار کروڑ ایکڑ میں ۳،۲ کروڑ ایکڑ نہری ہے۔ اس میں قریباً ڈھائی کروڑ ایکڑ پر ہر سال آب پاشی ہوتی ہے۔ یہ رقبہ دنیا کے زیرِ آب پاشی علاقے کا تقریباً بارہ[12] فی صد ہے۔ اس طرح بظاہر یہاں کافی علاقہ نہری ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ آبادی کے بڑھنے سے ہماری پانی کی ضرورت بھی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اور آبادی کا بار زمین پر برابر بڑھ رہا ہے۔ زمین پر جیسے جیسے بار بڑھتا جا رہا ہے ویسے ویسے آب پاشی کے لیے پانی کی تقسیم بھی زیادہ سے زیادہ کی جا رہی ہے۔ اس طرح نہری پانی

کے استعمال کی وسعت بڑھ رہی ہے، اور ہر کھیت کو اتنا پانی نہیں ملتا جتنی اس کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے جہاں ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ آب پاشی کے وسائل بڑھائیں۔ اور زیرِ کاشت زمین میں اضافہ کریں وہاں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ پانی کی بہم رسانی میں اضافہ کر کے صرف زیادہ اراضی ہی زیرِ کاشت نہ آئے۔ بلکہ جو زمین پہلے سے زیرِ کاشت ہے اُس کو بھی ضرورت کے مطابق پانی مل سکے۔ یہ مغربی پاکستان کا اہم مسئلہ ہے۔ آبادی میں اضافہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم غذائی وسائل بڑھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن آبادی میں اضافے کی رفتار بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے کوئی صورت کارگر نظر نہیں آتی۔ پچھلے ساٹھ سال کے عرصے میں مغربی پاکستان کی آبادی تقریباً دگنی ہو گئی ہے۔ لیکن غذائی وسائل میں اتنا اضافہ نہیں ہو سکا۔ لہٰذا ہمیں اپنی زمین کو بہتر بنانا ہے۔ ہمارے ملک میں فی ایکڑ پیداوار دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی نسبت بہت کم ہے۔ ہم کو بیک وقت دو مسئلوں کا سامنا ہے: یعنی قابلِ کاشت اراضی میں اضافہ کرنا اور دوسرے موجودہ زیرِ کاشت زمین کی پیداوار کو بڑھانا ہے۔ آپ کو یہ جان کر غالباً تعجب ہو گا کہ مغربی پاکستان میں زرعی زمین کی تقسیم صرف اعشاریہ نو ایکڑ فی کس پڑتی ہے۔ اور مشرقی پاکستان میں اس سے بھی کم یعنی صرف ۴ء۵ ایکڑ فی کس ہے۔ اس امر کے باوجود کہ مغربی ممالک کے مقابلے میں ہمارا معیارِ زندگی بہت پست ہے موجودہ زیرِ کاشت زمین ناکافی ہے۔ حکومت پوری کوشش کر رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ زمین زیرِ کاشت لائی جائے اور فی ایکڑ پیداوار بھی بڑھائی جائے۔ حکومت کی طرف سے کاشت کاروں کو تقاوی ملتی ہے جس سے وہ ٹیوب ویل کنوئیں لگاتے ہیں۔ بیج اور کھاد کے لیے حکومت قرضے دیتی ہے، اور ہر وہ کام جو انسان کے بس میں ہے کیا جا رہا ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ نہروں میں ہر سال توسیع کی جا رہی ہے۔ دریاؤں اور نہروں سے نہ صرف آب پاشی کا فائدہ ہے۔ بلکہ اُن میں بہت سے مناسب مقامات پر پن بجلی پیدا کی جا رہی ہے اور برقی طاقت بڑھائی جا رہی ہے ۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت پن بجلی کے منصوبوں کی تعمیری گنجائش صرف ۱۰،۷۰۰ کلوواٹ تھی۔ ۱۹۶۲ء تک ۲۰۰،۳۴۷ کلوواٹ ہو گئی ہے جس جگہ پر ہمارے دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں وہاں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں پن بجلی بڑی مقدار میں پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح نہروں کے آب شاروں سے پن بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ آب پاشی کی ترقی اور پن بجلی کی روز افزوں فراہمی ”واپڈا“ کے نمایاں کارنامے ہیں۔

اناج کی فصلوں میں اہم مغربی پاکستان میں گیہوں ہے اور ریشوں میں کپاس۔ ان دونوں فصلوں کی آپس میں خاصی رقابت ہے۔ کاشت کار اپنے مفاد کی خاطر دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتا ہے۔ دونوں فصلوں کو آب پاشی کی ضرورت ہوتی ہے اور اتفاق سے ان اراضیوں میں صرف تھوڑا حصہ بارانی ہے۔ اور اس طرح ماحول دونوں کے لیے یک ساں طور پر سازگار ہے۔ ایک تیسری فصل جس کو آزادی کے بعد فروغ حاصل ہوا ہے گنا ہے۔ مغربی پاکستان کے کئی علاقے گنے کی کاشت کے لیے خاصے موزوں ہیں، اور ہم گنے کی ایسی قسمیں دریافت کرنے میں کام یاب ہو گئے ہیں جو مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں جیسی سرد آب و ہوا میں اُگائی جا سکتی ہیں جن میں پشاور کا میدان بھی شامل ہے۔ ان علاقوں میں جہاں آب پاشی کے لیے پانی ملتا ہے، گنے کی کاشت، وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہم کو یہ بات بھی یاد رہے کہ مشرقی پاکستان گنے کی کاشت کے لیے مغربی پاکستان سے اور بھی زیادہ موزوں ہے، اس لیے کہ وہاں پالا نہیں پڑتا اور پانی کی کثیر مقدار بھی پائی جاتی ہے۔ اصولاً مشرقی پاکستانیوں کو بہت زیادہ گنا اُگانا چاہیے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں چاول، پٹ سن اور گنا تینوں فصلوں میں مقابلہ سا ہے۔ مواصلات کی خرابی کی وجہ سے مشرقی پاکستان کا کسان پہلے کھانے کے لیے چاول اُگاتا ہے۔ اور اگر اُسے نقدی فصل چاہیے تو وہ پٹ سن اُگاتا ہے۔ اس طرح اس ماحول میں اصل مقابلہ صرف چاول اور پٹ سن کی فصلوں کے درمیان ہے حالاں کہ ماحول گنے کی کاشت کے لیے سازگار ہے۔ پھر بھی گنا ایک پس ماندہ فصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک اور فصل ہے جو خصوصیت کے ساتھ ضلع سلہٹ میں اگائی جاتی ہے۔ وہ ہے چائے۔ ہم چائے کی کافی زیادہ مقدار پیدا کیا کرتے تھے۔ تقریباً ۵½ کروڑ پونڈ۔ اس سے ہمیں غیر ملکی زرمبادلہ کافی ملتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے چائے کی زیادہ برآمد نہیں کی جا سکتی کیوں کہ خود ہمارے ملک کے اندر ہی چائے کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔ ہمارے عوام بھی کافی چائے پینے لگے ہیں۔ چائے کی زمین میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت نے چائے برآمد کا ایک کوٹا مقرر کر دیا ہے۔ بہ ہر حال یہ ایسی فصل ہے جس میں ہمیں کچھ دھکا لگا ہے۔ اور ابھی زیادہ کام یابی نہیں ہوئی ہے۔

معدنی وسائل

اب ہم پاکستان کے معدنی وسائل پر روشنی ڈالیں گے۔ پاکستان کے وجود میں

آنے سے پہلے اراضیاتی مساحتیں کی گئی تھیں مساحتی پارٹیاں مختلف حصوں میں بھیجی گئی تھیں۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ علاقے جس میں ہمارے معدنی وسائل اچھے تھے پس پشت ڈال دیے گئے تھے اور ان علاقوں میں زیادہ معدنیات معلوم کی گئیں جو آج کل ہندستان کے حصے میں ہیں۔ جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے اراضیاتی جائزے لیے گئے اور معدنیاتی وسائل کے ذخیرے ملک کے مختلف حصوں میں دریافت کیے گئے ہیں۔ مغربی پاکستان میں کوہِ نمک معدنیات کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کوئلہ اور نمک کے بڑے بڑے ذخیرے اور دوسری معدنیات موجود ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ میں کلسی چٹانوں کی بہتات ہے۔ اور یہاں سنگِ گچ یا جپسم کے تقریباً لامتناہی ذخیرے ہیں۔ جس سے کھاد اور گندک کا تیزاب بنتا ہے۔ یہ دونوں اشیاء ہماری زرعی اور صنعتی ترقی کے لیے بڑی مفید ہیں۔ کوہِ نمک کے علاوہ تھر کے ریگستان میں بھی نمک کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ وہ اتنے زیادہ ہیں کہ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اس طرح اس نمک کی بہتات کے سبب ہمارے پاس کیمیائی صنعتوں کے لیے بڑے وسائل ہیں جنھیں ہم کو ترقی دینی ہے۔ اسی طرح ہمارے پاس گیس کی بھی قریب قریب لامتناہی مقدار موجود ہے۔ اس کا پتا ہمیں تیل کی تلاش کرتے وقت چلا ہے۔ ہمارے مغربی حصے میں گیس کے کئی میدان ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور سوئی کا ہے جو سابقہ بلوچستان کے شمال مشرقی حصے میں واقع ہے اور جو سارے ملک میں گیس کے ذخیروں کا تقریباً ایک تہائی ہے۔ اس میں پانچ ہزار ارب مکعب فیٹ کا ذخیرہ بتایا جاتا ہے۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سوئی گیس پہلے کراچی پہنچائی گئی۔ اور اب عنقریب لاہور میں بھی پہنچ رہی ہے۔ لاہور سے آگے شمال اور مغرب کی طرف سے یہ گیس اسلام آباد تک پہنچائی جائے گی۔ اب یہ منصوبہ بنایا جا رہا ہے کہ اس گیس کو کیمیائی صنعتوں میں بھی استعمال کیا جائے۔ سارے ملک میں ذخائر کا اندازہ تقریباً پندرہ ہزار ارب مکعب فیٹ ہے۔ اس میں دس ہزار ارب مکعب فیٹ عمدہ گیس ہے جسے نکال کر استعمال کے لیے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ یہ تقریباً ۲۱ کروڑ ٹن تیل اور ۳۲ کروڑ ٹن کوئلہ اور ۷۵ کروڑ کلوواٹ بجلی کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اس کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے۔ کہ مغربی پاکستان کے جنوبی علاقے میں کوئلہ، تیل اور ایندھن کے دیگر وسائل نہیں تھے۔ اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے گیس مل گیا ہے۔ مغربی پاکستان میں سوئی کے علاوہ اور کئی مقامات پر یعنی زین، اُچھ، خیرپور، کنڈکوٹ، مزارانی سکھر کے قریب پچاس میل شمال میں۔ اور ماڑی میں بھی گیس کے

ذخیرے ملے ہیں۔ لیکن ان سے ابھی استفادہ نہیں کیا گیا گیس کی فراہمی میں خدا نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں مساوات عطا فرمائی ہے۔ کوئلے کی تلاش میں مشرقی پاکستان میں بھی کئی جگہ گیس کے ذخیرے ملے ہیں۔ یہ زیادہ تر ضلع سلہٹ میں ہیں گیس سے وہاں چھاتک میں سیمنٹ کا کارخانہ چلتا ہے۔ حال ہی میں ڈھاکہ کے نزدیک ٹیٹاس میں گیس کا ذخیرہ ملا ہے۔ جس سے ڈھاکہ اور نرائن گنج کے صنعتی علاقے کو بڑی مدد ملے گی۔ مٹی کے تیل کی تلاش بہت سے مقامات پر کی جا رہی ہے۔ فی الحال اِس کی نکاسی ہماری ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔ مٹی کے تیل کے کنویں کوہ نمک کے شمال میں پوٹھوہار پلیٹو میں واقع ہیں۔ یہ زیادہ تر ڈھلیاں اور بلکیسر کے مقام پر سے نکلتا ہے۔ جہاں تک کوئلے کا تعلق ہے ہمارے پاس زیادہ نہیں ہے۔ لیکن حالیہ جائزے کے مطابق مکڑوال ضلع میانوالی میں اچھی قسم کا کوئلہ کافی مقدار میں دستیاب ہوا ہے۔ حال ہی میں کوئلے کا وسیع ذخیرہ مشرقی پاکستان کے بوگرہ ضلع میں بھی ملا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ چالیس کروڑ ٹن کوئلہ وہاں موجود ہے۔ اِس کے علاوہ ایک قسم کا نیم کوئلہ، جس کو پیٹ کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے کئی ضلعوں میں بکثرت ملتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہم لوہے کی کمی کو برابر محسوس کرتے رہے ہیں۔ لیکن خدا کا فضل ہے۔ کہ اب لوہے کے ذخیرے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ میانوالی کے ضلع میں کالا باغ اور ریاست چترال میں لوہے کے عمدہ ذخائر موجود ہیں۔ حال ہی میں بلوچستان میں دال بندین کے مقام پر عمدہ لوہے کا ذخیرہ ملا ہے۔ ان ذخیروں سے ہماری لوہے کی صنعت کو بڑا فروغ ہو گا اور فولادی کارخانوں کے قیام میں مدد ملے گی۔ چناں چہ کالا باغ میں فولاد کا کارخانہ بنانے کی تجویز ہے۔ پاکستان اپنی پیدائش کے وقت صنعتی اعتبار سے بہت پیچھے تھا۔ صرف چند کپڑے کے کارخانے اور دو یا ایک چینی بنانے کے کارخانے تھے۔ اُس حصّے میں جو ہندستان کو ملا خاصی صنعتی ترقی ہوئی تھی۔ چناں چہ غذا ہی خود کفیلی اور دیگر ضروریات زندگی کی بہم رسانی ہمارے لیے ایک بے حد پیچیدہ مسئلہ تھا۔ اللہ کے فضل سے اب صنعتی لحاظ سے ہم کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ کپڑے کی صنعت میں ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ اور اب ہم کپڑے میں نہ صرف اپنی ملکی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔ بلکہ ہم کافی مقدار میں برآمد بھی کر رہے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے وقت ہماری برآمد قریب قریب سب زرعی پیداوار پر مشتمل تھی۔ اور مصنوعات کی برآمد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اب خدا کے فضل سے ہماری برآمدی تجارت میں مصنوعات کا حصّہ تقریباً تیس فی صد ہے۔ چند علاقے صنعتی لحاظ سے نمایاں ہو گئے

ہیں۔ ان میں سے ایک علاقہ کراچی لانڈھی کا ہے۔ دوسرا علاقہ لاہور اور شیخوپورہ کے درمیان ہے۔ تیسرا صنعتی علاقہ پشاور اور نوشہرہ کے شہروں پر مشتمل ہے۔ لائل پور تو پاکستان کا مانچسٹر بن گیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ، نرائن گنج، چٹاگانگ اور کھلنا کے صنعتی علاقے نمایاں ہو گئے ہیں۔ متعدد جگہ صنعتی املاک قائم کی گئی ہیں۔ مغربی پاکستان میں سوتی اور اونی کپڑا اور چمڑے کے کارخانے قائم کیے گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں سوتی اور ریشمی پارچہ بافی اور پٹ سن سے ٹاٹ بوریاں بنانے کے کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ دونوں صوبوں میں شکر سازی کی ملیں بنی ہیں۔ صنعتی ترقی میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی (پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن) کا نمایاں حصہ ہے۔ یہ اب مغربی اور مشرقی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے اس کے علاوہ دوسرے سرکاری محکموں مثلاً صنعتی ترقیاتی بنک، پاکستان کی صنعتی قرض اور سرمایہ کاری کارپوریشن نے صنعتی ترقی میں کافی ہاتھ بٹایا ہے۔

نئی پالیسی کے مطابق صنعتی مراکز کو منتشر کیا جا رہا ہے، تا کہ سب علاقوں کے باشندوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ فیکٹریوں کی صنعت کے ساتھ ساتھ چھوٹی گھریلو صنعتوں کو بھی کافی فروغ دیا جا رہا ہے۔ یہ صنعتیں بھی ہمارے اقتصادی نظام میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں حکومت نے ان کے فروغ کے لیے کئی قدم اٹھائے ہیں اور کئی جگہ مختلف قسم کے مراکز قائم کیے ہیں۔

اس مختصر سے اقتصادی جائزے کے بعد اب میں آپ کی توجہ پاکستان کے جغرافیائی محلِ وقوع کی سیاسی اہمیت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

پاکستان کا محلِّ وقوع ـــــ سیاسی اہمیّت

ہمارے پاکستان کو اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر ہم مغربی پاکستان کے شمال مغرب کی طرف نظر اٹھائیں تو ایک مشہور درّہ ملتا ہے جس کو درّہ خیبر کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے برِّ صغیر سے وسط ایشیا میں افغانستان کے پار روس اور چین کو راستہ جاتا ہے۔ برِّ صغیر ہند و پاکستان کی تاریخ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں جتنے بڑے حملہ آور آئے وہ اسی درّہ کے راستے آئے۔ لہٰذا ہند و پاکستان کا دفاع ایک بڑی حد تک اس درّہ پر مرکوز ہے۔ اس درّہ کی حفاظت اور اس طرح پورے برِّ صغیر کی حفاظت ہمارے شانوں پر ہے۔ انگریز حکومت کو بھی اس درّہ کی اہمیّت کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے علاحدہ کر کے سرحدی صوبہ بنانے کا ایک بڑا مقصد یہی تھا کہ مرکزی حکومت درّہ خیبر اور دوسرے درّوں کی ناکہ بندی کر سکے۔ آج

بھی اس درے کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ انڈو پاکستان کا روس اور چین جیسی دنیا کی دو بڑی طاقتوں سے اسی درے کے ذریعے سے واسطہ ہے۔ اسی طرح جنوب مغرب کی طرف ہمارا درّہ بولان بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں سے گزر کر کوئٹہ چمن سے افغانستان میں قندھار کو راستہ ہے۔ افغانستان کی بیرونی تجارت کا دارومدار زیادہ تر اسی درے پر ہے۔ چناں چہ آپ نے حال ہی میں اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ چمن سے آگے ریل کی پٹری بڑھائی جا رہی ہے۔ اس طرح افغانستان کی بہبود بڑی حد تک ہمارے ساتھ دوستی پر وابستہ ہے۔

کچھ عرصہ ہوا افغانستان کے ساتھ ہمارے تعلقات کشیدہ ہوئے اور کوئٹہ اور پشاور کے راستے تجارت بند ہوگئی تو انھوں نے ایران کے راستے سامان کی برآمد درآمد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں تعلقات بہتر ہونے پر پھر وہ پرانے قدرتی راستے پر آگئے۔

مشرقی پاکستان کے نقشے پر نظر ڈالیے تو ہم دیکھیں گے کہ اس کی پشت پر مشرق میں بھارت کی ریاست آسام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بھارت اور اس حصے کے درمیان آمد و رفت ہمارے مشرقی پاکستان سے ہو کر آسان ہے۔ ورنہ بڑے پھیر سے آمد و رفت ہو سکے گی۔ اس لیے بھارت کو اس حصے میں اپنے ذرائع آمد و رفت بحال رکھنے کے لیے ہمارے ساتھ مل کر چلنا ہے۔

اگر دنیائے اسلام پر نظر ڈالیں تو پاکستان کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے مغرب میں دریائے سندھ کی وادی سے بحر اطلانٹک تک برابر اسلامی حکومتوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ جنوب مغربی ایشیا کے عرب اور غیر عرب ممالک کے ساتھ ہمارا گہرا واسطہ ہے۔ ہماری سنٹو اور آر۔ سی۔ ڈی کی رکنیت اس کا ایک کامیاب مظاہرہ ہے۔

اسی طرح دوسری طرف مشرقی پاکستان کی بدولت ہمارا جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے بڑا تعلق ہے۔ ہمارے پڑوس میں برما، ملیشیا اور انڈونیشیا کی حکومتیں دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ گزشتہ جنگ میں انڈونیشیا نے جس دوستی اور اخوت کا ثبوت دیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس بڑی اسلامی حکومت کے ساتھ باہمی تعاون سے ہم اپنی بحری قوت بڑھا کر بحرِ ہند پر اقتدار قائم کر سکتے ہیں اور اس طرح مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان بحری راستے کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

آبادی

اب میں آبادی کے بارے میں چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق سارے پاکستان کی آبادی نو کروڑ ۳۷ لاکھ تھی۔ اس میں پانچ کروڑ آٹھ لاکھ مشرقی پاکستان کی اور چار کروڑ ۲۹ لاکھ مغربی پاکستان کی تھی۔ اس طرح سے ملک کی تقریباً ۵۴ فی صد آبادی مشرقی پاکستان میں ہے۔ یہ صوبہ نہایت ہی گنجان ہے۔ ایک مربع میل میں ۹۲۲ اشخاص بستے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کا نہایت ہی گنجان آباد علاقہ ہے۔ یہاں معیارِ زندگی عام طور پر پست اور تولید زیادہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں کا معیارِ زندگی بھی اچھا ہو جائے گا اور آبادی میں بھی کمی ہوگی۔ مغربی پاکستان میں ایک مربع میل میں صرف ۱۳۸ افراد رہتے ہیں۔ یہاں آبادی کی کمی کے مختلف اسباب ہیں۔ ذرائع رسل و رسائل کم ہیں۔ ریلیں اور سڑکیں عام طور پر زرخیز علاقے تک محدود ہیں۔ چنانچہ پہاڑی اور ریگستانی علاقے جہاں نقل و حرکت میں دقت ہے کم آباد ہیں۔ سارے مغربی پاکستان کے ۵۵ فی صدی رقبے میں صرف سات یا آٹھ فی صد آبادی ہے۔ اور اس سے یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں آبادی کی "گنجانیت" کے لحاظ سے بہت فرق ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں ترقیاتی کاموں کے اعتبار سے بھی علاقے غیر یکساں نظر آتے ہیں۔

لیکن جب سے مغربی پاکستان کے سارے علاقے کا ایک صوبہ بنایا گیا ہے پس ماندہ علاقوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ سارا مغربی پاکستان نہایت ہی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے جس کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سارے وسائل ایک جگہ اکٹھے کر لیے گئے ہیں۔ زراعت کو خصوصیت کے ساتھ کافی فائدہ ہوا ہے۔ آپ نے امریکا میں ٹنسی ریلی اتھارٹی کا نام سنا ہوگا جو کافی مشہور ہے۔ دریائے ٹنسی کئی ریاستوں سے ہو کر گزرتا ہے اور اس اتھارٹی نے ساری وادی کو اکٹھا ترقی دی ہے۔ اسی طرح ہم اس بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ دریائے سندھ مغربی پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہتا ہے اس کے پانی کو ملک کی بہبود کے لیے اجتماعی طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ زراعت کو ترقی دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم طاس سندھ کو ایک یونٹ اور ایک معیشت کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اکٹھے وسائل سے پس ماندہ علاقوں کو ترقی دینے کے لیے کافی زیادہ رقم خرچ کی جا رہی ہے۔ چناں

خوش حالی نہ صرف ان علاقوں تک محدود ہے جو پہلے ہی ترقی یافتہ تھے بلکہ ان میں بھی پائی جاتی ہے جو پہلے غیر ترقی یافتہ تھے۔ مشرقی پاکستان شروع سے ہی ایک صوبہ ہے اس کی ترقی کے لیے نہ صرف وہاں کے سارے وسائل حاصل ہیں بلکہ مرکزی حکومت بھی وہاں خاص طور پر مدد کر رہی ہے تاکہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی اقتصادی ترقی میں ہمارے شانہ بہ شانہ چل سکیں اور اس طرح سارے ملک کی فلاح ہو! ہمارے ایک یونٹ کے وجود نے قومی زبان کے مسئلے کو بھی حل کر دیا ہے۔ یہاں کی زبان اُردو ہے جو تقریباً ہر جگہ مغربی پاکستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں بھی اُردو زبان کے بولنے اور سمجھنے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ دوسری قومی زبان بنگالی ہے جو مشرقی پاکستان میں عام ہے۔ انگریزی دونوں حصوں میں تعلیم یافتہ طبقہ بول سکتا ہے۔ اب مغربی پاکستان میں بنگالی اور مشرقی پاکستان میں اُردو کی بہ حیثیت ایک ثانوی زبان کے ترویج کی طرف کوشش کی جا رہی ہے۔ دونوں صوبوں میں میل جول نہ صرف بڑھ رہا ہے بلکہ ہم تیزی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گام زن ہیں۔ اِسلامی اخوت کے علاوہ قومی مسائل کا صحیح ادراک اور ہوش مندانہ تجزیہ اور مناسب انتظامی اقدام نے دونوں طرف کے لوگوں میں یک جہتی پیدا کر دی ہے جس کی بناء پر ہمیں یقین کامل ہے کہ ہمارے دونوں صوبوں کے افراد مکمل اتفاق کے ساتھ ترقی کی راہوں پر نظم و یقین کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ گزشتہ جنگ نے دِکھلا دیا ہے کہ ہم کس حد تک ایک ہیں اور کہاں تک ہماری اور اُن کی زیست اِس یگانگت کے ساتھ وابستہ ہے۔ جغرافیائی ماحول کا تنوع اور لوگوں کی یگانگت اور یک جہتی ہماری کام یابی کی ضامن ہے۔ اور اسی میں ہمارا مستقبل درخشندہ ہے۔

پاکستان پائندہ باد!

شامِ ہمدرد۔ لاہور

۲ر جون سنہ ۱۹۶۶ء

خانم مریم بہنام

آج کی یہ شام اس اعتبار سے خاص طور پر ممتاز اور یادگار ہے کہ پہلی مرتبہ یہاں ایک خاتون تخاطب فرما رہی ہیں، اور دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ہماری یہ عزیز اور محترم خاتون اُس خطۂ خاک سے تعلق رکھتی ہیں جو دنیا کے نقشے پر ایران کے نام سے معروف ہے۔ ایران کا نام ہمارے لیے ایک ولولۂ تازہ ہے۔ ایک عزم جوان ہے۔ دعوتِ دوستی، اور روحانی ارتباط کا ایک ناقابلِ انفصال رشتہ ہے۔ اس حقیقت کو ہم کسی طرح فراموش نہیں کر سکتے کہ جب پاکستان کا تصور قائداعظم محمد علی جناح نے پیش کیا تو ساری دنیا نے اسے ایک ناممکن مطالبہ سمجھا، لیکن وہ ایران ہی تھا جس نے اس تصور کی تائید و حمایت، سرکاری، نیم سرکاری اور عوامی طور پر کی۔ یہ حقیقت بھی کسی طرح لوحِ دل سے محو نہیں ہو سکتی کہ جب بہار، کلکتہ، گڑھ مکتیسر اور دوسرے مقامات پر

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو

تو وہ ایران ہی تھا جس نے مسلمانوں کے اس قتلِ عام پر احتجاج کیا۔ وہاں کے عوام نے برہمی اور ناراضی کا اظہار کیا اور وہاں کے اخبارات نے ان انسانیت سوز اقدامات پر نہایت صفائی اور بے باکی کے ساتھ مضامین اور مقالات لکھے۔ اور تاریخ اس روح پرور واقعہ کو بھی ہمیشہ یاد رکھے گی کہ جب پاکستان کی جنگ لڑی جا رہی تھی، جب برِصغیر کے مسلمانوں نے اس جنگ کو جیتنے کے لیے، ہر چیز داؤں پر لگا دی تھی تو وہ ایران ہی تھا جس نے دلیری اور سچائی کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا اور اس کی ذرا پروا نہ کی کہ بین الاقوامی طور پر اس طرزِ عمل کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟ اور تاریخ کے صفحات پر زرّیں الفاظ میں یہ واقعہ بھی ثبت ہے کہ جب پاکستان پر بھارت نے بین الاقوامی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اعلانِ جنگ کیے بغیر اور الٹی میٹم دیے بغیر پوری قوت سے مسلح حملہ کیا تو وہ ایران تھا جس نے ممکن طور اپنے جملہ وسائل و ذرائع پاکستان کے لیے وقف کر دیے۔ اس نے صرف اخلاقی امداد پر اکتفا نہیں کی مادی امداد سے بھی دریغ نہیں کیا۔

سچ پوچھیے تو یہ بات کچھ حیرت انگیز بھی نہیں، تہذیب، تمدّن، معاشرت، ثقافت، عقیدہ، تاریخ کون سی چیز ہے جو ہم میں اور ایران میں مشترک نہیں ہے؟ اور ہمارے اس اشتراک کی تاریخ چودہ سو سال پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، اصول، تصوف، فلسفہ، منطق، ادب، شاعری ہر گوشۂ حیات میں ایران کے آثار و نقوش موجود ہیں اور وہ اتنے تابناک اور روشن ہیں کہ کسی طرح اور کسی قیمت پر بھی انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان اور ایران کے مابین جو ربط و تعلق ہے وہ جغرافیائی بھی ہے، روحانی بھی ہے، تاریخی بھی اور فکری بھی اور چودہ صدیوں کی اس طویل مدّت نے اس ربط کو اس درجہ قوی، محکم اور ناقابلِ شکست کر دیا ہے کہ بجا طور پر ملّتِ ایران اور ملّتِ پاکستان کو ایک ہی ملّت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم دونوں ماضی میں ایک تھے، آج بھی ایک ہیں اور آج شاید پہلے سے زیادہ، اور مستقبل میں بھی ایک ہی رہیں گے۔ اور بلاشبہ ہمارا مستقبل ہمارے حال سے تابندہ تر ہوگا۔

شامِ ہمدرد کی مہمانِ خصوصی اسی ایران کی دخترِ بلند اختر اور ملّتِ ایران کی ایک مقتدر رکن خانم مریم بہنام نے ایران کے ایک ایسے خاندان میں شعور کی آنکھ کھولی جہاں بچّوں کی تعلیم و تربیت صرف گھر کی چار دیواریوں سے باہر نہیں ہو سکتی تھی۔ جہاں پردے کی اتنی سختی اور پابندی تھی کہ عورتوں کی آواز تو کجا چوڑیوں کی آواز تک کا پردہ تھا۔ یقیناً یہ انتہا پسندانہ ماحول تھا اور اس کا ردِّ عمل بھی لازمی تھا۔

خانم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خواتین کو اس ماحول سے قدم باہر نہیں رکھنا چاہیے کہ جو حزم و احتیاط کا ضامن ہو اور جہاں عورت کی عظمت اور وقار برقرار رہے۔ اس کی نسوانیت پر حرف نہ آئے۔ ساتھ ہی ساتھ ملک و ملّت کی خدمت کے تمام مواقع بھی موجود ہوں۔ چناں چہ اپنے خاندان میں وہ پہلی لڑکی تھیں جو سکول میں داخل ہوئیں اور اس کے بعد بڑی سُرعت اور وقار کے ساتھ تعلیم اور سوشل کاموں میں حصّہ لینے لگیں اور خواتینِ ایران کی گراں مایہ خدمات انجام دینے کے باعث اپنے ملک کی ایک اہم شخصیت بن گئیں۔

خانم وزارتِ تعلیم کی ایک اہم رُکن رہی ہیں۔ ہوم اکونومک سپر وائزر کے عہدے پر فائز رہنے کے علاوہ ایران کی سن سوسائٹی کی سوشل ڈائریکٹر بھی رہی ہیں۔ صوبۂ فارس میں لڑکیوں کی فزیکل ٹریننگ کی ڈائریکٹر رہ چکی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایرانی خواتین کی جدوجہد کے نتیجے میں شہنشاہِ ایران نے خواتین کو جو تاریخی حقوق عطا کیے ان کے پس منظر میں خانم مریم بہنام کی مساعیٔ جمیلہ بھی کار فرما تھیں۔ ۱۹۶۳ش میں ایرانی خواتین کے ہفت روزہ اخبار "اطلاعات بانوان" نے اپنے نوروز ایڈیشن میں خانم کو دخترِ مروارید کا خطاب دیا تھا۔

شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں کہ قیامِ پاکستان سے پہلے خانم مریم بہنام اسی کراچی میں اُس وقت اقامت پذیر تھیں جب قائدِ اعظم ایک مسلم ریاست کے حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو پرچمِ ہلالی کے نیچے جمع کر رہے تھے۔ خانم مریم بہنام نے اس جدّوجہد میں مجاہدانہ حصّہ لیا اور کراچی کی خواتین میں اپنی پُرمغز اور پُرجوش تقریروں اور تحریروں سے ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ اس طرح مجاہدینِ استقلال و قیامِ پاکستان کی صفِ اوّل میں ہماری یہ ایرانی بہن ماہِ عالم تاب کی طرح جلوہ گر نظر آنے لگیں۔

خانم مریم بہنام انگریزی اور عربی پر اچھا عبور رکھتی ہیں اور اُردو پر تو اس درجہ ہے کہ ہم میں سے کئی ان کی سلاست، روانی اور شگفتگیٔ بیان پر رشک کریں گے۔ فارسی زبان ہمارے لیے صدیوں سے ایک ذریعۂ فکر و فہم رہی ہے اور ہم نے اس چشمے سے ہمیشہ اکتسابِ فیض کیا ہے، غالباً اسی اکتسابِ فیض کا نتیجہ ہے کہ خانم صاحبہ آج اُردو زبان میں "ارتباطِ دائمیٔ ایران و پاکستان" کے موضوع پر خطاب فرمائیں گی۔

حکیم محمد سعید

ارتباطِ دائمی ایران و پاکستان

محترمہ خانم مریم بہنام
ناظمۂ امور خانہ فرہنگِ ایران، لاہور

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہ محمد والہ واصحابہ اجمعین وعلیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین محمد۔

دانش مندانِ عالی قدر حضارِ محترم!

مفتخر ہوں کہ سرورِ معظم حکیم محمد سعید صاحب نے مجھے یہ موقع دیا کہ آپ صاحبانِ علم کے ساتھ کچھ گفتگو کروں۔ میں عام طور پر خیالات کا اظہار فارسی میں کرتی ہوں، مگر آج یہ حکم ہوا ہے کہ اُردو میں بولا جائے، لہٰذا میں اس حکم کی تعمیل کرتی ہوں۔

حکیم صاحب نے میرے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ ازراہِ قدر افزائی ہے اور ان کی عالی اور بلند شخصیت کا ایک اور ثبوت ہے "وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم"۔ بہ ہر حال میں ان کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

دین کی بنیاد

سب سے پہلے اجازت چاہتی ہوں کہ دین اسلام سے متعلق چند کلمات عرض کروں۔

دین ایک ایسے عقاید و دستورہای عملی خاص کا نام ہے کہ ایک جماعت دل و جان سے اس کی پابند و معتقد ہے۔ دین کا لانے والا خدا کی طرف سے پیغمبر ہوتا ہے۔

ہر فردِ بشر کی احتیاج ہے کہ اپنے اندر ایک عہدِ غیبی کے لیے جذبۂ پرستش محسوس

کرتا ہے۔ انسان ایک موجود زندہ ہے، اس کا لازمہ حیات شعور و ادراک ہے۔ وہ اپنی ہستی سے باخبر ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود اپنا مالک و خالق نہیں، کسی اور سے وابستہ ہے۔ اس میں نہ یہ طاقت ہے کہ اپنے آپ کو اس دنیا میں لائے اور نہ یہ قدرت کہ اس دنیا سے لے جائے۔ وہ کسی ایسی عظیم ہستی کا محکوم ہے جو اسے کسی نامعلوم مستقبل کی طرف لیے جا رہی ہے۔ اس موجود کو اپنی ہستی سے بے انتہا محبّت ہے اور اپنی خیر و سعادت کے لیے اس قوتِ عظیم کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا ہے۔ اس سے استمداد کرتا ہے اور یہی جذبہ اور یہی احتیاج اس کے لیے دین کی بنیاد ہے۔

توحید و بت پرستی

بنی نوعِ انسان جس کی ذات میں یہ فطری احتیاج ہے اس کے شعور و فہم کا پایہ تمام افراد میں یکساں نہیں۔ اس کی زندگی ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ کبھی کسی چیز کو اپنا خالق سمجھتا رہا ہے اور کہیں مختلف رنگوں میں اپنا تخیلات کا مرکز بنا چکا ہے اور اپنے آفریدگار کے بارے میں معنوی اور روحانی احتیاجات کے لیے کچھ تصوّرات قائم کرتا رہا ہے۔ اس لیے دین کی دو راہیں ہو گئیں۔ ادیان بت پرستی اور ادیان توحید۔ بت پرستی وہ طریقہ ہے جس میں حیوان پتّھر، لکڑی، ستارے، آگ وغیرہ کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ اشخاص بھی دراصل سکونِ روح کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

ادیان توحید سے مراد دین اسلام اور بعض دوسرے توحیدی دین ہیں جن کے ماننے والے اپنے اپنے رنگ میں خدائے واحد، اس کے فرستادہ پیغمبر، نازل کردہ کتاب اور تسلیم کردہ آئین کو مانتے ہیں۔

دینِ اسلام کا تعارف

دین اسلام ایک ایسا مجموعہ عقاید و آداب و احکام ہے جو تقریباً چودہ سو برس پہلے حضرت محمّد بن عبداللہ صلی اللہ و آلہ وسلّم پر وحی کے ذریعے انسانیت تک پہنچایا گیا۔ یہ خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس دین کی کتاب آسمانی قرآن کریم ہے جو تقریباً ۲۳ سال تک تدریجاً پیغمبر اکرم پر نازل ہُوا اور آں حضرتؐ ہی کے زمانے میں مصحف کی صورت میں محفوظ ہُوا اور آج تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہُوئی ہے اور نہ ہو گی۔

معنای اسلام

اس دین کا نام قرآن کریم نے اسلام رکھا ہے یعنی تسلیم بہ خالق ذوالجلال والاکرام اور اس

کے احکام کی دل وجان سے اطاعت کرنا۔
مسلم کے تین معنی ہیں: اوّل: صلح واشتی دوم: سلامتی وتندرستی سوم: اطاعت وتسلیم بہ خالق دو جہان۔

معنای مسلم یا مسلمان

مسلم وہ شخص ہے جس کی پوری ہستی خدا کے لیے ہو اور خدا کی طرف اس کی خالصانہ توجہ ہو۔ اس کی نیت صاف ہو اور اس کا مقصد حیات حصولِ رضائے الٰہی ہو۔ اپنے معبود کو کسی خاص رنگ اور سانچے میں نہ ڈھالے۔

نامیدن این بہ اسلام

یہ دین جس کی حضرت محمد مصطفٰےؐ پر وحی کی گئی اس کا اس لیے اسلام نام رکھا گیا کہ لوگوں کو توحیدِ خالص کی طرف، جس میں کوئی شک، شرک اور رنگ آمیزی نہیں، دعوت دے۔ قرآن پیغمبر اکرمؐ کو خطاب کرتا ہے:

"قل اننی ھدانی ربی الی صراط مستقیم۔ دینا قیما
ملة ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین۔ قل ان
صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک
لہ وبذالک اُمرت وانا اوّل المسلمین۔

اسلام وہ جامع وکامل دین ہے جس میں بشر کے ہر مرحلۂ زندگی کے لیے ہر زمانے میں تہذیب، تمدن، اخلاق اجتماع اور گھریلو معاملات سے لے کر سیاسی زندگی اور مملکت داری تک کے لیے دستورات اور ارشادات موجود ہیں کہ کسی اور دین میں نہیں۔ اس دین کی بنیاد ہی خدا کی بندگی، اطاعت اور رضا پر ہے۔

خدا کا دین فقط اسلام ہے

قرآن فرماتا ہے کہ اسلام کوئی تازہ دین نہیں جو حضرت محمد مصطفٰےؐ نے اپنی طرف سے اختراع کیا ہو بلکہ وہ دین ہے کہ جس دن سے خدا نے انسان کو خلق کیا اس کے لیے یہی دین مقرر کیا۔ خدا کا دین ایک سے زیادہ نہیں جس طرح انسان کی روح ایک، عقل ایک ہے، دین بھی ایک ہے۔

اسلام سب موجودات کا دین ہے

اسلام جو کہ بہ معنای سرِ تسلیم خم کردن بہ درگاہِ ذوالجلال ہے سب موجودات کا دین ہے، چاہیے انسان ہو یا غیرِ انسان، مومن ہو یا کافر۔ سب مخلوقات طبعاً اپنے خالق کے مطیع ہیں۔ سب اسی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف واپس جائیں گے۔ جیسا کہ اسلام کے معنی سے معلوم ہوا تسلیم بہ خدائے لاشریک لہ اور دو معنی اور یعنی آشتی و سلامتی، یہ دین اتفاق اور آشتی کی طرف دعوت کرتا ہے یعنی بغض، حسد اور کدورتِ نفسانی کو دُور کر کے نیروئے ایمان کی بنا پر اور توحید کی برکت سے پوری اُمّتِ محمدیہ کو متحد اور اس کے افراد کو آپس میں بھائی بھائی بناتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان امان میں رہیں۔ اس لیے دین اسلام نے اپنے پیروؤں کے لیے مقرر کیا ہے کہ ملاقات میں "السّلام علیکم" کہا جائے یعنی ہم تمھارے ساتھ ہمدردی اور اتفاق رکھتے ہیں اور تمھارے خیر خواہ ہیں۔ اسی لیے بہشت کو بھی دارالسّلام کہا گیا ہے۔ اہلِ بہشت کا درود سلام ہے کیوں کہ بہشت میں کسی کے دل میں کینہ اور بغض نہیں: "واللّٰہ یدعوا الیٰ دار السلام ویھدی من یشاء الیٰ صراطٍ مستقیم"۔ قرآن نے ایک ایسے دین کی طرف دعوت دی ہے جس کا مقصد بندگیِ خالصِ خدا ہے اور حق و عدالت و برقراریِ صلح و سلامتی جان تا کہ انسان کے لیے زندگی نمونۂ بہشت ہو جس کی لوگوں کو یہاں تلاش ہے:

هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق
لیظهره علی الدین کله وکفیٰ بالله شهیدا ۝

دینِ اسلام کی خصوصیت تکمیلِ عقیدۂ توحید ہے

دینِ اسلام نے صفاتِ الٰہیہ کو کامل اور روشن تر صورت میں پیش کیا ہے۔ لا الٰہ الا اللّٰہ میں خالص کامل توحید ہے۔ دینِ اسلام نے برتری کی میزان صرف نیکیِ ذات و فضیلتِ انسانی کو قرار دیا ہے، نہ رنگ و نژاد کو اور نہ درویش یا غنی ہونے کو۔ اسلام امر بہ عدالت و حق خواہی و مساوات واخوت کرتا ہے، اور سب سے پہلے یک سوئی سے خدائے واحد کی عبادت کرنا سکھاتا ہے۔ چاہے ایک مسلمان بھائی مشرق میں ہو چاہے مغرب میں ہر ایک کا وہی قبلہ، وہی حسِ یگانگی و وحدت اور تمام ارکانِ دینِ اسلام، یعنی سب مسلمانوں کے لیے توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ،

داروئے تمام دردہاست۔

نہضت اسلامی

نہضت اسلامی ایک ایسی سرزمین سے وجود میں آئی جو بالکل خشک اور فقیر تھی۔ نہ مدرسہ تھا، نہ کتاب، نہ حکومت، نہ قانون، نہ سابقۂ تمدّن اور نہ کوئی صنعت و ہنر۔ اس نہضت کا بانی ایک ایسا شخص تھا جس کے اختیار میں کسی قسم کے مادّی وسائل اور آلات نہ تھے، مگر اس کی یہ تحریک مکّے سے مدینے تک، مدینے سے جزیرۃ العرب تک اور پھر ہمسایے ملکوں تک یعنی مصر، افریقہ، ایشیائے صغیر، ایران برصغیر پاکستان و ہند وغیرہ دُور دُور تک پہنچ گئی اور آج تک روبہ افزائش ہے اور لوگوں کے قلب و روح پر اس کی سلطنت ہے۔ یہ کون سی ایسی طاقت ہے جو ایک فرد واحد کے ہاتھوں سے، جس کے اختیار میں کوئی مادّی وسیلہ نہ تھا، عمل میں آئی۔ ایسے ممالک کو جن کے عقائد مختلف، مذاہب مختلف، زبانیں مختلف ایک سانچے میں ڈھال کر ایک رنگ میں لانا کس کے بس کی بات تھی! ایک ایسا ایمانِ قوی جو دنیا میں بے نظیر ہے وجود میں آیا۔ اسلام کی نہضت میں کون سے ایسے عوامل مساعد تھے کہ ایسا معجزہ کر دکھایا؟

اسلام کی تعلیم

اسلام سے پہلے ہر کام میں عرب اپنے شخصی نظریے اور شخصی فائدے کے لیے کام کرتے تھے۔ اسلام نے اس نظریۂ حیات کو تبدیل کر کے ایک اجتماعی اور وحدانی نظریہ پیش کیا اور افراد سے وحدانی معاشرہ بنایا اور تاکید کی کہ ہر شخص اپنے ذاتی فائدے کو معاشرے اور ملّت کا تابع بنا لے۔ اسلام سے پہلے افراد کی آزادی محدود نہ تھی، ہر شخص جو چاہتا تھا کرتا تھا، مگر اسلام نے کسی حد تک افراد کی آزادی کو، جو دوسروں کی آزادی اور ملّت کے منافع میں خلل انداز ہو، ممنوع قرار دیا۔ زنا و شراب و قمار کو بالکل حرام کر دیا۔

اسلام سے پہلے کوئی احساس مسؤلیت و ذمّہ داری نہیں کرتا تھا۔ ہر شخص اپنے آپ کو پتھر کا ٹکڑا یا حیوان سمجھتا تھا۔ اسلام نے آدمی کو اشرف المخلوقات کہا اور بتایا کہ تم انسان ہو، عقل اور شعور رکھتے ہو، نظافت اور طہارت کی مراعات کرو، معیّن وقت پر عبادت کرو۔ اپنی دولت کا ایک حصّہ فقرا میں تقسیم کرو۔ دفاع و جہاد کے وقت کوئی مضائقہ نہ کرو۔ لوگوں کے حقوق اور ناموس کا احترام کرو۔ خود غرضی اور خود خواہی نہ کرو۔ غرور، کینہ و انتقام جوئی و سوءِ ظن سے بچو۔ ظلم و ستم نہ کرو۔

اسلام سے پہلے لوگ خدا کو اتنا چھوٹا سمجھتے تھے کہ ہر قبیلے کا ایک خدا ہوا کرتا تھا۔ اسلام نے خدا کو کائنات کا اور کل عالم کا پروردگار بتایا ہے جو مالکِ دو جہان اور لاشریک ہے۔

پستی اور جہالت سے اسلام نے سب کو نکالا۔ دین اسلام اپنی تعلیمات سے گمراہوں کو ہدایت کی طرف لایا۔ پیغمبر اسلامؐ نے بہت رنج اٹھائے، نجات کی کشتی بنائی اور ساحل تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اتنی بڑی مسؤلیت اور ذمے داری! ایک طرف لوگوں کی جہالت دوسری طرف خدا کا ڈر، جدّوجہد سے کام لیا۔ وہی ایمان قوی، خلوص بے پایاں، وہی بے غرضی، وہی فکر جامع وملت، وہی دعوت اتحاد و اخوّت، انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللّٰہ لعلکم ترحمون ۔ یہ نقارشتۂ اتحاد در دنیائے اسلام جو ایسے عقائد پر مبنی ہے۔

اصول مشترک

سب سے پہلے جب بشر کی طرف نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کس قدر مختلف ملل موجود ہیں جو کہ زبان، دین، عادات، آداب، افکارِ علمی و فلسفی، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مگر تھوڑے سے تعمق کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ مشترک سب میں موجود ہے۔ مثلاً سب کے ہاں ایک قسم کی الف بے ہے جس سے کلمات اور جملات بنتے ہیں اور افکار و عقاید کے اظہار کا ذریعہ قرار پاتے ہیں۔ کڑھائی اور صنعت کے لیے وہی اُون یا روئی یا ریشم کام میں لایا گیا ہے، کوئی نقشہ رنگین، کوئی سادہ، کوئی ہاتھ سے بنا ہوا، کوئی مشین سے مگر ہر چیز میں ایک اصولِ مشترک کی جھلک موجود ہے۔ مختلف ادیان اور اعتقادات ہیں مگر سب میں وہی احتیاج بشر بقوۂ غیبی کار فرما ہے۔ وہی جذبات اور عاقبت کا خوف، وہی ثواب و عذاب کا خیال۔

ہر حکمِ کلّی میں ایک حکمِ خصوصی بھی ہے۔ سب سے پہلے انسان، انسان ہے۔ کچھ لوگ اس دنیا میں ہمارے بنی نوع ہیں، کچھ ہم وطن ہیں مگر ایک نسل و نژاد سے نہیں پھر کچھ ہم وطن ہیں کہ ضروری نہیں ہم مذہب ہوں۔ کچھ ہم سفر ہیں مگر ممکن ہے ہم فکر نہ ہوں۔ کچھ ہم مذہب ہیں مگر ایک دوسرے سے جسماً دور ہیں۔ کچھ رشتے دار ہیں، ایک ہی خاندان سے ہیں مگر ممکن ہے بغض اور کدورت کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔ کچھ ہمسایے ہیں مگر برابر بر سر پیکار یا پھر فقط ہمسائے واقع ہوئے ہیں، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

پس وہ کون سا ایسا رشتہ ہے جو معنوی وحدت کی نظر سے، تاریخ کی نظر سے، حقِ ہمسائگی

کی نظر سے، زبان، فرہنگ، تہذیب اور تمدّن کی نظر سے، احساسات اور جذبات کی نظر سے مشترک میراث کے لحاظ سے، یعنی من حیث المجموع وہ کون سی ایسی خوبیاں ہیں، کون سی ایسی وحدت فکر و نظر ہے کہ افراد جسماً الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہو جاتے ہیں۔ اس رشتے اور وحدت کا نمونہ کون ہیں؟ بلاشک یہ پاکستان اور ایران ہیں۔

تاریخ کی ورق گردانی کر کے دیکھئے کہ ماضی میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ کسی مملکت کے افتخارات منبعِ تخریب نہیں۔ تخریبی عناصر ملک اور قوم کی پیش رفت کی علامت نہیں۔ بطور مثال جرمنی کو ہٹلر یا بم سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ گوئٹے سے جس پر قوم کو فخر ہے۔ انگریزوں کی بڑی شخصیت شیکسپیر ہے کہ انھیں آج تک اس پر ناز ہے۔ ایران کی بڑی خدمت ایجادِ صلح ہے۔ ایران نے کبھی ٹینک یا بم نہیں بنایا، بلکہ ایسے وسیلے مہیا کیے کہ زندگی میں لطائف، قدر و قیمت اور سرور و لذت ہو تاکہ لوگ صلح و صفا سے اور حسنِ معاشرت سے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہیں۔ ایران نے دنیا کو تجارت، صنعت، علم و ادب اور فنِ طب انسان کی آسائش کے لیے دیا۔ اس کے علاوہ شعر و شاعری، مصوّری و نقاشی، معماری اور موسیقی بھی دی، یعنی وہ تمام چیزیں جو انسان کی پیش رفت و ترقی، تمدّن اور بقا کے لیے ضروری ہیں نہ کہ تباہی کے لیے۔

تبادلِ فکری و معنوی و روحی ایران و پاکستان کے درمیان صدیوں سے ہے۔ میں کبھی پاکستان کو نیا ملک نہیں سمجھ سکتی۔ یہ وہ قدیم اور تاریخی ملک ہے جس کی عظیم روح صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ممکن ہے اس نے نیا لباس پہن رکھا ہو مگر درحقیقت اصیل اور قدیم ہے۔ یہ آپ کی شرافت و اصالت اور شائستگی سے نمایاں ہے۔ آپ نے مل کر کچھ دن پہلے ثابت کر دیا کہ توحید اور ایمان کی بنا پر کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی میں نے بڑے فخر سے محسوس کیا ہے کہ کسی تہذیب کا غلط نفوذ آپ کے اندر اثر نہیں کر سکتا۔ دوسرے ملک آپ کی طرف، آپ کی تہذیب اور تمدّن کی طرف متمائل ہوتے ہیں، مگر آپ نہیں ہو سکتے۔ غیر ملکی استعمار کے باوجود جس نے برسوں آپ کے اور آپ کی خودی کے درمیان ایک پردہ حائل کر رکھا تھا اور آپ اپنی خودی کو کھو بیٹھے تھے آپ نے اب اپنے آپ کو دوبارہ پا کر بچھڑے ہوئے رشتے داروں کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ آپ کا ایک سچا بھائی اور سچی بہن ایران اور سرزمین ایران ہے جس کی صدیوں سے آپ کے درمیان ایک مشترک عامل کی حیثیت رہی ہے۔ ایران کے شعرا آپ کی سرزمین میں آ کر پلے اور پرورش پائی۔ یہ سلسلہ پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوا مسعود سعد سلمان لاہوری کے زمانے سے جو ہمدان کے رہنے والے تھے، مگر ان کی نسبت لاہوری ہے۔ انھوں نے ایران سے آ کر لاہور میں اپنے ذوق کی پرورش کی۔ لاہور کے آستان دار رہے۔ اٹھارہ سال زندان میں گزارے۔ پھر ایران ہو آئے

جا کر لاہور کی یاد میں یہ غزل لکھی ہے:

اے لاہور ویحک بی من چہ گونہ ای
اے آفتاب روشن روشن چہ گونہ ای
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار
با من چہ گونہ بودی و بی من چہ گونہ ای

وہ شعراء جن کے لیے دورۂ صفوی میں آزادیِ فکر وفن نہ تھی اس طرف آگئے، جہاں ان کے مشوق اور اہلِ ذوق جمع تھے۔ اکبر بادشاہ، جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں بھی یہ خطّہ ایرانی فرہنگ و ادبیات کا مرکز تھا۔ فارسی میں ان بادشاہوں کا عجیب ذوق تھا۔ ان کے وزراء فارسی دان بھی تھے اور شاعر پرور بھی۔ اُنھوں نے فارسی زبان کی ترویج کی بلکہ فارسی لازمی اور اجباری تھی۔ یہاں تک کہ یہ خطّہ سرزمینِ معنوی ایران تھا۔ ان بادشاہوں کے عہد میں شعراء عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، طالب آملی، قدسی مشہدی اور صائب تبریزی ایسی بھائی کے گھر میں مقیم تھے۔ تین قسم کے ادیب اور شاعر تھے۔ کچھ ایران سے آکر برسوں رہے، گھلے ملے، اپنے ذوق کی پرورش کی اور ایران واپس چلے گئے۔ کچھ ایران سے آکر یہاں کی خاک پاک میں مدفون ہوئے، یعنی زندگی ہی ساتھ نہیں گزاری بلکہ موت میں بھی شریک ہوئے۔ ہماری ابدی آرام گاہیں بھی ایسی ملی جلی ہیں کہ کوئی امتیاز نہیں۔ تیسرے وہ ادیب و شعراء ہیں جو اس سرزمین کے ہیں اور فصیح اور بلیغ فارسی لکھتے رہے بلکہ اُنھوں نے ایرانی علماء و فضلاء کو سرچشمۂ الہام پایا۔ چناں چہ حضرت علّامہ اقبال کہ نہ ان کو ایران جانے کا اتفاق ہُوا، نہ کسی استادِ فارسی زبان نے انھیں تعلیم دی، نہ ان کی مادری زبان فارسی تھی مگر ایسی بلیغ، رسا اور دل کش زبان میں شاعری کی کہ ایرانیوں کو دچارِ حیرت کر دیا۔ اُنھوں نے سنائی، عطّار، مولوی اور جامی سے میراث لی۔ ان کا مرشد اور پدرِ روحانی رومی تھا کہ خود انکسار سے کہتے ہیں:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

اب اس پر غور کیجئے کہ علّامہ اقبال کا روحانی باپ رومی تھا اور اس عظیم الشان مملکت پاکستان کے روحانی باپ حضرت علّامہ اقبال ہیں۔ آپ صاحبان خود ہی بتائیے کہ یہ کیا رشتہ ہے؟ کیا یہ بے حد قوی اور ناگسستنی ارتباط نہیں ہے؟ سبحان اللّٰہ!

ایران میں چند سال قبل اقبال کو کم لوگ پہچانتے تھے۔ وہ اس لیے کہ درمیان میں ایک سد بنی ہوئی تھی یعنی سیاسی، فکری، مذہبی، عرفانی، اقتصادی اور معنوی روابط میں ان دو بھائیوں

کے درمیان اجنبی حائل تھا۔ یہیں اس شاعرِ فارسی زبان نے دوبارہ اپنے پیغام سے خواب غفلت کے مارے لوگوں کو جگایا اور اپنی طرف کھینچا۔ اپنی خودی و ہستی پر غور کرنے کی دعوت دی۔ یہ بادل اور تاریکی برطرف ہو گئی، پردہ ہٹ گیا اور سب آگاہ ہو گئے اور ارتباط دوبارہ بہ حکمِ خدا و بہ حکمِ قانونِ فطرت برقرار ہو گیا۔ قانونِ فطرت اس لیے کہتی ہوں کہ ناخن گوشت سے جدا نہیں ہوتا۔ دو بھائی جسماً جدا ہوتے ہیں، مگر جب ملتے ہیں قلباً، فکراً، ارثاً، وروحاً، پھر وہی ایک ہوتے ہیں۔ اقبال کی دُور اندیشی نے ہمیں یہی بتایا کہ اتحاد سے رہنا ہماری بقا کے لیے ضروری ہے۔ اقبال نے توحید کو "علاجِ تمام دردہا" سمجھا ہے۔ ہماری پیش رفت ترقی و تعالی کے لیے وہی نقشہ قابلِ عمل ہے جو "ہدایتِ خدا و پیغمبرؐ ماست و حکمتِ قرآنِ ماست"۔ اگر دنیا میں سرافراختہ رہنا ہے تو تعلیمات اسلامی کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ کسی دانش مند نے اقبال سے پوچھا کہ آپ کا ماخذِ خودی کیا قرآن ہے تو اقبال نے اس آیۂ شریفہ کی طرف توجہ دلائی:

یا ایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل
اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم تعملون۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر فرض ہے اپنی خودی کی محافظت، اگر تم ہدایت پہ ہو تو وہ شخص جو گمراہ ہے تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ تم سبھوں کو اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہی تمھارے اعمال پہ تمھیں مطلع کرے گا۔

گر جہاں فتنہ گیرد از چپ و راست
و آتش صعقہ پیش و پس باشد
تو پریشان نہ کردہ ئی کس را
چہ پریشانیت ز کس باشد
راستی پیشہ گیر و ایمن باش
کو رہا بندۂ تو بس باشد

کسی نے ایک دن مجھ سے پوچھا، "خانم! خدا اور خداوند میں کیا فرق ہے؟" تو یہ شعر یاد آیا:

تم تو بت ہو تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

اسی طرح اقبال کا یہ کلام سن کر میں اکثر محظوظ ہوتی ہوں:

جہانِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
اگر خدا دِل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

واضح ہے اقبال کے کلام کو سمجھنے سے پہلے قرآنِ کریم کو سمجھنا ضروری ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

مقامِ خویش اگر خواہی در ایں دیر
بہ حق دِل بند و راہ مصطفیٰ رو

اقبال کے متعلق نظریۂ ایرانیانِ امروز

اس وقت یہ کہنا بجا ہے کہ جس طرح حافظ، سعدی، خیام وغیرہ شعراء نامی ایران کو ہر فرد پاکستانی پہچانتا ہے اسی طرح اقبال کو ہر فرد ایرانی جانتا اور مانتا ہے۔ مغالطے یا مبالغے کے بغیر یہ کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ آج کل بڑے اہتمام کے ساتھ یوم اقبال مدارس میں، محافل و مجالس ایران میں منایا جا رہا ہے۔ ریڈیو تہران کئی راتوں سے یہی ذکر کر رہا ہے اور یقین کیجئے کہ میں ریڈیو ایران آج کل صرف اس لیے کھولتی ہوں کہ میں لاہور میں بیٹھ کر کلامِ اقبال اور مقامِ اقبال سنوں اور دل عشقِ طرفین سے لبریز ہو جائے۔ صرف تہران میں نہیں بلکہ جنوب اور شمالِ ایران میں ہر طرف اور ہر جگہ لوگوں کے دِل میں اقبال کی قدر و منزلت ہے۔

ایرانی ادبا نے وقتاً فوقتاً اقبال کو جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس کی صرف ایک مثال آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں:

شاعرِ معاصر آقای ابراہیم مہیا نے فرمایا ہے:

خوشا آں شاعرِ فرخندہ اقبال — کز او نامِ نکو ماند بدنبال
نہ ہر کس درخورِ نامِ بلند است — نہ ہر کوکب بود خورشید اقبال!
بہ قرنی آسمانِ فضل و دانش — فروزان اختری زاید چو اقبال

زپاکستان بود اقبال لیکن | جہان اوراکند اکرام واجلال
سخنور خاص یک شہر و وطن نیست | کہ مہتابد بہ کوہ و دشت واطلال
نہ باشد مرگ مردان ہنر را | گواہ من بود تاریخ احوال
کہ گو باشہرت و عزت بمیرد | زخوانندہ شود ہر ماہ و ہر سال
ازاین رو در جہان علم و فرہنگ | درخشند تاجہان باقی است اقبال

۲۰ سال سے میرے گھر میں نہ صرف اقبال کے فارسی کے مجموعے بلکہ میں فخر کے ساتھ کہتی ہوں کہ بانگ درا، بالِ جبریل، اور دیوانِ غالب کے نسخے بھی ہمارے کمروں کی زینت ہیں۔ ایران میں تیس چالیس سال پہلے امیر خسرو کا کلام، موسیقی اور گانے ریکارڈوں سے گھر گھر سنے جاتے تھے۔ اب پاکستانی موسیقی اور اردو کے گانے بہت مقبول ہیں۔ یہ قلمی وابستگی کی وجہ سے ہے۔ ممکن ہے الفاظ نہ سمجھ میں آئیں لیکن لطف آتا ہے۔

گزشتہ ہنگامے کے بعد جب ایرانی نرسوں کا لاہور آنا ہوا تو خانہ فرہنگ نے ایک چھوٹی سی تقریب منعقد کی۔ پاکستانی اور ایرانی بہنیں سب کس خلوص وصفا اور گرم جوشی سے گلے ملتی تھیں، یہ منظر قابلِ دید تھا۔ مجھے پہلے تو خوف تھا کہ مجلس میں سردی چھا جائے گی۔ چوں کہ ایک دوسرے کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے ممکن تھا خدا نہ خواستہ ایک دوسرے سے کھنچے رہیں مگر شاید ہی ایسے الفاظ مل سکیں گے جو اس محفل کی گرمی اور رونق کا بیان کر سکیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سب ایک دوسرے کے درد میں شریک ہیں۔ اپنے مشترک بھائیوں کے غم گسار ہیں۔ کبھی اشکِ شوق، کبھی حسرت، ایک دوسرے کی قربت سے تسکین حاصل کرتے تھے۔ زبان کوئی لازمی چیز نہ تھی۔ بقول شاعر:

خوش آں کہ بر رخ یارش نظر کند شاداب
لبش نہ جنبد و قلبش کند سوال وجواب

ایک اور واقعہ عرض کیے دیتی ہوں۔ چند سال ہوئے کراچی سے ٹیبل ٹینس کی ٹیم ایرانی نیشنل چیمپین شپ میں حصہ لینے کے لیے ایران آئی۔ میں اُن دنوں تہران میں تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہر ایرانی خاندان دو حصّوں میں بٹ جاتا۔ آدھے پاکستانی ٹیم کے طرف دار بن جاتے اور آدھے ایرانی ٹیم کے۔ ایرانیوں کے جوش وخروش اور تالیوں سے یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ کون ہارا اور کون جیتا۔ پاکستانی ٹیم کے چند افراد ہمارے ہاں مقیم تھے۔ ایک ایرانی نامہ نگار ہمارے ہاں آیا اور پوچھا "خانم! ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ آپ کو کیسے جانتے ہیں"۔ پھر مجھے راز بتانا ہی پڑا کہ پاکستانی ٹیم کی لڑکیاں دراصل پشت با پشت سے ایرانی ہیں۔ کچھ عرصے

سے پاکستان میں رہ رہی ہیں۔ اب انھیں پاکستان سے اتنا عشق ہے کہ پاکستان کے ہر افتخار کو اپنا افتخار سمجھتی ہیں۔ پاکستان کی عزت و آبرو ان کی عزت و آبرو ہے۔ پاکستان کی کام یابی ان کی کام یابی ہے۔ وہ صاحب مسکرائے اور کہا۔ "سبحان اللہ! عجب رشتہ ایست!"

معذرت خواہ ہوں کہ میں جذبات کی رو میں بہ گئی۔ تاریخ کے ایک اور باب پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ متصوفینِ ایرانی کیا قدر و منزلت رکھتے تھے۔ حضرت سید علی ہجویری نے اپنی زندگی کا اہم حصہ لاہور میں گزارا۔ اس خطے کو مسلمان کر دیا اور آج وہیں مدفون ہیں اور حضرت بہاؤ الدین ذکریا ملتان میں مدفون ہیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھ کے لوگوں کے قلبوں کو روحانیت سے منور کیا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت سید محمدؐ منصور، حضرت شیخ معین الدین چشتی اجمیری علیہم الرحمہ پاکستان اور ایران میں یکساں اثر انداز ہیں۔ نذر و نیاز ہوتی ہے۔ ان کے نام کے دسترخوان بچھتے ہیں۔

اعیاد و جشنہای باستانی

پاکستان و ایران کی تقریبات بھی ایک ہیں حتیٰ! نوروز۔ آج تک یہ عام خیال تھا کہ نوروز ایرانی عید ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کا اس سرزمین کے بادشاہوں میں بھی رواج تھا اور نوروز منایا جاتا تھا۔ مذہبی طور پر ثابت ہوا کہ خلقت کا سلسلہ یعنی آفرینش زمین و آسمان و جمادات و نباتات و حیوانات اور انسان کی تخلیق پہلی فروردین کو ختم ہوئی اور اسی فرصت کے دن عید منائی گئی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو کاندھے پر بٹھا کر بتوں کو تڑوایا۔ ہر نظر سے فروردین کا مہینہ جو سال کا اوّلین مہینہ ہے مناظر فطرت کی سرسبزی و شادابی سے تعلق رکھتا ہے۔ پس ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہماری اعیاد ایک ہیں، سوگواریاں ایک ہیں اور طرز فکر و عمل یقیناً ایک ہے۔ یہاں ایران کے ایک علاقے کا تعارف کرانا بے جا نہ ہوگا جو جنوب ایران میں خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہے، لارستان اور لبستک جو بندر عباس کے نام سے معروف ہے۔ یہ شیراز اور کرمان کے کچھ نزدیک واقع ہوئے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کا رہنا سہنا اور لباس دیکھیں تو آپ بھی کرتا، چست پاجامہ، دوپٹہ اور برقع ہے اور عورتوں کا زیور اور کپڑے کی کڑھائی وغیرہ اس قدر ملتی جلتی ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کون کہاں سے آیا ہے اور کیا لایا ہے اور کس طرح ہوا ہے۔ مہندی کے رسومات، شادی بیاہ کے آداب، دُلہن کا گھونگٹ، دُولہا کا سہرا اور گھوڑا، اسپ

سواری اور گشت، پردہ اور عامیانہ توہمات یہ سب چیزیں پاکستان سے ملتی جلتی ہیں۔ اُردو زبان بھی وہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح وہاں کی دست کاری بھی سندھ، بلوچستان اور پنجاب کی دست کاری سے بالکل مشابہ ہے۔ رنگ ایک بہت بڑا نمائندہ ہے کسی قوم کے ذوق و ہنر کا۔ یہی مختلف زندہ رنگ اور ان کا امتزاج اور موزونی ہر چیز میں دیکھی جاتی ہے۔ ہمارے دونوں ملکوں کا ایک مخصوص سُرخ اور نیلا رنگ ہے جو بالخصوص عورتوں کے لباس سے نمایاں ہوتا ہے۔ یہ خوش رنگی دنیا کے دوسرے خطوں میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

آپ کہتے ہیں سرمہ لگانا تو سب کو آتا ہے مگر مٹکانا کسی کسی کو آتا ہے۔ شاید یہ فن یعنی آں چناں را آں چناں تر کردن بھی ہماری باہمی تخلیق ہو۔

کھانے کے برتن قدیم الایام سے وہی ہیں بلکہ اب ہر چند جدید ظروف گھروں میں آگئے ہیں مگر نفائس کے طور پر فخر کے ساتھ قدیم ظروف اب بھی برتنوں کی الماری کی زینت ہیں اور خاص خاص موقعوں پر ان سے استفادہ ہوتا ہے۔ قدیم فرنیچر جو اس سرزمین کا بنا ہوا ہے گھروں میں محفوظ رکھا جاتا ہے اور فخر سے کہتے ہیں کہ پاکستان کا ہے۔

کوزہ گری یعنی فن سرامیک کو ہی ملاحظہ فرمایئے۔ کوزوں اور دیگر ظروف میں کس قدر مشابہت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایران اور پاکستان کے کوزہ گروں کا استاد ایک ہے۔ اغلباً پیر و مُرشد بھی ایک ہے۔

خطِ نستعلیق بھی ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے اور یہ تمام عالم میں حسین ترین رسم الخط ہے۔

کھانے کی نوعیت اور ذائقے کا معیار بھی تقریباً ایک ہے۔ دونوں ملک بڑے فراخ دل اور مہمان نواز ہیں۔ گھریلو جھگڑے، ساس اور بہو کی کش مکش بھی ایک ہے۔ مردوں کا راج گھروں میں اب بھی کچھ نمایاں ہے۔ خاص طور پر بعض علاقوں میں اولادِ نرینہ کی آمد پر دھوم دھام سے خوشیاں منائی جاتی ہیں لیکن لڑکیوں کو دیدۂ ترحم سے دیکھا جاتا ہے، مگر بہ حکمِ قانونِ فطرت یہ برق آسا قہر دُور ہو رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ اب مردوں کا یہ ہم تک بیویاں رکھنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اللہ ہم عورتوں کو مردوں کے کرم سے بچائے۔

خیر سنجیدہ گفتگو کی طرف لوٹتی ہوں۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ فارسی تذکرہ نویسی، فرہنگ نویسی، تاریخ نویسی، برہان قاطع اور فرہنگ آنند راج اسی سرزمین کے

کارنامے ہیں۔ ایران کے گراں بہا آثار کے تحفظ کی خدمت جو یہاں انجام دی گئی ہے عظیم الشان ہے۔ فارسی کی اکثر اہم کتابیں سب سے پہلے یہیں چھپی تھیں۔ مل کر ہم کیا کچھ نہیں کرتے تھے؟ لکھنے والے ایرانی تھے، چھاپے خانے یہاں کے، دونوں کے تعاون سے مطبوعات کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔

قصّوں کو لیجئے۔ سسی پنوں کا قِصّہ سندھی ہے۔ اس قصّے کو سب سے پہلے فارسی کا لبادہ پہنانے والا پنجابی ہے۔ ہیر رانجھا کا قِصّہ پنجابی ہے مگر اس قِصّے کو فارسی میں لکھنے والا سندھی ہے۔

مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ ماہرینِ فن کے حضور میں ایران اور پاکستان، خاص طور پر سندھ کے تاریخی تعلّقات کا یہاں ذکر چھیڑ دوں۔ مگر فارسی ادب کی جو خدمت اس وقت بھی پاکِستانی ادیب کر رہے ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ صرف چند انتشاراتِ فارسی کا نام لینا ہی کافی ہو گا جو دانش مندانِ سندھ کے خاص کارنامے ہیں۔ مثنوی، نیلسر نامہ، مقالات الشعرا، منظہر الآثار، تذکرہ شعرای فارسی، اور تحفۃ الطاہرین جس کے بارے میں آقائے سید نفیسی کہتے ہیں کہ یہ کتاب فارسی علم و ادب پر منّت و احسان رکھتی ہے اور بہترین کتب سے ہے جو آج تک پاکِستان میں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

ایران اور سندھ اور ملتان کی کاشی کاری کو ملاحظہ کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی خطّے کی صنعت ہے، حتیٰ کہ ایرانی بیر جیں کاری ملتانی کاشی کے نام سے معروف ہے۔ شیراز و اصفہان کی عمارتوں کو اگر پاکِستان میں منتقل کر دیا جائے اور جہاں گیر کے مقبرے، وزیر خان کی مسجد، رکن عالم کے مقبرے کو ایران لے جایا جا سکے تو کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا فنِ معماری ایک ہے۔ تاج محل، لاہور کی شاہی مسجد، ٹھٹھے کی شاہی مسجد، لاہور کا قلعہ اور دیگر نادر آثار جو آج جاودانی ہیں ہماری باہمی علمی اور فنّی صلاحیتوں سے وجود میں آئے۔ یہ سلیقہ، ہم آہنگی اور توافق روحی و فکری کا نتیجہ تھا۔ اس فنّی عظمت کا کون قائل نہیں؟ اس کی کون داد نہیں دیتا؟ آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا کیوں کہ خدا کو یہی منظور ہے:

شکر نعمت نعمتش افزوں کند

اللہ کی کن کن نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔ وہی حمد و تعریف کے لائق ہے۔

ہمیں تو خلوص، اتحاد، محبت، اخوت، اور جدّوجہد کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ پاکستان و ایران اپنی گزشتہ عظمت کو پھر سے زندہ کر دکھائیں گے۔ خدا ہم کو توفیق بخشے۔

آسمان زیک دگر نتوانیم شد جدا
ما و ترا چو رشتہ بہم تاب دادہ اند

شامِ ہمدرد، کراچی
۹ر جون ۱۹۶۶ش

پروفیسر خواجہ محمد اسلم

نعتِ رسولؐ پر اب تک بہت کچھ کہا گیا ہے اور سدا کہا جاتا رہے گا۔ یہ موضوع جمیل ایسا ہے جو کبھی اختتام تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اپنے وقت کے سب سے بڑے شاعر حضرت شیخ سعدیؒ نے اس موضوع پر چار مصرعے کہے ہیں وہ غیر فانی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان ہی سے میں اپنے کلمات افتتاحیہ کا آغاز کرتا ہوں۔

بلغ العُلیٰ بکمالہٖ　　　کشف الدجیٰ بجمالہٖ

حَسُنت جمیع خِصالہٖ　　　صلو علیہ و آلہٖ

"شامِ ہمدرد" بہت سی منائی جا چکی ہیں۔ علمی، ادبی، فنی، طبی، سائنسی، ہر طرح کی، لیکن آج کا یہ اجتماع اپنی نوعیت اور اہمیت کے پیشِ نظر سب سے ممتاز ہے، جداگانہ ہے اور انفرادی حیثیت کا حامل۔ آج کی مجلس سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور نعت کے لیے وقف ہے۔ ایک حدیث قدسی سیرت کی اکثر کتابوں میں نظر آتی ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر آپؐ نہ ہوتے تو میں یہ زمین و آسمان نہ پیدا کرتا۔ اس حدیث کی صحت اور عدم صحت پر محدثین اور علمائے اصول نے کافی گفتگو کی ہے۔ میرا یہ منصب نہیں کہ کوئی محاکمہ کر سکوں۔ میں اتنا ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ اگر یہ حدیث کے بجائے قول ہے تو بھی اس کی صداقت شک و شبہ سے ماورا ہے۔ کم از کم میرا ایمان تو یہی ہے۔

آں حضرتؐ کی سیرتِ طیبہ کا ایک پہلو اس حقیقت کا مظہر ہے کہ ایسا مثالی انسان نہ آج تک پیدا ہوا ہے نہ قیامت تک پیدا ہو سکے گا۔ آپؐ کی رفتار و گفتار، وضع و طریق گھر میں رہنے کا انداز، دوستوں، عزیزوں اور دشمنوں سے حُسنِ سلوک، یہ ساری چیزیں بجائے خود معجزہ ہیں اور معجزہ بھی وقتی نہیں دائمی۔

آپؐ کے سوا دوسرے انبیاء مرسلین کی ہم تصدیق کرتے ہیں اس لیے کہ قرآن حکیم ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے کہ آپ نے ان کی تصدیق فرمائی ہے۔ لیکن حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسٰیؑ تک کون سا نبی ایسا ہے جس کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہو۔ دوسرے انبیاء کے ساتھ اُن کا عہد بھی گیا، ان کا پیام بھی گیا، ان کی تعلیم بھی گئی، ان کی سیرت، ان کی شخصیت اور کردار کے نمونے بھی گئے۔ لیکن آپؐ جب "اسوۂ حسنہ" بن کر جلوہ فرما ہوئے تو اس طرح کہ آپؐ کے شب و روز کا ہر ہر لمحہ پوری تفصیل، پوری جامعیت اور پورے استناد کے ساتھ محفوظ رہ گیا۔ ایک سالارِ فوج کی حیثیت سے، ایک فاتح کی حیثیت سے، ایک مہاجر کی حیثیت سے، شوہر کی حیثیت سے، دوست کی حیثیت سے، معلم کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا، جو کچھ کہا، جو آثار و نقوش چھوڑے وہ چودہ سو سال کی طویل مدت گزرنے کے باوجود آج اسی صحت و استناد کے ساتھ موجود ہیں جیسے اپنے وقت میں رونما ہوئے تھے۔ آپؐ کی حیاتِ مبارک قیامت تک کے لیے ساری انسانیت کے لیے جو اسوۂ حسنہ قرار دی گئی ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ آپؐ کا ہر عمل اور آپؐ کا ہر قول محفوظ رہ جاتا۔

گزشتہ چودہ سو سال کے عرصے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر عربی، فارسی، اُردو اور دنیا کی دوسری زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اور کوئی شبہ نہیں ان میں بہت سی کتابیں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے یکتا اور بے ہمتا ہیں۔ اسی طرح اس طویل مدت میں آپ کی نعتیں بھی شعرا نے لکھیں اور بلا شبہ بعض شعرا کی لکھی ہوئی نعتیں اپنے سوز اور اثر کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ لیکن نثر و نظم میں سیرتِ نبویؐ پہ جو کچھ لکھا گیا وہ سب ایک طرف اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا ایک چھوٹا سا جملہ ایک طرف۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور کردار کی نوعیت اور کیفیت کیا تھی؟ حضرت عائشہؓ نے برجستہ جواب دیا، کیا تم نے قرآن مجید نہیں پڑھا؟ جو کچھ قرآن حکیم میں لکھا ہے وہی آپؐ کی سیرت تھی!"

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، کردار اور شخصیت کا اس سے زیادہ جامع و مانع تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ آپؐ کی زندگی قرآن مجید کے سوا کچھ نہ تھی اور قرآن پاک کے معیار پر زندگی بسر کر لینا واقعی انسانیت کی معراج ہے۔

آج آپ کے سامنے جو حضرات اس موضوع پر اپنے افکار پیش کر رہے ہیں میں ان کا ممنون ہوں۔ اپنے علم و فضل اور فکر و نظر کے اعتبار سے ملتِ پاکستان میں ان کا ایک خاص

مقام ہے۔ اور یہ میری خوش بختی ہے کہ ایسے احباب کا تعاون حاصل کرنے میں مجھے کام یابی ہوئی۔

سب سے پہلے میں جناب قاری غلام رسول صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں ریڈیو اور ٹیلے وژن پر جن کی خوش الحانی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس کے بعد اپنے محترم جناب حکیم احمد شجاع صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جنھوں نے نعت رسول سے متعلق اپنے بلند افکار و تاثرات آپ کے سامنے پیش کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی۔

جناب خواجہ محمد اسلم صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور ملک کے دانش وروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک فاضل معلّم ہی نہیں ہیں ایک ژرف نگاہ محقق بھی ہیں اور مصنف بھی۔

حضرت احسان دانش صرف شاعر نہیں مداح رسولؐ بھی ہیں۔ ان کے کلام میں ایمان و یقین کی چنگاری ہے۔

جناب نظر امروہی بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سننے والا محسوس کرنے لگتا ہے۔

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

آخر میں اپنے مخدوم اور ملک کے مایہ ناز مفکّر دانش ور شاعر اور نقاد جناب جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ حقیقی معنوں میں مجمع البحرین ہیں۔ سوچتا ہوں ان کی تعریف اور تعارف میں کیا کہوں۔ ایک ایسے ہی موقع پر مولانا شبلی کی توصیف کرنے کے لیے ایک صاحب ان کی موجودگی میں کھڑے ہوئے مگر صرف اتنا کہہ کر بیٹھ گئے۔ "حضرات مولانا شبلی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔" میں اس پر اتنا اور اضافہ کرتا ہوں،

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

محمد سعید

رحمۃٌ للعالمین

جناب پروفیسر خواجہ محمد اسلم (تمغۂ پاکستان)
پرنسپل اسلامیہ کالج - لاہور

قرآن مجید میں یوں تو متعدد مقامات پر بعض اوقات اشاروں کنایوں میں اور بعض اوقات قدرے وضاحت کے ساتھ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت کے لقب سے سرفراز فرمایا گیا ہے لیکن سورۂ انبیاء میں اس حقیقت کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ائمۂ لغت وادب نے اس آیت کے جو مختلف مفہوم متعین کیے ہیں ان کی روشنی میں اس کے کئی ایک ترجمے کیے جا سکتے ہیں۔ مَیں یہاں آپ کے سامنے صرف دو ترجمے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔

۲۔ ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے سراپا رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

اس آیت کا یوں تو ایک ایک حرف قرآن مجید کی معجزانہ بلاغت کا آئینہ دار ہے لیکن اس میں خاص طور پر چند الفاظ قابل غور ہیں۔ "اِلَّا" کا لفظ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ حضور صلعم سراپا رحمت ہی تھے اور اس بنیادی صفت سے متصف فرما کر باری تعالےٰ نے انھیں نوعِ بشری کی ہدایت اور راہ نمائی کے لیے مبعوث فرمایا۔ انھوں نے اپنی حیات مقدس میں جو کچھ کیا اور جو کچھ اپنی زبانِ فیض ترجمان سے کہا اس کے پیچھے بجز انسانیت کی گہری اور سچی محبت اور اس کے حق میں اتھاہ اور لازوال جذبۂ رحم کے سوا

کوئی دوسرا محرک کارفرما تھا۔ ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید نے حضور صلعم کی شانِ رحیمی و کریمی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ٥ (سورہ توبہ)

(بے شک تمھارے پاس ایک رسول آئے ہیں جو خود تم ہی میں سے ہیں۔ تمھارا نقصان میں پڑنا ان پر شاق ہے تمھاری بھلائی کے وہ انتہائی آرزومند ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے وہ غایت درجہ شفیق اور رحیم ہیں۔)

اہلِ علم کی اس محفل میں یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ پہلی آیت میں "رحمتہ" کو جو نکرہ استعمال کیا گیا ہے وہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ اسم نکرہ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ حضور صلعم کی رحمت کا کوئی حد و حساب نہیں، اس کا کوئی ایک رُخ نہیں بلکہ یہ رحمت باران کی طرح غریب و امیر، پست و بالا، گورے اور کالے، عربی و عجمی، گناہ گار اور نیک ہر فرد پر برستی ہے اور اسے اپنی نوازشوں سے فیض یاب کرتی ہے۔ نیز قرآن مجید میں حضور صلعم کو دنیا کی رحمت نہیں کہا بلکہ "رحمتہُ للعالمین" کہا ہے۔ اس کی توجیح صاحبِ کشّاف نے یہ کی ہے کہ حضور صلعم کی ذاتِ والا صفات بلاشبہ پوری نوعِ بشری کے لیے رحمت ہے اور حضور صلعم کو اس شانِ رحیمی کے ساتھ دنیا میں مبعوث فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس رحمت سے وہی لوگ فیض یاب ہوں گے جو اس کے لیے اہلیت اور استحقاق پیدا کریں گے۔

اس جلسے پر لفظ "رحمت" کی تشریح بھی ضروری ہے۔ "رحمت" امام راغب کی تحقیق کے مطابق اُس رقّتِ قلب کا نام ہے جس کی بنا پر ایک انسان دوسرے انسان کی معاونت کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کسی دلِ حسّاس کے اندر کسی شخص کی مظلومیت اور بے بسی دیکھ کر ارتعاش پیدا نہیں ہوتا اور وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی ضرورت مند کی دست گیری کے لیے آگے نہیں بڑھتا اس وقت تک رحمت کے تقاضے کما حقہ، پورے نہیں ہوتے۔ ایک شخص کی وہ خدمت جس کے پیچھے کسی ضرورت مند کے لیے گہری محبت، اخوت اور اخلاص کا جذبہ کام نہ کر رہا ہو وہ اسلام میں کسی قدر و اہمیت کا حامل نہیں۔ اسلام میں کسی کی معاونت اور دست گیری کی تحریک اس کے جذبہ رحم سے ہوتی ہے اور وہ ایک آقا نے ولی نعمت کے متکبرانہ احساس کے ساتھ نہیں بلکہ ایک بھائی کے جذباتِ اخوت اور ہمدردی، اور اس کے دُکھ درد میں شریک ہونے کی آرزو کے ساتھ اس کی خدمت کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ میری اس

گزارش سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو گی کہ اسلام میں اصل چیز فعل نہیں بلکہ وہ جذبہ اخلاص ہے جس کے تحت کوئی آدمی کسی دوسرے کے لیے ایثار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ ایک انسان اگر صحیح معنوں میں رحم دل ہے تو وہ جو کچھ دوسروں کے لیے کرتا ہے وہ انھیں ممنون کرنے اور ان پر اپنے احسانات جتلانے یا معاشرے میں اپنے لیے عزّت و شہرت کا مقام حاصل کرنے کے لیے نہیں کرتا بلکہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہنسی خوشی اور ممنونیت اور سپاس گزاری کے جذبات کے ساتھ یہ سب کچھ سرانجام دیتا ہے۔ جس طرح کسی سرجن کا فعل جراحت بظاہر کتنا ظالمانہ نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں وہ بڑا رحیمانہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے پیچھے بجز مریض کی خیر اور بھلائی کے اور کوئی جذبہ کام نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح بعض اعمال جو ہمیں ظاہری طور پر تقاضائے رحمت کے خلاف نظر آتے ہیں وہ دراصل انتہائی رحیمانہ ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کی غایتِ اولیٰ صرف بھلائی ہی ہوتی ہے۔ یوں تو حضور صلعم کی حیاتِ طیبہ میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے لیکن مَیں یہاں صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں:۔

فتح مکّہ پر حضور صلعم نے تمام دشمنوں کو معاف کر دیا لیکن ایک شخص جس کی شرارتوں، عفّت مآب خواتین پر رکیک حملوں اور بے بسوں پر ایذا رسانیوں کی وجہ سے اس کا قتل ناگزیر تھا اس کے بارے میں حضور صلعم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ اس واقعہ کو علاّمہ اقبال کے الفاظ میں سنیے:۔

"ذوالفقارِ حیدری نے ایک آن میں اس کم بخت کا خاتمہ کر دیا اس کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ لڑکیوں سے زیادہ حیا تھی، جس کا قلب تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ تھا اس دردانگیز منظر سے مُطلق متاثر نہ ہوئی۔ مقتول کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سُنی تو نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنتے تو حضور صلعم اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نُضَیر (مقتول کا نام ہے) کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ فعل محمد رسول اللہ صلعم کا ہے اور اپنی روتی

ہوئی آنکھوں پر انگلی رکھ کر کہا کہ یہ فعل محمدؐ بن عبد اللہ کا ہے۔ پھر حکم دیا کہ نُضَیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے۔" (اقبال نامہ ج ا ص ۱۰۔۱۴)

یہ واقعہ اسلام کے تصورِ رحمت کے سمجھنے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام نے رحمت سے مراد سطحی جذباتیت نہیں بلکہ اس سے مراد نوعِ بشری کے ساتھ سچی محبت، اس کی فلاح و بہبود کی لگن، اس کے اندر پھیلی ہوئی برائیوں کو مٹانے کا عزمِ صمیم، بھلائی کو فروغ دینے کی دلی آرزو اور دنیا میں حق و انصاف، صداقت و شرافت کی عملداری قائم کرنے کی گہری تڑپ ہے۔ حضور صلعم سراپا رحمت تھے۔ انھوں نے انسانی کمزوریوں کو بڑی فیاضی کے ساتھ جانچا اور ان پر ایک سخت گیر قاضی کی طرح حکم لگانے کے بجائے ایک اہلِ دل انسان کی طرح غور کیا۔ اور ان کمزوریوں کو خوبیوں سے بدلنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔ لیکن حضور صلعم نے جہاں یہ محسوس کیا کہ اگر ان کمزوریوں کا بر وقت سدِّباب نہ کیا گیا تو یہ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی اور اس سے انسانیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا وہاں انھوں نے بوقتِ ضرورت محض نوعِ بشری کی بھلائی اور اس کے مفاد کی خاطر انھیں سختی سے روکا۔ لیکن اس کام کو کسی جذبۂ نفرت یا کسی جذبۂ انتقام کے ساتھ نہیں بلکہ سراسر جذبۂ رحم کے ساتھ سر انجام دیا۔ حضورؐ نے گناہ سے ہمیشہ نفرت کی اور اسے مٹانے کے لیے پوری قوت صرف کی مگر گناہ اور گناہ گار کے درمیان ہمیشہ امتیاز روا رکھا، اور گناہوں میں ملوث اشخاص کے ساتھ بہ حیثیت انسان مروت اور گہری ہمدردی کا برتاؤ کیا اور انھیں ان سے نجات دلانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اگر حضورؐ یہ کام نہ کرتے تو عدل و انصاف کی بنیاد کا کوئی صحیح اور صحت مند نظام معرضِ وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

حضور صلعم کی رحمت اور اس کی نوعیت کی اس مختصر سی گفتگو کے بعد اب ذرا رحمت کے بے شمار پہلوؤں میں سے چند پہلوؤں پر غور فرمائیں۔

حضور صلعم کی رحمت کا سب سے نمایاں اور سب سے تابناک اور درخشاں پہلو جس کا خود قرآن مجید نے اسی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے نوعِ انسانی کو اپنے خالق و مالک کی صحیح پہچان اور معرفت عطا کی اور اس طرح انسانیت کو جھوٹے خداؤں کے چنگل سے نکال کر خدائے واحد کی غلامی سے لذت آشنا کیا۔ انسان کی اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے کہ جس خالق نے اسے وجود بخشا ہے اور اس کی زیست کا سامان پیدا کیا ہے وہ اسے بھلا کر معبودانِ باطل کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جائے اسلام

کا نظریۂ توحید جہاں ایک طرف ربّ لم یزل کی اطاعت اور بندگی کا اعتراف ہے وہاں انسانی عزّ و شرف کا بنیادی دستور ہے۔ مالک الملک کی غلامی اختیار کر لینے کے بعد انسان ہر دوسری غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ انسان کو یہ اعزاز حضور سرورِ کائنات صلعم کی رحمت کے صدقے میں ملا۔ فکر و نظر کے اس خوش گوار اور حیات آفریں انقلاب سے نہ صرف ذہنوں کی تاریکیاں کافور ہوئیں، تعصبات کے بندھن ٹوٹے اور انسان نے بہتر، شادکام اور آزاد فضا میں زندہ رہنے کے اسلوب سیکھے بلکہ اونچ نیچ کی مصنوعی تفریق، جو مفاد پرست طبقوں نے اپنے مفادات کی خاطر وضع کر رکھی تھی اور گورے کالے کے درمیان امتیاز جو انھوں نے اپنے مخصوص مصالح کے پیشِ نظر قائم کر رکھا تھا، وہ ختم ہوا۔ اور انسان نے معرفتِ الٰہی حاصل کر کے خود اپنے ارفع و اعلا مقام کو پہچان کر بالکل ایک نئے طرزِ زندگی کی طرح ڈالی۔ فکر و نگاہ کا یہ انقلاب کتنا موثر اور ہمہ گیر تھا اس کا اندازہ حضرت جعفر طیارؓ کی اس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے نجاشی کے دربار میں کی:۔

"اے بادشاہ! ہم سب جاہل اور نادان، بت پوجنے والے، مردار کھانے والے اور بدکاریوں کے رسیا تھے۔ ہم میں انسانیت اور صلہ رحمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہمسایوں کی دل آزاری کرنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ بالادست زیردست کو ستاتا تھا۔ اس اثنا میں باری تعالیٰ نے ہم پر رحم فرمایا اور ہم میں سے ایک بزرگ ذات کو مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب، جس کی شرافت، صدق و امانت، تقویٰ و پاکیزگی سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہم کو توحید کی دعوت دی اور یہ بنیادی حقیقت ہمارے ذہن نشین کرائی کہ اس ذاتِ بے ہمتا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اس نے ہمیں بتوں کی پوجا سے منع فرمایا۔ ہمیں سچ بولنے، ایفائے عہد، گناہوں سے دست کش رہنے، برائیوں سے بچنے اور انسانی جان کا احترام کرنے کی تلقین کی۔ اس نے ہمیں نماز قائم کرنے، صدقہ دینے، روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس نے ہمیں یتیموں کا مال کھانے سے منع کیا۔ ہمسایوں کے حقوق کا احترام سکھایا۔ ظلم اور خون ریزی سے ہمارے ہاتھ کو روکا۔ عفیف عورتوں پر الزام اور بہتان تراشی سے بڑی سختی کے ساتھ باز کیا۔ اور یہ حکم صادر

فرمایا کہ صرف خدائے واحد کی عبادت کریں اور اس میں کسی دوسری ذات کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اعمالِ بد کے ارتکاب سے پوری طرح پرہیز کریں۔"

حضرت جعفر طیارؓ کی یہ تقریر درحقیقت اُن احسانات کا کھلا اعتراف ہے جو باری تعالیٰ نے حضور سرورِ کائنات صلعم کو مبعوث فرما کر انسانیت پر کیے۔ چشمِ فلک نے انسانوں کے اندر فکر و نظر اور جذبہ و ایثار کی یہ تبدیلی کبھی نہیں دیکھی۔ وہ لوگ جو غیر اللہ کی غلامی پہ فخر کیا کرتے تھے، پتھر کے بتوں کے سامنے جبینِ نیاز جھکانے میں اپنی فلاح و کامرانی کا راز مُضمر پاتے تھے، انسانیت کی بربادی اور زبردست آزادی ان کا شیوہ تھا، برائی جن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی، جن کی زد سے کسی شخص کا جان و مال عزّت و ناموس محفوظ نہ تھی، انھوں نے صدیوں کی رچی بسی اور راسخ عادات کو چھوڑ کر زندگی کے بارے میں ایک نیا طرزِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کیا۔ خدا کے علاوہ انھیں ہر دوسری غلامی سے شدید نفرت تھی۔ زبردست آزادی کی جگہ وہ اب مظلوموں کے سب سے بڑے محافظ اور پاسبان تھے۔ اُنھوں نے رنگ، نسل، وطن کے سارے بتوں کو توڑ کر پوری انسانیت کو ایک خاندان بنا دیا۔ عفیف اور پاک دامن عورتوں پر رکیک حملے کرنے کے بجائے اب وہ ان کی عزّت و ناموس کے محافظ بنے۔ ہادیٔ برحق کے اس انقلاب کے بعد معاشرہ ہر قسم کی کشاکش سے پاک ہو گیا۔ قوی نے کمزور کی حفاظت کا ذمّہ اُٹھایا۔ بھائی نے بھائی کی معاونت اور دست گیری کو اپنا سب سے بڑا اعزاز سمجھا۔ پڑوسی نے اپنے پڑوسی سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اسے اپنا رفیق سمجھا۔ خواتین اپنے گھروں میں شوہروں کی عدم موجودگی میں بھی اپنے آپ کو اس طرح مامون محسوس کرتی تھیں کہ غیر مرد کا طائرِ وسوسہ بھی ان کے حریمِ عصمت کی طرف پرواز نہ کر سکتا تھا۔

مسلمان رحمتِ عالم صلعم کی غلامی اختیار کرنے کے بعد کن پاکیزہ اور مقدس نظریات کے علم بردار بن کر دنیا میں اُٹھے، اس کے لیے کسی زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں۔ صرف تاریخ پر سرسری سی نگاہ ڈالنے سے یہ حقائق پوری طرح معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں ان مقدّس عزائم کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں۔ جب عرب قاصد شاہِ ایران کے پاس پہنچے تو اس نے ان سے وہاں آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس کے جواب میں ان قاصدوں نے جو کچھ کہا اس سے ان پاکیزہ عزائم کا پتا

چلتا ہے جنھیں لے کر مسلمان نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ ایک نئی ملت کی حیثیت سے دنیا میں سرگرم عمل ہوئے تھے۔ ان عرب قاصدوں نے اپنی جدّوجہد کے اصل مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکل کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگی سے نجات دلا کر وسعت و کشائش کی راہ دکھائیں۔ ظلم و استبداد سے بچا کر عدل و انصاف کی فضا میں لائیں۔ بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ان کے درمیان برادرانہ محبت قائم ہونی چاہیے ہماری نظر میں انسانوں کے درمیان شریف و کمین کی تقسیم صحیح نہیں۔ ہم انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کے بھی قائل نہیں۔ ہم تمام انسانوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں سمجھتے ہیں اور سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ ملک گیری اور کشور کشائی ہمارا مقصد نہیں۔ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں۔"

ان مقدس عزائم کا اظہار اس قوم کی زبان سے ہو رہا ہے جس نے اللہ کے گھر کے اندر سینکڑوں بُت پرستش کے لیے نصب کر رکھے تھے۔ ناجائز استحصال، غریبوں اور کمزوروں کا ستانا جن کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ کبر و غرور جن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ تنگ نظری، تعصب جن کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ باری تعالیٰ نے اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اس پس ماندہ قوم کو رحمت عالم کے ہاتھ سے انسانی شرف کا تاج پہنایا اور اس قوم کے دل سے جاہلیت کے سارے امتیازات ختم کر کے اسے پوری انسانیت کی رُشد و ہدایت کا علم بردار بنایا۔

حضور سرور دو عالم صلعم کی رحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے کائنات کے بارے میں انسان کو حیات آفرین تصور دیا۔ جب حضورؐ دنیا میں تشریف لائے تو کائنات کے بارے میں انسان کا عام تصور یہ تھا کہ انسان مادّے کی اندھی بہری قوتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بُتوں کی پرستش کے ساتھ ساتھ مظاہرِ قدرت کی پرستش کو بھی اپنی زندگی کا ایک لازمی جزو خیال کرتا تھا۔ لیکن جب حضور صلعم تشریف لائے تو انھوں نے انسان کے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی کہ انسان کائنات کے لیے نہیں بلکہ ساری کائنات اور قدرت کے سارے مادّی وسائل اس کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور انسان کو ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اُسے فطرت کا غلام نہیں بنایا گیا بلکہ اُسے فطرت میں تصرف کے وسیع اختیارات دیے گئے ہیں۔ علم کی قوت سے انسان ذہنِ عالم کے پرے

جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ علم حقیقی علم ہو۔ محسوس زمان و مکان کی تحدید کسی غیر مسلم کا جو توحید سے لذّت آشنا نہیں، راستہ تو روک سکتی ہے، لیکن خدائے واحد کے پرستاروں کے لیے زمان و مکان کی حد بندیاں قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے علم کی قوّت سے جہانِ چارسو پر تصرف پا سکتے ہیں اور افلاک تک ان کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ اس حقیقت کو علاّمہ اقبال نے حضور سرورِ کائنات صلعم کے معراج سے واضح فرمایا:۔

"سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہیں گردوں"

جذب و وجدان (Perception and Inspiration) جس کا خمیر اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے اُٹھایا گیا ہو اس میں یہ صلاحیّت ہے کہ وہ آنِ واحد میں پورے عالم کو اپنی بصیرت میں لپیٹ لے اور یہ بصیرت ہی تسخیرِ جہالت کی ضامن ہے۔ اسی موضوع پر علاّمہ اقبال نے مختلف مقامات پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ میں صرف ایک شعر پیش کر کے اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں:۔

تو اے اسیرِ مکاں، لامکاں سے دُور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاک داں سے دُور نہیں

شامِ ہمدرد، لاہور
۷ر جولائی ۱۹۶۶ش

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نعت
بمناسبت میلادِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم

حکیم احمد شجاع ساحر
(ستارۂ امتیاز)

کچھ اور ہی ہیں رونقیں فضائے کائنات پر
نیا ہی رنگ روپ ہے تجلیاتِ ذات پر
ہُوا ہے کون جلوہ گر یہ منظرِ حیات پر
کہ غالب آگیا بشر تمام ممکنات پر
صلوٰۃُ والسّلام علیٰ نبیّنا محمّدٍ

تبارک الّذی عجب یہ ساعتِ سعید ہے
یہ شبِ شبِ برات ہے یہ روز روزِ عید ہے
وہ آگیا کہ جس کی دید آبروئے دید ہے
حیات کی نوید ہے نجات کی کلید ہے
صلوٰۃُ والسّلام علیٰ نبیّنا محمّدٍ

پھر ایک بار جوش پر مئے خُمِ الست ہے
مکیں بھی آج مست ہے مکاں بھی آج مست ہے
حریمِ نازِ حُسن میں عجیب بندوبست ہے
بشر ہے اُس مقام پر کہ جس سے عرش پست ہے
صلوٰۃُ والسّلام علیٰ نبیّنا محمّدٍ

خدا کی رحمتوں کا آج اس قدر وفور ہے
جدھر نظر اُٹھائیے سرور ہی سرور ہے
عرب کی سرزمین کا ذرہ ذرہ کوہِ طور ہے
فضائے شرق و غرب پر محیط ابرِ نور ہے
صلوٰۃُ والسّلام علیٰ نبیّنا محمّدٍ

وہ آگیا جو رونقِ طلسمِ ہست و بود ہے
جو منتہائے کُن فکاں جو مقصدِ شہود ہے
وہ جس کا عتبۂ شرف مقامِ صد سجود ہے
جو مرجعِ سلام ہے جو مہبطِ درود ہے
صلوٰۃُ والسّلام علیٰ نبیّنا محمّدٍ

بدرگاہِ سرورِ کائنات

جناب احسان دانش

بصد یقین و بصد اعتبار دیدہ وری
ہے تیری ذات پہ تکمیل عظمتِ بشری

ترے وجود پہ فہرستِ انبیا ہے تمام
تجھی پہ ختم ہے روح الامیں کی نامہ بری

ترے حدودِ نبوت، ترا مقامِ نظر
بتا رہی ہے تری زندگی کی زود اثری

ہے ایک تو ہی تو نباضِ رحمتِ یزداں
ہے صرف تجھ پہ مدارِ شفاعتِ بشری

گئی کبھی نہ ترے در پہ سر جھکائے بغیر
سجودِ شوق کی اُلجھن جبیں کی در بدری

مرے کریم مجھے ہے ترا کرم درکار
مرے مسیح مجھے ہے تلاشِ چارہ گری

ترے حضور بصد شرم لے کے آیا ہوں
کچھ آنسوؤں کا تلاطم کچھ آنسوؤں کی تری

بنا لے پھر ہمیں اپنا کر رحمتِ عالم
دلوں میں بے خبری ہے دعائیں بے اثری

گرے پڑے ہیں اب اُن راستوں میں دیوانے
جہاں نہ ذکرِ گریباں نہ فکرِ بخیہ گری

دہائی ہے کہ یہاں بک رہے ہیں عمامے
تری شراب کی کرتے ہیں رند پردہ دری

عمل غلام، عبادت غلام، علم غلام
لطافتوں سے معرّا، بلندیوں سے بری

گناہ و جرم کے سائے میں پل رہے ہیں علوم
تمام بے خبری، کمالِ بے خبری

چمن اُجاڑ کے دنیا سجا رہی ہے مزار
نگاہِ شوق ہے یک سر حجاب جلوہ گری

ترا بھی ہے یہی منشاء تو اے شہ بطحیٰ
مجھے قبول یہ شام و سحر کی دردسری

ترے سوادِ دلِ دانش میں کچھ نہیں لیکن
تری رضا ہو تو، اک انتقام فتنہ گری

حضورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم

جناب جسٹس ایس اے رحمٰن

زمانہ قدیم کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ دنیا میں کہیں ذات پات کی تمیز تھی تو کہیں طبقاتی عصبیت یا انسانی معاشرہ روبہ انحطاط ہی نہیں تھا بلکہ اس میں فساد رونما ہو چکا تھا۔ مختلف مذاہب میں پیغام ربانی میں، جو وقتاً فوقتاً انبیا علیہم السلام کی معرفت اللہ کے بندوں تک پہنچتا رہا، تحریف وتبدیل کی وجہ سے اصل پاکیزگی انسانی توہمات سے ملوث ہو چکی تھی پھر سابق ادیان طبقاتی یا قومی حد بندیوں میں محصور ہو چکے تھے۔ کہیں تو اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی نجات پیشِ نظر تھی اور کہیں برہمنوں کی علم دین پر اجارہ داری۔ نیچ ذاتوں کے لیے علمِ دین ایک بند دروازہ تھا۔ ان ادیان کے بانیوں کی زندگیاں بھی اساطیر اور دیو مالا کی تاریکیوں میں گم ہیں۔ یہ رسولِ عربی کی ذات ستودہ صفات ہے جن کی زندگی تاریخی روشنی میں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ آج بھی ہمارے سامنے ہے اور جن کا لایا ہوا پیغامِ ربانی آج بھی ہمارے پاس من وعن موجود ہے۔ اس پیغام میں دین و دنیا دونوں کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

مَیں اپنے آپ کو اس بات کا اہل نہیں سمجھتا کہ نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی پر تبصرہ کر سکوں لیکن حضورؐ کے ایک ادنیٰ غلام ہونے کی حیثیت سے عرض کروں گا کہ میری نظر میں حضورؐ ہی کی بدولت دنیا ایک بڑے انقلاب سے روشناس ہوئی۔ حضورؐ نے نوعِ انسانی کو ایسا حیات افروز پیغام دیا جس سے دنیا میں جہالت اور توہمات کی گھٹائیں چھٹ گئیں۔ رنگ ونسل اور طبقاتی امتیازات ختم ہو گئے۔ مساوات کا پرچم بلند ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں صحیح انسانی معاشرہ معرضِ وجود میں آیا۔ جس میں صرف ایک خدائے برحق کی پرستش کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے، اور جس کے معاشرے میں کوئی شخص اپنی امارت، نسل یا رنگ پر فخر نہیں کر سکتا۔ اس معاشرے میں اگر کسی بات پر انسان فخر کر سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔ یہی فضیلت کا معیار ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے مردہ انسانیت کو زندہ کر کے ان بلندیوں تک پہنچا دیا جو اسے قبل ازیں میسّر نہ تھیں۔ ان کی بدولت زندگی نے اپنی معراج کو چھو لیا۔ اسلام کے جو فرائض و واجبات

حضورؐ نے ارشاد فرمائے تھے وہ صحیح اخلاقی اقدار کے حامل ہیں اور جن پر عمل کر کے مسلمان دین و دنیا میں سُرخرو ہو جاتا ہے۔ آپؐ نے امنِ عالم کے لیے مسلمانوں کو پیغام دیا کہ آپؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیا پر ایمان لانا فرض ہے اور یہ کتنا بڑا صلح کا پیغام ہے۔ قرآنِ کریم دوسرے اہلِ کتاب کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ ہم سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آخر میں آپؐ نے کہا کہ ہم اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر ہی حیاتِ دنیوی اور حیاتِ اخروی میں سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

(کلماتِ اختتامیہ)

رحمۃ للعالمین

جناب نظر امروہوی

تم سے جو وابستگی ہے رحمۃ للعالمینؐ
ہر تمنّا قیمتی ہے رحمۃ للعالمینؐ

شدّتِ سوزِ دروں سے آج آنسو بھی نہیں
شرحِ غم ناگفتنی ہے رحمۃ للعالمینؐ

ہے اگر دنیا کو اپنی سربلندی پر غرور
مجھ کو نازِ بندگی ہے رحمۃ للعالمینؐ

جھولیاں بھر لیں جہاں نے تیرے فیضِ عام سے
اور مرا دامن تہی ہے رحمۃ للعالمینؐ

میکدے سے تیرے ملتی ہے مئے عرفاں مگر
جس کو جتنی تشنگی ہے رحمۃ للعالمینؐ

چند آنسو لے کے آیا ہے نظرؔ تیرے حضور
اس کے دامن میں یہی ہے رحمۃ للعالمینؐ

سیّد محمد قاسم رضوی

تاریخ ارض جتنی کچھ بھی ہیں معلوم ہے اُس کا کوئی دور ایسا نہیں ہے کہ حکایت ہائے جنگ و جدل سے خالی ہو۔ انسان کسی نہ کسی مقصد کے لیے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہا ہے، ایک گروہ دوسرے گروہ سے کسی نہ کسی بنا پر الجھتا رہا ہے۔ حکومتیں آپس میں برسرِ پیکار رہی ہیں اور ایک سلطنت دوسری سلطنت کے لیے معرکۂ جدال و قتال کا سامان کرتی رہی ہے۔ یہ جنگیں اور معرکے خواہ کسی عنوان پر ہوتی ہوں مگر ان میں بنیادی نکتہ ہمیشہ ایک رہا ہے، یعنی ایک کی دُوسرے پر برتری کا مظاہرہ۔ اس جذبے سے کوئی معرکۂ جنگ خالی نہیں ہو سکتا، البتہ اسباب جنگ میں جائز و ناجائز حق و ناحق اور برائی اور بھلائی کے پہلو ضرور نکل سکتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے پاکستان پر جب حملہ کیا تو ہم نے اسے بزدلانہ حملہ اس لیے کہا کہ یہ حملہ اعلانِ جنگ کے بغیر تھا اور اُصولِ جنگ کے منافی تھا۔ ہم نے اس حملے کو ناپاک اس لیے قرار دیا کہ اس حملے کے محرکات میں سرِفہرست یہ محرک تھا کہ پاکستان کو ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے منصۂ شہود پر جلوہ گر نہ ہونے دیا جائے اور پاکستان کو ضعیف اور کمزور بنا دیا جائے، اور کمزور و حقیر بنائے رکھا جائے تاآں کہ پاکستان اس قدر ناتواں ہو جائے کہ ہندوستان کے زیرِ اثر رہے۔

پاکستان ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آیا اور عالمی برادری میں اس کی واضح حیثیت ایک اسلامی مملکت کی ہے۔ برصغیر کی آزادی کے ساتھ برصغیر کا دو حصّوں میں تقسیم ہو جانا قطعی طور پر اس بنیاد پر ہوا تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنی ایک الگ حیثیت قائم رکھنا چاہتے تھے اور اپنے وجود کو ایک اسلامی وجود کے نام سے مستحکم کرنے کے آرزومند تھے۔ برصغیر کی یہ نظریاتی تقسیم برصغیر کی اکثریت کے لیے قابلِ قبول نہ تھی، مگر مسلمانوں کی شدّت و طاقت

نے اس تقسیم پر بہر طاقت کو سرنگوں کر دیا اور نقشۂ دنیا پر پاکستان ثبت ہوگیا، مگر اس حقیقت کو ہندوستان نے اپنے ہندو ہونے کی بنیاد پر کبھی تسلیم نہیں کیا اور ہندوستان کی مذہبی کشمکش نے اسے پاکستان پر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو حملہ آور ہونے کے لیے راغب اور مجبور کر دیا۔

اس جنگِ ستمبر میں پاکستانی مسلمان کا کیا کردار رہا، یہ موضوع نہایت اہم ہے اور لائقِ توجہ، کیوں کہ اس کردار ملت کا مطالعہ کیے بغیر ہم نہ تو یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس جنگ میں ہندوستان کو پسپائی کیوں نصیب ہوئی اور نہ یہ ممکن ہے کہ ہم اس کے بارے میں رائے قائم کر سکیں تو آنے والے دور میں ملتِ پاکستانیہ اپنے قوی کو مضبوط بنانے کے لیے اور ایسے حملوں کے دفاع کے لیے خود کو کس انداز پر تیار کرے گی۔

آج شامِ ہمدرد میں "جنگِ ستمبر اور قومی کردار" پر فکر اور اظہارِ خیال کے لیے ہم نے جناب سید محمد قاسم رضوی صاحب سے درخواست کی ہے۔ سید صاحب اس موضوع پر روشنی ڈالنے کے اس لیے اہل ہیں کہ وہ جنگِ ستمبر کے احوال و مقامات کے رہنما اور رازداں رہے ہیں اور انھوں نے ایک خاموش جنرل کا کردار ادا کیا ہے۔ اس سے قطعِ نظر ایک محبِ وطن کی حیثیت سے اور ایک انسان شناس کی حیثیت سے اور صاحبِ فکر و نظر ہونے کی حیثیت سے ان کا مطالعۂ کردار ملی اہمیت کا حامل ہوگا۔ جناب سید محمد قاسم رضوی صاحب ۱۹۵۰ء سے اب ۱۹۶۶ء تک حکومتِ پاکستان کے مختلف اہم شعبوں میں بڑی اہمیت کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ وہ تحریکِ پاکستان میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں نمایاں حصہ لیتے رہے ہیں اور مسلم لیگ کی تحریکِ آزادی میں شریک رہ کر دو بار جیل بھی جا چکے ہیں۔

"جنگِ ستمبر اور قومی کردار" جس قدر اہم موضوعِ فکر ہے مہمانِ مقرر اس قدر اس پر کلام کرنے کے اہل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے خطاب میں ہمیں تعمیرِ کردار کے لیے رہنما اصول بھی ملیں گے۔

حکیم محمد سعید

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ اور قومی کردار

جناب سید محمد قاسم رضوی
ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنز، حکومت پاکستان، راولپنڈی

پہلے مجھے ایک خوش گوار فریضہ کی ادائیگی کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ اس لیے کہ یہ نہ صرف آداب میزبانی کا تقاضا ہے بلکہ مجھے معلوم ہے کہ اس میں آپ سب کی خواہش کا اظہار بھی ہوگا۔ میں اپنی طرف سے اور آپ سب کی طرف سے اس محفل کے بانی اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کو ستارۂ امتیاز کا اعزاز ملنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

گزشتہ سال ستمبر کی جنگ کے بعد راولپنڈی میں اور بہت سی رونقوں میں جو اضافہ ہوا اس میں یہاں "شامِ ہمدرد" منانا بھی شامل ہے۔ یہ تقریب یہاں کی ثقافتی زندگی کا ایک روشن باب بن چکی ہے۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ آسمانِ حکمت پر حکیم محمد سعید دہلوی کا مقام ستاروں سے بھی بلند ہے۔ لیکن حکومت نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ آپ علم و ادب، صحافت اور زندگی کے کئی دوسرے شعبوں میں بھی ایک روشن ستارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حکما ہی کا قول ہے کہ مدعو مہمانوں اور چائے کے لوازمات کے درمیان زیادہ دیر کھڑا رہنا ذاتی صحت و عافیت کے لیے خطرہ کا نشان ہے اس لیے میں زیادہ دیر مزاحم نہیں رہوں گا۔

قومیت کے تاثر کی تعمیر کے لیے مختلف جذبات بروئے کار آتے ہیں۔ یہ جذبات مثبت اور منفی دونوں پہلو رکھتے ہیں۔ یعنی جو جذبات انسانوں کے انبوہ کو با مقصد گروہ بناتے ہیں وہ مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی۔ جو لوگ پیشہ ورانہ جماعتیں بناتے ہیں۔ محلہ داری، شہر داری،

رنگ، نسل، جغرافیائی، علاقائی یا اسی نوع کی کوئی اور قدر مشترک ڈھونڈ کر رعایتوں اور بے انصافیوں کے لیے اشتراک عمل کرتے ہیں وہ منفی محرکات کے تحت یک جہتی کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو اشتراک اصول یا عقیدہ کی بنیاد پر کیا جائے۔ وہ مثبت اشتراک کہلانا چاہیے۔ اس لیے کہ اس اشتراک میں انسان صرف اپنے مفاد کے لیے ہی نہیں سوچتا ہے، وہ صرف اپنی جغرافیائی حدود میں پابند گروہ کے لیے ہی نہیں سوچتا ہے بلکہ تمام ہم عقیدہ لوگوں کے مشترکہ مقصد کے لیے سب کی بھلائی کے لیے اور ایک دوسرے کی مکمل ہم آہنگی کے لیے سوچتا ہے۔ قومی کردار کی تعمیر جغرافیائی یا مادی وسائل سے نہیں ہوتی۔ افراد کی حق پرستی اور نیک نیتی پر ہوتی ہے۔ میرے موضوع کا ملخص یہ ہے کہ پاکستانی قوم کا نظریہ مذہب اور ہم عقیدگی کی عظیم اقدار سے تعمیر ہوا ہے، اور مسلم اخوت کے مشترک اصول پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں عقیدے پر منحصر اس مثبت اشتراک کا بھرپور اظہار دو بار ہو چکا ہے۔ ایک پاکستان کے قیام کی جدوجہد کے وقت اور دوسرا پچھلے سال ستمبر کی جنگ کے دوران۔ حصول پاکستان کی جدوجہد میں ہم سب نے ایک خاص قسم کے مثبت ردعمل کا اظہار کیا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد بدقسمتی سے کچھ عرصہ کے لیے ایک ایسا وقت آیا جب قوم اور افراد کے سامنے کوئی مشترک مقصد نہ رہا۔ اور لوگ اپنے اپنے انفرادی اور گروہی مفادات میں الجھ کر رہ گئے۔ ہاں اس دوران میں پاکستانیوں میں صرف عقیدے کا اشتراک رہا۔ اس کی وجہ خواہ مولوی صاحب کی جہد ہو یا ہمارا اپنا شعور! بہرحال نفسا نفسی کے اس دور میں ہم عقیدگی ایک نعمت تھی جو کسی نہ کسی وجہ سے قائم رہی۔

اسی ہم عقیدگی کی وجہ سے پاکستانیوں نے ایک بار پھر جنگ ستمبر میں اپنے عظیم کردار کا مظاہرہ کیا۔ پہلا موقع ایک ملک اور ایک وطن کے حصول کے لیے جدوجہد کا تھا اور بلاشبہ یہ ایک عظیم مقصد تھا۔ دوسرے موقع پر ملک موجود تھا اور قوم کے سامنے مقصد اسے بچانا اور اسے سربلند رکھنا تھا۔ اس جنگ نے ظاہر کر دیا کہ پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے کوئی بھی چیز ملک کے دفاع سے زیادہ قیمتی اور گراں نہیں۔ ملک کے استحکام کے مقابلے میں دوسری سب چیزیں ہیچ ہیں۔

حصول پاکستان کے وقت پاکستانی قوم نے عظیم مشترکہ قومی کردار کا مظاہرہ کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا اشتراک بامقصد تھا۔ اس کے بعد گزشتہ سال جنگ ستمبر کے دوران ایک بار پھر دنیا نے پاکستانی قوم کے عظیم کردار کا مظاہرہ دیکھا۔ اس وقت ساری قوم کے

افراد بلاتفریق عالم، جاہل، باشعور، بے شعور، امیر، غریب، بڑا یا چھوٹا وطن عزیز کے دفاع کے لیے چٹان کی طرح ڈٹ گئے۔ جب لوگوں کو ایک بار اس بات کا احساس ہو گیا کہ جو ملک انھوں نے بیش بہا قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اس کا وجود اور استحکام خطرے میں ہے تو ایک بار پھر ان کے سامنے ایک عظیم مشترک مقصد آگیا یعنی ملک کا دفاع! ہر قیمت اور ہر قربانی پر ملک کا دفاع! لوگوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے تمام اختلافات اور ذاتی مفادات کو ختم کر دیا، اور قومی کردار کا ایک ایسا بے مثال نمونہ پیش کیا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ جنگ کے دوران قومی کردار کے روشن پہلو ہر بات پر حاوی تھے۔

۶ ستمبر کے سورج نے اس خطۂ ارضی پر کیا کیا۔ تعجب خیز نظارے روشن نہیں کیے۔ محنت سے چُور، قرضوں سے دبے ہوئے کسان نے جب یہ سنا کہ ملک کی آن پر غنیم نے حملہ کیا ہے تو اُس نے پسینہ پونچھتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ "مجھے کیا" کوئی بھی حکمران ہوں مجھ سے تو ہر خوشہ گندم ملکیت، ٹیکس اور قرضہ کے نام پر چھین لیا جاتا ہے۔ "ہوتے دو جو ہوتا ہے۔" نہیں اُس نے سینہ کشادہ کیا، اپنی سوکھی روٹی کی پوٹلی ہاتھ میں لی۔ اُس کی بیوی مکھن کا ڈونا ساتھ لے آئی وہ سڑکوں پر نکل آئے کہ گزرتے ہوئے فوجیوں کو اپنی محنت کا خراج پیش کریں۔ انھوں نے اصرار سے ہر "لام" پر جانے والے کو رد کا کہ "اے قوم کی آن ٹھنڈی لسّی پی اور محاذ پر میرے لڑنے کی حسرت بھی ساتھ لے جا۔" مزدور نے اپنے کندھے کے بوجھ کو پھینک کر یہ نہیں کہا کہ "میرے بے روشنی گھر، غلیظ ماحول اور جانگداز کم تنخواہی کا علاج نہ یہ حکومت ہے نہ غنیم۔ مجھے اس سے کیا اور جنگ سے کیا۔" اُس نے خاموشی سے اُن مقاموں کی راہ لی جہاں گولہ بارود لادنے کے لیے اُس کے بازو اور کمر کی قوت بلا اجرت درکار تھی۔ ہر کہ ومہ صرف وہ صرف قوم کی سرخروئی کا تمنائی تھا۔ عام آدمی خوف خدا اور خود اعتمادی کے جذبے سے سرشار تھا۔ اور میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس نو خوابیدہ جذبے کا سرچشمہ اُن کا عقیدہ یعنی اسلام تھا۔

اگر ہم دیانت داری سے دیکھیں تو آزادی نے، سماج نے، قوم کے اداروں نے اس غریب کسان اور اس غریب مزدور کے لیے وہ آسائشیں، سہولتیں اور سہر لیفانہ گزر بسر کے اسباب مہیا نہیں کیے تھے۔ اگر قومیت اور قومی جذبہ مادی وسائل، جغرافیائی حدود، معاشیات یا اس قماش کی کسی اور جنس پر منحصر ہوتا تو اس کسان، اور اس مزدور کو ایسے ملک کے بچانے اور اُس کے دفاع کے لیے قربانی دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے کردار میں اپنی محرومیوں کے باوجود قوم اور ملک کی محبت کسی مادی نظام کا عطیہ نہیں۔ ہمیں اس معجزہ نما اظہار کردار کی وجہ کہیں اور ڈھونڈنی پڑے گی۔

کردار بذاتِ خود تو پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ یہ ہمارے تجربے کا عکس ہے۔ ہمارے مسلسل اور روز و شب تجربات کی روشنی میں غیر ارادی طور پر ہمارا عمل اور ردِ عمل ماحول کا پرتو بنتا جاتا ہے اور ہمارے کردار کا جزو ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ہمارا معاشرہ، جو بیشتر محرومیوں کا معاشرہ ہے، دولت کی غلط تقسیم کا معاشرہ ہے، مال داروں اور بے زاروں میں عدم تعاون کا معاشرہ ہے۔ انسانوں کو انسانوں پر مسلط رکھنے کا معاشرہ ہے، دولت طلبی، عزت پرستی اور دقار پرستی کا معاشرہ ہے۔ ایسا معاشرہ کردار میں لالچ کی جگہ دیانت، خود غرضی کی جگہ خلوص، عافیت کوشی کی جگہ قربانی غرض کہ منفی قدروں کی جگہ مثبت قدریں پیدا نہیں کر سکتا۔

اس کلیے کے باوجود ہماری تاریخ کے ان دو اہم مواقع پر افراد نے فرداً فرداً اور قوم نے مجموعی لحاظ سے جس ردِ عمل کا مظاہرہ کیا وہ مثبت تھا، قابلِ فخر تھا اور نظریاتی کلیوں کی پیش گوئیوں کے مخالف تھا۔

میں اس مجلس میں آپ سے یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یہ محیّر العقل ردِ عمل صرف اور صرف اس وجہ سے تھا کہ پاکستان کے افراد کو سمجھ نہ سکنے اور عمل نہ کرنے کے باوجود مذہب سے لگاؤ تھا۔ اور اُن کے دل میں کہیں نہ کہیں خوفِ خدا کا جذبہ خوابیدہ تھا۔ یہ صرف پاکستانی عوام کے دلوں میں باحق مذہب کا ضمیر تھا جس نے انہیں آزمائش کے وقت بلا تفریق ایک صف میں لا کھڑا کیا اور وہ سب سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک متنفر کر دشمن کے سامنے ڈٹ گئے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ گزشتہ جنگ میں ہمارا مذہب ہی قومی کردار کی تعمیر میں مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ پاکستانی قوم بے عمل اور گناہ گار قوم ——— اسلام پر ایمان رکھتی۔ ۔ یہی ایمان ہمارے لوگوں کو آنے والے وقت کے لیے متحد و منظم رکھے گا، اور اس کے ذریعے ہم ملک کی سلامتی کے لیے ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں گے۔

مجھے یہ کہنے میں قطعاً ہچکچاہٹ نہیں کہ افراد اور قوم کا عمل اسلام کے اصولوں کے مطابق نہیں۔ ہم، اور سب سے زیادہ میں، گناہوں سے ملوث ہیں۔ روزمرہ کی عملی زندگی میں تعلیماتِ اسلام کے خلاف پے در پے عمل کرتے ہیں۔ میری عرض کا مقصد محض اتنا ہے کہ بے عمل ہونے کے باوجود محض ایمان اور ایمان کی موجودگی ہی قومی ابتلاء کے وقت ہمارے کردار کا وہ پوشیدہ پہلو اُجاگر کر دیتی ہے جو انسان کو انسانیت کے لیے اسلام کا انعام ہے۔

اگر اس ایمان کے ساتھ عمل بھی شامل ہو جائے تو اس قوم کی عظمت و قوت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری بداعمالیوں کے باوجود اسلام ہمارے لیے بہت بڑی قوت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور قوموں کے کردار کی تعمیر میں محض اقتصادی منصوبہ بندی اور مادی ماحول ہی نتیجہ خیز نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں اقتصادی ترقی و خوش حالی کے باوجود طمانیت کا فقدان ہے۔ خودکشی، گھریلو بدمزگی، اور کئی دوسری معاشرتی اور ذہنی الجھنیں عام ہیں۔

پاکستان کے مسلمانوں کو جنگ کے دوران جو وحدت اور یگانگت ارزاں ہوئی اور انھوں نے جس اشتراکِ عمل اور قومی کردار کا مظاہرہ کیا اس کا منبع صرف اسلام تھا خواہ ہم اس موقعے پر ہزار جغرافیائی اور گروہی عصبیتیں ابھارتے، استحکام اور اخوت کے وہ نظارے ہرگز دیکھنے میں نہ آتے جو اسلامی اخوت اور اشتراکِ عمل کی وجہ سے نظر آئے۔ بلکہ ہم نے دیکھا کہ جب پاکستان پر آزمائش کا وقت آیا تو دوسرے اسلامی ملکوں نے بھی جغرافیائی حدود اور اپنے سیاسی معتقدات کی پروا کیے بغیر ہمارے لیے دعائیں کیں اور جس طرح بن پڑا وہاں کے عوام نے ہماری امداد کے لیے عملی اقدام کیا۔ وہ کون سی چیز تھی جس نے افغانستان، انڈونیشیا، عرب، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں کے عوام کو تڑپا دیا کہ وہ اپنی مسجدوں میں ہماری فتح و کامرانی کے لیے دعائیں کریں۔ یہ چیز صرف وحدتِ خیال ہے۔ ہمارا اور اُن کا اعتقاد ایک ہے۔ ہم اور وہ مسلمان ہیں۔

آخر میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بدقسمتی سے پاکستان میں اس قیمتی خزانے کا اُس بے نظیر جذبے کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا جا رہا۔ لوگوں کے دلوں میں مذہب کا خمیر ہے جس کو کام میں لا کر پاکستانی قوم سے بڑے سے بڑا کام بھی کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں کے عوام کو نہ اسلامی اصول سے روشناس کرایا جا رہا ہے اور نہ انھیں اسلامی تعلیم اور فلسفے سے پوری طرح آگاہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ اسلام پر غیر متزلزل اعتقاد و یقین رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اس پر پوری طرح عمل پیرا نہیں ہوتے۔ ضرورت ہے کہ پاکستانی قوم کی اس بھرپور صلاحیت سے فائدہ اُٹھایا جائے اور ان کے ملی جذبات کو فروغ دیا جائے۔

شامِ ہمدرد۔ راولپنڈی
اگست ۱۹۶۶ء

ملک خدا بخش بُچّہ

مغربی پاکستان کے وزیر تعلیم ملک خُدا بخش بُچّہ صاحب کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصّہ سرکاری خدمات میں بسر ہُوا۔ لیکن ان کا علمی، ادبی اور مذہبی ذوق ان گراں بار ذمّے داریوں کے دَور میں بھی نمایاں ہوتا اور اُبھرتا رہا۔ آپ صوبہ مغربی پاکستان کے وزیرِ تعلیم ہیں اور بہت مختصر سی مدّتِ وزارت میں ان کے ذہن، دماغ اور قلب و نظر کی پختگی نے قوم کی اُمنگوں اور حوصلوں کی صحیح طور پر حوصلہ افزائی کر کے ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ مشنری اسکولوں میں مسلمان طلبہ کے لیے مذہبی تعلیم کا انتظام، تعلیم گاہوں میں مخلوط قسم کے نام نہاد ثقافتی اجتماعات پر پابندیاں، نیز طالبات کے بے حجابانہ رقص و سرود پر قدغن، اتنا بڑا اور وقیع کارنامہ ہے جسے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک انجام دینے کی کسی کو جراَت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ یقیناً یہ کارنامہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور بلاشُبہ ہماری تاریخ کا یہ ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ثابت ہو گا۔ یہ جو کچھ ہُوا بہت ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا ابھی باقی ہے، اور بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس سلسلے میں بھی اُمیدیں پوری ہوں گی، اور مایوسی سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔

کسی قوم کے لیے سب سے اہم اور نازک تر مسئلہ تعلیم کا ہوتا ہے۔ غیر منقسم ہندستان میں جب انگریزی تعلیم عام ہونے لگی تو اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

دِل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اندیشہ ایک تلخ حقیقت بن کر نمودار نہیں ہُوا۔

انگریز اس ملک کے فرماں روا تھے سا اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کی مکمل تکمیل کے لیے انھیں ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت تھی جو ان کے آلۂ کار بن سکیں اور دل و جان سے ان کی خدمت بجا لائیں۔ اُنھیں ایسے علماء کی ضرورت نہیں تھی جو اعلائے کلمۃ الحق کے عادی ہوں، جو تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے ماہر ہوں، جو اپنی مذہبی روایات پر نازاں ہوں،

جنھیں اپنی ملی میراث پر فخر ہو۔ ایسے لوگ توان کے راستے کا پتھر تھے۔ چناں چہ انھیں راستے سے ہٹایا گیا، دینی علوم کی کوئی اہمیت نہ رہ گئی۔ مذہبی مکاتب اور مدارس کی سرپرستی سے گریز کیا۔ زور صرف اس پر دیا کہ ابنائے وطن کو ایسی تعلیم دی جائے جو ان کے دِل بدل دے۔ چناں چہ کچھ ہی مدت کے بعد یہ تعلیم رنگ لائی، صرف زبان نہیں بدلی، صرف علوم نہیں بدلے، صرف خیالات نہیں بدلے، بلکہ دِل ہی بدل گئے۔ فرنگی زبان، فرنگی علوم کے ساتھ فرنگی معاشرت، فرنگی آرٹ، فرنگی بے حجابی، فرنگی تمدن اور فرنگی معاشرت بھی جاری ہو گئی، کیوں کہ راستے کا سنگِ گراں ہٹ گیا تھا۔

یہی حالات دیکھ کر سرسید نے فرنگی سامراج کے بدترین دَورِ حکومت میں ایک آزاد مسلم تعلیم گاہ کا خواب دیکھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دِل نہ بدلنے پائیں۔ شبلی نے سرسید کی ساری تحریک کو ایک مصرع میں پنہاں کر دیا ہے کہ:

"ایں سر رشتہ تعلیم ما در دستِ ما باشد"

لیکن یہ خواب شرمندہ تکمیل نہ ہو سکا ادھورا ہی رہا۔ ایک سامراجی حکومت اپنے محکوموں کو ایک آزاد تعلیم گاہ قائم کرنے کی اجازت کس طرح دے سکتی تھی؟ سرسید، سر آغا خان، محسن الملک، وقار الملک، محمد علی اور دوسرے اکابر نے لاکھ لاکھ کوشش کی، مگر وہ مستعمراتی حکومت کو اپنا ہم نوا نہ بنا سکے، پھر بھی جو کچھ ان نامساعد حالات میں اُنھوں نے کیا اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی غلام قوم ایسا نظام تعلیم بروئے کار لا بھی نہیں سکتی جو اس کے اپنے اور ملی مزاج کے مطابق ہو۔ اس لیے کہ جو چیز محکوم کے اپنے اور ملی مزاج کے مطابق ہوتی ہے وہی حاکم کے استعماری اغراض و مقاصد کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔

پاکستان کی تحریک اس لیے عالمِ وجود میں آئی تھی کہ مسلمان اسلامی طرزِ حیات کو اپنا سکیں اور جب پاکستان عالمِ وجود میں آ گیا تو بجا طور پر ہر مسلمان کو یہ توقع تھی کہ سب سے پہلے جو انقلابی پروگرام روبہ کار لایا جائے گا وہ نظامِ تعلیم کی یک سر تبدیلی پر مبنی ہو گا۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے عالمِ وجود میں آتے ہی، آفات و مصائب کا غیر منقطع سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس دن پاکستان قائم ہوا اُسی دن سے پاکستان کو ختم کرنے کی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ پاکستان کے جسمِ ناتواں پر پے بہ پے گھاؤ لگے اور لگتے ہی چلے گئے۔ ان حالات میں ایک قوم

تعمیر پر اتنی توجہ نہیں کر سکتی ہے جتنی دفاع پر کرتی ہے۔ یہ اگر عذر ہے تو مجھے تسلیم ہے۔ اگر دلیل ہے تو بھی میں اس سے انکار نہیں کر سکتا اور اگر بیان درست ہے تو ظاہر ہے حقیقت کو جھٹلانے کی کون جرأت کرے گا۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نظامِ تعلیم کی یک سر تبدیلی کا جو کام پہلے دِن ہی ہو جانا چاہیے تھا اٹھارہ سال تک ——— اور نہ جانے کب تک ——— اس کا ملتوی اور معلّق رہنا، ہمارے رہنماؤں، سیاست دانوں اور اربابِ اقتدار کی کارگزاریوں کا کوئی اطمینان بخش نمونہ نہیں ہے۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے، پاکستان کا قیام و دوام منحصر ہے اسلام اور صرف اسلام پر، لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم سائنس، طبیعات، معاشیات، تاریخ اور دوسرے متعدّد علوم و فنون پر پوری توجہ صرف کر رہے ہیں۔ لیکن نہیں کرتے تو اس بات پر کہ ہمارے اسکول، ہمارے کالج، ہماری دانش گاہیں اسلام کا مورچہ بن جائیں۔ اس فرض سے غفلت برت کر ہم پوری ایک نسل کے مستقبل کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ بہت زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے جواب دہ ہم قوم کے سامنے بھی ہیں اور خدا کے سامنے بھی۔

تاریخ سے اچھا اور سچا گواہ کوئی نہیں اور تاریخ سے قدم قدم پر جو سبق ہمیں ملتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ کوئی قوم اپنی روایات و شعائر سے بے نیاز رہ کر ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کی ترقی، عروج اور فروغ کا دَور اسی وقت شروع ہو جاتا ہے کہ جب وہ ان روایات و شعائر پر پورے جوش اور جذبے سے عمل کرتی ہے اور زوال، انحطاط اور ادبار کی کار فرمائی اسی آن شروع ہو جاتی ہے جب یہ جذبہ کم زور پڑ جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم بھی ہمارے سوا ایسی نہیں ہے جو صاحبِ زبان ہو لیکن جس کی تعلیمی زبان بدیسیوں کی ہو، جس نے اپنا لباس، تمدّن، معاشرت اور طرزِ حیات دوسروں سے مستعار لیا ہو اور اپنی ہر چیز یں طاقِ نسیاں پر رکھ دی ہوں۔ ہر قوم خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی پس ماندہ ہو یا ترقی پذیر، تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ، اگر آزاد ہے تو اپنی انفرادیت سے کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہو سکتی۔ افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کی کئی ریاستوں کو آزاد ہوئے ابھی چند سال گزرے ہیں، لیکن اس مختصر سی مدّت میں انھوں نے تعلیمی انقلاب برپا کرنے میں سب سے زیادہ اور سب سے پہلے توجہ کی ہے۔ لیکن ہم جو اپنی پوری چودہ سو برس کی قابلِ فخر تاریخ رکھتے ہیں اور صدہا سال تک یورپ اور ایشیا کے بڑے بڑے خطّوں اور ملکوں پر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر چکے ہیں آزادی کے اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی تعلیمی انقلاب سے محروم ہیں۔ یہ محرومی اس قوم کے حصّے میں آئی ہے جس کے بارے میں اقبال کا حسنِ ظن یہ تھا کہ

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!

اور جس سے شاعرِ مشرق کو یہ امید تھی،

سبق پھر پڑھ شجاعت کا، صداقت کا، امامت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

بے شک دنیا ہماری امامت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اسے کیا کہا جائے کہ ہم بارِ امامت اُٹھانے سے کترا رہے ہیں۔

میری یہ پختہ رائے ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ جرأتِ رندانہ سے کام لیا جائے اور اس فرسودہ نظامِ تعلیم کو جو ہمارے لیے ایک روگ بن چکا ہے پورے طور پر مسترد کیا جائے اور اس نظام میں ایسی دور رس تبدیلیاں کی جائیں جو ہمیں ایک اچھا انسان اور سچا مسلمان بنا سکیں کہ ہمارا وجود اس وقت تک کارآمد ہے جب تک ہم مسلمان ہیں۔ اگر اسلام سے ہمارا رشتہ کمزور پڑ گیا تو کیا ہم اور کیا ہمارا وجود،

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

حکیم محمد سعید

نظامِ تعلیم اور آزادی کے تقاضے

ملک خدابخش بچہّ صاحب وزیرِ تعلیم مغربی پاکستان

(۱) یقین کیجیے، محترم حکیم صاحب کی طرف سے شامِ ہمدرد کے معزّز سامعین سے خطاب کرنے کی فرمائش میرے لیے ایک آزمائش سے کچھ کم ثابت نہیں ہوئی۔ محبّی حکیم صاحب کے لیے اپنے جذبۂ محبّت و احترام کے پیشِ نظر میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن بعد میں جب موضوع کی نزاکت پر غور کرنے کا موقع ملا تو احساس ہوا کہ مجھ ایسے شخص کے لیے جو نہ تو ماہرِ تعلیم ہو کہ موضوع کا حق ادا کر سکے اور نہ ہی ایسا مقرّر کہ اپنی علمی کم مائگی کو خوب صورت الفاظ میں چھپا سکے، شامِ ہمدرد کے معزّز سامعین سے خطاب کرنے میں کتنی دشواری ہے۔ محترمی حکیم صاحب نے شامِ ہمدرد کی روایت قائم کر کے اہم قومی موضوعات پر بلند آہنگ سوچ کا جو انوکھا طریقہ تلاش کیا ہے وہ بہت ہی مفید اور قابلِ قدر ہے لیکن آج کی شام جس موضوع پر گفتگو کرنے کی مجھے دعوت دی گئی ہے اس میں مجھے ایک سامع کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ بہر حال میں اپنے محترم دوست کے پاسِ خاطر اور تعمیلِ ارشاد کے لیے آپ کے سامنے حاضر تو ہو گیا ہوں لیکن اپنے سیدھے سادھے خیالات اور غیر مرتّب معروضات کے لیے شروع ہی میں معذرت کر دینا بھی نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔

(۲) میں نے جب کبھی تعلیم اور آزادی کے موضوع پر قرآنِ حکیم کی روشنی میں غور کیا ہے

تو ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آزادی اور تعلیم لازم و ملزوم ہیں۔ صحیح قسم کی آزادی کے لیے قرآن حکیم خلافت کی اِصطلاح استعمال کرتا ہے۔ قصّہ آدم کے ضمن میں مذکور ہے کہ باری تعالیٰ نے انسان کو خلافت ارضی سونپنے کا ارادہ فرمایا اور اپنی اس مشیّت کا اظہار فرشتوں پر کیا تو وہ متردّد ہوئے، کیوں کہ ان کے نزدیک آزادی انسان کے لیے خطرناک تھی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے گا، زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔ لیکن جس ربّ قدیر نے اس مشتِ خاک کو لائقِ آزادی خیال فرما لیا تھا اس نے اِسے تعلیم، صلاحیت اور علمی اِستعداد سے بھی بہرہ ور کر رکھا تھا۔ چناں چہ قادر مطلق نے فرشتوں کے ان اندیشوں کی تردید نہیں فرمائی بلکہ انسان کو "الاسماء کلّھا" کی تعلیم دی۔ یہاں "کلّھا" کا لفظ بڑا معنی خیز ہے اور علم انسانی کی وسعتوں پر دلالت کرتا ہے۔ پھر ایک امتحان کے ذریعے پیکرانِ نوری کے مقابلے میں آدم خاکی کی علمی برتری کو ثابت کرکے فرشتوں پر واضح کر دیا کہ آدم خاکی کی پوشیدہ صلاحیتوں کے بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں اس کی تمھیں خبر نہیں ہے۔ چناں چہ وہ دن اور آج کا دن، انسان کی خلافت یا آزادی اس کی علمی صلاحیتوں کے ساتھ مشروط چلی آرہی ہے۔ بے شک بنی نوع انسان آزاد ہے۔ وہ چاہے تو زمین میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کرتا پھرے لیکن لاریب وہ ایسی تعلیمی صلاحیت و استعداد بھی رکھتا ہے کہ اپنی مفوضہ آزادی یا خلافت کو تسخیرِ فطرت اور تعمیرِ سیرت کے کاموں میں بروئے کار لا کر اسی دنیا کو رشکِ فردوس بنا لے۔

(۳) جب بھی ہم آزادی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہمیشہ کسی نہ کسی اعلا مقصد کی تکمیل مراد لی جاتی ہے۔ کسی اعلا مقصد کے تصور کے بغیر آزادی کا لفظ سراسر لغو اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ مثلاً انفرادی آزادی کا یہ مطلب کبھی اور کہیں نہیں لیا جاتا کہ کسی شخص کو چوری، ڈکیتی یا عریانی و فحاشی یا ظلم و ستم یا قتل و غارت کی کھلی چھٹی ہے۔ نہ ہی قومی آزادی سے کبھی یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ کوئی کام انتشار و بدنظمی، راہ روی، پراگندہ حالی و پراگندہ خیالی کے لیے آزاد چھوڑ دی گئی ہے یا اُسے بین الاقوامی میدان میں جارحیت، جوع الارض، استعمار و استبداد اور معاشی استحصال کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ لہٰذا آزادی کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ قوم کے سامنے ایک واضح مقصد ہو جو اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہونے پائے۔ صرف وہی نظام تعلیم آزادی کے اس تقاضے کو پورا کر سکتا ہے جو قومی مقصد کو نوجوانوں کے ذہنوں میں ہمیشہ تازہ رکھے

اور ہمارا اعلیٰ مقصد ایک خدا ترس معاشرے کا قیام ہے۔

(۴) جب کوئی قوم آزادی کا نعرہ لگاتی ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم اپنے نشوو ارتقاء اور آئیڈیالوجی کے حاصل کرنے اور اس کے نفاذ کے لیے ایک ایسی پر ممکنات فضا میں سانس لینا چاہتی ہے جہاں خارجی رکاوٹیں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ برِ صغیر ہندستان میں حصولِ آزادی کی صبر آزما جنگ میں انگریزوں کے خلاف ایک طویل عرصے تک ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ لڑتے رہے لیکن دونوں کے نزدیک آزادی کا مطلب و مقصد جُدا جُدا تھا۔ ہندو ذہنیت کے نزدیک آزادی کا مطلب یہ تھا کہ یک وطنی قومیت کی آڑ میں وہ اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو زیرِ نگیں رکھ سکیں جب کہ مسلمان آزادی سے مراد ایسی سیاسی فضا لیتے تھے جہاں اُن کا دین اور تہذیب و تمدّن ہر قسم کے اثرات سے آزاد ہو۔ مقاصد کا یہی افتراق ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی تفریق کا باعث بنا اور بالآخر مسلمانوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ اپنی آزادی کا نشان پاکستان قرار دیں، اور ہمارے نزدیک پاکستان کا نام بیک وقت آزادی کا نشان بھی تھا اور لا الٰہ الا اللہ کی علامت بھی۔

(۵) آزادی کا حصول شاید اتنا مشکل نہیں رہا جتنا کہ آزادی کو قائم و برقرار رکھنا، کیوں کہ آزادی کے اقتصادی اور ثقافتی مضمرات آج کل آزادی کے سیاسی مضمرات سے کچھ کم اہم نہیں رہے ہیں سیاسی آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھی اس امر کا اندیشہ ہر وقت موجود رہتا ہے کہ کم زور اقوام طاقت ور اقوام کے اقتصادی اور ثقافتی چنگل میں پھنس کر نہ رہ جائیں۔ اس لیے موجودہ دَور میں تنہا افواج ہی کسی ملک کی آزادی اور سالمیت کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتیں بلکہ جب تک کسی قوم کا ایک ایک فرد آزادی کی حفاظت کو اپنا مقدّس فریضہ نہ خیال کرے قومی آزادی کو قائم و برقرار رکھنا مشکل بلکہ محال ہو جاتا ہے۔

(۶) آزادی جہاں ہمیں حقوق و اختیارات سے آشنا کرتی ہے وہاں چند گراں بار ذمّے داریاں بھی عائد کرتی ہے اور ان ذمّے داریوں کو نبھانے کے لیے خاص قسم کی صفات رکھنے والے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزاد اقوام کی یوں تو کئی صفات گنوائی جا سکتی ہیں لیکن دو اوصاف نہایت ہی اہم بلکہ لازم ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ قوم اپنے سامنے ایک واضح نصب العین اور اس کے لیے جدّوجہد کرنے کا عزم رکھتی ہو۔ جس قوم کے

سامنے کوئی نصب العین نہ ہو یا نصب العین کے لیے محبت نہ ہو اس میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہوتی اور جس قوم میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور جرأت نہ ہو اس کی آزادی آج بھی چھن سکتی ہے اور کل بھی۔ دوسری اہم صفت یہ ہے کہ وہ قوم اپنی آئیڈیالوجی کی حفاظت اور پشت پناہی کے لیے مناسب مادی قوت بھی رکھتی ہو۔ موجودہ دور میں مادی قوت کے حصول کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس لیے آزادی کا پہلا تقاضا آئیڈیالوجی ہے اور دوسرا ٹکنالوجی، اور ایک آزاد قوم کی ہیئتِ ترکیبی میں آئیڈیالوجی اور ٹکنالوجی وہی اہمیت رکھتے ہیں جو ایک فرد کی زندگی میں روح اور جسم کو ہوتی ہے۔ اس لیے نظامِ تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو آزادی کے ان دونوں تقاضوں کو بیک وقت پورا کر سکے۔

(۷) حصولِ پاکستان کے فوراً بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں نظامِ تعلیم کو آزادی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک کانفرنس بلائی گئی تھی جس میں تعلیمی مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا:

> "غیر ملکی حکومت کی ایک صدی سے زائد عرصے کی غلامی کے دور میں تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اگر ہمیں سُرعت کے ساتھ حقیقی اور ٹھوس ترقی کرنی ہے تو ہمیں تعلیم کے مسئلے پر گہری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر منظم کرنا چاہیے جو ہماری قوم کے مزاج کے مطابق ہوں۔ ہماری تاریخ اور کلچر سے ہم آہنگ ہوں اور جن میں دورِ جدید کے عالمی حالات اور مادی ترقی کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔"

قائدِ اعظمؒ کے اس ارشاد میں اوّلیت کی اُس صحیح ترتیب کے متعلق بھی نہایت واضح اشارہ پایا جاتا ہے جسے ہمیں اپنے تعلیمی نظام میں پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ قائدِ اعظمؒ کے دیے گئے خطوط کی بنیاد پر اس کانفرنس میں تین بڑی سفارشات مرتب کی گئیں تھیں۔ اوّل یہ کہ تعلیم اسلامی ہو، دوم یہ کہ پرائمری سطح تک تعلیم مفت اور لازمی ہو اور سوم یہ کہ ٹیکنیکل تعلیم کو از سرِ نو منظم کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تعلیم کو اسلامی رُخ دینے کی پالیسی شروع ہی سے ہمارے نظامِ تعلیم کی نظریاتی اساس کا اہم ترین جزو رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عملی طور پر ہمارے تعلیمی ماہرین اس ضمن میں کوئی واضح، ٹھوس اور مؤثر لائحہ عمل تجویز نہیں کر سکے ہیں اور جو عملی اقدامات اس سلسلے

ہیں وقتاً فوقتاً کیے بھی جاتے رہے ہیں وہ بھی خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ کوئی آسان کام ہے بھی نہیں۔ یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی مشکل بھی ہے۔

(۸) بدقسمتی سے دین کے غلط تصور کی وجہ سے روح و مادّہ، دین و دنیا، مذہب و سیاست کی تفریق نے ہمارے ہاں دو مختلف تعلیمی نظام پیدا کر رکھے ہیں جن سے دو متضاد قسم کی شخصیتیں (مسٹر اور مولوی) تیار ہو کر نکلتی ہیں۔ نظامِ تعلیم کو اسلامیانے کی سابقہ کوششوں میں زندگی کی یہی خانہ ساز تقسیم حائل ہوتی رہی ہے۔ نظامِ تعلیم میں اسلام کو چوں کہ ایک دین کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مذہب کی حیثیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اس لیے خاطر خواہ نتائج آج تک برآمد نہیں ہوئے۔ اگر ہم فی الواقع ایسا نظامِ تعلیم تشکیل دینا چاہتے ہیں جو مسٹر اور مولوی کے بجائے تخلیقِ مومن کا ضامن ہو تو اس کی صحیح صورت یہی ہو گی کہ ہم اپنے پورے نظامِ تعلیم میں تصورِ توحید کو حصولِ تنظیم اور اصل الاصول قرار دیں تاکہ تمام علوم و فنون میں خدا کا تصور شاخِ گل میں بادِ سحر گاہی کے نم کی طرح سرایت کر جائے۔

(۹) قومی آزادی کی بقا کے لیے قومی وحدت، یک جہتی اور ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔ اس نصب العین کے لیے آزاد اقوام کیا کچھ کر گزرتی ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض قوموں میں ہزار ہا سال پرانی مردہ زبانوں کو ازسرِ نو اپنا کر اور ذریعۂ تعلیم قرار دے کر موزوں ثقافتی پس منظر رکھنے والے شہریوں کو ایک ہی رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس طرح سے قومی وحدت و ہم آہنگی کا اہتمام کر لیا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قومی تعلیم کو قومی وحدت حاصل کرنے کے لیے ایک مؤثر ذریعے کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے اور اگر کسی نظامِ تعلیم کو قومی آزادی کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے تو لازم ہے کہ قومی وحدت کا حصول اس تعلیم کا ایک بنیادی مقصد قرار پائے جیسا کہ آپ کو علم ہو گا کہ حکومت تہیہ کر چکی ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے تعلیم کو استعمال کریں۔ چناں چہ ثانوی تعلیم کے آخری درجوں تک اسلامیات اور اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دینا اور دیگر اقدامات اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

(۱۰) آزادی کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ نظامِ تعلیم کو مادی ضروریات کا پابند اور

کفیل بنایا جائے۔ غلام اقوام خود اختیاری کے بنیادی حق سے ہی محروم ہوتی ہیں اور اس لیے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتیں لیکن اگر کوئی قوم آزاد ہونے پر بھی اپنی ضروریات کا صاف صاف اور واضح شعور حاصل نہ کر سکے اور اپنی تعلیم کو ان ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی استعداد سے محروم ہو تو آزادی اور غلامی میں آخر فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ تعلیم کو قومی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور حقیقت پسندی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ سٹالن نے ایک بار ایچ۔ جی۔ ویلز سے کہا تھا تعلیم ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی خوبیٔ تاثیر ہتھیار اُٹھانے والے اور ہتھیار کی چوٹ کھانے والے پر یکساں انحصار رکھتی ہے۔ اس لیے تعلیم کے میدان میں منصوبہ بندی کو وہی اہمیت حاصل ہے جو میدانِ جنگ میں جنگی چال (Strategy) کو۔

(ا) تعلیمی منصوبہ بندی کا کام اس قدر نازک واقع ہوا ہے کہ اس میں ذرا سی بھول چوک سے پورا نظامِ تعلیم خطرناک حد تک غیر متوازن اور خوفناک حد تک قومی ضیاع کا باعث بن سکتا ہے۔ نظامِ تعلیم میں بالعموم تین قسم کے قومی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں: سیاسی، معاشی اور تعلیمی۔ تعلیم کا سیاسی مقصد یہ ہے کہ سیاسی شعور کی تعمیر و تہذیب کے لیے چوں کہ تعلیم ناگزیر ہے اس لیے عام تعلیم کو وسعت دینی چاہیے تاکہ سیاسی فضا میں وہ کیفیت پیدا نہ ہو جسے برنارڈ شا

Liberty by unlimited suffrage for unqualified nobodies elected by politically uneducated everybodies.

سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن یہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اگر سیاسی دباؤ کے زیرِ اثر محض عام تعلیم کی توسیع پر ہی زور دیا جاتا رہے تو اس سے جو روشنیٔ طبع پیدا ہو گی وہ اُن تعلیم یافتگان کے لیے اس وقت تک بلائے جان بنی رہے گی جب تک ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی معیشت نہ سنورے۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں شرح خواندگی کو بڑھانے کے لیے عمومی تعلیم پر ہی زور دیا جاتا رہا۔ یہ حسنِ اتفاق تھا کہ تعلیم پانے والوں کے لیے مواقع روزگار بھی میسر تھے۔ لیکن جوں جوں ہمارے ہاں صنعتوں میں ترقی ہوتی گئی ہے اُسی نسبت سے روزگار کے مواقع صرف ٹیکنیکل تعلیم پانے والوں تک کے لیے مخصوص ہوتے گئے ہیں۔ اگرچہ کسی

ملک کی سیاست کو اُس ملک کی معیشت سے جُدا نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تعلیم کے مقابلے میں معاشیین کی دلچسپی سیاسیین سے مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ ماہرینِ معاشیات کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کی ہر اُس توسیع کو روک دیا جائے جو گراں قیمت ہو اور ملک میں بے روزگاری کا باعث بھی بنے۔ اگر کسی خاص قسم کے روزگار کی خواہش رکھنے والوں کی تعداد مواقعِ روزگار کی تعداد سے بڑھ جائے تو معاشی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ معاشی اعتبار سے صرف وہی نظامِ تعلیم سود مند ہوتا ہے۔ جس میں روزگار کی مختلف نوعیتوں اور مختلف سطحوں کے لیے صرف اتنے افراد تیار ہوتے رہیں جن کو معیشت کے مختلف شعبوں میں کھپا کر ترقی کی رفتار کو جاری رکھا جا سکے۔ ان ماہرینِ سیاسیات و معاشیات کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ماہرینِ تعلیم کا بھی ہے جو اپنا مخصوص نقطۂ نظر ان دونوں سے الگ رکھتا ہے۔ اس کا سارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ تعلیم میں توسیع کے بجائے تعلیمی معیار کو بڑھانے یا قائم رکھنے کی فکر کی جائے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تینوں نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ اگر سیاسی دباؤ کے تحت تعلیم کی عام توسیع پر زور دیا جاتا ہے تو سکولوں اور کالجوں سے نوجوانوں کی اتنی بڑی کھیپ تیار ہو کر نکلتی ہے جنھیں سرِ دست ملکی معیشت میں کھپانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس سے ملکی بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے اور عام بد دلی پھیلتی ہے۔ اگر تعلیم میں صرف معاشی نقطۂ نظر غالب رکھا جاتا ہے تو سیاسی قائدین کہتے ہیں کہ اتنے سارے لوگوں کو محض اندیشہ ہائے دور دراز کی بنا پر زندگی کی بنیادی ضرورت یعنی تعلیم سے محروم رکھنا اور ان کی صلاحیتوں سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھانا ایک نہایت ہی ظالمانہ رویہ ہے۔ اسی طرح تعلیمی نقطۂ نظر سے معیار پر اصرار بڑی اچھی بات سہی لیکن بعض مضامین اور بعض معیار وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے زیرِ اثر اتنی اہمیت کے حامل نہیں رہتے اور اگر ان معیاروں میں کسی قدر لچک پیدا نہ کی جائے تو تربیت یافتہ افرادی قوت جلد تیار نہیں ہوتی۔ لہٰذا کسی بھی آزاد ملک کے لیے یہ نہایت ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظامِ تعلیم میں ان تینوں نقطہ ہائے نظر میں توازن کو قائم رکھنے کا خاص اہتمام کرے، کیوں کہ ہمہ جہتی ترقی اسی طرح ممکن ہے۔ ان تمام پابندیوں سے بڑھ کر ایک مجبوری اور بھی لاحق ہوتی ہے اور وہ مالی وسائل کی کمی۔ ان تمام حدود کے اندر رہتے ہوئے شروع سے لے کر آخر تک یعنی

پرائمری، ثانوی اور اعلا سطح کی تعلیم ایک ہی نظم کے تحت ایسا جامع منصوبہ تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو پوری تعلیمی انتظامیہ اور تعلیمی فیصلوں میں سرایت کر جائے۔

(۱۲) آزادی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تعلیمی اعتبار سے ہم مِنْ حَیْثُ القوم عالمی علمی ترقی کے قدم بہ قدم چلنے کے قابل ہوں۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسانی علم میں ہر دس سال کے بعد سو فی صد اضافہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علمی ترقی کے اس محیر العقول دور میں اگر کوئی قوم اپنے تعلیمی معیاروں کو بین الاقوامی معیاروں کے مطابق نہ رکھ سکے تو وہ جلد ہی جہالت و پس ماندگی کا ایک جزیرہ بن کر رہ جائے گی، اور جلد یا بدیر اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی اہلیت بھی کھو بیٹھے گی۔ لہٰذا ہمارے نظامِ تعلیم کو آزادی کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے مسلسل تحقیق، دیگر ممالک کی علمی ترقیوں سے استفادہ اور جدید علمی دریافتوں کا ملکی حالات کے مطابق عملی اطلاق کی ضرورت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے تعلیمی رہنما اس سباق و سباق سے باخبر رہیں اور ہمارے تعلیمی اِدارے علمی ترقی کی فضا سے معمور ہوں۔

(۱۳) تعلیم کا مسئلہ زندگی کا مسئلہ ہے اور زندگی ہی کی طرح پیچیدہ اور گریز پا بھی۔ بنیادی طور پر تعلیم تکمیلِ انسان کے معیار کو بلند کرنے کے عمل کو کہتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اساتذہ وطلبا کا تناسب تو مقرر کیا جاسکتا ہے لیکن طلبا اپنے اساتذہ کے ذہنی پس منظر سے زیادہ علم حاصل نہیں کر سکتے۔ اعلا قابلیت رکھنے والے اساتذہ اگر کم ہوں تو اور بھی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس لیے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اعلا ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے اساتذہ کو مجتمع کر کے اُن کی قابلیتوں سے بھرپور فائدہ اُٹھایا جائے اور قابل ترین لوگوں کی ایک کھیپ تیار کی جائے جو تعلیمی میدان میں رہنمائی کے فرائض انجام دے سکے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ حکومتِ صوبے میں چند اعلا سائنس کالج کھول رہی ہے جن میں سائنسی تعلیم کو ممکنہ اعلاترین معیار پر قائم و برقرار رکھنا مقصود ہے۔

(۱۴) آزادی کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ کسی آزاد قوم کے افراد نہ صرف معاشی بلکہ معاشرتی اعتبار سے بھی خوش حال ہوں۔ معاشرتی خوش حالی صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ جب لوگوں میں اعلا اخلاق اور ملکی قانون کا احترام پایا جائے، اور ہر فرد اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ اس کا وجود ملک و ملت کے لیے ایک بوجھ نہیں بلکہ ایک قابلِ فخر اثاثہ ہو۔ وہ اپنے معاشرے کے لیے نافع اور باعثِ خیر و برکت

ہو۔ لوگوں میں اکرامِ محنت (Dignity of Labour) مفید شہریت (Useful Citizenship) اور حب الوطنی (Patriotism) کے جوہر پیدا کرنے کے لیے ہر آزاد اور ہوش مند قوم اس بات کا اہتمام کیا کرتی ہے کہ اس کے نظامِ تعلیم میں علمی، ادبی اور سائنسی نصابات کے ساتھ ساتھ معاشرتی بہبود، اچھی شہریت، اور پسندیدہ اخلاق و اطوار کی تربیت کا بھی مؤثر انتظام موجود ہو۔ چناں چہ ہم نے اپنے نصاباتِ تعلیم مرتب کرنے میں اِس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے کہ ہمارے طلبہ میں یہ اوصافِ حسنہ پیدا ہوں۔

(۱۵) ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اِس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا نہایت ضروری ہے کہ تعلیم ایک سُست رَوعمل ہے۔ کسی بھی نظامِ تعلیم کے اثرات مرتب ہونے میں اچھا خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ اِس لیے کِسی نظامِ تعلیم کے سود مند یا غیر سود مند ہونے کے بارے میں فیصلہ دیتے وقت بے صبری اور بے تابی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ درحقیقت کِسی نظامِ تعلیم کی صحیح جانچ پرکھ کے لیے کم از کم چودہ برس کی مدّت چاہیے۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کِسی قوم کی صلاحیتِ آزادی کا امتحان لینے کے لیے جنگ سے بہتر اور کوئی میدان نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ نازک موقع ہوتا ہے جس میں کِسی قوم کی خوبیاں اور خامیاں کُھل کر سامنے آجاتی ہیں ستمبر کی جنگ پوری قوم کے لیے ایک آزمائش تھی اور اِس آزمائش میں ہماری قوم بحمد اللہ پوری اُتری۔ ہمارے شہداء میں اچھّی خاصی تعداد اُن جوانانِ رعنا کی تھی جنھوں نے مرّوجہ نظامِ تعلیم سے ہی موت و حیات کا وہ فلسفہ سیکھا تھا جس سے ان میں ذوقِ شہادت پیدا ہوا اِس کا صاف مطلب یہ ہے ہمارے نظامِ تعلیم میں ایسی کردار سازی کی صلاحیت یقیناً موجود ہے جو آزادی کے تقاضوں پر ہر طرح سے پوری اتر سکتی ہے۔ اس جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ حریفوں کے مقابلے میں ہماری آئیڈیالوجی کہیں برتر ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں اس کے استحکام و انصرام پر اور بھی توجہ صرف کرنی چاہیے اور دوسری طرف ٹکنالوجی کے میدان میں ہمیں اپنے آپ کو کہاں تک آگے لے جانا ہے اس کا اندازہ بھی ہمیں اِسی جنگ کی بدولت ہوا ہے۔

(۱۶) نظامِ تعلیم خواہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، اس کی کامیابی کا تمام تر انحصار اساتذہ پر ہوتا ہے۔ کِسی بھی نظامِ تعلیم کو کام یاب یا ناکام بنانے میں بنیادی کردار یہی

لوگ ادا کرتے ہیں۔ نظامِ تعلیم یا نصاب کی کمی تو اساتذہ دُور کر سکتے ہیں لیکن اساتذہ کی کمی کو نصابات یا نظامِ تعلیم پورا نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہی نظامِ تعلیم آزادی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے جس میں غالب اکثریت ایسے اساتذہ کی ہو جو اپنی آزادی اور آئیڈیالوجی کے لیے محبت کا شدید جذبہ رکھتے ہوں۔ حکومت نے تمام اساتذہ کے لیے قرآن خواں ہونا اسی لیے لازم قرار دے دیا ہے کہ اُن میں اپنی آئیڈیالوجی سے محبت پیدا ہو۔

(۱۷) آزادی کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ تعلیم کو کلیتاً حکومت کی ذمے داری نہ خیال کیا جائے بلکہ نجی دائرے میں بھی صاحبِ حیثیت لوگ تعلیمی کاموں میں پورا پورا حصّہ لیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں نجی دائرے کی تعلیم وہاں کے تعلیمی نظام کا ایک بہت بڑا اور نہایت ہی مضبوط ستون شمار کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں بھی نجی دائرے کے بعض تعلیمی اداروں کو حکومت کی طرف سے گرانٹ ملتی ہے مگر بیشتر پرائیویٹ ادارے ایسے ہیں جو حکومت سے کسی قسم کی امداد نہیں لیتے بلکہ اگر حکومت امداد دینا بھی چاہے تو وہ اسے قبول کرنا ادارے کے وقار کے منافی خیال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے نجی اور تجارتی ادارے خود اپنے خرچ پر حکومتی اداروں میں خاص خاص موضوعات پر تحقیقی کام بھی کرواتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف امریکا میں دس ہزار فونڈیشنز تعلیمی کاموں کے لیے وقف ہیں۔ ان میں بعض فونڈیشنز اتنے چھوٹے چھوٹے بھی ہیں جو بہ مشکل چند کنبوں کے تعلیمی اخراجات کے ہی کفیل ہیں۔ لیکن بعض فونڈیشنز مثلاً کارنیگی کارپوریشن، فورڈ فونڈیشن، راک فیلر فونڈیشن جیسے بڑے بڑے ادارے تو اپنے ملک کے علاوہ بیرونی ممالک کے تعلیمی کاموں میں بھی دل چسپی لیتے ہیں۔ کارنیگی کارپوریشن کی لائبریری سروس ہی اتنی بڑی ہے کہ اِس وقت امریکا اور غیر ممالک میں ڈھائی ہزار لائبریریاں اس کے خرچ پر چل رہی ہیں۔ جن پر پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر خرچ کیے جا چکے ہیں۔ ان ہی اداروں کے تحت بے شمار اساتذہ کو پنشن اور غریب طلباء کو وظائف دیے جا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی بعض صاحبِ ثروت حضرات وقف کے ذریعے سماجی بہبود کے کام کر رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ تعلیمی کاموں کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیں کیوں کہ مُلکی اور ملّی تعمیر کے کاموں میں یہ کام بنیادی اہمیت ہی نہیں رکھتا بلکہ دور رس نتائج کا حامل بھی ہے اور کارِ ثواب بھی۔

(۱۸) آخر میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جوں کہ مدرسہ و مکتب کے علاوہ معاشرہ بھی بچوں اور نوجوانوں پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے صرف وہی نظامِ تعلیم مؤثر نتائج پیدا کر سکتا ہے جسے معاشرتی ماحول کی تائید و مساوات حاصل ہو۔ یہ بھلا کیوں کر ممکن ہے کہ معاشرے میں تو آگ لگی ہوئی ہو اور تعلیمی اداروں میں پھول مہکیں! درحقیقت معاشرتی اصلاح و تعمیر کا کام اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس کے لیے تعلیمی اداروں کے علاوہ تمام معاشرتی اداروں کی اصلاح و تنظیم ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔

(۱۹) یہ چند غیر ماہرانہ معروضات پیش کرنے کے بعد میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور آپ حضرات کا ممنون ہوں کہ آپ نے میری گذارشات کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ سننے کی زحمت گوارا کی۔ میں حکیم صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس خوش گوار تقریب میں اپنے منتشر خیالات سامعین شامِ ہمدرد کے سامنے رکھنے کا موقع دیا، گو میں اس کا اہل نہ تھا۔ آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسئلہ تعلیم کسی فردِ واحد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں انتہائی ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب قومی تعلیم کے کسی پہلو پر بھی مجھے اپنی تجویز سے مستفید ہونے کا موقع بخشیں۔

شکریہ

شامِ ہمدرد - لاہور
اگست ۱۹۶۶ء

لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا

ہمارے آج کے مہمان مُقرّر لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا، اپنے صفات گوناگوں، اور اوصاف بوقلموں کے اعتبار سے ایک مرتبہ خاص پر فائز ہیں، وہ سپاہی بھی ہیں اور دانش ور بھی، مردِ میدان بھی، اور دریائے علم کے غوّاص بھی۔ آپ کا وطن مشرقی پنجاب کا ضلع ہوشیار پور ہے۔ ایک معزز زمین دار خاندان میں آپ نے آنکھیں کھولیں۔ ایف۔ سی کالج لاہور اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آپ نے تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۳۱ء میں سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۳۲ء میں انڈین ملٹری اکیڈیمی دہرہ دون میں فوجی تربیت کے لیے داخل ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی۔

میدانِ جنگ کا یہ کھلاڑی، کھیل کے میدان میں بھی، پیچھے نہیں ہے۔ فٹ بال، ہاکی، تیراکی، اور گھوڑ سواری میں ہمیشہ امتیاز حاصل کیا۔ برطانوی بٹالین کے ساتھ ایک سال کام کرنے کے بعد آپ کا تقرر جنوبی وزیرستان کی رزمک چھاؤنی میں فرنٹیئر فورس کی رائفل بٹالین میں ہوگیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک وزیرستان میں سرگرم کار رہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں پانچ سال تک مشرقِ اوسط، لیبیا، شام، عراق، فلسطین اور اٹلی میں عسکری فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں واپس تشریف لائے، اور تقسیم کے بعد پاکستان آپ کے عزم جواں کا جولاں گاہ بن گیا۔ اس پُر آشوب عہد میں امرت سر اور لاہور کے درمیان بارڈر ڈیفنس ڈیوٹی پر ایک بٹالین کی کمان کرتے رہے۔ سرحد کشمیر کی دیکھ بھال بھی آپ کے فرائض میں شامل تھی۔

۱۹۴۹ء میں آپ بریگیڈیر کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے، ۱۹۵۲ء میں فرنٹیئر کور کے انسپکٹر جنرل کا عہدہ آپ کو دیا گیا۔ اس سلسلے میں دو سال تک آپ پشاور میں متعین رہے۔ پھر گلگت ایجنسی سے بحرِ عرب تک کی سرحدی نگرانی آپ کو تفویض ہوئی۔

۱۹۵۵ء میں میجر جنرل کا معزز منصب عطا ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں کور کمانڈر اور لیفٹیننٹ جنرل کے منصب پر آپ نے ترقی پائی۔ اسی عرصے میں چار سال تک آپ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی رہے۔ اور نہایت خوبی سے اپنے فرائض سرانجام دیے۔ گزشتہ ستمبر کی جنگ میں مغربی پاکستان کے کور کمانڈر کی حیثیت سے آپ نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

حکیم محمد سعید

جنگِ ستمبر

جناب لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا
نشانِ پاکستان و ستارۂ قائدِ اعظم

آج ہم یہاں اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اُن جوانوں اور شہریوں کو خراجِ عقیدت پیش کریں جنھوں نے بھارتی جارحانہ حملے کے خلاف مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں نثار کیں۔

میں ہمدرد کے منتظمین کا اور حکیم محمد سعید کا شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے آج کی "شامِ ہمدرد" کی تقریب میں مجھے آپ سے گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ میں خصوصیت سے حکیم احمد شجاع صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے یہاں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

جیسا کہ حکیم صاحب نے ابھی ابھی فرمایا ہے اور آپ میں سے بہت سے حضرات بھی جانتے ہیں کہ میں ایک سپاہی ہوں جس کی عمر کا بیشتر حصہ مختلف جنگوں اور سپاہ گری میں گزرا ہے۔ اس لیے آج کی محفل میں آپ کو میرے سپاہیانہ اندازِ گفتگو پر قناعت کرنی پڑے گی۔ میری گفتگو میں شاید زبان و بیان کی وہ چاشنی آپ کو نہ ملے جو کہ عموماً ایسی ثقافتی اور علمی مجالس کا شعار ہوتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ تقریباً ان ہی دنوں پچھلے سال چھ ستمبر (۱۹۶۵ء) کو بھارت نے بغیر کسی اعلانِ جنگ کے پاکستان پر جارحانہ حملہ کر دیا تھا۔ اس بلا وجہ اور بغیر اعلانِ جنگ کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان کی ساری شہری آبادی اور مسلح افواج تن واحد کی طرح آنِ واحد میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اگرچہ دنیا میں صلح و جنگ کے اصول متعیّن

ہیں لیکن ان دنوں آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ جنگی حکمت عملی میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی ہے اور وہ یہ کہ کوئی ملک اس تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ وہ باقاعدہ کسی قسم کا اعلانِ جنگ کرے یا جنگ سے پہلے الٹی میٹم دے۔ ویت نام میں کسی الٹی میٹم یا اعلانِ جنگ کے بغیر طرفین میں جنگ جاری ہے۔ اعلانِ جنگ کے بغیر دوسرے ملک پر حملہ آور ہونا اب ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں ستمبر کی جنگ کے بارے میں تفصیلاً کچھ عرض کروں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے پہلے کی فوجی پوزیشنوں اور نقشے کی مدد سے کچھ نکات کی وضاحت کردوں تاکہ آپ کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ کس طرح ہندستان نے ہمارے ملک پر حملہ آور ہونے کا پروگرام ترتیب دیا اور کس طرح ہمارے بہادر جوانوں نے عزم اور جرأت کا پیکر بن کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ میں آج اس جگہ آپ کے ساتھ شامل ہو کر ان بہادر شہیدوں اور غازیوں کے کارناموں کی یاد کو دوبارہ تازہ کروں گا جنھوں نے قومی کردار یا مسلم قومی کردار کی ایک شان دار مثال قائم کی ہے جو کہ ہمیشہ ہماری قومی تاریخ میں سنہری لفظوں میں لکھی جائے گی۔

نقشے کی مدد سے وضاحت

اس نقشے کے ذریعے وضاحت سے یہ آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مختلف حالات میں ہماری مسلح افواج کو کن کن مشکلات کا سامنا تھا۔ یہ بات بھی آپ پر واضح ہوگئی کہ جنگی چالوں میں تبدیلی کے سبب سے جنرل اور کمانڈروں کو کس طرح اپنی زیرِ کمان فوج کو ترتیب دینا پڑتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جنگ لڑنے کے کچھ اصول اور طریقے ہوتے ہیں میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ چارٹ کی مدد سے ان طریقوں کا مختصر طور پر ذکر کر دیا جائے۔ تاکہ اس کا پس منظر آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

آپ کو یہ معلوم ہے کہ بھارت ایک وسیع ملک ہے۔ اس کی افرادی قوت ہم سے کئی گنا زیادہ ہے اور اس کے دولت کی وسائل ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ بھارت پچھلے انیس سالوں سے اپنے آپ کو اسلحہ سے لیس کر رہا تھا اور اس موقع کی تلاش میں تھا کہ کب اسے ہمیں کاری ضرب لگانے کا بہانہ ملے۔ بھارت کے مقابلے میں آپ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے حالات و وسائل کیا ہیں اور افرادی قوت کس قدر کم ہے۔ جس حد تک بھارت کی افرادی

قوت کا تعلق ہے وہ اگرچہ ہمارے مقابلے میں تعداد میں بہت زیادہ ہے لیکن ہماری افرادی قوت معیار یا کوالٹی کے لحاظ سے بھارت سے کہیں اعلیٰ ہے۔ بھارت کے وسائل اور افرادی قوت، یہاں تک کہ فوج، ٹینک، طیارے اور توپیں ہمارے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ بھارت چین سے جنگ لڑنے کے بہانے ایک مدت سے روس اور امریکا سے اسلحہ حاصل کرتا رہا ہے حالاں کہ یہ بات ان کو معلوم تھی کہ بھارت کبھی بھی چین پر حملہ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا اور یہ سارا اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اکٹھا کیا جا رہا ہے۔

آپ کو اس بات کی بھی خبر ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ تمام دنیا اس سے باخبر ہے کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور وہاں پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ چناں چہ پچھلے سال جب اہلِ کشمیر نے بھارت کے ظلم و تشدد کے خلاف آواز اٹھائی اور بھارت کی ستم رانی حد سے بڑھ گئی تو آزاد کشمیر کے بہت سے لوگ وادیٔ کشمیر میں اپنے بھائی بندوں پر بھارتی فوج کے ظلم و ستم کو روکنے کے لیے پہنچ گئے۔ اس سے بھارتی حکومت کو موقع مل گیا کہ وہ آزاد کشمیر کی حکومت کے خلاف اقدام کرے۔ بھارتی حکومت کی آزاد کشمیر کی حکومت کے خلاف کارروائی کے بعد ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ پاکستان اس پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ آزاد کشمیر کی حکومت نے بھارتی حملے کے خلاف حد بندی لائن کے اِس طرف اپنے علاقے کے دفاع کی کوشش کی۔ یہ مقامات درۂ حاجی پیر، ٹیٹوال اور پونچھ کے علاقے تھے، جہاں پر بھارتی فوج نے بڑے پیمانے پر آزاد کشمیر کی فوجوں پر حملہ کیا تھا۔ حکومتِ پاکستان نے بھارت کے حملے کے خلاف آزاد کشمیر کی فوجوں اور حکومت کی مدد کی اور ان کی توجہ ہٹانے کے لیے چھمب کے علاقے میں کارروائی کی۔ اس سے بھارت کو ایک بہانہ مل گیا جس کی وہ پچھلے اُنیس سال سے تاک میں تھا تاکہ اس کی آڑ میں پاکستان پر بھی حملہ کر سکے۔ ان واقعات سے بہت پہلے اپریل ۱۹۶۵ء کے مہینے میں بھارت نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ اپنی فوجوں کی نقل و حرکت میں اضافہ کر دیا تھا۔ رن کچھ میں ہندوستانی حملے کے خلاف ہماری کارروائی کے بعد اس قسم کی فوجی نقل و حرکت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ رن کچھ میں بھارتی فوج نے ابتدا میں ہمیں اچانک آ لینے کی کوشش کی لیکن جب انھیں عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا تو ان کی خِفّت اور بڑھ گئی۔ رن کچھ کی لڑائی نیفا میں چین کے ہاتھوں پسپائی کے بعد بھارت کی دوسری عبرت ناک شکست تھی۔ اس لڑائی کے بعد باوجود فوج کی

زیادہ تعداد اور زیادہ مقدار میں اسلحہ ہونے کے بھارتی فوج کا حوصلہ یا مورال بہت پست ہو گیا تھا۔ چناں چہ ہماری توجّہ بانٹنے کے لیے مغربی اور مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بھارتی فوجوں کو پھیلا دیا گیا۔ جس وقت کشمیر میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحدوں کے بالکل قریب تھیں۔ اور وہ سیالکوٹ، لاہور اور قصور جیسے پاکستان کے اہم مقامات پر حملہ آور ہونے کی پوزیشن میں تھیں۔

جنگ کے دنوں میں اور اب بھی ملک میں بعض حلقوں میں یہ خیال ہے کہ جب بھارت ہم پر حملہ آور ہوا تو ہم اس کے مقابلے کو تیار نہ تھے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ میں اس وقت مغربی پاکستان میں فوج کا کمانڈر تھا اور یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اپریل ۱۹۶۵ء سے لے کر بھارت کے حملے تک ہم نے کیا احتیاطی اقدامات کیے تھے۔ اگر ہم تیار نہ ہوتے اور ہماری فوجیں میدان میں نہ ہوتیں تو لاہور، سیالکوٹ اور قصور پر بھارت کی فوجوں کو قبضہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ اعلا حکام کی ہدایت پر مکمل حفاظتی تدابیر کر لی گئی تھیں اور شروع ہی سے بھارتی فوج کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔ چناں چہ جب بھارت ہم پر حملہ آور ہوا تو ہم اس کے مقابلے کے لیے ہر طرح تیار تھے۔ اسی انتظار میں ہماری فوج کے اکثر و بیشتر افراد نے ۱۹۶۵ء کا موسم گرما دھوپ اور کھلے میدانوں میں گزارا تھا۔

حملہ آور ہوتے وقت بھارت کے عزائم پوری طرح واضح تھے۔ انھوں نے امرتسر سے اپنی فوجوں کو ہماری سرحد کی جانب مختلف سمتوں میں بڑھایا۔ ہماری سرحد وہاں سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر تھی۔ ان کی نیت ہمیں اچانک آ لینے کی تھی۔ انھوں نے حسینی والا سے لے کر سیالکوٹ کی سرحد تک ہماری فوجوں کو مصروف رکھنا چاہا۔ ان کا حملہ لاہور کے محاذ پر تھا۔ چناں چہ انھوں نے واہگہ، برکی اور کھیم کرن کی جانب سے سڑک کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کی۔ انھوں نے جسّڑ اور سیالکوٹ پر بھی حملہ کیا۔ اس طرح حملہ آور ہونے سے ان کا خیال تھا کہ وہ ہمیں اچانک آلیں گے (حالاں کہ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ ہماری فوجیں پہلے ہی اس علاقے میں موجود ہیں) اور اس طرح لاہور، سیالکوٹ اور قصور پر وہ بہ آسانی قبضہ کر کے ہم سے اپنی من مانی شرائط تسلیم کرائیں گے۔

انھوں نے بڑی چالاکی سے جالندھر سے اپنی فوج کا ایک بڑا حصّہ سیالکوٹ اور جمّوں کے علاقے میں منتقل کر دیا تھا۔ اس فوج کی تعداد ایک آرمڈ ڈویژن جس میں پانچ سو ٹینک تھے اور تین انفنٹری ڈویژن پر مشتمل تھی۔ ہر ڈویژن میں چار بریگیڈ تھے جن میں

سے ہر ایک چار بٹالین پر مشتمل تھا۔ یہ ہندستان کی اصل محفوظ فوج تھی جس کا کام حملے کو روکنا یا کسی جانب حملہ آور ہونا تھا۔ یہ ایسی فوج تھی جو ریزرو تھی اور کسی جگہ متعین نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کا حملہ لاہور، سیالکوٹ اور قصور پر ناکام رہے تو وہ اس فوج کی مدد سے سیالکوٹ کے محاذ پر زور دار حملہ کر کے وزیر آباد پر قابض ہو جائیں اور ہماری بڑی شاہراہ اور راولپنڈی اور لاہور کے درمیان سلسلۂ رسل و رسائل کو منقطع کر دیں۔

اب میں آپ کو بتاؤں گا کہ ان فوجوں کا کیا ہوا! قصور میں بمبانوالہ، راوی، بیدیاں، دیپال پور رابطہ نہر کے ساتھ بھارتی حملے کو روک لیا گیا۔ یہی صورت لاہور میں اور برکی کے علاقے میں بڑی شدت کی جنگ کے بعد ہوئی۔ ہمارا شروع ہی سے یہ پلان تھا کہ حملے کو اس نہر کے اُس پار روکا جائے۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم اس میں کامیاب رہے۔ ہم نے اُن کے حملے کو پوری طرح روک لیا۔ ہم نے چھے اور آٹھ ستمبر کے عرصے میں جوابی حملہ کر کے قصور کے علاقے میں بھارت سے کافی علاقہ چھین لیا۔ سیالکوٹ کی سرحد پر دشمن کا حملہ بڑا شدید تھا اور اُس نے سیالکوٹ سے آگے نکل جانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور حملہ روک لیا گیا۔ سیالکوٹ کی جانب سے ان کے راستے میں سوائے ہماری فوج کے کسی قسم کی رُکاوٹ نہ تھی۔ بھارت نے ایک آرمرڈ اور تین دوسرے ڈویژنوں کی مدد سے چروا، فلورا، چونڈہ اور پسرور کے راستے ڈسکہ، گوجرانوالہ اور وزیرآباد کی جانب بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں ہماری فوج نے اپنے منصوبے کے مطابق آگے بڑھنے سے روک دیا۔ چوں کہ اس علاقے میں کسی قسم کی رُکاوٹ یا قدرتی مزاحمت کی صورت نہیں اس لیے یہ علاقہ آرمرڈ کے استعمال کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ اس علاقے میں بھارت کے پاس بہت بڑی تعداد میں فوج تھی۔ ہمارا اور ان کا تناسب سیالکوٹ کے علاقے میں ایک اور سات کا تھا۔ اس علاقے میں ہمارے پاس صرف ایک ڈویژن اور ایک آرمرڈ فارمیشن تھی۔ لیکن خدا کی مدد ہمارے شاملِ حال تھی۔ ہم اس حالت میں بھی بھارت کے حملے کو روکنے میں کامیاب رہے۔ جس طرف بھی اُنھوں نے رُخ کیا ان کا حملہ صرف روکا ہی نہیں گیا بلکہ دشمن کو شدید جانی نقصان بھی اُٹھانا پڑا۔ شکر گڑھ کا سارا علاقہ تقریباً خالی پڑا تھا لیکن دشمن کو اس علاقے میں گھسنے کی جرأت تک نہ ہوئی کیوں کہ وہ اس علاقے میں ہم سے ٹکر لینے سے ڈرتا تھا۔

اس جنگ میں ہمارے افسروں، جونیئر کمیشنڈ افسروں اور جوانوں نے دلیری اور جاں بازی کا جو شان دار مظاہرہ کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گا اور تاریخ میں وہ سنہری حروف

سے لکھا جائے گا۔ حالاں کہ ہمارا اور دشمن کا ہر معاملے میں تناسب ایک اور سات کا تھا اس پر بھی ہماری فوجوں نے حیرت ناک کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے سپاہی کی حیثیت سے مدافعانہ جنگ لڑ رہے تھے اور ان کے دلوں میں مجاہدوں کے ایمان کی شمع روشن تھی۔ انھیں اپنے خدا پر پورا بھروسا تھا۔ وہ ظلم کے خلاف اور حق کی سربلندی کے لیے لڑ رہے تھے، اور حق کے لیے لڑنے والوں کو کبھی شکست نہیں ہوتی۔ اس جنگ میں ایسے مواقع بھی آئے کہ ہمارے ایک افسر یا ایک جوان نے دشمن کے بیس بیس اور تیس تیس افراد سے جنگ کی اور ان سب کو جہنم رسید کیا۔ شہید عزیز بھٹی اور میجر بلوچ کا کارنامہ حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ جرأت و دلیری کی لازوال مثال بھی ہے۔ اسی طرح کا واقعہ بنگال رجمنٹ کے ساتھ ہوا۔ دشمن ان سے تعداد میں بیس گنا زیادہ تھا لیکن ان جیالوں نے دشمن کا ہر وار ڈٹ کر روکا اور ہر حملے پر دشمن کے لاتعداد افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ ہمارے بہادر جوان جس جگہ ڈٹ جاتے تھے وہاں سے ان کو ہٹانا قریب قریب ناممکن تھا۔ وہ میدان میں شیروں کی طرح دشمن پر لپکتے تھے اور اپنے سے کئی گنا دشمن سے لڑ جاتے تھے۔ دشمن کے جو سپاہی ہمارے ہاتھ آئے ان کا موازنہ جب اپنے جوانوں سے کرتے ہیں تو اپنے قومی کردار اور اعلا روایات کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ دشمن کے سپاہی، جنھیں ہمارے جوانوں نے حراست میں لیا تھا، وہ ان کی جاں بازی سے اس قدر حواس باختہ تھے کہ ان کے منھ سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ ہم نے اس جنگ میں دیکھا ہے کہ ہمارے ایک ٹینک نے دشمن کے پانچ ٹینکوں سے مقابلہ کیا ہے۔ چونڈہ میں ہمارے ایک "ٹینک مین" نے صرف ایک ٹینک کے ساتھ دشمن کے چار ٹینک تباہ کیے۔ یہ "ٹینک مین" اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندہ و سلامت ہے۔

ہمارے جوانوں کی دلیری اور بہادری اپنی جگہ لیکن یہ سب کچھ خداوند کریم کی مہربانی سے ممکن ہوا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہماری صحیح راہ نمائی کی۔ ہم نے اللہ کی ہدایت کے مطابق اپنے دفاع میں ہتھیار اُٹھائے۔ دوسری طرف عیار دشمن نے جنگ کے اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے ہم پر جارحانہ حملہ کیا اور ایک سے ایک بڑھ کر فاش غلطی کی جس کا نتیجہ اس کی عبرت ناک شکست کی صورت میں نکلا۔ بھارت نے جنگ کا آغاز کر کے ابتدائی کامیابی ضرور حاصل کی۔ ہر وہ فوجی کمانڈر جو پہل کرتا ہے اسے کچھ نہ کچھ ضرور فائدہ یا برتری حاصل ہوتی ہے۔ بھارت کے پاس زیادہ فوج تھی اور زیادہ اسلحہ تھا۔ اس نے پہل کی لیکن اس کے باوجود ہم نے کامیابی سے حملے روکے۔ بلکہ جوں ہی اس کا ہمارے جوانوں

سے سامنا ہوا وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے۔

مجھے سول افسروں اور شہریوں کی خدمات کا خاص طور پر اعتراف ہے۔ اس قومی ابتلاء کے موقع پر جس پرخلوص جذبے اور جاں فشانی سے انھوں نے دشمن کے مقابلے کے لیے تعاون کیا اس سے ہمارے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔ انھوں نے جس نظم وضبط کا مظاہرہ کیا اور جس تندہی سے فوجوں کی ضرورت کو پورا کیا وہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔

میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو کر اپنی ہوائی فوج کو جرأت مندانہ کارنامے پر خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ بھارت کے پاس ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوائی جہاز تھے اور ہم سے زیادہ ہوائی اڈے تھے۔ ہمارے ہوا بازوں نے جنگ کے پہلے تین دنوں کے اندر ان اڈوں کو تباہ کر دیا اور ان کی حملہ آور ہونے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا۔ اس کے بعد ہمارے ہوا باز سارے محاذوں پر چھائے رہے۔

بھارتی ہوائی جہاز جوں ہی ادھر کا رخ کرتے وہ ہمارا ایک ہوائی جہاز بھی دیکھ پاتے تو اپنے ملک کو بھاگ جاتے۔ ہوائی فوج کی بہادری اور جرأت بھی ہمارے جذبے کو ابھارنے کے لیے بہت اہم سرمایہ تھی۔ یہ ان ہی کی ہمت تھی کہ انھوں نے بھارتی فوج برباد کر کے رکھ دی اور ان کے تربیت یافتہ عملے کو بھی کافی جانی نقصان پہنچایا۔ میں اینٹی ایئر کرافٹ کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں جنھوں نے جنگ کے دوران ۱۹ بھارتی ہوائی جہازوں کو تباہ کیا۔

اس جنگ میں ہمارے رینجروں نے بھی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ راجستھان کے ریگستانوں میں وہ دشمن پر نہ صرف غالب رہے بلکہ دشمن کی مسلح افواج کو، جس کے پاس بہتر ساز و سامان بھی تھا، عبرت ناک شکست دے کر راجستھان کے وسیع رقبے پر قبضہ کر لیا۔ میں اس جنگ کے دوران بہ حیثیت کمانڈر کے تمام جنگی کارروائیوں سے متعلق رہا ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ساری کی ساری قوم نے مردانہ وار دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن مقابلے پر آنے کے بعد ایک انچ بھی قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔

ہم بھارتی فوج کی صلاحیت سے پوری طرح واقف ہیں۔ برطانوی دورِ اقتدار میں ہندستان کی افواج کی اکثریت ان علاقوں سے تعلق رکھتی تھی جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ پاکستانی علاقوں کے سپاہی ہندستانی فوج کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے

تھے۔ اب بھارتی فوج مختلف قسم کے عناصر پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تعداد میں زیادہ ہے اور اس کے پاس بہتر ہتھیار ہیں لیکن جب تک ہمارا خدا پر ایمان مضبوط ہے اور اسلام کی شمع ہمارے دلوں میں فروزاں ہے بھارت کبھی بھی مسلمانوں پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہ بات میرے جزو ایمان کی حیثیت رکھتی ہے۔

بعض ایسی باتیں بھی اس جنگ کے دوران ہوئیں جو افسوس ناک تھیں۔ ہمارے ملک میں دشمن کے ایجنٹوں نے افواہوں کا بازار گرم رکھا۔ مثلاً ایک ایسی افواہ جس کو بعض لوگ اب بھی صحیح خیال کرتے ہیں یہ تھی کہ ہم نے لاہور کے دفاع کا معقول انتظام نہیں کیا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں قطعاً صداقت نہیں۔ کمانڈر انچیف اور دیگر اعلیٰ احکام کی ہدایت کے تحت میں مغربی پاکستان کے ہر محاذ کا اور ہر اہم مقام کے دفاع کا ذمے دار تھا۔ اور آپ بھی اس سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے وسائل محدود تھے، اس کے باوجود ہم دشمن کا حملہ روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ جنگ میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ حملہ آور کی راہ میں پتھروں کی چٹان یا لوہے کی دیوار حائل کر دی جائے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ دشمن ایسے مقام تک آگے آجائے جہاں اس کی صفوں میں پھیلاؤ پیدا ہو جائے اور اس پر ضرب کاری لگائی جائے۔ ایسے حالات میں جنگی حکمتِ عملی یا چال ضروری ہو جاتی ہے۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا اندازہ اور طریق کار بالکل صحیح تھا، اور اسی وجہ سے بھارت کامیاب نہ ہو سکا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جنگ تھوڑے عرصے جاری رہی لیکن یہ بہت شدید تھی۔ ہماری فوجیں اس سارے عرصے میں لڑتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے جوان کئی دن تک آنکھ بھی نہ جھپکا سکے۔ ہمارے ہر فرد میں پاکستان کی حفاظت کا احساس بڑا شدید تھا۔ تمام کمانڈر اوپر سے لے کر نیچے تک محاذِ جنگ کے اگلے مورچوں پر جنگی کارروائیوں کی ہدایات دے رہے تھے۔

بھارت نے جنگ میں اپنی کامیابی کا غلط ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ مثلاً جنگ کے پہلے روز انھوں نے بڑ ہانکی کہ وہ لاہور پر قابض ہو گئے ہیں۔ انھوں نے جھوٹ کا طومار باندھ کر اقوامِ عالم کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس ہم نے کبھی بھی اپنی کامیابی کے غلط دعوے نہیں کیے۔ ہمارے اعلانات واضح اور حقیقت پر مبنی ہوتے تھے۔ ہم جھوٹ بول کر نہ تو اپنی قوم کو دھوکا دینا چاہتے تھے اور نہ ہی عالمِ انسانی کو فریب میں مبتلا کرنا چاہتے تھے۔

جنگ کے دوران ہمارے مواصلات کے ذرائع نے انتہائی شاندار کام کیا۔ اسی طرح شہری انتظامیہ نے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے انجام دیے کہ ہمیں دورانِ جنگ کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئی۔ عوام کی ان معاملات میں دلچسپی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ انھیں جب بھی اور جو بھی کام سونپا گیا اُنھوں نے پوری ذمّے داری اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ عوام نے دشمن کے چھاتہ برداروں پر ملک بھر میں نگرانی کی۔ میں نے دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو مختلف پُلوں کی حفاظت کرتے دیکھا ہے۔ ان میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ ہر ایک ایک دوسرے سے بڑھ کر خدمت اور قربانی کو تیار تھا۔ کئی ایسے واقعات بھی ہوئے کہ ہمارے عوام نے عام رائفلوں کے ساتھ دشمنوں کے ٹینک پکڑ لیے۔ یہی حالت ہمارے ہوابازوں کی تھی جو بلاخوف وخطر دشمن کی فضا میں دن رات حملے کرتے رہتے تھے۔

آخر میں، میں اب آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میرے ساتھ مل کر ان لوگوں کو خراجِ عقیدت پیش کریں جنھوں نے مادرِ وطن کی حفاظت کی اور وطن کے لیے سینہ سپر ہیں۔ انھوں نے جرأت، بہادری، ادائی فرض اور حُب الوطنی کی جو درخشندہ مثال قائم کی ہے ہم ہمیشہ اس کے لیے ان کے ممنون احسان رہیں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہاتھ اُٹھا کر خداوند کریم سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اتنی توفیق دے کہ ہم اپنے وطن کا دفاع کرسکیں اور اگر کبھی پھر دشمن ہماری سرحدوں پر بُری نظر ڈالے تو اُسے مار بھگائیں۔

شامِ ہمدرد، لاہور
یکم ستمبر ۱۹۶۶ء ش

رئیس امروہوی

جنگِ ستمبر، اور ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا جب خیال آتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ یہ دِن جوش و جرأت کا دن ہے، دینی حمیّت کا دن ہے اور قومی غیرت کا دن ہے۔

ہماری حکومت نے اسے "یومِ دفاعِ پاکستان" کا نام دیا ہے۔ سر آنکھوں پر، مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس عظیم اور قومی دن کو صحیح تر الفاظ میں "یومِ جہاد" کہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کی تاریخ جن جنگی معجزات سے بھرپور ہے اُن سب میں "جذبۂ کار فرما" جہاد ہی رہا ہے۔ معرکۂ بدر، اُحد، خندق، احزاب، اور یرموک کی لڑائیاں اسی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر لڑی گئیں، اور بڑی بڑی طاقتوں پر مسلمان غالب آئے۔ مسلمانوں نے کُفر و شرک کی قوتوں سے ہمیشہ ٹکر لی ہے اور اسے ہمیشہ پاش پاش کیا ہے۔

۶ ستمبر کو جب ہندستان نے پاکستان پر اعلانِ جنگ کیے بغیر اور بزدلانہ حملہ کیا، اور اپنی ۱۸ سالہ جنگی تیاریوں کے بعد اور اپنی عظیم عسکری طاقت کے ساتھ بھرپور حملہ کیا تو اُسے اور اس کے دوستوں کو یقین کامل تھا کہ پاکستان اس مہلک وار کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اُن کی یہ خوش فہمی بے جا بھی نہ تھی، رقبے کے اعتبار سے، آبادی کے اعتبار سے، وسائل و ذرائع کے لحاظ سے، دولت و ثروت کے لحاظ سے، جنگی آلات و اسلحہ کے اعتبار سے پاکستان، ہندستان کے مقابلے میں برابری یا برتری کا دعوا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بایں ہمہ جنگ ہوئی اور ایک بار دنیا نے پھر دیکھ لیا کہ ایمان کی قوت مادی وسائل و طاقت پر کس طرح غالب آتی ہے۔ ۶ ستمبر کی جنگ درحقیقت حق و باطل کی جنگ تھی۔ ایمان اور کفر کے درمیان جنگ تھی، آخر کار حق کو فتح مبین حاصل ہوئی اور باطل کو نامراد و ناکام ہونا پڑا۔

ہماری جاں باز افواج نے آزمائش کے نازک لمحے میں بے خوفی، بے جگری اور جاں فروشی کے ساتھ ارضِ پاکستان کا دفاع کیا ہے۔ ان کا جذبۂ جہاد، ان کا شوقِ شہادت، اُن کی حب الوطنی اور اُن کی فرض شناسی ہمارے اسلاف کی عظمتِ کردار کا پرتو ہے۔ اپنے جری مجاہدوں کے دلیرانہ کارناموں پر قوم جتنا بھی فخر و ناز کرے کم ہے۔ کلمہ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کی ایک آواز نے ملت کو بیدار کر دیا اور دشمن کی ایک للکار نے اس کی غیرتِ اسلامی و حمیتِ ایمانی کو جگا دیا۔ دلوں میں احساسِ خود آگہی، جذبۂ عمل اور ولولۂ تازہ کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ ہماری قوم اور ہماری فوج کے کارنامے تاریخ کی درخشاں و تابندہ روایات بن چکے ہیں۔

آج شامِ ہمدرد کا موضوع ہے: جنگِ ستمبر اور قومی کردار۔ اس اہم موضوع پر وہی حضرات بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں جو براہِ راست احوالِ جنگ اور حالاتِ جنگ کے رہنما اور رازدار رہے ہوں، اور جن کی نظر ملک و ملت پر عمیق ہو اور جو اس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ ایسے جہاد و جنگ قومی کردار پر نہایت گہرے اثرات ڈالتے ہیں اور چھوڑتے ہیں۔

شامِ ہمدرد راولپنڈی میں اسی موضوع پر جناب سید محمد قاسم رضوی صاحب ڈائرکٹر تعلیماتِ عامہ، حکومتِ پاکستان اور لاہور میں جناب لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا صاحب اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج شامِ ہمدرد میں جناب پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب، اور جناب رئیس امروہوی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔

جنابِ رئیس ہمارے ملک کے مشہور شاعر اور ایک ممتاز صحافی ہیں۔ نظم اور نثر دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں رئیس صاحب کی قادر الکلامی سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں اور تقریباً روزانہ ہی ان کے ادبی معجزات کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ رئیس صاحب گزشتہ انیس سال سے روزانہ بلا ناغہ جنگ میں قطعہ لکھ رہے ہیں۔ چار مصرعوں میں اپنی بات کہہ دینا اور بات میں بات پیدا کرنا رئیس صاحب ہی کا حصہ ہے۔ رئیس صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "الف" رکھا ہے، معلوم نہیں یہ انکسار ہے یا طنز، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مختصر سا مجموعہ بہت سے ضخیم دیوانوں پر بھاری ہے۔ نثر میں بھی آپ نے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے اور اکثر خوب لکھا ہے۔ گزشتہ سال ستمبر کی

جنگ کے موقع پر رئیس صاحب نے جس طرح اپنے قومی جذبات کو نغموں کے قالب میں ڈھالا ہے، اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ میں رئیس صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر آج کی شام ہمدرد میں "جنگ ستمبر اور قومی کردار" کے موضوع اظہارِ خیال کی زحمت فرمائی۔

میں اپنے محترم پروفیسر اے بی۔ اے حلیم صاحب کا بھی دل سے ممنون ہوں کہ موصوف نے اختتامیہ ارشادات سے مستفید کرنے کی درخواست منظور فرمائی۔ پروفیسر صاحب محترم علمی اور تعلیمی حلقوں میں کسی تعارف و تعریف کے محتاج نہیں ہیں پاکستان بننے کے بعد آپ نے کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے جو تعلیمی خدمات انجام دیں، ان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم محمد سعید

جنگِ ستمبر اور قومی کردار

جناب رئیس امروہوی

انسان کے ذہنی ردِعمل کے حوالے سے جب بھی کردار کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے ایک خاص معنی ہوتے ہیں۔ علم النفس میں کردار کے معنی مجرد ردِعمل کے نہیں ہیں بلکہ شخصیت کے مجموعی عملِ اظہار و ابلاغ کو کردار کہتے ہیں۔ مخصوص حالات میں ایک شخص کس طرح قدم اُٹھاتا ہے، کس اندازِ فکر کے تحت کام کرتا ہے، کن جذباتی کیفیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی سوچ کا پیمانہ کیا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی مخصوص صورتِ حال میں انسان کی مجموعی ذہنی، جسمانی اور روحانی کارکردگی کو نفسیات کی زبان میں کردار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک فرد۔ خاص ماحول میں کسی خاص کردار کا اظہار کرتا ہے اسی طرح ایک قوم بھی اپنی حیاتِ اجتماعی کے انقلاب انگیز اور ہیجان انگیز مواقع پر ایک ممتاز اور نمایاں رویہ اور ردِعمل کا مظاہرہ کرتی ہے۔ شخصی اور اجتماعی نفسیات میں کردار کہتے ہیں کسی شخص یا کسی قوم کی مجموعی شخصیت کے ردِعمل کو جب کہ وہ قوم کسی اندرونی یا بیرونی ہیجان سے دوچار ہو۔ فرض کیجئے دو شخص بیک وقت خطرے سے دوچار ہوئے ہیں۔ ایک شخص خطرے کے مقابل لرزنے لگتا ہے، فریاد کرنے لگتا ہے اور جس طرح ممکن ہو اپنی جان بچا کر فرار ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا شخص باوجودیکہ اسی صورتِ حال سے دوچار ہے جس سے اس کا ساتھی اور خطرے کی نوعیت اور شدت بھی وہی ہے تاہم یہ شخص اپنے دوست کے برخلاف مضبوطی کے ساتھ خطرے کے مقابل جم جاتا ہے۔ اس کے ہوش و حواس برقرار

رہتے ہیں اور وہ نہایت اعتماد و اطمینان کے ساتھ اُس خطرے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ خطرے کے موقع پر اِن دونوں دوستوں کا الگ الگ ردِ عمل در حقیقت ان کی روحانی شخصیت کا اظہار و ابلاغ ہے۔ اور آج کی گفتگو میں قومی کردار کے اِس پہلو پر میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ عام حالات میں افراد اور اقوام کی سیرت و کردار کا حقیقی جوہر شعور کے خالص سماجی قوانین کی گرفت میں رہتا ہے۔ بالعموم ان کا ردِ عمل مصنوعی ہوتا ہے اور وہ اِس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ان کے ہر عمل کا ایک منطقی جواز مہیا ہو جائے۔ یوں سمجھئے کہ عام حالات میں، جب کہ کوئی قومی ہیجان ذہن کو متحرک کرنے کے لیے موجود نہ ہو فرد زندگی کے ہر گوشے میں "دو اور دو چار" کے اصول پر کام کرتا ہے، لیکن جب غیر معمولی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے جب انسانی شخصیت کے طاقت ور جذباتی محرکات بروئے کار آتے ہیں، جب کوئی بیرونی ہیجان روح میں ایک طوفان برپا کر دیتا ہے تو ذہنِ انسانی "دو اور دو چار" نہیں بلکہ دو اور دو پانچ کے اصول پر عمل کرتا ہے۔ مقصد یہ کہ وہ منطق اور ریاضی کے تمام اصول، عام لگے بندھے قاعدوں اور تمام رسمی اور عقلی زنجیروں سے آزاد ہو کر نئے رویّے اور نئے کردار کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کی سب سے واضح، درخشاں اور حقیقی مثال ہم نے اور ہماری قوم نے پچھلے سال کی سترہ روزہ جنگ میں پیش کی۔ مَیں نے اِس جنگ کے زمانے میں قوم کے غیر معمولی کارناموں سے متاثر ہو کر عرض کیا تھا کہ

اب کھُلا ہم پر کہ ہم میں تھی نہاں
ایک روحِ فتح مند و کامراں
ایک عزمِ بے پناہ و بے اماں
اِک جہانِ بے حدود و بے کراں
کائناتِ نو بہ نو کے در کھُلے
اب ہماری قوم کے جوہر کھُلے

فرد (اور فرد کی طرح قوم) کا رویّہ اور کردار یکایک کس طرح بدل جاتا ہے؟ ہم سال گزشتہ کی جنگ میں اس کا ذاتی تجربہ کر چکے ہیں۔ مشہور روسی نفسیات داں آئی۔ پی۔ پاؤلاف نے اِس ذہنی مظہر یعنی حیواتی کردار کی ناگہانی تبدیلی کے اسباب و عوامل کی تحقیق کے سلسلے میں جو کام کیا ہے اس کی اہمیّت دنیا بھر میں تسلیم کر لی گئی ہے۔ یہ بات طے ہے کہ انسان عام حالات میں یعنی جب کوئی قومی ہیجان اور جذباتی و نفسی محرک نہ ہو تو کبھی

اپنے رویے، اندازِ نظر اور کردار کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ البتہ ایک مرحلہ ضرور ایسا آجاتا ہے کہ وہ اپنے شعوری ارادے اور قصد و اختیار کے بغیر اس طرح بدل جاتا ہے کہ بیک نظر شناخت مشکل ہو جاتی ہے اور پرانی شخصیت کے تمام نقوش مٹ کر ایک نئے شخص کے خد و خال نظر آنے لگتے ہیں جو برائے نام تو وہی ہوتا ہے جو پہلے تھا مثلاً رئیس امروہوی لیکن درحقیقت وہ ایک نیا رئیس امروہوی ہوتا ہے جسے اندازِ فکر اور کردار کے لحاظ سے اپنے خاص سے کوئی واضح ذہنی مناسبت نہیں ہوتی۔ یہ بات میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ قوم ہو یا فرد دونوں کے کردار کی تبدیلی اور روحانی انقلاب کے اسباب اور مظاہر ایک ہی ہوتے ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے، صرف پیمانۂ اظہار کا فرق ہے۔

فرد کے کردار میں تبدیلی شخصی سطح پر ہوتی ہے جب کہ قومی کردار میں انقلاب کے مظاہر اجتماعی زندگی کے تمام سانچوں کو یکسر تبدیل کر دیتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں کردار کی تبدیلی اور نفسی قلب ماہیت کے اسباب ایک ہی ہیں۔ درحقیقت ہمارے کردار اور انداز نظر کی بنیاد ہمارے اعلا اعصابی نظام کی کارکردگی پر استوار ہے۔ یعنی حیوانی کردار اعصابی نظام کی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔ اگر فرد کے اعصابی نظام پر ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال دیا جائے یا کوئی ایسی متضاد صورتِ حال پیش آجائے کہ دماغ کوئی فیصلے کرنے سے قاصر رہے۔ یا جذباتی دباؤ انتہا سے گزر جائے یا جسم کو غیر معمولی طور پر تھکا دیا جائے تو ایسے مرحلے پر ذہن میں اثر پذیری اور تاثر اندوزی کی حیرت انگیز صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تمام جسمانی، اعصابی، نفسی اور جذباتی دباؤ پہلے مسلّمہ رویّے اور ماضی کے شعوری کردار کو موم کی طرح پگھلا کر نفس کو سیّال حالت میں لے آتا ہے جیسے پگھلا ہوا لوہا، اور پھر اس پگھلے ہوئے لوہے کو مطلوبہ سانچے میں ڈھال کر ایک نئی چیز کو وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ آپ نے بارہا لوگوں کو کسی ناگہانی صدمے، جذباتی حادثے یا غیر معمولی اعصابی شکست و ریخت کے عالم میں مختل، مخبوط الحواس اور بے ہوش ہوتے دیکھا ہوگا۔ یہ ہے دماغ کا دفاعی عمل یا اعصاب کی تحفظی کایا پلٹ ہنگامی صورتِ حال میں جب اعصاب ٹوٹنے اور چٹخنے لگتے ہیں تو حفظِ حیات کی جبلت کامل شکست و ریخت اور ٹوٹ پھوٹ سے بچنے کے لیے عام دماغی کارکردگی کو معطل کر دیتی ہے اور بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ کردار کی تبدیلی کا جسمانی طریقہ ہے۔ جس کا تجربہ ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔ رویّے اور کردار کی تبدیلی یا قلب ماہیت کا دوسرا مظہر خالص نفسی ہوتا ہے۔ جسمانی، دماغی اور نفسیاتی حادثے کس طرح انسان کی قلب ماہیت اور روحانی کایا پلٹ کر دیتے ہیں اور کس طرح اس کے اندازِ

فکر میں بنیادی اور بعض اوقات متضاد تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں، غور سے جائزہ لیا جائے تو ہمیں ہر قدم پر اس کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ آپ نے جذباتی حوادث کے زیر اثر ملحد کو مذہبی، مذہبی کو ملحد، شیطان کو فرشتہ، فرشتے کو شیطان، نیک کو بد، بد کو نیک، خدا پرست کو کافر، کافر کو خدا پرست، معقول کو مجنوں، مجنوں کو معقول، معصوم کو مجرم، مجرم کو معصوم بنتے دیکھا ہوگا۔ اس کا قانون وہی ہے جس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں یعنی غیر معمولی جذباتی حادثے بھی غیر معمولی اعصابی اور جسمانی حوادث کی طرح اعلا اعصابی نظام کو تلپٹ کر دیتے ہیں۔ ان حادثات کا قوی ہاتھ پچھلے کردار کے تمام ذہنی نقوش کو اس طرح کھرچ کر صاف کر دیتا ہے جس طرح کوئی تختی یا سلیٹ کو رگڑ کر صاف کر دے۔ پھر زندگی کے لیے تقاضے یا نئے اندرونی ہیجانات، جو اب تک نفس کے تہہ خانے میں دفن تھے، بروئے کار آتے ہیں اور فرد یا قوم کے اندر سے نیا کردار، نئی اجتماعی شخصیت اور نیا انداز نظر ابھرتا ہے جو اس کے پچھلے رویے اور کردار سے اکثر حالات میں متضاد ہوتا ہے۔ فرد کی یہ روحانی تبدیلی اور ذہنی قلب ماہیت اتنی مکمل ہوتی ہے کہ انسان کے ماضی اور حال کے درمیان کوئی مناسبت باقی نہیں رہتی۔

غیر معمولی جذباتی حادثات کے موقع پر کسی قوم کے رویے اور کردار میں تبدیلی دو سمتوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ بہتر کی طرف یا بدتر کی طرف۔ اگر کسی قوم کا اخلاقی ضمیر اعلا مقاصد حیات سے خالی ہے تو وہ ایسے نازک موقع پر منفی رویہ اختیار کرے گی اور اگر کسی قوم کی روح اجتماعی صحت مند ہے اور اس کی تشکیل میں پاکیزہ روایات شامل ہیں تو امتحان و آزمائش کے مواقع پر اس قوم کے افراد کے رویے اور کردار میں ایسی انقلاب انگیز اخلاقی خوبیاں ابھر آئیں گی جو پہلے بروئے کار نہ آئی تھیں۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک ہندستانی اور پاکستانی اقوام برکوچک کی یہ دونوں قومیں زبردست ہیجان اور اشتعال کے دور سے گزری ہیں اور گزر رہی ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات، ہندستان میں اقلیت کا قتل عام، جوناگڑھ، مانادر اور حیدرآباد پر ہندستان کے ناگہانی حملے، کشمیر کا بزور الحاق، ہندستان میں اقلیتوں کے کلچر اور زبان کی پامالی، نسلی رجعت پسندی کے مظاہرے، اہمسا کے ادعا کے باوجود۔ بے مثال فرقہ وارانہ تشدد، ناگاؤں کا استیصال، سکھوں پر مظالم، عیسائیوں کا اخراج، ملک کی مسلمہ اور مقبول زبان اردو پر بندش اور پھر سال گزشتہ پاکستان پر ہندستان کا مجنونانہ حملہ، یہ تمام واقعات۔ ہندستان کے قومی کردار کا آئینہ ہیں۔ ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے شاندار ماضی کے باوجود ہماری ہمسایہ

قوم میں کیسی جوہری اور بنیادی کرداری خامیاں موجود ہیں۔ قومیت کا محدود نظریہ، ذات پات کا نظام، وحدتِ کائنات کے عقیدے سے ذہنی بے گانگی، سماجی رجعت پسندی، نسلی تفاخر، ایک عجیب و غریب قسم کا علم الاصنام اور پھر علاحدگی پسندی کا پانچ ہزار سالہ رجحان، ان تمام عوامل نے اس برکوچک کی سب سے بڑی اور ایک اعتبار سے عظیم الشان قوم کا پول آزمائش کے موقع پر کھول دیا۔ دوسری طرف گزشتہ سال کی جنگ نے یکایک ہماری قومی شخصیت کو ایک انقلابی سانچے میں ڈھال لیا۔ پاکستان پر حملۂ ہندستان سے قبل بھی ہم سیاسی اور عملی طور پر ایک ہی قوم تھے، ہمارا ایک ہی پرچم تھا، ایک ہی نعرہ تھا، ایک ہی مقصدِ حیات کا اعلان کیا جاتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سچائی کو جب تک کسوٹی پر نہ پرکھا جائے کوئی دعوا نہیں کیا جا سکتا۔ سال گزشتہ ۶ ستمبر کی صبح نے اس حقیقت و صداقت کا ثبوت مہیا کر دیا۔ یہ جنگ صرف سترہ روز جاری رہی اور صرف سترہ روز میں ہزاروں سال کی منزل مراد طے ہو گئی:

طے می شود ایں رہ بدرخشیدنِ برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم

مَیں نے عرض کیا تھا کہ غیر معمولی جذباتی اور ہنگامی صورتِ حال کے موقع پر قوم کی روح اجتماعی یا نفسِ اجتماعی کی تمام مخفی قوتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ اس جنگ کی پہلی ضرب ہی سے ہمارے اندر کی تمام تخلیقی صلاحیتیں یکایک جاگ اٹھیں۔ جنگ انسان کی زندگی کا سب سے پُرجوش شخصی اور اجتماعی مظہر ہے۔ آپ نے بارہا آزمایا ہو گا کہ کس طرح خطرے کے وقت آپ کے جسم کا ایک ایک ریشہ اور آپ کی روح کا ایک ایک ذرّہ نئی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جسم اور نفس کی یہ مستعدی سوئی ہوئی قوتوں کو یکایک بیدار کر دیتی ہے۔ جب ہماری قوم کو ایک غیر متوقع جارحانہ حملے کے مقابلے کا موقع ملا تو اس کے نفسِ اجتماعی میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ مجاہدین نے۔ زمین، ہوا اور سمندر پر ایثار و شجاعت، دفاع و اقدام اور سیرت و کردار کے ایسے غیر معمولی کارنامے دکھائے کہ ہر قوم کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات ہو سکتے ہیں۔ شعرا کو یکایک محسوس ہوا کہ ان کی روح میں بے پایاں تخلیقی قوت کے سرچشمے پھوٹ پڑے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس روحانی ہیجان کے عالم سے گزر چکا ہوں۔ حملۂ ہندستان کے پہلے روز سے التوائے جنگ تک جذب و جوش کی ایک ایسی عجیب و غریب کیفیت مجھ پر اور میرے ہم کاروں پر طاری تھی کہ اب اس کا تصور تک محال ہے۔ فوجی، شہری،

مل مالک، مزدور آجر و اجیر، شاہ، گدا، جوان بوڑھے، عورتیں بچے، الغرض قوم کی قوم جہد و عمل کے مختلف میدانوں میں ایک ہی کردار کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جنگ کے زمانے میں جس قدر مکاشفے، جس قدر رویائے صادقہ، خرق العادت کے جس قدر مظاہرے دیکھنے میں آئے وہ سب اسی روحانی بیداری کا نتیجہ تھے۔ درحقیقت جنگ ستمبر ہمارے قومی کردار کی سب سے بڑی آزمائش تھی اور الحمد للہ کہ ہم اِس امتحان و ابتلا میں پورے اُترے۔

شامِ ہمدرد، کراچی
۸ر ستمبر ۱۹۶۶ء

جناب بریگیڈیر گلزار احمد

علمائے اخلاقیات نے کردار کی متعدد تعریفیں کی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ کردار انسانی زندگی کو سنوارتا ہے، معاشرے کی تطہیر کرتا ہے اور ملک و ملت کی تشکیل و تعمیر میں معین و مددگار رہتا ہے۔ یہ ایسی متعدی صفت ہے جو دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو صحیح ہوگا کہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست، مدّاحوں کو نکتہ چین اور نکتہ چین کو مدّاح، ہواخواہوں کو بدخواہ اور بدخواہوں کو ہواخواہ بنانے میں جس چیز کو سحر انگیز طور پر دخل حاصل ہے وہ کردار کا خوب اور ناخوب ہونا ہے۔

معاشرہ افراد کے مجموعے سے عبارت ہوتا ہے۔ اگر لوگ بھلے ہیں تو معاشرہ بھی اچھا ہوگا اور اگر برعکس صورت ہے تو اس کے نتائج و ثمرات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ صحت مند یا بیمار معاشرے کا قوم کی زندگی اور موت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی اور تطہیری تحریکیں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی سب سے زیادہ زور کردار کی صحت و سلامتی پر دیتی ہیں کہ اسی طرح وہ بلند اور برتر معاشرہ پیدا ہو سکتا ہے جو انسانیت کی فلاح و صلاح پر آخر کار منتج ہوتا اور ہو سکتا ہے۔

اگر کردار کمزور ہے یا سرے سے نابود ہے یا اس کی قرار واقعی عظمت و اہمیت نگاہوں سے اوجھل ہے تو نہ معاشرہ سدھر سکتا ہے نہ قوم ترقی کی منزلیں طے کر سکتی ہے۔ وہ کردار —اور صرف کردار— ہے جو قوموں اور ملتوں کے ادبار و عروج، زوال و ارتقا، انحطاط و فروغ اور ہبوط و صعود کا ذمّے دار ہے۔ لہٰذا کسی موقع پر بھی اور کسی مرحلے پر بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابھی پچھلے سال ہم ایک عظیم اور ہولناک جنگ سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اس جنگ کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ اس لڑائی میں وہ قوم سرخ رو ہوئی جو آبادی کے اعتبار

سے کم، سامانِ جنگ کے لحاظ سے بے مایہ، مالی اعتبار سے تہی دامن اور ذرائع و وسائل کے لحاظ سے ناقابلِ اعتنا تھی — اور شکستِ فاش اس قوم کے حصے میں آئی جو مذکورہ اعتبارات سے کہیں زیادہ بلند و برتر تھی۔ ایسا کیوں ہوا؟

صرف اس لیے کہ جیتنے والی قوم کا کردار فولاد و آہن کی طرح مضبوط اور بے لچک تھا۔ اگر اس بلند کردار نے مستقل صورت اختیار کر لی تو بلاشبہ ملّتِ پاکستان اقبال کے خواب کی تعبیر بن سکتی ہے:

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

"معاشرہ میں کردار کی اہمیت" اور اس کی معنویت پر جتنا زیادہ غور کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ یہ بات واضح ہو گی کہ یہ ایسی بنیادی اور سنگین حقیقت ہے کہ جس پر ملک و ملّت کی تعمیر اور انسانی اقدار کی تشکیل و تطہیر منحصر و مضمر ہے۔

آج "شامِ ہمدرد" کے مہمان مقرّر جناب محترم بریگیڈیر گلزار احمد صاحب نے اظہارِ خیال کے لیے بھی اہم موضوع چنا ہے۔ بریگیڈیر صاحب عسکری اور ادبی حلقوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں جن کی نظر سے ان کی کتاب "یادِ ایام" گزری ہے وہ اس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو مشرق و مغرب کے کتنے محاذوں پر کس قدر گوناں گوں عسکری تجربات و مشاہدات ہوئے ہیں۔ ادبی میدان میں بھی ہمارے مہمان مقرّر کی فتوحات ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔

بریگیڈیر گلزار مفکّر بھی ہیں اور مورخ بھی۔ ان کے فکر و نظر کا سرچشمہ اسلام اور تاریخ ہے۔ علم و ادب سے ان کے گہرے شغف کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی لائبریری پاکستان کے چند بڑے انفرادی کتب خانوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

ضلع جہلم میں پھیلے ہوئے کوہستان نمک کے آغوش میں جیالے سپاہی کے گھر پیدا ہونے والے گلزار احمد کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔ ایک عام سپاہی کے رینک سے اپنی محنت و لیاقت کی بدولت یہ بریگیڈیر کے منصب تک پہنچے۔ پھر ترقی دیہات کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وزارتِ خارجہ میں ڈائرکٹر جنرل رہے۔ ملک میں ترویجِ تعلیم میں ان کی رضاکارانہ خدمات لائقِ تحسین ہیں۔ یہ راولپنڈی کے سرسیّد اسکول کے بانیوں میں ہیں۔ ضلع جہلم میں ایک شاندار پبلک اسکول ان کی مساعی سے کام کر رہا ہے۔

میری طرح آپ کو بھی یہ جان کر حیرت ہو گی کہ پچھلے سال ۵۶ برس کی عمر میں ہمارے مہمان مقرّر نے ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کے امتحانات پاس کیے ہیں۔ ان جماعتوں میں ان کو خود اپنے بیٹے کے دوش بدوش ڈیسک پر بیٹھنا پڑا!

حکیم محمد سعید

انسانی معاشرے میں کردار کی اہمیّت

جناب بریگیڈیر گلزار احمدؒ

معاشرے کے لفظ کا اطلاق ہر اُس انسانی گروہ پر ہو سکتا ہے جو منظّم طور پر کسی خاص مقام اور وقت پر اجتماعی زندگی گزار رہا ہو۔ اسے آپ ملک، قوم یا قبیلہ کا سا بھی نام دے دیں۔ اس کی اجتماعی زندگی کو جب کُلّی طور پر دیکھا جائے گا تو وہ اس قوم، قبیلے یا مِلّت کا معاشرہ کہلائے گا۔ کردار سے مراد انسان کا طرزِ عمل ہے۔ چوں کہ معاشرے میں ہر شخص انفرادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے معاشرے کے کردار سے زیادہ فرد کے کردار یعنی اس کے طرزِ عمل کو اہم مقام حاصل ہے۔ افراد کے کردار میں جو خصوصیتیں مشترک ہوتی ہیں، ان کو مجموعی طور پر قوم یا مِلّت کا کردار کہا جاتا ہے۔ قومی کردار کا وجود چوں کہ سراسر افراد کے کردار پر مبنی ہے اس لیے تشکیلِ کردار کا جہاں تک تعلق ہے وہاں بھی فرد کو ہی اہمیت دی جانی چاہیے۔

قوم و مِلّت یا بعض اوقات کسی ملک کے باشندوں کے کردار واضح خطوط کے حامل ہوتے ہیں اور بعض حالات میں ان کی مشترک خصوصیات کے کم ہونے کی وجہ سے یہ خطوط پوری طرح واضح نہیں ہوتے۔ بہرکیف ہر انسانی گروہ کے وجود کی بنیاد ایک قومی کردار کی وجہ سے ہوتی ہے ورنہ اگر ان کو باہم منسلک رکھنے کے عناصر موجود نہ ہوتے تو ان کا از خود منظّم گروہ کی شکل میں موجود ہونا ممکن نہ ہوتا۔ قومی کردار کی اہمیت، اس کو محکم یا پائیدار کرنے کے ذرائع اور اسے انتشار سے محفوظ رکھنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسا اہم اور نازک مسئلہ ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے کے لیے قوم کے پورے وسائل کو استعمال میں

لانا ضروری ہوتا ہے۔ عصر حاضر میں فاصلے کوتاہ اور ذرائع نقل وحمل صبا رفتار ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے افکار وخیالات کی دنیا پر کچھ اس شدت سے ایٹمی ضربیں پڑ رہی ہیں کہ ان کے حُسن وقبیح میں تمیز مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر پہلے وقتوں میں اجتہادی مسائل صدیوں یا سالوں بعد نمودار ہوتے تھے تو اب ہر ماہ و ہر سال ایسی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں جن میں اجتہادی نظر کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ ایسے دور میں اگر معاشرے کے خطوط اور قومی کردار کی بلندیوں کو قائم رکھنے کا ارادہ ہو تو جب تک قوم کی پوری توجہ اس طرف مبذول نہ کرائی جائے یہ خدشہ رہتا ہے کہ قوم انتشار کا شکار ہو جائے گی اور پہلی نسلیں اپنے مابعد کی نسلوں کو داخلی طور پر پہچان بھی نہ سکیں گی۔ یہ خدشہ معمولی خدشہ نہیں۔ میری رائے میں ایسے آثار پیدا ہونے شروع ہو چکے ہیں کہ والدین اپنی اولاد کے ذہن وفکر کو اجنبی تصور کرنا شروع کر چکے ہیں اور اولاد اپنے والدین کو عہد جاہلیت کی پیداوار سمجھنے لگی ہے۔ اگر یہ رفتار جاری رہی تو قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا اور پھر قومی یک جہتی کی حقیقت سراب سے زیادہ نہ ہوگی۔ انتشار ہمیشہ فرد سے بڑھ کر خاندان، پھر محلّے، پھر شہر اور پورے معاشرے میں پھیل جاتا ہے۔ اگر دو نسلوں کے درمیان نظریات اور اقدار کا فرق عام ہو گیا تو پھر قدروں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

ایسی محفل میں موضوع کے مبادیات کی طرف یا بنیادی مفروضات کی طرف اشارہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مصداق ہے مگر بحث کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ دلائل سے قبل بعض مفروضات نظر کے سامنے رکھ لیے جائیں۔ جب تک مفروضات پر اتفاق نہ ہو اس وقت تک دلائل کی قبولیت یا ان سے انکار مشکل ہو جاتا ہے۔ چوں کہ کردار سے مراد طرزِ عمل ہے، اس لیے عمل کا مقام واضح کرنا ضروری ہوگا۔ اس تحت میں پہلا مفروضہ یہ ہے کہ عمل ذہن کا تابع ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیتے ہیں کہ عمل ذہن کا تابع ہوتا ہے تو پھر ہماری تمام تر توجہ ذہن کی طرف ہونی چاہیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہوتے ہیں جو ذہن پر اثر کرتے رہتے ہیں اور اسے خیر یا شر، حُسن یا قبح اور نیک و بد میں سے کسی ایک طرف مائل کرتے ہیں۔ کیا خیر وشر یا نیک وبد کی تمیز انسان کی جبلّی خاصیت ہے یا اکتسابی ہے؟ یعنی آیا ہر شخص خیر وشر کی تمیز پیدائش سے اپنے اندر لے کر آتا ہے یا اسے حاصل کرنی پڑتی ہے؟ میری رائے میں خیر وشر کی تمیز قدرت نے کچھ بھی کیوں نہ بنائی ہو عملی طور پر اکتسابی ہے جبلّی نہیں یعنی پیدا تو مسلمان ہوتا ہے مگر اس کے بعد بھی اگر اسے قبول کر لیا جائے تو پھر یہ دوسرا مفروضہ ہوگا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہر بچّہ جو پیدا ہوتا ہے اس میں خیر وشر کی تمیز صحیح خطوط پر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تیسرا قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ اگر معاشرے کی صحت معاشرے کا اجتماعی مسئلہ ہے

تو پھر آزادیٔ رائے کے احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے معاشرے کو ایسے خطوط وضع کرنے پڑیں گے جن پر عمل کرنے سے ہر بچّے کے ذہن میں خیر و شر کی تمیز کا مادّہ صحیح وقت پر پڑ سکے گا۔ بالفاظِ دیگر قوم کی آئندہ نسلوں کی تربیت قوم کا اجتماعی فرض قرار دیا جائے گا۔

یہاں یہ ممکن ہے کہ بعض ذہنوں میں الجھن پیدا ہو کہ اگر فرد کی تربیت کو اجتماعی طور پر معاشرہ اپنے ہاتھ میں لے لے گا تو آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس لیے کیوں نہ ہر شخص کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور نیک و بد کی تمیز کو قائم رکھنے کے لیے قوانین بنا دیے جائیں کہ ہر بدکار کو سزا دی جائے اور لوگ گمراہی سے بچتے رہیں یعنی اس بات کا یقین ہے کہ قانون کا خوف لوگوں کو راہِ راست پر رکھے گا۔ اس سوال کا جواب دینے سے قبل ضروری ہوگا کہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ آیا انسان برائی کی طرف مائل کیوں ہوتا ہے؟

اس لیے کہ اسے اچھے اور برے کی تمیز نہیں ہوتی۔

(یا) اس لیے کہ وہ اچھے اور برے کی تمیز تو کر سکتا ہے مگر بعض کششیں اُسے برائی کی طرف لے جاتی ہیں۔

(یا) اس لیے کہ اس کے ذہن میں اچھے برے کی جو تمیز ہے اس سے اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو اختلاف ہے۔

ہو سکتا ہے اور صورتیں بھی ممکن ہوں مگر پہلے ان تین صورتوں پر غور کرنا ضروری ہوگا۔ پہلی صورت جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا یہ ہے کہ آیا غلطی کا مرتکب شخص اس لیے غلط روی اختیار کرتا ہے کہ اسے اچھے یا برے کی تمیز نہیں یا کوئی اور وجہ ہے؟

مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھائی اور برائی سے کیا مراد ہے؟ آیا ہر معاشرے اور ہر دور یا ایک ہی معاشرے کے مختلف طبقوں میں اچھائی اور برائی کا ایک سا تصور پایا جاتا ہے۔ بادی النظر میں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر تمام معاشرے چند ایسے محاسن پر اتفاق کریں گے جو فرد اور معاشرے کے کردار کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہر معاشرے میں اصولی طور پر سچ کی افادیت کو قبول کیا جائے گا اور جھوٹ کو مکروہ قرار دیا جائے گا۔ اس کے باوجود جب عملی دنیا کی طرف نگاہ کی جائے تو بعض معاشروں میں شخصی یا ملّی و ملکی مفاد کے تحفّظ کے لیے جھوٹ بولنے کو مصلحت وقت کہہ کے اس کا جواز پیش کیا جائے گا۔

ایک اور مثال لیجیے۔ بعض معاشروں میں نیت اور عمل دونوں کے صحیح ہونے پر

زور دیا جائے گا مگر اس کے برعکس دوسرے معاشروں میں نیت کو تو اہمیت دی جائے گی البتہ عمل کو یہ کہہ کر غیر اہم قرار دیا جائے گا کہ اصل بات تو مقصد ہے، اگر مقصد نیک ہو تو بُرے ذرائع استعمال کرنا بُری بات نہیں۔

اِن دو مثالوں میں ایسے معاشروں کو لیا گیا ہے جن کے اصولوں میں فلسفیانہ فکر کو صدیوں سے دخل رہ چکا ہے اور جو مستحکم بنیادوں پر قائم رہ چکے ہیں۔ دونوں مثالوں میں سچ کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو مدِ نظر رکھا گیا ہے مگر جب اس پر عمل کی نوبت آتی ہے تو ایک معاشرہ وقتی ضروریات کو اصول پر فوقیت دینے پر مجبور ہو گیا۔ اور اس مثال کو روز مرہ کے واقعات کے پیشِ نظر دیکھئے۔ کچہریوں، دفتروں اور تجارتی اداروں میں آپ کو سینکڑوں، ہزاروں مثالیں ملیں گی کہ حقیقت کو پوشیدہ صرف اس لیے رکھا جاتا ہے کہ اس طرح وقتی طور پر کچھ فائدے کی اُمید ہوتی ہے۔ بعض ایسے واقعات ملیں گے کہ اصول پر کار بند رہنے والے اشخاص دیدہ دلیری سے جھوٹ بولنے پر صرف اس لیے آمادہ ہو جائیں گے کہ اس سے ان کو، ان کے کسی عزیز کو یا ان کے قبیلے کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سچ صرف اس وقت بولا جائے کہ جب سچ بولنے سے فائدہ اور کسی طرح کا خطرہ نہ ہو تو پھر سچائی کی چنداں وقعت نہیں رہ جاتی۔ پھر سچ وہ ہے جس سے فائدہ ہو اور جھوٹ وہ ہے جس سے اپنا یا اپنے کسی متعلقہ شخص کا نقصان ہوتا ہے۔ اسی استدلال کو اس کے انجام تک لے جانے سے ظاہر ہوگا کہ سچ پر عمل اس لیے نہیں کیا جاتا کہ خسارہ، نقصان یا تکلیف کا خوف ہوتا ہے۔ یعنی حرص، لالچ، خود غرضی، بزدلی اور خوف جیسے احساسات جھوٹ بولنے کا موجب بنتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے جھوٹ بولنے والے انسان میں ہمت اور دلیری کی کمی ہوتی ہے۔ دلیری اور ہمت کا فقدان طبعی نہیں ہو سکتا اسی طرح بزدلی اور دوسری خاصیتیں بھی فطری نہیں ہو سکتیں۔ تربیت کی کمی اور ناپختگی ہی یہ کمزوریاں پیدا کر سکتی ہے۔ یعنی اصولی طور پر اگر ہر انسان کی تربیت صحیح خطوط پر کی جائے۔ تو وہ ان کمزوریوں سے پاک اور بالاتر ہو کہ زندگی کی تگ و دو کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے گا۔ ہمارے پہلے اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہوا کہ انسان برائی کی طرف اس لیے نہیں مائل ہوتا کہ اسے اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں ہوتی بلکہ اس لیے کہ اس کی طبیعت میں جو خوف و ہراس اور خطرات کا مقابلہ کرنے سے متعلق جو بزدلانہ کیفیت پیدا ہو چکی ہے اس کے زیرِ اثر وہ بُرائی کی طرف مائل ہوتا ہے۔

ہمارا تیسرا سوال یہ تھا کہ آیا یہ بھی ممکن ہے کہ نیکی اور برائی کا جو تصوّر اس کے ذہن

میں موجود ہے اُس کے گرد و پیش کے لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ یہ حالات اور ایسے واقعات مستحکم اور منظم معاشروں میں نہیں ہونے چاہئیں مگر جہاں تہذیب و تمدن اور ثقافت وفن پر چہار پہلوؤں سے شب و روز حملے ہوتے رہیں وہاں اگر بنیادی اقدار نہ بھی بدلیں تو ان اقدار کے مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو اشخاص خارجی اور بیرونی اثرات کا کماحقہٗ شکار ہو جاتے ہیں وہ نیکی اور برائی کا معیار اور اس کا اظہار باقی معاشرے سے مختلف طور پر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حیا کا جذبہ یا احساس ہر معاشرے میں موجود ہوتا ہے اور اسے باقاعدہ ایک بنیادی قدر کا مقام دیا جاتا ہے مگر حیا کے مظاہر ہر معاشرے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے میں اگر انسانی بدن کو گھٹنوں سے کمر تک ڈھانپ لیا جائے تو وہ حیا کی معراج ہے اور کسی معاشرے میں اگر ناخن بھی نظر آجائے تو وہ بے حیائی کا ادنی ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔ یہ مثال شاید انتہائی اختلافات کو پیش کرتی ہو۔ ایک ایسی مثال لیجئے مگر آپ اور مثالیں کیوں لیتے ہیں۔ خارجی ممالک سے ہمارے ہاں ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں ایسی فلمیں درآمد کی جاتی ہیں جنھیں سنسر بورڈ نا قابلِ نمائش تصور کرتا ہے اور اس پابندی پر اخباروں میں خطوط شائع ہوتے ہیں کہ ان فلموں میں کون سی برائی تھی۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ جو اشخاص خارجی اثرات کو زیادہ جذب کر چکے ہوتے ہیں ان کا تصور نیک و بد کے متعلق اپنے گرد و پیش سے مختلف ہوتا ہے اور اسی کی بناء پر وہ ان پابندیوں کو شخصی آزادی اور آزاد خیالی کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔

شاید اب آپ یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں گے کہ عالمی اقدار یا بنیادی صداقتیں کاغذ پر یا الفاظ و بیان میں یکساں ہوں تو ہوں عملی دنیا میں خصوصاً ان کی ظاہری اور عملی صورت میں ہر معاشرے کی اپنی اقدار ہوتی ہیں۔ اور معاشرے کے مفکروں کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ وہ ہر اس رجحان کو سختی سے روکیں جو معاشرے کی متفقہ اقدار کی فصیل میں رخنہ اندازی کرنے کا اہل ہو۔ یہاں یہ چوں کہ ایک بنیادی سوال پیدا ہو جاتا ہے اس لیے اجازت دیجئے کہ پہلے اس کو زیرِ غور لے آئیں۔ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ افراد ان اقدار کی پابندی کیوں کریں ہر عاقل و بالغ شخص اچھائی اور برائی کو سمجھ سکتا ہے؟ پھر وہ کسی عہدِ عتیق کے بتائے ہوئے اصولوں کی پابندی پر کیوں مجبور کیا جائے؟ مگر اس سوال کو اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ انسان برائی اور گناہ سے بچنے کی کیوں کوشش کرے اور کیوں نہ صرف اپنے فائدے اور نقصان کو مدِ نظر رکھے؟ اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ چند لمحوں کے لیے ایک ایسے معاشرے کو تصور میں لائیے جس میں ہر شخص جھوٹ بولتا ہو اور ہر شخص

دوسرے کے مال پر نظر جمائے ہوئے ہو اور جب اسے موقع ملے اور کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو اسے اپنے قبضے میں لے لے۔ اگر پکڑا جائے تو زورِ بازو کا استعمال کرے۔ اگر زورِ بازو اور دوستوں کی مدد نہ لے سکے تو جھوٹ بولے۔ اگر مقدمہ و نالش کی نوبت آئے تو گواہ خرید کر اپنی بریت کا انتظام کرے یا خدا نخواستہ اگر عدل کی کرسی میں کمزوری نظر آئے تو اس کرسی کے پائے سیم و زر سے لیپ کر اپنی من مانی کرے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے معاشرے کے تصور سے یا کم از کم ایسے معاشرے میں زندگی گزارنے کے خیال سے آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ خیال کہ پرانی اقدار اور پرانے زمانے کے بنائے ہوئے اصولوں کی زنجیروں میں کیوں ہم اپنے آپ کو جکڑے رکھیں صرف ایک واہمہ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جس معاشرے میں کردار کی اہمیت نہیں وہ انتشار در انتشار کے ایسے گرداب میں پھنس جائے گا کہ پھر جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ناممکن ہو جائے گا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق طوائف الملوکی کا ایسا دور دورہ شروع ہو جائے گا کہ ڈاکوؤں، لیٹروں اور رہزنوں کے سوا اور کوئی اپنی محنت کا پھل نہ کھا سکے گا اور اس قماش کے لوگ آپس میں نبرد آزما ہونے کے بعد ایک دوسرے کو فنا کرتے رہیں گے، حتیٰ کہ انسانی آبادی ختم ہو جائے گی۔ آپ تصوراتی نقشے کو غیر ممکن نہ سمجھیں۔ بیشتر دنیا پر ایسے ادوار گزر چکے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لہلہاتے کھیتوں کی جگہ وہاں اب خاک کے بگولے اڑتے ہیں، جہاں رنگ و بُو کی دنیائیں بستی تھیں وہاں قبروں کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھ کر معاشرے کے مصدّقہ اور آزمائے ہوئے اصولوں اور اقدار کو اپنی طبیعتوں کے لیے ناگوار بوجھ سمجھا تھا اور اس بوجھ سے ایسے آزاد ہوئے کہ یہ دنیا خود ہی ان سے آزاد ہو گئی۔

اب شاید اس سوال کا جواب دے دیا جا چکا ہو گا جو کچھ دیر پہلے سامنے لایا گیا تھا یعنی کیوں نہ قوانین بنا لیے جائیں اور ہر شخص کو قانون کے خوف سے راہِ راست پر رکھا جائے اور تربیت کو شخصی آزادی میں بے جا دخل سمجھ کر نظر انداز کیا جائے۔ وہ کھنڈرات کا ڈھیر جہاں پہلے آباد بستیاں تھیں وہاں بھی قوانین تو موجود تھے البتہ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے نے جب مکمل آزادی اور آزاد روی کی صورت اختیار کر لی اور ہر شخصی مفاد نے اجتماعی مفاد پر فوقیت حاصل کر لی تو نہ اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکا اور نہ ہی انفرادی مفاد کا تحفظ ہو سکا۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ متفقہ اصولوں کے مطابق ہر فرد کی تربیت لازمی اور ضروری ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم یہاں پہنچ کر اس موضوع کو ختم کر دیتے مگر معاشرے میں کردار کی اہمیت قبول کر لینے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تشکیلِ کردار، اس کے ذرائع اور اس

کے موقع و محل پر بھی غور کیا جائے۔ جہاں تک موقع یعنی وقت کا تعلق ہے اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی سطح پر وہی نقش پائیدار ہوتا ہے جو وقت کے لحاظ سے اولیت کا مقام رکھتا ہو اور ہر لمحہ اس کو گہرے سے گہرا کیا جاتا رہے۔ اگر اولین نقش غلط ہو جائیں تو پہلے انھیں مٹانا پڑتا ہے اور نئے نقش بنانے پڑتے ہیں۔ کردار کے معاملے میں اگر پہلے غلط خطوط پر عمارت بنائی جائے تو اس کے ڈھانے میں ذہن پر چوٹ پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشکیلِ کردار کی نسبت اصلاح کردار کو مشکل پایا گیا ہے بلکہ بعض حالتوں میں تو اصلاح کردار کے خلاف ذہن انسانی بغاوت پر اتر آتا ہے اور اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے۔

اگر وقت کے لحاظ سے اولین موقع بہترین موقع ہے تو مقام ظاہر ہے۔ یعنی جہاں ایامِ طفلی گزرتے ہوں اسی جگہ تشکیل کردار ممکن ہو سکتی ہے۔ یہ مقام گھر کی چار دیواری اور مدرسہ و مکتب کے در و دیوار ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں ماں باپ نہ صرف زبانی نیکی کی تلقین کریں بلکہ عملی طور پر بھی بچوں پر ثابت کریں کہ وہ تمام دل چسپیوں اور کششوں کے باوجود راہ راست پر قائم رہنے کو فوقیت دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ایک لمحہ بچے سے کہا کہ جھوٹ نہ بولا کرو اور دوسرے لمحے کسی غیر دل چسپ آواز پر اسی بچے سے کہا "ان سے کہہ دو کہ ابا گھر پر نہیں ہیں۔" بچے کو تو تلقین کی کہ لڑنا جھگڑنا برا ہوتا ہے اور خود میاں بیوی گھر کو جہنم کا آئینہ بنائے رکھیں۔ اولاد کو تو مشورہ دیا جاتا ہے کہ رزقِ حلال کو ترجیح دو اور خود ہر ڈالی اور ہر تحفے کو مسکراتے ہوئے قبول کیا کریں۔

مدرسہ بچے کا دوسرا گھر ہوتا ہے جس میں وہ شاید گھر سے بھی زیادہ وقت گزارتا ہے۔ اس لیے کہ نیند کے دوران تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس وقت کو گنتی میں لانا درست نہ ہوگا۔ مدرسے کا ماحول گھر کے ماحول سے کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ گھر میں تو نیکی اور خوف کا ذکر ہو اور مدرسے میں کتابیں چوری ہو رہی ہوں۔ استاد غیر حاضروں کی حاضری لگا رہے ہوں۔ امتحان کے دوران نااہلوں کو ترجیح دی جا رہی ہو تو پھر یہ خیال کرنا کہ یہ نسل جوان ہو کر نیکی اور اچھائی یا خوفِ خدا کی طرف مائل ہوگی خام خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ خوفِ خدا، اس ایک لفظ میں کئی دفتر پنہاں ہیں۔ خوفِ خدا ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانوں کو، کمزور انسانوں کو دنیا کی تمام کششوں اور آلائشوں کے باوجود صراطِ مستقیم پہ رکھ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا ہے: راس الحکمۃ مخافۃ اللہ۔
خوفِ خدا کے ذکر سے دین و مذہب کا خیال پیش نظر آجاتا ہے اور تشکیل کردار میں دین و مذہب کا مقام ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اسے زیرِ غور لائے بغیر یہ اہم پہلو حل ہی نہیں ہو سکتا۔ ہر

معاشرہ اپنے بنیادی اصولوں کے لیے دین و مذہب کا مرہونِ منت ہوتا ہے اس لیے معاشرے کے مسائل دین و مذہب کی طرف رجوع کیے بغیر حل ہی نہیں ہو سکتے۔ لادینی نظام ناتواں پتّوں کی طرح ہوا کے ہر جھونکے کے زیرِ اثر اپنی حرکت کا رخ بدلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد انھیں یہ معلوم ہی نہیں رہتا کہ اُن کے معاشرے کا نصب العین کیا ہے اور ان کا منتہائے مقصود کیا ہے۔ دین و مذہب کے اصولوں سے وابستگی ہی کسی معاشرے کو مضبوط چٹان کی طرح نت نئے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔

اگر آپ ایک فرد کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ اگر جھوٹ بولنے کی عادت عام ہو جائے تو خرید و فروخت، لین دین، صنعت و حرفت، خانگی اور خاندانی اختلافات اور قانون کے احترام سبھی پہلوؤں کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ اچھا میں خود فیصلہ کر لوں گا کہ کس جھوٹ سے نقصان پہنچتا ہے۔ جب ایسا موقع آیا تو وہاں سچ بولوں گا۔ جب نقصان کا احتمال نہ رہے گا تو پھر جھوٹ بولتا رہوں گا۔ سچ کا افادی پہلو کتنا ہی درست سہی عام افراد کو سچ پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس کے برعکس اگر اللہ کا خوف قلب میں جاگزیں ہو اور اللہ کی خوشنودی سے قلب و ذہن میں فرحت محسوس ہوتی ہو تو کڑی سے کڑی حالتوں میں بھی انسان سچ پر قائم رہے گا۔ فن و صداقت کے تحفظ کے لیے کتنے دلیروں نے ایثار و قربانی کی بلند منازل طے کی ہیں۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ و پائندہ ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس مفاد کے تحفظ کے لیے کوشش تو کی جا سکتی ہے قربانی نہیں دی جا سکتی۔

آج چوں کہ مستحسن خصائل کی مثالوں میں سچائی یا صداقت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے بہتر ہوگا کہ وہ خاصیتیں بھی بیان کر دی جائیں جو صداقت کی بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ پہلی خاصیت جو حق و صداقت پر قائم رہنے یا سچ بولنے کے لیے ضروری ہے وہ دلیری اور بہادری کی خاصیت ہے۔ جھوٹ کی تہ میں جان اور مال کا خوف جاگزیں ہوتا ہے اور جو خوف سے بلند ہو سکتے ہیں وہی سچ پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد خودداری اور غیرت کی خاصیتوں کا مقام آتا ہے۔ خوددار انسان کے لیے ایسا مقام موت سے بھی بدتر ہے اگر اُسے یہ خیال بھی پیدا ہو جائے کہ جو کچھ اُس نے کہا ہے وہ جھوٹ ہے اور کوئی اسے جھوٹا تصور کر رہا ہے۔ تشکیل کردار کے دوران دلیری، بہادری، خودداری اور غیرت کے احساسات پر زور دیتے رہنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب تک افراد میں یہ خاصیتیں پیدا نہ ہوں گی ان کے اعمال بلندیوں کی جانب کا رخ اختیار نہ کر سکیں گے۔

جس معاشرے میں خوفِ خدا کو مرکزی مقام دیا جاتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کے تشکیل کردار کے زمانے میں انضباطِ نفس (سیلف ڈسپلن) کے پہلو کو روشن کرتے رہیں۔ خوفِ خدا فرد اور خالق و مالک کے درمیان براہِ راست ایک تعلق پیدا کرتا ہے جس کی گہرائی اور شدت صرف فرد ہی جان سکتا ہے۔ اگر فرد اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور ان پر بے لوث تنقید کا عادی ہو جائے گا تو اس سے سہواً یا بے خبری میں جو لغزشیں صادر ہو جائیں گی ان کا بھی وہ علاج سوچ لے گا۔ انضباطِ نفس ہی انسان کو سود و زیاں سے بلند کر کے ایثار و قربانی کا متلاشی بنا دیتا ہے اور کون نہیں جانتا ایثار و قربانی کی افراط کے بغیر نہ قوم زندہ رہ سکتی ہے اور نہ معاشرے کا وجود ہی باقی رہ سکتا ہے۔ ایثار و قربانی صرف وہی کر سکتے ہیں جن کے کردار پختہ ہوں اور کردار کی یہ پختگی انھیں حق و صداقت پر قائم رہنے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ معاشرے میں کردار کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ قوم کے مفکر اس کی طرف پوری توجہ دیتے رہیں۔ اس کے بغیر قوم نہ روحانی اور نہ ہی مادّی میدان میں نمایاں مقام حاصل کر سکتی ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔

شامِ ہمدرد، راولپنڈی
۴ر اکتوبر ۱۹۶۶ ش

میاں محمد یاسین وٹو

علمائے اخلاقیات نے کردار کی متعدد تعریفیں کی ہیں، لیکن سب سے زیادہ جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ کردار انسانی زندگی کو سنوارتا ہے، معاشرے کی تطہیر کرتا ہے اور ملک وملت کی تشکیل و تعمیر میں معین و مددگار ہوتا ہے۔ یہ ایسی متعدی صفت ہے جو دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو صحیح ہوگا کہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست، مدّاحوں کو نکتہ چینی اور نکتہ چینوں کو مدّاح، ہوا خواہوں کو بدخواہ اور بدخواہوں کو ہوا خواہ بنانے میں جس چیز کو سحرانگیز طور پر دخل حاصل ہے وہ کردار کا خوب اور ناخوب ہونا ہے۔

معاشرہ افراد کے مجموعے سے عبارت ہے۔ اگر لوگ بھلے ہیں تو معاشرہ بھی اچھا ہوگا اور اگر برعکس صورت ہے تو اس کے نتائج وثمرات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ صحت مند یا بیمار معاشرے کا قوم کی زندگی اور موت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی اور تطہیری تحریکیں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی سب سے زیادہ زور کردار کی صحت وسلامتی پر دیتی ہیں کہ اسی طرح وہ بلند اور برتر معاشرہ پیدا ہو سکتا ہے جو انسانیت کی فلاح وصلاح پر آخر کار فتح یاب ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔

اگر کردار کم زور ہے یا سرے سے نابود ہے یا اس کی قرار واقعی عظمت واہمیت نگاہوں سے اوجھل ہے تو نہ معاشرہ سدھر سکتا ہے نہ قوم ترقی کی منزلیں طے کر سکتی ہے۔ وہ کردار ——— اور صرف کردار ——— ہے جو قوموں اور ملتوں کے ادبار وعروج، زوال وارتقا، انحطاط وفروغ اور ہبوط وصعود کا ذمے دار ہے۔ لہٰذا کسی موقع پر بھی اور کسی مرحلے پر بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابھی پچھلے سال ہم ایک عظیم اور ہولناک جنگ سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اس جنگ کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ اس لڑائی میں وہ قوم سُرخ رو ہوئی جو آبادی کے اعتبار سے کم، سامان

جنگ کے لحاظ سے بے مایہ، مالی اعتبار سے تہی دامن اور ذرائع و وسائل کے لحاظ سے ناقابلِ اعتنا تھی ـــــ شکستِ فاش اس قوم کے حصے میں آئی جو مذکورہ اعتبارات سے کہیں زیادہ بلند و برتر تھی!

ایسا کیوں ہوا؟

صرف اس لیے کہ جیتنے والی قوم کا کردار فولاد و آہن کی طرح مضبوط اور بے لچک تھا! اگر اس بلند کردار نے مستقل صورت اختیار کرلی تو بلاشبہ ملّت پاکستان اقبالؒ کے خواب کی تعبیر بن سکتی ہے:

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

"معاشرے میں کردار کی اہمیت" اور اس کی معنویت پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اتنا ہی زیادہ یہ بات واضح ہو گی کہ یہ ایسی بنیادی اور سنگین حقیقت ہے کہ جس پر ملک و ملّت کی تعمیر اور انسانی اقدار کی تشکیل و تطہیر منحصر و مضمر ہے۔

آج "شامِ ہمدرد" کے مہمانِ مقرّر اور حکومت مغربی پاکستان کے وزیر باتدبیر جناب محترم میاں محمد یاسین خان وٹو صاحب نے اظہار خیال کے لیے یہی اہم موضوع چنا ہے۔

میاں صاحب ایک متحرک انسان ہیں۔ اپنے زمانۂ طالب علمی سے بہ ایسے مباحث میں نمایاں حصّہ لیتے رہے ہیں جن کا تعلق تعمیر ملک و ملّت سے رہا ہے۔ قانون اور سیاست ان کے موضوع رہے ہیں اور ان کی انتظامی قابلیت نے وزارت کو ان سے قریب کر دیا۔ اس اتحاد نے ان کے لیے ایک وسیع میدان عمل پیدا کیا جہاں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا فراخ دلی سے مظاہرہ کیا۔

حکیم محمد سعید
۲ر اکتوبر ۱۹۶۶ ش

انسانی معاشرے میں کردار کی اہمیّت

جناب میاں محمد یٰسین وٹو
وزیر بلدیات مغربی پاکستان

جہاں تک انسانی معاشرے میں کردار کی اہمیت کا سوال ہے اس ضمن میں ہم لاشعوری طور پر اس حد تک حسّاس واقع ہوئے ہیں کہ معمولی سے غور و فکر کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ کردار کے بغیر انسانی معاشرے کا وجود ہی ممکن نہیں۔ حالاں کہ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ انسانی معاشرہ اور کردار دو جداگانہ حقیقتیں ہیں۔ انسانی معاشرے کی بنیاد جبر پر ہے اور کردار کی اختیار پر —— مل جل کر زندگی بسر کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود ہم اپنی اسی فطرت کو بدل نہیں سکتے۔ چناں چہ معاشرہ انسان کی مجبوری ہے۔ اس کے برعکس کردار انسان کے مجبورِ محض ہونے کو ظاہر نہیں کرتا، اس میں اس کے اختیار کو بڑا عمل دخل ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ معاشرے اور کردار کا یہ بنیادی تضاد ان دونوں میں نفاق یا بُعد کا باعث بنتا ہے۔ معاشرہ اور کردار آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک جسم ہے تو دوسرا روح۔ جس طرح روح کے بغیر جسم بے جان ہو جاتا ہے اسی طرح کردار کے بغیر معاشرہ اپنی حقیقت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔

حکمانے کردار کی تعریف کچھ اس طرح کے الفاظ میں کی ہے۔ کردار نام ہے جذبے، ارادے اور عقل کی ان امتیازی صفات کے مجموعے کا جس سے ایک انفرادی ذہن تشکیل پاتا ہے۔ یہ تعریف کس حد تک مکمل ہے۔ ہم فی الحال اس بحث میں جانا نہیں چاہتے۔ البتہ ہمیں اس تعریف کے پیشِ نظر اتنا ضرور پتا چل جاتا ہے کہ کردار اور ذہن دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی حقیقت

کے دو نام ہیں۔ کسی فرد کا کردار بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اس کا ذہن۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ ذہن کردار کی پوشیدہ صورت ہے اور کردار ذہن کی آشکارہ شکل۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے ذہن اور کردار میں ہمیشہ تھوڑا یا بہت اختلاف ضرور قائم رہتا ہے۔ ہم جو سوچتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ دراصل جو لوگ ذہن اور کردار کو اس طرح دو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں وہ اس نفسیاتی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ فکر محض کو ذہن نہیں کہتے۔ جب تک فکر و عمل ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں ذہن سے اُن کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ فکر و عمل میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے تو ذہن وجود میں آتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہم ذہن سے علاحدہ ہو کر سوچتے ہیں۔ بلکہ اگر سچ پوچھئے تو ذہن سے علاحدہ ہو کر سوچنا آسان ہے ذہن سے الگ ہو کر عمل کرنا آسان نہیں اور عام حالات میں تو اسے قریب قریب ناممکن سمجھئے۔ ہم ذہن سے علاحدہ ہو کر بہت کچھ سوچ سکتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں۔ ہماری سوچ کا بیشتر حصہ ہمارے ذہن کا جزو کیوں نہیں بنتا؟ دراصل یہ ہے وہ سوال جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ درست ہے کہ عقل کے علاوہ جذبہ و ارادہ بھی تشکیل ذہن میں بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں لیکن عقل چوں کہ جذبہ و ارادہ کے رُخ متعین کرنے میں پیش پیش رہتی ہے اس لیے ذہنی ساخت و پرداخت میں اس کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ دوسری فطری مجبوریوں کی طرح سوچ بچار بھی ہماری ایک مجبوری ہے۔ سوچنا ہماری جبلت میں داخل ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی لمحہ سوچ کے بغیر نہیں گزرتا، لیکن جب تک سوچ ہمارے ذہن کا جزو نہیں بنتی اس سے ہمیں کسی قسم کا فیض نہیں پہنچتا۔ فکر ایک جبلت ہے لیکن اگر یہ جبلت صلاحیت بن جائے تو عقل کہلاتی ہے اور پھر ذہن اس سے خاطر خواہ متاثر ہوتا ہے۔ جبلتِ فکر کا صلاحیت میں تبدیل ہونا ہی دراصل سوچ کے جزوِ ذہن بننے کی ابتدا ہے۔ واضح رہے کہ ہم اور ہمارا ذہن دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ ہم اپنے ذہن کے خالق ہیں۔ ہر شخص کے ذہن کی تخلیق اس کا ''میں'' کرتا ہے۔ ذہن کی تخلیق ذات کی جملہ قوتوں کو ایک نظم و ترتیب میں لے آنے سے عمل میں آتی ہے۔ میرا ''میں'' میری ذات کی قوتوں کو کسی طرح ترتیب دیتا ہے، اس سے میرے ذہن کی نوعیت متعین ہوتی ہے۔

ہماری سوچ میں فی نفسہٖ کوئی صداقت ہو یا نہ ہو ہم جب بھی کسی سوچ کو اپنے ذہن کا جزو بناتے ہیں تو اسے بطور صداقت ہی قبول کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک بات کو ہم جھوٹی بھی سمجھ رہے ہوں اور وہ ہمارے ذہن کا جزو بھی بن جائے۔ ہم سمجھنے میں غلطی کر سکتے ہیں اور عموماً کر جایا کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں بہت سی جھوٹی باتیں بھی سچی بن کر ہمارے ذہن

کا جزو بن جاتی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہماری کوئی سوچ اس وقت تک ہمارے ذہن کا جزو نہیں بنتی جب تک ہمیں اس کی سچائی کا یقین نہیں ہو جاتا۔ انسان اپنی سوچ کو جن معیاروں کے ذریعے صحیح معنوں میں صداقت کا درجہ بخشتا ہے وہ اس کا بالواسطہ یا براہ راست تجربہ، علم اور عقیدہ ہیں، لیکن ان تین حقیقی معیاروں کے علاوہ ایک اور معیار بھی ہے۔ یہ معیار غیر حقیقی ہونے کے باوجود عام حالات میں بڑا موثر ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ عموماً یہ معیار دوسرے بڑے حقیقی معیاروں کے زور اور توانائی کو چشم زدن میں غیر موثر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ ہم اس معیار کو سہل انگاری یا تن آسانی کا نام دے سکتے ہیں۔ انسان نے اکثر سہل انگاری کے سامنے اپنے تجربے، علم اور عقیدے کے چراغوں کو گل ہوتے دیکھا ہے۔ میرے خیال میں وہ تمام فلسفے جو انسان کو مجبور محض ثابت کرتے ہیں اور جبلتوں سے جوں کا توں چپکے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سہل انگاری کی پیداوار ہیں۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تجربہ، علم اور عقیدہ تو ہوئے صداقتِ فکر کو پرکھنے کے حقیقی معیار ــــ یہ سہل انگاری کا معیار کیا بلا ہے جو غیر حقیقی ہونے کے باوجود حقیقی معیاروں کو غیر موثر بنا دیتا ہے اور فکرِ صحیح کو ہمارے ذہن کا جزو نہیں ہونے دیتا؟ عقیدے کی طرح علم و تجربہ کے معیار بھی ہماری ذمے داریوں میں شامل ہیں ــــ ان معیاروں کے ذریعے ہم اپنی جس سوچ کو بھی جزوِ ذہن بنانا چاہیں گے اس کے لیے کسی نہ کسی نوع کی ذمے داری کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ ذمے داری کا بوجھ اٹھانا یوں تو انسان کے مختار ہونے کی دلیل ہے لیکن انسان مختار ہونے سے خوف کھاتا ہے۔ خوفِ مختاری کی وجہ خواہ کچھ ہو، سہل انگاری اُس کا سب سے بڑا آلۂ کار ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا ہے عقیدے کی ذمے داری ہو یا علم و تجربہ کی ذمے داری ان سب کا مقصد انسان کو صاحبِ اختیار بنانا ہے۔ اور سہل انگاری کا کام اس اختیار کو وہم اور لغو قرار دینا ہے۔ سہل انگاری کے پاس جواز کے بے شمار نسخے ہوتے ہیں جن کو بروئے کار لا کر وہ ہر طرح کی سچائی کا مذاق اڑاتی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں شوخی اور ظرافت بھی سہل انگاری کا ایک حربہ بن جاتی ہے۔ مجھے اس وقت غالب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہاں غالب کا علم اور عقیدہ دونوں ہی اس کے ذہن کی حدوں سے باہر عالمِ غربت میں کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ علم جب تک یقین کی صورت اختیار نہیں کر لیتا وہ ذہن کا جزو نہیں بن پاتا۔ اگر غالب جاننے کے ساتھ طاعت اور زہد کے ثواب کو مان بھی لیتے تو ان کی طبیعت ضرور اس

طرف مائل ہو جاتی۔ میرا مقصد شعر کے حسن اور شاعر کے اندازِ بیان کی خوبی سے انکار کرنا نہیں ہے، میں تو صرف شعر کے نفسیاتی پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اسی شعر کے ساتھ مجھے غالب کا ایک اور مشہور شعر یاد آرہا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

انسان کی زندگی کا المیہ اس کا مجبور ہونا نہیں ہے بلکہ مختار ہونا ہے۔ اگر اس کی خلقت میں اختیار کا عنصر بطورِ خاص شامل نہ کیا جاتا تو اس کی زندگی بڑے آرام سے گزرتی۔ مشکل یہ ہے کہ جو چیز اسے بطورِ خاص ودیعت ہوئی ہے اسی سے وہ جی چراتا ہے۔ غالب کے اس شعر میں ایمان کا روکنا اور کفر کا اسے کھینچنا ایسی کیفیتیں ہیں جو بڑے واضح اور دل کش انداز میں انسان کے اس گریز اور نفسیاتی کشمکش کا اظہار کر رہی ہیں۔ اسی طرح یہ مصرعہ "کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے" انسانی نفسیات کی طرف بڑے بلیغ اشاروں کا حامل ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس شعر میں کعبہ اختیار کا سمبل (Symbol) ہے اور کلیسا جبر کا۔ نفسیاتی احوال کے پیشِ نظر یہاں ایمان اور کفر بھی اختیار اور جبر کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انسان اپنی جبلی مجبوریوں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتا ہے اور انھیں میں کشش محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس اختیار کی ذمے داریوں کو پس پشت ڈالتا ہے اور ان سے جان بچانا چاہتا ہے، لیکن چوں کہ اختیار بھی اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اس لیے وہ اس سے دامن بھی نہیں چھڑا سکتا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ انسان خیر و شر یا نیک و بد کی کشمکش میں اتنا مبتلا نہیں ہے جتنا کہ نفسیاتی طور پر اختیار اور جبر کی کشمکش اسے بے حال کیے ہوئے ہے۔ بہ غور دیکھا جائے تو اس کی ساری بے چینیوں کا سبب اسی کشمکش میں پوشیدہ ہے۔ غالب ہی کی زبان میں ہم اس کشمکش کو آدمی اور انسان کی کشمکش کہہ سکتے ہیں۔ کردار اس کشمکش کو حل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ آدمی سے انسان تک پہنچنے کا سفر جبر سے اختیار کی طرف آنے کا سفر ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کا انسان بننا جبر کو اختیار میں ڈھال دینے کے مترادف ہے۔

دراصل انسانی معاشرے کا وجود ہی اس لیے عمل میں آیا کہ انسان تنہا جبر و اختیار کی اس کشمکش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجبوریوں کو مختاریوں میں بدل دینا ممکن تو ہے لیکن یہ اکیلے انسان کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے ایک دوسرے کا سہارا لازمی ہے۔ گویا انسانی معاشرے کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ جب اس کے افراد میں اپنی فطری مجبوریوں پر قابو پانے کی سکت پیدا ہو جائے۔ صاحبِ اختیار ہونے کے لیے صاحبِ کردار ہونا ضروری ہے۔ اور

صاحبِ کردار ہونے کے لیے ایک حق آگاہ ذہن کی ضرورت ہے۔ ذہن کو حق آگاہی اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے کہ جب وہ اپنی سوچ کو سہل انگاری کے قریب نہ آنے دے۔ سہل انگاری حق کو ناحق اور ناحق کو حق بنا کر دکھایا کرتی ہے۔ ذہن کی ساخت و پرداخت میں جس ہوش مندی کی ضرورت ہے وہ یہ ہی ہے کہ اس پر سہل انگاری کا سایہ تک نہ پڑے۔ سہل انگاری ذہن میں ذرا بھی مسلط ہو جائے تو کوئی بڑی سے بڑی سوچ اس کے نزدیک نہیں آسکتی۔ یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ خود اس سوچ میں اتنا زور کیوں نہیں ہے کہ وہ سہل انگاری کے طلسم کو توڑ کر ذہن کا حصہ بن جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کسی سوچ کی صداقت، عظمت اور ندرت اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک وہ ذہن کا حصہ نہیں بن جاتی۔ اور سوچ میں توانائی تو خاص طور پر اسی وقت آتی ہے کہ جب وہ ذہن کا جزو بنتی ہے۔ چناں چہ معاشرے کے استحکام کا تمام تر انحصار افراد کے ایسے ذہن اور کردار پر ہے جسے سہل انگاری کی ہوا تک نہ لگی ہو۔ اور ابتدا سے جفاکشی جس کا شعار رہا ہو۔

ویسے مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو انسان نے ابھی تک مل جل کر زندگی بسر کرنا زیادہ طور پر جبر کے تحت ہی قبول کیا ہے۔ عموماً ہم ایک دوسرے سے مجبور ہو کر ملتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرتی اعتبار سے انسان ابھی ارتقا کے نہایت ابتدائی مراحل میں ہے۔ اور جسے ہم انسانی معاشرہ کہتے ہیں اس نے تا حال اپنے مفہوم کو پوری طرح نہیں پایا۔ معاشرے کو جو چیز بامعنی بناتی ہے وہ مضبوط ذہن اور کردار ہے۔ مضبوط ذہن اور کردار انسان کو بااختیار ہو کر زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور یہ ہی وہ واحد عمل ہے کہ جس کے ذریعے ہم پر زندگی کے جمال و جلال کی صداقتیں آشکارہ ہوتی ہیں۔

شامِ ہمدرد، لاہور
۶ر اکتوبر ۱۹۶۶ ش

لفٹیننٹ کرنل سیّد محمد حسنین بخاری

آج کی "شامِ ہمدرد" کے مہمان مقرر دنیائے طب کی ایک اہم شخصیت لیفٹیننٹ کرنل سیّد محمد حسنین بخاری صاحب ہیں۔ آپ میں سے بہت سے ان کو ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ وہ راولپنڈی میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں۔ اور "نیشنل ہیلتھ لیبورٹریز" جیسے عظیم اور وسیع پروجیکٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ان کی اہم خدمات اب پردۂ خفا میں نہیں ہیں۔

کرنل بخاری صاحب افواجِ پاکستان سے زیادہ وابستہ رہے ہیں اور اس وابستگی کے دَور میں کئی فوجی طبّی اداروں میں پیتھالوجی میں ماہرانہ خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اس کے بعد پاکستان کی طرف سے مختلف ممالک میں طبّی اور صحّی مذاکرات میں حصّہ لے چکے ہیں۔ ہیلتھ لیبورٹریز کی پلاننگ کے لیے عالمی ادارۂ صحت کی فیلوشپ پر وہ دو بار تربیت حاصل کر چکے ہیں۔

کرنل بخاری صاحب کو تحقیق اور ریسرچ سے بڑی دل چسپی ہے۔ اس میدان میں یہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، اور اس موضوع پر انھوں نے بہت سے مقالات اور ریسرچ پیپرز لکھے ہیں جو غیر ملکی فنّی جرائد میں طبع ہو کر درجہ سند و استناد حاصل کر چکے ہیں۔

کرنل صاحب کو اپنی فطری صلاحیتِ تفکّر کی بنا پر کام و خدمت کے لیے نئے میدان پیدا کرنے کا شوق ہے۔ چناں چہ وہ آرمڈ فورسس انسٹی ٹیوٹ آف پیتھالوجی راولپنڈی کی تکمیل پلاننگ کر کے اس انسٹی ٹیوٹ کو جاری و ساری کر چکے ہیں، اور اب ان ہی صلاحیتوں کی بنا پر پاکستان کے ایک عظیم منصوبے "نیشنل ہیلتھ لیبورٹریز" اسلام آباد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔

ان کی یہ کثیر المشاغل زندگی شامِ ہمدرد سے خطاب میں مانع آسکتی تھی مگر میں اس کا گواہ ہوں کہ ہمارے مہمان مقرر بلا کے ذہین اور حد درجہ فعال (ایکٹو) انسان ہیں۔ اسی لیے وہ آج

وقت نکال سکے اور ہمارے درمیان موجود ہیں۔

طب میں مشاہدات کو زبردست اہمیت حاصل ہے خواہ ان مشاہدات کا تعلق معالجات سے ہو یا تشخیص امراض سے یا ادویہ کی ایجادات سے۔ مشاہدات کے بغیر طب کے کسی بھی شعبے میں کامیابی اور صحت کا دعوا نہیں کیا جا سکتا۔ طب مشرقی کی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی یہ بات بالکل صاف اور عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ فنِ طب کے ان قدیم ماہرین کے نزدیک جو آج بھی مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں، فنِ طب مشاہدات کے بغیر ایک لایعنی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔

آج کے دور میں یقیناً ایسے ذرائع میسر آگئے ہیں کہ جنھوں نے انسانی ذہن و فکر کی جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس کے باوجود آج بھی حکیم جالینوس کے اس قول کی نفی نہیں کی جا سکتی کہ مریض کا بہ غور مشاہدہ ہی طبیب کا معاون بن سکتا ہے۔ حکیم ابن سینا، حکیم رازی اور حکیم ابن نفیس جیسے اکابرِ فنِ طب نے مشاہدات کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔

شیخ الرئیس حکیم ابن سینا طبی مسائل و مباحث کے ذیل میں ایک معالج کو مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک فلسفہ، طبیعات اور کیمیا کا تعلق ہے معالج ان کو جوں کا توں قبول کر سکتا ہے لیکن بعض مسائلِ طب ایسے ہیں کہ ان کی صحت و عدمِ صحت پر معالج کو خود کلیتہً مطمئن ہونا چاہیے۔ مثلاً اعضا اور ان کے افعال کو سمجھنے کے لیے مشاہدہ اور فنِ تشریح (اناٹومی) کی مدد لینی چاہیے۔

وَاَمَّا الْاَعْضَاءُ مَنَافِعُهَا فَيَجِبُ اَنْ يُّصَادِفَهَا بِالْحِسِّ وَالتَّشْرِيْحِ ـ

ایک جگہ ابن سینا نے لکھا ہے:

اَلْاَمْرَاضُ وَاَسْبَابُهَا وَعَلَامَاتُهَا وَاَنَّهٗ كَيْفَ يُزَالُ الْمَرَضُ وَيُحْفَظُ الصِّحَّةُ فَاِنَّهٗ يَلْزَمُهٗ اَنْ يُّعْطِي الْبُرْهَانَ عَلٰى مَاكَانَ مِنْ هٰذَا خَفِيُّ الْوُجُوْدِ بِتَفْصِيْلِهٖ وَتَقْدِيْرِهٖ وَتَوْقِيْتِهٖ ـ

یعنی امراض ان کے اسباب و علامات نیز ازالۂ مرض کی تدابیر اور اسی طرح حفظِ صحت کی تدابیر کے سلسلے میں معالج پر لازم ہے کہ وہ ان سب کو اپنے مشاہدے اور علم سے مدلل طور پر سمجھے۔

میری رائے میں آج طب میں جو انکشافات اور اکتشافات ہوئے ہیں ان کی اہمیت کو محسوس کرنا چاہیے اور ان سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے، لیکن اس کا خیال رکھنا چاہیے

کہ قوتِ مشاہدہ کو زنگ نہ لگ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ آلات و ذرائع کی وجہ سے انسان کی قوت مشاہدہ اور حواس خمسہ کی جودت ضعیف ہو کر رہ جائے۔ آلات کو حواس خمسہ کا نعم البدل سمجھ لینا صحیح نہیں ہو سکتا۔

میں اب آپ کے اور مہمان مقرر کے درمیان زیادہ حائل رہنا نہیں چاہتا طبی مشاہدہ کی قوت اور اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم نے ایک واقعہ لکھا ہے وہ آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نے جب انگلستان کا دورہ کیا تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم جارج پنجم کے خصوصی سرجن سے ملنے گئے۔ اس وقت وہ ایک اپریشن کرنے والے تھے۔ سرجن نے ہم کو اپریشن تھیٹر میں بلالیا۔ وہ مریض کے شکم پر شگاف دینے کے لیے نشان لگا چکے تھے۔ سرجن نے حکیم صاحب کو مریض کے حالات بتائے۔ حکیم صاحب نے مریض کا معائنہ کیا۔ اور اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ ورم اندرونی ابھی اس قابل نہیں ہے کہ اپریشن کیا جائے، اور یہ کہ اپریشن کے لیے نشان صحیح جگہ نہیں ہے۔ سرجن نے مسیح الملک کے بیان پر اعتبار نہیں کیا لیکن شگاف کے بعد اس پر غلطی واضح ہو گئی۔"

اس واقعہ کے بیان کرنے سے منشا یہی ہے کہ ایکس ریز و امتحانات کیمیائی اپنی جگہ اہم ہیں مگر مشاہدہ ان پر بھاری ہے۔ ان دنوں بھی کراچی کے ایک ہسپتال میں ایک مریض ایک بڑے نیورو سرجن کے زیرِ علاج ہے۔ اس مریض کے بارے میں ایک حقیر طبیب نے یہ رائے دی تھی کہ اس کے سر میں رسولی نہیں ہے بلکہ پھوڑا ہے جو اب اس قدر تیار ہے کہ اس کی پیپ کان کی راہ نکلنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے اپریشن میں اب تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس رائے پر معالجین کا ایک "سپوزیم" ہوا اور فیصلہ ہوا کہ دیکھا جائے کہ پیپ کان کی راہ نکلتی ہے یا نہیں۔ دوسرے دن طبیب کی رائے صحیح ثابت ہوئی۔

ہمارے آج کے مہمان مقرر نے درحقیقت اظہارِ خیال کے لیے ایک نہایت اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ میں ان کو مبارک باد دیتا ہوں اور اب ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیالات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

حکیم محمد سعید

طب میں مشاہدات کی اہمیّت

جناب لیفٹیننٹ کرنل سیّد محمد حسنین بخاری
ڈائرکٹر نیشنل ہیلتھ لیبورٹریز اسلام آباد۔

علمِ طب کا اِرتقا

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زمین کئی ارب سال پہلے سورج سے پیدا ہوئی۔ اس پر کتنے ہی مختلف دَور آئے۔ ابتدائے حیات کے بارے میں ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ ہمیں چار پانچ ہزار سال پہلے سے اب تک کی تاریخ کا علم ہے اور وہ بھی بسا اوقات نامکمل و مبہم۔

ابنِ آدم کو وجود میں آتے ہی سب سے پہلے جسم و جان کی حفاظت کا احساس ہوا، اور جب وہ معصومانہ زندگی ختم کر کے عالمِ ہوش میں پہنچا تو اسے تزکیہ نفس و روح یعنی علم الادیان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس اعتبار سے علم الصحت سب سے پرانا علم ہے۔ انسانیت کی تاریخ کے ساتھ آباء اوّلین نے تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر عقل و فہم کو کام میں لاکر آہستہ آہستہ چند تکالیف جسمانی کا درماں ڈھونڈ لیا۔ جب زمانے کی ضرورت بڑھتی گئی اور انسانی عقل و فکر میں مزید ترقی ہوتی گئی تو نت نئے مشاہدوں کی بنا پر نئی راہیں تلاش کی جانے لگیں اور یوں مسائل زندگی حل ہوتے رہے۔

مادی قوتوں پر تصرف حاصل کرنے کے لیے انسان نے اپنے ماحول کو غور و فکر سے پرکھا۔ عملی تجربات کیے۔ قدرتی تجربات سے استفادہ کیا۔ کلیات و نظریات کی بنیاد قائم ہوئی،

اور ان سب کے امتزاج سے علم انسانی ایک منظم و مربوط صورت اختیار کرتا گیا۔ اگرچہ ابھی تک ناقص ہے اور ہمیشہ نامکمل رہے گا، کیوں کہ اس میں اضافہ اور ترمیم کی ضرورت ہے اور رہے گی۔

ابتدائی تاریخ طب

طبی مشاہدات کا آغاز شعورِ انسانی کے آغاز وارتقا کی کہانی ہے۔ زخم خوردہ انسان نے خون کو روکنے اور درد کو دور کرنے کے لیے اضطرار کے عالم میں زخم کو دبایا ہوگا، اور گردوپیش سے کوئی چیز اُٹھا کر باندھی ہوگی۔ پھر اُس نے کچھ دیر بعد مٹی اور جڑی بوٹیوں کا پلستر کرنا بھی سیکھ لیا۔ ان مشاہدوں سے حاصل کیے ہوئے مفید اثرات کا دوسروں پر بھی تجربہ کیا جانے لگا۔

دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے کو تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ اب سے تقریباً ۵۰۰۰ سال پہلے کے کچھ مشاہدات مٹی کی تختیوں پر کندہ ملے ہیں۔ یہ بھی عیاں ہے کہ اس تہذیب کا اثر قافلوں کے راستے ہندستان، عرب اور مصر وغیرہ تک پہنچا۔

علم الطب والادویہ کو علم الارواح کا جزو لازم سمجھا جاتا تھا۔ بابل کی تہذیب سے اخذ کردہ کئی دوائیں مثلاً ملہٹی، شہد اور شیر پوست (Poppy Juice) وغیرہ اب بھی مستعمل ہیں۔

اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے کی تاریخ طب چین سے پتا چلتا ہے کہ شن ننگ (SHEN NUNG) نے بہت سی جڑی بوٹیوں کا تجربہ اپنے اوپر کیا۔ ان میں ایک بوٹی ماہوارگ یعنی افیڈرا Ephedra کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ بوٹی پاکستان میں بہ کثرت ملتی ہے۔ اس کا جوہر افیڈرین کے نام سے موسوم ہے۔ کوئٹہ میں اعلا پیمانے پر تیار کیا جاتا ہے۔

شن ننگ نے بہت سی دواؤں کا اضافہ کیا اور قرابادین کی بنیاد ڈالی۔

اس کے بعد مصری طبی معلومات کا ماخذ اب سے تقریباً ۳۵۰۰ سال پرانا ہے۔ یعنی ۱۵سو سال ق م۔ اگرچہ مصری تہذیب تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہے، مگر طبی مشاہدات کا علم پاپائرس عبرس Papyrus Ebers کے ذریعے ہم تک پہنچا۔ جو پندرہ سو سال قبل از مسیح کی تحریر ہے۔ اسے GEORGE EBERY نے ۱۸۷۵ء میں دریافت کیا۔ اس میں ۸۱۱ نسخہ جات اور سات سو دواؤں کا ذکر ہے۔

اب ہم یونانی دور میں داخل ہوتے ہیں۔ حکیم بقراط حضرت عیسیٰؑ سے پانچ سو برس پہلے پیدا ہوا۔ وہ یونانیوں میں پہلا شخص تھا جس نے اس فن کی تدوین کی۔ اپنے مشاہدات کو متعدد کتابوں میں قلم بند کیا۔ اور اپنی خاندانی روایات کے برخلاف اس فن کو عام کر دیا۔ وہ یونانی طب کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ جس نے اسرار علم و حکمت کو علم سینہ سے

علمِ سفینہ میں تبدیل کر دیا۔

یونانی دور میں بہت سے حکما نے خدمتِ فن کی THEOPHRASTUS (۳۰۰ سال ق م) نے بہت سی دوائیں، جو اب بھی مستعمل ہیں، بیان کیں اور علم الادویہ وافعال الادویہ پر سیر حاصل تبصرے لکھے۔

شاہ میتھریڈیٹوس MITHRIDATES نے ایک سو سال ق م میں طب اور علم الادویہ کے نمایاں مشاہدات کیے۔ اس زمانے میں دربار کی ریشہ دوانیوں میں قتل کا طریقہ زہر کے ذریعے عام تھا۔ اس بادشاہ نے سمیات پر مفید اور غیر معمولی مشاہدات مرتب کیے، اور ان کے تریاق بھی معلوم کیے۔

دوسری صدی عیسوی میں علم الادویہ میں نمایاں ترقی ہوئی۔ حکیم جالینوس نے دوا سازی میں بے مثل تجربات کیے۔ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا طبیب، دوا ساز اور سائنسی انداز میں تجربہ کن ثابت ہوا، اور تقریباً ۱۵ سو سال تک جالینوس کی طبی خدمات سے دنیا استفادہ پذیر ہوئی۔

طبِ اسلامی

اب ہم اختصار کے ساتھ اُس دور پر نظر ڈالتے ہیں جس کا آغاز صحرائے عرب میں خاتم المرسلین کے پیامِ عالی مقام سے ہوا۔ آپ نے امتِ اسلامیہ اور انسانیت کو ایسی فرامین دی کہ جس سے دنیا میں بے شمار علوم پھوٹ پڑے۔ کتاب اللہ اور فرمان رسول ؐ کی روشنی میں فکر و شعور کے دروازے کھل گئے۔ مدینۃ العلم کی زبانِ فیض رساں نے یہ کلیہ بیان فرمایا۔ لکل داءٍ دواءٌ ـــــ (ہر مرض کے لیے چارہ دوا ہے) اور اس طرح تجسس کی تلقین و ہدایت کی۔ اس ارشاد کی تشریح باب مدینۃ العلم، حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے ان اشعار میں کی۔

دواءک فیہ وما تشعر	وداءک منہ وما تبصر
وتحسب انک جرم صغیر	وفیک انطوی العالم الاکبر
وانت الکتاب المبین الذی	باحرفہ یظہر المضمر

(ترجمہ) (اے انسان) تیری دوا تیرے اندر ہے مگر تو شعور سے کام نہیں لیتا۔ تیرے مرض بھی تجھ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مگر تو نہیں دیکھتا تجھے گمان ہے کہ تو چھوٹا سا جان دار ہے مگر تیرے اندر ایک بڑی کائنات بسی ہوئی

ہے۔ تو کتاب مبین ہے۔ جس کی عبارت سے پوشیدہ چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دورِ اقتدار میں وہ تمام علوم اپنی زبان میں منتقل کر لیے جن کو عقل انسانی منتخب کر سکتی تھی۔ اس طرح وہ کلدانیوں، مصریوں، پارسیوں، یونانیوں اور ہندوؤں کے علوم کے وارث ہو گئے۔

ہمیں آج صرف علم الصحت پر سرسری تبصرہ کرنا ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف ترجمہ و شرح، نقد و جرح پر اکتفا کی بلکہ بے شمار مشاہدات و تجربات کیے، اور علم طب میں مزید اضافے کیے۔ چناں چہ انھوں نے علم حفظ صحت مرتب کیا۔ فن جراحت کو ترقی دی۔ مرکبات میں شہد و شکر کو استعمال کیا۔ مشاہدات کو مرتب کیا مثلاً یوحنا بن سرافیون نے جذام پر اور زکریا رازی نے چیچک و خسرہ پر پہلی بار کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں عربوں نے علم الادویہ کے سلسلے میں شان دار خدمات انجام دیں۔ بے شمار نئی دوائیں دریافت کیں جن سے اطبائے یونانی ناواقف تھے۔ علم الادویہ کی بہت سی کتابیں سنسکرت وغیرہ زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرائیں۔

طب میں علم کیمیا کی تو بنیا دہی عربوں نے رکھی۔ بے شمار کیمیائی مرکبات مثلاً نائیٹرک ایسڈ، سلفورک ایسڈ، نائیٹرو ہائیڈرو کلورک ایسڈ، امونیا، مرکری کلورائیڈ وغیرہ بنائے۔ کئی قسم کے کھار حاصل کیے اور الکحل کشید کی۔ جس فراخ دلی اور جاں فشانی سے مسلمانوں نے دنیا بھر کے مشاہداتِ طبی کو مجتمع کیا اس کی مثال تاریخ طب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تمام دنیا کی مفید معلومات جمع کر کے ان میں اضافہ کیا، اور اپنے عہد کی ایک جامع طب بنائی۔

طب عرب یا مسلمانوں کے دور کا علم الصحت اس وجہ سے ممتاز نہیں کہ یہ مسلمانوں کی ایجاد ہے، بلکہ اس کے امتیاز کی وجہ یہ ہے۔ کہ زوال یونان، اور عروج مغرب کے درمیان حائل ہونے والے تاریک دور میں مسلمانوں نے نہ صرف علم و حکمت کی روایات کو روشن رکھا بلکہ علم انسانی کی مزید آبیاری کی، یہاں تک کہ اہلِ مغرب نے فلسفہ اور سائنس کی اس گراں قدر پونجی سے کماحقہ، فائدہ اٹھایا۔

اسلامی دور کی خدماتِ فن کا بیان ایک طویل کہانی ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جب مغرب تاریکی کے بحر ذخار میں غرق تھا۔ مسلمانوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملّت، اور بلا لحاظِ رنگ و نسل، فنِ طب کی ترویج کے لیے ہندو، عیسائی، یہودی وغیرہ حضرات کو

شامل کیا۔ یہ مسلمانوں کی علم پرستی، بے تعصبی اور فراخ دلی کی بیّن مثال ہے۔ علوم طب وفلسفہ وغیرہ کے سلسلے میں پہلے ادوار کے علوم ومشاہدات کی نقول وتراجم اور شرح وغیرہ کے لیے غیر زبانوں کا علم ضروری تھا۔ لہٰذا انھوں نے یونان، فارس اور ہند وغیرہ کی فنّی کتابیں جمع کیں۔ نہ صرف علوم ماضی پر کما حقہ دسترس حاصل کی بلکہ بے شمار اضافے کیے۔

مسلمان اطبا کی کتب میں ہمیں جا بجا وہ اقوال ملتے ہیں جن سے واضح لفظوں میں یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے علم تشریح الاجسام میں تحقیق واکتشاف کے سلسلے میں مشاہدے سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور قیاس آرائیوں اور خیال پیمائیوں کی سختی سے مخالفت کی۔

شیخ الرئیس بو علی الحسین ابن سینا اپنی کتاب القانون فی الطبّ میں فرماتے ہیں:
"طبیب کے لیے واجب ہے کہ اعضاء اور ان کے منافع کو حِس وتشریح سے معلوم کرے۔"
چناں چہ اس ضمن میں بے شمار اضافے ہوئے۔

مسلمانوں نے اپنے دور میں فنّی مشاہدات کو قلم بند کر کے انسانیت کی بڑی خدمت کی اور طبّی نظریات کو عملی جامہ پہنایا، مثلاً:

شفاخانوں کا قیام، اطبا کا امتحان، ممالک اسلامی میں کتب خانوں کا قیام، اطبا کے لیے اخلاقی اقدار کا تعیّن، علم کیمیا کا سائنسی آغاز۔ وغیرہ

اس دور کی عظیم القدر شخصیتوں، بو علی سینا، محمد بن زکریا رازی، جابر بن حیّان، ابوالقاسم زہراوی، ابن رشد وغیرہم، کی تصنیفات ساری دنیا کے لیے صدیوں تک علم طب کا واحد ذریعۂ اکتساب بنی رہیں۔ مگر افسوس کہ ہمارا سرمایہ دوسروں کے کام آیا یا تباہی کی نذر ہوا۔ مسلمانوں کے دور کے مشاہدات اکثر بالواسطہ ہم تک پہنچ رہے ہیں۔ لاکھوں کتابیں تلف اور برباد ہوئیں اور اب یہ کیفیت ہے کہ ایسے بیش رو بزرگوں کی کتب حاصل کرنے کے لیے بھی ہمیں مغربی ممالک کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اسی صورتِ حال کو یوں نظم فرمایا ہے۔

ع

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیّارہ

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

احیائے علوم اور یورپ میں چند بنیادی تحقیقات

یورپ میں احیائے علوم مسلمانوں کے علمی ورثے کا مظہر ہے جس کے ذریعے مغرب میں علوم کے دروازے کھل گئے۔ یہاں ہم صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

جراثیم کی دریافت۔ یہ نظریہ کہ بعض مرض ننھے ذرّات سے پھیلتے ہیں عرصہ دراز سے قائم تھا۔ مگر مشاہدے سے یہ بات پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچی تھی۔ مسلمانوں نے محدّب اور مجوّف شیشے بنا کر خردبین اور دُوربین کے لیے ابتدائی جدوجہد کی۔

ہالینڈ کے ایک شخص اینتھونی خان لیوان ہُک (ANTHONY VAN LEEWENHOOK) کو محدّب شیشے بنانے کا شوق تھا۔ اُس نے کوئی طبّی یا سائنسی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ ایک بزاز کی دکان پر کام کرتا تھا۔ مگر اکتا کر اپنے وطن ڈیلفٹ (DELFT) جاکر ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ تاکہ اپنے شوق کو پورا کر سکے۔

اُس نے ایک خردبین بنا کر انواع و اقسام کی چیزوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر اُس نے ۱۶۷۶ ش میں قطرۂ آب میں حرکت کرتے ہوئے ننھے جان دار دیکھے جسے اُس نے Animalcule کا نام دیا۔ بعد میں ۱۶۸۳ ش میں اُس نے چھوٹے جراثیم بھی مشاہدہ کیے۔ اُس کے قلم بند مشاہدات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اُس زمانے میں خردبینی اشیا کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ اُس نے پانی کے قطرہ میں ایسے چھوٹے جان دار دیکھے جو اُس کے صحیح اندازے کے مطابق جوں کی آنکھ کے ایک ہزارواں حِصّے کے برابر تھے۔ ان تجربات کی بنا پر اُس نے سینکڑوں مقالے لکھ کر رائل سوسائٹی اور فرانسیسی اکادمی کو بھیجے۔ مگر یہ تحقیقات درخورِ اعتنا نہ سمجھی گئیں، بلکہ ان کا مذاق اڑایا گیا۔ مقامِ شکر ہے۔ کہ اس کی زندگی میں اُس کی خردبین اتنی شہرت پکڑ گئی۔ کہ زار روس اور ملکہ برطانیہ نے لیوان ہُک کے گاؤں میں جاکر بہ نفسِ نفیس اس خردبینی دُنیا کا مشاہدہ کیا۔ یہ بنیادی مشاہدہ دنیائے علم اور بالخصوص علم الصحت میں ایک انقلاب لے آیا اور بے شمار تحقیقات کا پیش رو بنا۔

اب ہم اینٹی بایوٹکس (Antibiotics) کا ذکر کرتے ہیں:

یہ دوائیں مٹی میں ابتدائے آفرینشِ انسان سے ہی موجود ہوں گی، اور ممکن ہے

کہ بعض مرتبہ زخموں پر لگانے سے ان کا جراثیم کش اثر بھی انسان نے مشاہدہ کیا ہوگا۔

انیسویں صدی کے وسط میں مرکزی ایشیا اور دیگر ممالک کے لوگ پنسلیئم (Pencillium) سے ملتی جلتی پھپھوندی کو زخموں پر لگایا کرتے تھے اور اس کے فائدے سے واقف تھے ۱۸۷۷ء میں پاسچر (PASTEUR) اور اس کے رفیق کار جوبرٹ (JOUBERT) نے مشاہدہ کیا کہ مرض جمرہ خبیثہ Anthrax کے جراثیم پیشاب میں زندہ رہتے ہیں۔ لیکن اگر دوسرے قسم کے جراثیم پیشاب میں ڈال دیئے جائیں تو جمرہ خبیثہ کے جراثیم مرجاتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے جراثیم نے ایک قسم کی Antibiotic پیدا کی۔

اس کے بعد چند ایک اور تجربے اسی سمت میں ہوئے۔

۱۹۲۸ء میں الگزنڈر فلیمنگ (ALEXANDER FLEMING) نے پنسلین (Pencillin) دریافت کی۔ یہ دریافت اتفاقیہ امر نہ تھی۔ پاسچر کا قول ہے کہ اس قسم کے مشاہدات صرف وہی شخص کر سکتا ہے کہ جس کی آنکھیں اور احساسات ایسا مشاہدہ منضبط کرنے کے لیے پہلے ہی سے تیار ہوں۔ فلیمنگ کا مقالہ دس سال تک طاق نسیاں کی زینت رہا۔ آخر ۱۹۳۸ء میں اس پر مزید کام شروع کیا گیا۔ فلوری اور چین (FLOREY & CHAIN) نے اسے انسانی امراض میں استعمال کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۱۹۴۱ء تک صرف اتنی پنسلین بن سکی ہو کہ ایک مریض کے لیے کافی نہ ثابت ہو سکی۔ اکسفرڈ کے سائنس دان فلوری اور ہیٹ لے (HEATLEY) ۱۹۴۰ء میں امریکا گئے، اور احتیاطاً پنسلین۔ پھپھوندی کو اپنی واسکٹ کے اندر لیپ کر لے گئے۔ کہ کہیں راستے میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

دَورِ قریب کی چند تحقیقات

آیئے اب ہم اختصار کے ساتھ دورِ قریب کی چند تحقیقات کا جائزہ لیں۔ جن کا تعلق ہند وپاکستان سے ہے۔

مرض سُرا (Surra) ہمارے ملک میں ایک عام بیماری گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں میں پائی جاتی ہے جسے مقامی زبان میں سُرا کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر گرفتھ ایوانس (GRIFFITH EVANS) کے مشاہدات نہایت قابلِ قدر ہیں۔

ڈاکٹر ایوانس ۱۸۶۰ء میں برطانوی فوج میں متعین ہو کر (کینیڈا) گئے اور وہیں پر میک گل

یونیورسٹی سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ (اس ہفتہ ہمارے نوجوان عالم ڈاکٹر محمد یوسف گورایا اسی یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ کی اعلا تعلیم حاصل کر کے ادارہ تحقیقات اسلامیہ میں شامل ہوئے ہیں)۔

۱۸۷۹ء میں ڈاکٹر ایوانس ہندستانی فوج میں متعین ہوئے۔ اور بہت جلد ۱۸۸۰ء میں اُس زمانے کی معمولی خردبین کے ذریعے مشاہدہ اور عملی تجربے کے بعد یہ ثابت کیا کہ سُرا بیماری ایک خلیہ والے حیاتی جراثیم (Trypanosome) کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی تحقیق چھپی۔ مگر بے توجہی کا شکار ہوئی۔ یہاں تک کہ جب یہ رپورٹ حکومتِ ہند کے منیسٹری کمشنر کو پہنچی تو بعض حضرات نے اہانت آمیز الفاظ استعمال کیے۔ اور کرسی نشین ڈاکٹروں نے بغیر مشاہدے کے اپنا فیصلہ صادر کر دیا کہ "یہ جراثیم تو بیماری کا نتیجہ ہیں، سبب نہیں"۔ ڈاکٹر موصوف کو اس رویے سے بڑا دکھ پہنچا ہوگا۔ اب میں اس تحقیق کی بنیادی اہمیت کا ذکر کرتا ہوں۔ علم الطب میں یہ مشاہدہ سنگِ میل کا مقام رکھتا ہے۔ انسانی یا حیوانی خون میں ایک خلیہ والا حیاتی جراثیم (Protozoa) جو سب سے پہلے بیماری کا باعث ثابت کیا گیا، وہ بھی Trypanosome ہے۔ جسے بعد میں Trypanosoma evansi کے نام سے معلوم کیا گیا۔ یہ مشاہدہ مقام شامِ ہمدرد سے تقریباً ۲۷ میل دُور ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی تحصیل ٹانک میں کیا گیا۔ فاضل محقق نے مغربی پاکستان کے کئی دوسرے مقامات پر بھی تحقیق کی۔ وہ راولپنڈی بھی آتے رہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے علم میں سب سے بڑی بنیادی سائنسی تحقیق جو سرزمینِ پاکستان پر کی گئی۔ وہ ڈاکٹر ایوانس کی ہی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد دنیا کے دیگر ممالک میں انسانوں اور جانوروں کی بیماریاں جو اس قسم کے جراثیم سے پھیلتی ہیں معرضِ مشاہدہ میں آئیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور انسانی مرض African Trypanosome یا Sleeping Sickness ہے۔ تھوڑے عرصے بعد راجرس نے یہ بھی معلوم کر لیا۔ کہ سُرا مکھیوں کی ایک خاص قسم Gad-flies (Tabanus) کے ذریعے پھیلتی ہے۔ پھر یہ بھی اضافہ ہوا کہ یہ بیماری اصطبل کی دوسری مکھیوں۔ Stomoxys یا دوسرے خون چوسنے والے کیڑے مکوڑوں سے بھی پھیل سکتی ہے۔

ڈاکٹر ایوانس کا کردار قابلِ ستائش ہے۔ انھوں نے اعلا ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی یہ پسند نہیں کیا کہ برطانوی ہندستان کے بڑے طبقے یعنی راجوں، مہاراجوں اور

نوابوں کا معالج بن کر رُتبہ اور نام پیدا کریں۔ وہ تحقیق و مشاہدہ کی لگن میں گم نام رہ کر بے زبان جانوروں کے دکھ درد کی طرف متوجہ ہوئے، اور علم الطب میں ایک تابندہ باب کا اضافہ کر گئے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ یہ تحقیق اگرچہ ہمارے ملک میں ہوئی یہ مرض اب بھی اسی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس مشاہدے کی اہمیت دُنیا بھر میں مسلّم ہے مگر ہمیں ہنوز اس عرق ریزی سے استفادہ کرنا ہے۔

آیئے اب ہم ملیریا پر سرسری نظر ڈالیں۔ ابتدائی دَور میں اس مرض کا سبب گندی ہوا قرار دیا گیا تھا۔ اسی لیے ملیریا نام پایا۔ فرانسیسی فوج کے ایک طبیب لاویران LEVERAN نے سب سے پہلے چوتھیے بخار کے جراثیم ۱۸۸۰ء میں خردبین کے ذریعے مشاہدے کیے، اور ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

اُنیسویں صدی کے آخری دس سال میں مشاہدات سے یہ ثابت ہوتا رہا کہ کئی بیماریوں کے جراثیم مچھر، چیچڑ، اور پسوؤں وغیرہ کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر پیٹرک مانسن (PATRIC MANSON) نے ثابت کیا کہ مرض Filariasis کے کیڑے عام مچھر Culex کے ذریعے ایک مریض سے دوسرے صحت مند انسان کے جسم میں داخل ہو کر بیماری پیدا کرتے ہیں۔ اس تحقیق کے اعلان پر ہارلے سٹریٹ کے شہرہ آفاق پنڈتوں نے جی بھر کر مانسن کا مذاق اڑایا اور اس تحقیق کو ذہنی بیماری قرار دیا۔

ڈاکٹر رانلڈ راس RONALD ROSS جو ہندستان میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ طبی تعلیم حاصل کر کے انڈین میڈیکل سروس میں داخل ہو گئے۔ مگر یہ پیشہ انھیں ذرا نہ بھاتا تھا۔ چھٹی گزارنے کے لیے ڈاکٹر راس ۱۸۹۲ء میں لندن پہنچے۔ وہ طبی پیشہ چھوڑنے کے درپے تھے۔ اسی اثنا میں اُن کی ملاقات ڈاکٹر مانسن سے ہوئی۔ ایک شام اوکسفرڈ اسٹریٹ میں چہل قدمی کرتے ہوئے ڈاکٹر مانسن نے ڈاکٹر راس سے بے ساختہ کہا: میرے قیاس کے مطابق ملیریا بھی مچھروں کے ذریعے پھیل سکتا ہے۔ مگر اس کا حتمی مشاہدہ اور ثبوت فراہم کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر مانسن نے راس کو ملیریا کے جراثیم دکھائے اور مزید ہدایات دیں۔

راس واپس ہندستان پہنچا۔ جون ۱۸۹۷ء میں سکندرآباد کے ہسپتال میں تعینات ہو گیا۔ اس نے ایک مریض مسمی حسین خان کو اس سودے پر راضی کر لیا کہ وہ فی مچھر چند آنوں کے عوض اپنے آپ کو کٹوائے گا۔ اب راس نے ان مچھروں کا مشاہدہ کیا جو ملیریا

کے مریض کا خون چوس چکے تھے۔ بالآخر یہ ثبوت مہیا ہو گیا کہ ملیریا کے جراثیم مچھر کے پیٹ کی جھلی کے باہر کی طرف نشو و نما پا کر ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ اب اگر یہ مچھر صحت مند آدمی کو کاٹے تو ملیریا پھیلانے کا سبب بن سکتا ہے۔

اسی اثنا میں ڈاکٹر راس کو مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے کہیں اور تبدیل کر دیا گیا۔ مگر اُس نے ڈاکٹر مانسن کی وساطت سے اپنا تبادلہ کلکتے کی لیبارٹری میں کرا لیا۔ اور اپنے مددگار محمد بخش کے ساتھ تجربوں میں مصروف رہا۔ یہ معلوم کر کے کہ ملیریا پرندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسے مزید عملی تجربے کرنے کے مواقع فراہم ہو گئے۔

آخر کار یہ تحقیقات ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر راس نے برٹش میڈیکل جرنل میں چھپوائیں۔ اتفاق سے ساتھ ہی ساتھ اٹلی کے ایک ماہر فن ڈاکٹر گراسی (GRASSI) نے بھی اسی وقت یہی تحقیق مکمل کر کے اپنے مشاہدات چھپوائے۔ یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ ملیریا ایک خاص قسم کے مچھر اینوفیلز (Anopheles) کے ذریعے پھیل سکتا ہے۔

ملیریا کے متعلق سلسلہ وار تحقیقات ہوتی رہیں۔ لیکن ۱۹۴۸ء تک یہ معلوم نہ تھا کہ مچھر کے کاٹنے کے بعد ملیریا کے جراثیم تقریباً دو ہفتے تک کہاں پر نشو و نما پا کر اچانک دوران خون میں بڑی تعداد میں داخل ہوتے ہیں، اور یہ کہ ملیریا دائمی صورت کیسے اختیار کر لیتا ہے۔ پرندوں کے تجربات سے یہ واضح ہو گیا تھا۔ کہ یہ منزل جگر اور تلی میں گزرتی ہے۔ چناں چہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر شارٹ اور اُن کے ساتھیوں نے انسانی رضا کاروں پر تجربے کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ منزل جگر میں طے ہوتی ہے۔ یہ لوگ چند انجینئر تھے۔ جنھوں نے اپنی چھٹی کے دوران یہ رضا کارانہ خدمت انجام دی۔

پلیگ یا طاعون ایک شدید وبا ہے۔ اس کی تباہ کاریوں سے یورپ بار بار بُری طرح متاثر ہوا۔ اس وبا نے کئی مرتبہ تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ چودھویں صدی میں پلیگ نے یورپ کی ایک چوتھائی آبادی یعنی ڈھائی کروڑ انسانوں کا خاتمہ کر دیا۔

۱۸۹۶ء سے ۱۹۳۳ء میں پلیگ کا دَور ہند و پاکستان کی تباہی کا باعث بنا۔ علم الطب میں نمایاں اضافہ انڈین پلیگ کمیشن کی جد و جہد کا مرہونِ احسان ہے۔ غیر ممالک کے بہت سے لوگ تحقیق کے لیے یہاں آئے۔ روس کے ماہر فن ڈاکٹر (HAFFKINE) کا نام نمایاں ہے۔ کہ جن کے نام پر بمبئی میں مشہور عالم ہافکن انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔

میں صرف ان مشاہدات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ابتدائی دَور میں "۱۸۹۹ - ۱۹۰۰ء" کی رپورٹ سے عیاں ہیں۔ ان کی بنا پر جو طریقہ کار استعمال کیا گیا وہ

حفظِ صحت کی تاریخ میں نمایاں باب کا اضافہ کر گیا۔ یہ ثابت ہوا کہ آبادی کو خالی کر کے لوگوں کو نئے کیمپوں میں رہائش پذیر کرانے کے بعد بڑی حد تک مرض میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور پھر آفت زدہ دیہات کے گرد حلقہ بندی کرنے سے مرض کی توسیع نہیں ہوتی۔ اور جو لوگ چوری چھپے آفت زدہ حلقہ میں پہنچے انھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس سال ہسپتال کے عملے کا ایک شخص اور پولیس کے دس آدمی جو اندرونی حلقہ بندی کی نگرانی پر مامور تھے بیمار ہو کر چل بسے۔

لوگوں نے یہ مشاہدات از خود دیکھے۔ کیپٹن جیمس کے الفاظ میں اس مشاہدہ کے بعد لوگوں کا رویہ انتہائی قابلِ تعریف رہا۔

ایک وبائی مرض ٹائفس (Typhus) کی مثال لیجئے۔ اس مرض کو حکیم بقراط نے بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ یورپ کی پے در پے تباہی میں اس مرض کا بڑا دخل ہے۔ جوں، چیچڑ، پسو اور حلمہ (Mite) کے ذریعے انسانوں میں پھیلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نپولین کی شکست کا باعث ٹائفس کے جراثیم پھیلانے والی جوں بنی۔ لاتعداد سپاہی اور شہری لقمۂ اجل ہو گئے۔

پچھلی صدی میں انگریز ڈاکٹر یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ یہ بیماری ہندستان میں بھی پائی جاتی ہے، وہ اسے خالصتہً یورپی مرض سمجھتے رہے۔

پچھلی صدی کے دوسرے نصف میں آہستہ آہستہ مشاہدات مجتمع ہوتے رہے اور اس نظریے کی تردید ہونے لگی۔

۱۸۵۵ء میں کچھ مریض کوہاٹ میں دیکھے گئے۔ ضلع مردان میں بھی ایسے مریض پائے گئے راولپنڈی اور اجمیر کی جیلوں میں یہ مرض پھوٹ پڑا۔

ضلع ہزارہ کی وبا میں انڈین میڈیکل سروس کے ایک ڈاکٹر میجر جے۔ آر۔ جونسن نے ۱۶۶۸ء میں اسی مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔

پھر ۲۴-۱۹۲۳ء کی وبا، جو کشمیر میں پھوٹی تھی، اور جس کی تحقیق پر میجر ایف۔ ڈبلیو کراج (F.W.CRAGG) کو متعین کیا گیا، خاصی بڑی نوعیت کی تھی۔ میجر کراج اسی مرض کا شکار ہو کر کشمیر سے بواسطہ راولپنڈی واپس ہوتے ہوئے لاہور پہنچنے سے پہلے ہی لقمۂ اجل بن گئے۔

نگرانِ شہدائے فن کے مشاہدات اب اور آئندہ بھی ہمیشہ کے لیے مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔ ان ابتدائی قربانیوں اور مشاہدات نے اس مرض کی تحقیق کے سلسلے میں نئی راہیں

کھول دیں۔ کچھ تحقیقات ہو چکی ہیں۔ اور کچھ ابھی جاری ہیں۔

ہیضہ کی ابتدائی ماہیت کا ذکر بقراط جالینوس ، سشرت اور وانگ شوہز (WANG SHOOHS) کی تحریروں سے ملتا ہے۔ انیسویں صدی میں یہ مرکز اپنے ماخذ سے پھیل کر کئی مرتبہ تمام یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے گیا۔

۱۸۵۴ء میں ڈاکٹر سنو (SNOW) نے لندن میں پانی کے ذریعہ سے اس مرض کا پھیلنا ثابت کیا۔ ۱۸۸۳ء میں جرمن ماہر جراثیمات ڈاکٹر رابرٹ کاخ نے ہیضے کا جرثومہ دریافت کیا۔ اپنے مشاہدات کو ثابت کرنے کے لیے اُس نے افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرق بعید کا سفر کیا، اور کلکتے میں ٹھہر کر مفید مشاہدات قلم بند کیے۔

ہیضے کی وباؤں نے اس شدت سے یورپ میں تباہ کاریاں پھیلائیں کہ اس مرض کو یورپ میں حفظِ صحت کا سب سے بڑا اُستاد تصور کیا گیا۔ شاید آپ حضرات واقف ہوں گے۔ کہ بین الاقوامی تعاون سے ڈھاکہ میں ہیضے پر مزید تحقیقات کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان نے ایک مہتم بالشان تجربہ گاہ قائم کی ہے۔ جس کے مشاہدات نسلِ انسانی کی بہبود کے لیے منظرِ عام پر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور اس سے بہت علمی اضافے کی توقع وابستہ ہے۔

لیجئے۔ اب ایک نہایت عام بیماری کا ذکر پیش ہے۔ اسے داءالصّنار یہ (Hookworm Disease) کہتے ہیں۔

اس کرم امعا کی دو قسمیں ہیں اور دونوں خون چوستی ہیں۔ ان میں ایک قسم زیادہ سخت بیماری کا باعث ہے جسے Ankylostoma Duodenale کہتے ہیں۔ تین کیڑے یومیہ ایک مکعب سنٹی میٹر تک خون چوس کر جسم سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس طرح تین سو کیڑے ایک سو سی سی تک خون روزمرہ چوس سکتے ہیں۔ کیڑے کی مادہ بے شمار انڈے دیتی ہے۔ فضلے کے امتحان اور انڈوں کی تعداد سے کیڑوں کی تعداد کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ یہ مرض بہت عرصے سے معلوم ہے۔

حکیم بوعلی سینا نے واضح الفاظ میں کرم امعا سے پیدا ہونے والی بیماری جسے ہم داءالصّناریہ کہتے ہیں، بیان کی ہے، اور ان کیڑوں کو بیماری کا سبب ثابت کیا ہے۔ یہ بیماری کم و بیش دنیا بھر میں پائی جاتی ہے۔ خردبین کے استعمال سے اس کی تشخیص بہت آسان ہو گئی ہے۔

بعض علاقوں میں اس مرض کا مشاہدہ بڑی مدت کے بعد ہوا اگرچہ یہ بیماری ہزارہا

سال سے موجود ہے۔ یہی مثال پنجاب کی ہے جہاں دیہاتی اور نہری علاقوں میں ۵۰ فی صد سے زیادہ آبادی اس موذی مرض کی شکار ہے۔

۱۹۳۰ ش تک باوجود میو ہسپتال اور میڈیکل کالج لاہور کے اس بیماری کا وجود معلوم نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میڈیکل کالج کے ایک طالب علم عبدالعزیز نے گرمی کی چھٹی کے بعد اپنے اساتذہ سے کچھ مشاہدات تحصیل شکر گڑھ کے بارے میں بیان کیے کہ وہاں خون کی بیماری کا مرض دیہاتیوں میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ اُن کے خون میں ملیریا کے جراثیم نہیں اور نہ ہی انھیں ملیریا کے علاج سے افاقہ ہوتا ہے۔ اسی طرح فولاد دینے سے بھی فائدہ معمولی ہوتا ہے البتہ فضلے میں کہ ورم (صنار یہ) کے انڈوں سے مشابہ چیزیں دیکھی گئی ہیں۔ یہ سُن کر اساتذہ نے مشورہ دیا۔ کہ میاں پہلے امتحان تو پاس کر لو۔ بعد میں اس طرف توجہ دینا۔

غرض امتحان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پاس کرنے کے بعد صحت عامہ کی جانب سے ڈاکٹر عبدالعزیز کے ایما پر تحصیل شکر گڑھ کے لوگوں کا معائنہ کیا گیا، اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ بیشتر آبادی اس مرض کا شکار ہے۔ چوں کہ بعض دیہات میں ۸۰ فی صد سے بھی زیادہ اشخاص اس مرض کا شکار تھے۔ اس لیے سب کو کیڑے نکالنے کی دوا دی گئی۔ اور اس کے نتائج بہت حوصلہ افزا تھے۔

اس طرح ایک متعلم طب کے مشاہدے نے اساتذہ اور طبی دنیا کے کارکنوں کو ایک بیماری کے وجود سے روشناس کرا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم ۱۹۳۰ ش سے پہلے میڈیکل کالج کے پروفیسروں کے سامنے کسی مریض کی تشخیص کہ ورم بنا دیتا تو وہ ضرور فیل کر دیا جاتا۔

اب یہ کیفیت ہے کہ یہ بیماری سارے مغربی پاکستان میں کم یا زیادہ پائی جاتی ہے۔ خصوصاً دیہات اور نہری علاقے زیادہ متاثر ہیں۔

دَورِ حاضر کے تقاضے۔ بین الاقوامی تقاضے

ہمارا زمانہ پہلے ادوار سے مختلف ہے، اور اب علم الصحت کو علاقائی سمجھنا بے معنی ہے۔ ملکوں کے درمیان آمد و رفت اور تیز ترین ذرائع نقل و حرکت نے علم الصحت کو صحیح معنوں میں بین الاقوامی بنا دیا ہے جیسے لازمی طور پہ ہر جگہ رائج ہونا ہے۔ مشاہدات سے ثابت ہوا ہے کہ اگر پاکستان سے چیچک یا ہیضے کا مریض کسی دوسرے ملک پہنچ

جائے جہاں پران بیماریوں کا سدِّباب ہو چکا ہو تو وہ غیر ملک وبائی خطرے کا شکار بن جائے گا۔ اسی طرح ہمارے ملک میں نیا عارضہ مثلاً زرد بخار ایک خطرناک مہلک وبا کی صورت اختیار کر سکتا ہے اگر ایک مریض یہاں داخل ہو جائے اور ہمارے بہ کثرت مچھر از قسم Aedes Egypti اس مرض کے جراثیم پھیلانا شروع کر دیں تو یہ وبا ہمیں عالمِ بے چارگی تک پہنچا سکتی ہے۔

ادویات کا تجربہ اور معیار۔ اور بین الاقوامی ضروریات۔

مشاہدوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جڑی بوٹیوں میں مخصوص جوہر کی مقدار بہت کم یا بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ عینی مشاہدے سے یہ فرق معلوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن جوہر کی غیر موجودگی یا کمی کے باعث مریض کو فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ جوہر کی زیادتی کے باعث نقصان کا اندیشہ ہے۔

کیمیائی اور عملی تجربے کی بنا پر ہی وثوق سے کسی جڑی بوٹی کے جوہر کی مقدار معیّن کی جا سکتی ہے۔ اس طرح جڑی بوٹیوں پر قومی اور بین الاقوامی کنٹرول ممکن ہو گیا ہے جس طرح کہ دوسری قسم کی دواؤں پر نافذ ہے۔

۱۹۵۷ء میں ریاست میسور کے ضلع شموگا میں ایک نئی بیماری منصّۂ شہود پر آئی۔ یہ مرض جنگلی بندروں اور انسانوں میں وبائی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہ ایک چیچڑ کے ذریعے پھیلتا ہے۔ اس کا جرثومہ Russian Spring Summer Encephalitis سے ملتا جلتا ہے، اور بیماری بھی مشابہت رکھتی ہے۔ اس وبا کی تحقیق کے لیے راک فیلر فاؤنڈیشن امریکا نے ہندستان میں ایک بہت بڑا فیلڈ ریسرچ اسٹیشن بنایا، اور پونا میں تحقیقاتی مرکز قائم کیا۔ اس مرض کی ماہیت جسے Kyasanur Forest Disease کہتے ہیں تمام دنیائے طب کے لیے دلچسپی کا باعث بن چکی ہے۔

۱۹۵۹ء کی بین الاقوامی رپورٹ F.A.O. میں شائع شدہ ایک مشاہدہ قابلِ بیان ہے۔ پاکستان سے ایک اونٹ جاپان لے جایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر چند چیچڑ Hyolamma Dromedarii دیکھے گئے، جن کے اندر کیو فیور کے جراثیم تھے۔ اونٹ کے خون کا مشاہدہ کیا گیا جب سے معلوم ہوا کہ یہ بیماری اونٹ کو بھی عرصۂ بعید گزرے لاحق ہوئی تھی۔ جب یہ جانور پاکستانی تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ مرض انسانوں اور جانوروں کے مابین مشترک ہے۔ اس مشاہدے سے یہ نتیجہ

حتمی طور پر مرتب ہوا کہ یہ مرض پاکستان میں بھی ضرور پایا جاتا ہے اگرچہ ابھی تک ہم اس سے روشناس نہیں تھے۔

مزید مشاہدہ یہ ہوا کہ اونٹ کا چیچڑ بھی اس بیماری کے جراثیم کا حامل بن سکتا ہے۔ اس سے پہلے یہ معلوم نہ تھا۔

اب انسان خلائی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ خلائی علم الصحت کے بارے میں کچھ ابتدائی تجربات ہو چکے ہیں اور ابھی جاری ہیں۔ سب سے پہلے مشاہدات کا ماخذ روسی کتیا لائکہ (LAIKA) تھی۔ پھر امریکنوں نے دو بندروں کو خلا میں بھیج کر مزید مشاہدات مرتب کیے۔

پہلا انسان روسی ہوا باز گاگارین تھا جس نے ۱۰۸ امیل کی بلندی میں دنیا کے گرد چکر لگا کر اپنے آپ کو پیش کیا۔ جس سے اس کے جسمانی اثرات اور گرد و پیش کے مشاہدات فراہم ہوئے۔

خلائی سفر کے عازمین کو تیز رفتاری، تاب کاری، فقدان وزن اور خوراک و ہوا کے مسائل درپیش ہیں۔ ماہرین فن کے لیے صلائے عام ہے کہ اس زمانے کے تقاضے پورے کریں۔

غالباً میں یہ بتانے میں کچھ کامیابی حاصل کر سکا ہوں کہ ارتقائے علم الصحت ایک مسلسل کہانی ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ منضبط علم کی بنیاد اُن لاانتہا مشاہدوں کی مرہونِ منت ہے کہ جن سے انسان نے بلالحاظ مکان و زمان، رنگ و نسل اور تہذیب و تمدن کما حقہٗ استفادہ کیا۔

سلسلہ وار مشاہدات ذہن انسانی کو پیہم غذائے فکر مہیا کرتے رہیں گے اور علوم انسانی کے مزید نشو و نما کا باعث بنیں گے۔

خاتمہ کلام

محترمی حکیم محمد سعید صاحب کا وہ بیان قابلِ صد ہزار ستائش ہے۔ جو موصوف نے دورۂ چین سے واپسی پر ایک عشائیہ کے موقع پر دیا۔ اور فرمایا:

"چین نے آزادی کے بعد جس طرح مسئلہ صحت کو حل کیا وہ ہمارے لیے ایک اچھی مثال بن سکتا ہے چینی معالجین چاہے وہ حکیم ہوں یا ڈاکٹر، مریض کی شفایابی اور عوامی خدمت کو اولیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل چیز بیماری سے نجات دلانا

ہے نہ کہ اپنے فن کے محدود دائرہ کا پابند ہو جانا۔ وہ قدیم و جدید دونوں طریقہ ہائے علاج سے فائدہ اُٹھاتے اور دونوں کے جان دار اجزا کو اپناتے ہیں۔"

اب میں حضرت علامہ اقبال کے ایک شعر پر اختتام کلام کی اجازت چاہتا ہوں۔

زمانہ ایک حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصّۂ جدید و قدیم

شام ہمدرد، راولپنڈی
یکم نومبر ۱۹۶۶ ش

سیّد ہاشم رضا

جناب سیّد ہاشم رضا صاحب کی زندگی میں نگاہ ڈالتا ہوں تو وہ فکر و عمل، خلوص و محبّت، جدوجہد، اخلاق و مروّت، شستگی اور شائستگی کی ایک خوش بو دار دنیا ہیں۔ میں ان کی کن کن باتوں کا ذکر کروں اور کن کن بلندیوں تک آپ کو لے جاؤں! مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ سیّد ہاشم رضا صاحب ایک انسان ہیں، اور ایک باغ و بہار شخصیّت ہیں۔ معاشرے میں جب تک ایسے سچّے انسان اور مسلمان ہیں مایوسی کا نام کفر ہی رہے گا۔

اخلاق سب سے بڑی قوّت ہے، سب سے بڑی طاقت ہے۔ انسان جب تک اس طاقت سے مسلّح ہے دوسری کوئی طاقت اسے شکست نہیں دے سکتی۔ کوئی قوم و ملّت جس کے افراد اخلاق کی رفعتوں پر ہوں زیرِ نگیں نہیں ہو سکتی، اور کسی بد اخلاق قوم و ملّت پر تاجِ عظمت نہیں پایا جا سکتا۔

سیّد ہاشم رضا صاحب کا شمار ہماری ملّتِ پاکستانیہ کے اُن افراد میں ہوتا ہے جو اچھّے انسان ہیں، سچّے مسلمان ہیں اور با اخلاق ہیں۔ رئیس الاحرار مولانا محمّد علی جوہر کو اپنا موضوعِ تقریر بنا کر انھوں نے عملاً اپنی تلاشِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مولانا محمّد علی جوہر اُن رفیع و بلند انسانوں میں سے ہیں کہ عالمِ اسلام اُن پر فخر کرتا ہے، اُن کی عظمت اور اُن کے خُلق کی قسم کھاتا ہے۔ ایسے صاحبِ عزت اور بلند مرتبہ انسان پر کلام کرنے کے لیے ایک اچھّا انسان ہی ہو سکتا ہے۔

حکیم محمّد سعید

مولانا محمد علی جوہر
اپنے اشعار کے آئینے میں

جناب سید ہاشم رضا

میں حکیم محمد سعید کا تہہِ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی وساطت سے مجھے کراچی کے اہلِ دل اور اہلِ قلم حضرات سے تجدیدِ ملاقات کا موقع ملا۔ اُردو ادب میں شامِ اودھ کے تذکرے اکثر ملیں گے، حکیم صاحب نے شامِ ہمدرد کی بنا ڈال کر میرے لیے شامِ اودھ کا نعم البدل مہیا کیا۔ میری دعا ہے کہ شامِ ہمدرد کی رنگینیوں اور وسعتوں میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا جائے۔

میری سروس کی ابتدا ۱۹۳۴ء میں احمد نگر، جنوبی ہند میں ہوئی اور بتیس[۳۲] برس کے بعد میں جولائی ۱۹۶۶ء میں اسلام آباد میں سبکدوش ہوا۔ سروس کے دَور میں مجھے زبان بندی کی تعلیم دی گئی، سرکاری فائلوں کے علاوہ ہم اپنے خیالات کا اظہار کسی پلیٹ فارم سے نہ کر سکتے تھے۔ سروس سے سبکدوشی کے بعد میں زبان بندی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ اور مجھے سخن ہائے گفتنی کے اظہار کی نعمت ملی۔ یہ سخن ہائے گفتنی قابلِ شنیدن ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ آپ جیسے حضرات فرمائیں گے۔ اسٹینلے ایونز کا قول ہے:

> Your home is not where you intend to live..
> but where you wish to die

یعنی تمہارا وطن وہاں نہیں جہاں تم رہنا چاہتے ہو بلکہ وہاں ہے جہاں تم مرنا چاہتے ہو۔ اس لحاظ سے میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کراچی میرا وطن ہے۔ اس میں شک نہیں

کہ زندگی میں پھلنے پھولنے کے لیے اسلام آباد جیسی جگہیں بہت مناسب ہیں لیکن مرنے کے لیے کراچی سے بہتر کوئی جگہ نہیں کیوں کہ یہاں بانیِ پاکستان قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح اپنی آخری آرام گاہ میں آسودۂ خاک ہیں۔

میرے طالب علمی کے دَور میں جن چار ہستیوں نے مجھے مرعوب کیا وہ یہ تھیں: مولانا محمدؐ علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی اور قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح۔ حکیم صاحب نے جب مجھے شامِ ہمدرد میں تقریر کرنے کی دعوت دی اور موضوعِ سخن پوچھا تو میں نے مولانا محمدؐ علی جوہر کی ذاتِ گرامی کو منتخب کیا۔ رٹائرمنٹ کے بعد جب میں کراچی واپس لوٹا تو اپنی جائے رہائش کے لیے میں نے محمدؐ علی ہاؤسنگ سوسائٹی میں جوہر روڈ کا انتخاب کیا اور میری روز کی چہل قدمی میں جوہر روڈ اور حسرت موہانی پارک شامل ہیں،

مولانا محمدؐ علی کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا جب انھوں نے لکھنؤ میں امین آباد پارک میں تقریر کی تھی۔ یہ واقعہ ۱۹۲۰ئ کا ہے۔ میری عمر اس وقت دس برس کی تھی۔ میں وقتِ مقررہ سے دو گھنٹے پہلے پارک میں پہنچ گیا تھا تاکہ انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملے۔ اگر میں وقتِ مقرّرہ پر جاتا تو پارک میں داخلہ بھی مشکل ہوتا، کیوں کہ ہر طرف سے خلقت کھنچ کر پارک میں آگئی تھی۔ مولانا نے تقریر شروع کی تو ایسا معلوم ہوا کہ کچھار میں شیر آگیا۔ سفید استراخانی ٹوپی نے ان کے قد کو دوبالا کر دیا تھا۔ سیاہ جبّے نے ان کے جثّے کو بڑھا دیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی، ان کی زبان سے پھول جھڑ رہے تھے۔ اُنھیں سارے مجمع پر پورا قابو تھا، وہ جب چاہتے مجمع کو کشتِ زعفران بنا دیتے اور جب چاہتے بیرونی حکومت کے خلاف غم اور غصّے کی لہر دوڑا دیتے۔ ان کی تقریر دو گھنٹے تک جاری رہی لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دس منٹ میں ختم ہو گئی۔ میرا شوق تشنہ رہ گیا یہی جی چاہتا ہے کہ ع

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

وہ ایک بہادر ماں کے بڑے بہادر بیٹے تھے۔ ایک مرتبہ جب حکومتِ وقت کے کاسہ لیسوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ مولانا محمدؐ علی اور مولانا شوکت علی نے حکومتِ برطانیہ سے معافی مانگ لی جس کی وجہ سے ان کی سزا میں تخفیف کر دی گئی اور وہ رہا ہونے والے ہیں، جب یہ خبرِ وحشت اثر ان کی والدہ محترمہ تک پہنچائی گئی جن کو سارا ملک پیار سے بی اماں، کہتا تھا تو انھوں نے ایک اخباری نمائندے سے یہ فرمایا، "چوں کہ تم نے یہ خبرِ بد مجھے سنائی ہے لہذا تم میرا پیغام میرے دونوں بیٹوں تک پہنچا دو" اور پیغام یہ تھا،

"مجھے اس بات کا یقین ہی نہیں آتا کہ تم دونوں اتنے کمزور ہو جاؤ گے کہ حکومت سے معافی مانگو، لیکن اگر جیل کی صعوبتوں نے تمھیں اتنا ہی بدل دیا ہے کہ معافی تک نوبت پہنچی ہے تو یہ سُن لو کہ تمھاری ضعیف ماں کے ہاتھوں میں ابھی اتنی قوت باقی ہے کہ اگر تم معافی مانگ کر جیل سے نکلے تو میں تم دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔" اسی قابلِ فخر ماں کے بیٹے مولانا محمد علی نے خالق دینا ہال کراچی میں ارکانِ جیوری کے سامنے جب ان پر، ان کے بھائی مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تھا یہ الفاظ کہے تھے: "میں اپنی ذاتی خصومت کی وجہ سے کسی کو بھی نقصان نہ پہنچاؤں گا لیکن اللہ کی خوشنودی کے لیے میں سب کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں گا اپنے بھائی کو قتل کر دوں گا، اپنی بزرگ اور عزیز ماں کو قتل کر دوں گا اور اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کر دوں گا، اللہ مجھے استقامت عطا فرمائے۔"

مولانا محمد علی جوہر کی ذات میں اتنی صفات بھری تھیں جنھیں بادی النظر میں لوگ اجتماعِ ضدین کہتے تھے لیکن جو حقیقت میں ان کی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلو تھے۔ وہ مسٹر بھی تھے اور مولانا بھی، ایڈیٹر بھی اور لیڈر بھی، شاعر بھی اور نثر نگار بھی، کانگریسی بھی اور مسلم لیگی بھی، وہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر مکمّل قدرت رکھتے تھے، علی گڑھ کے نامور طالب علم تھے اور بی۔ اے کے امتحان میں الہ آباد یونی ورسٹی میں اوّل آئے تھے۔ آکسفورڈ سے ہسٹری میں بی۔ اے کیا تھا جب حکومتِ برطانیہ کے خلاف انھوں نے عدم تعاون کی تحریک چلائی تو علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد کو یہ اپیل کی کہ اس درس گاہ کو بند کر دیا جائے جس کے بعد انھوں نے جامعہ مِلّیہ کی بنیاد ڈالی۔ جب انگریزی لباس پہنا تو فیشن ایبل انگریزوں سے ٹکّر لی اور جب ہندستانی لباس کو اپنایا تو جامہ زیبی کے جوہر دکھائے۔

وہ جس محفل میں جاتے تھے سب کی توجّہ کا مرکز بن جاتے تھے، ایک ایسی ہی محفل میں جس میں وہ انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے ایک انگریز خاتون شامل تھیں جو ان سے واقف نہ تھیں۔ ان کی انگریزی کے تلفّظ اور زورِ بیان سے متاثر ہو کر انھوں نے مولانا سے یہ سوال کیا کہ آپ نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سیکھی؟ مولانا نے مسکرا کر جواب دیا کہ انگلستان کے ایک گاؤں میں جسے آکسفورڈ کہتے ہیں۔

مولانا محمد علی آل انڈیا مسلم لیگ کے اوّلین ممبروں میں سے تھے، اُنھوں نے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی جو ڈھاکے میں منعقد ہوا

تھا۔ انھوں نے مسلم لیگ کا نظام عمل مرتب کیا اور متعدد تجاویز عام اجلاس میں پیش کیں جو منظور کی گئیں۔ انھیں کی تحریک پر ۱۹۱۳ء میں مسٹر محمد علی جناح مسلم لیگ کے ممبر بنے۔ کلکتے میں مسلم لیگ کے دسویں اجلاس کی صدارت کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا لیکن صدارت کرنے سے پہلے ہی حکومتِ ہند نے انھیں حراست میں لے لیا۔ مسندِ صدارت پر ایک طرف ان کی تصویر تھی اور دوسری جانب بی اماں۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا نے آل انڈیا خلافت کانفرنس کی صدارت کی جو کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا نے آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی جو کہ صوبہ مدراس میں کوکناڈا کے شہر میں منعقد ہوا۔ مولانا نے ملک کی آزادی کے لیے ہندوؤں سے بھرپور تعاون کیا، تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدمِ تعاون میں ہندو اور مسلمان لیڈرز ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے، لیکن نہرو رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد مولانا ہندو لیڈروں سے بددل ہو گئے اور آخرکار دسمبر ۱۹۲۸ء میں انھوں نے کانگریس کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ کانگریس کی مسندِ صدارت پر بیٹھ کر انھوں نے جس مقام کی خواہش کی تھی وہ آخرکار انھیں مل گیا ان کا شعر ہے ؂

یہ تختِ نشینی ہو مبارک تمھیں جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

یہ صلہ کیا کم ہے کہ انھیں اپنی آخری آرام گاہ کے لیے قبلۂ اول کے حدود میں جگہ ملی!

ایک مرتبہ علی گڑھ میں ہندو اور مسلمانوں کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا تھا: "اگر ہندو مسلم مسئلہ طے نہ ہوا تو ہندوستان ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا۔" ہندوستان کی تقسیم کے بہت پہلے جنوری ۱۹۳۱ء میں مولانا کا انتقال لندن میں ہوا۔ مرنے سے پہلے انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو جدوجہدِ آزادی میں قربانیاں دینے کے لیے تیار کر دیا تھا، انھیں بار بار نظر بند کیا گیا، ان کے اخبار کامریڈ اور ہمدرد بند کیے گئے، ان کا پریس ضبط کیا گیا لیکن ان کا حوصلہ بڑھتا ہی گیا۔ ایک مرتبہ جب وہ جیل میں تھے انھیں اپنی عزیز بیٹی آمنہ کی علالت اور نازک حالت کی خبر ملی۔ ایسی حالت میں اگر وہ پیرول پر اپنی بیٹی کے آخری دیدار کے لیے رہا ہونا چاہتے تو حکومت بخوشی انھیں اجازت دے دیتی لیکن مولانا نے اس استقامت اور بہادری کا ثبوت دیا جو اللہ کے خاص بندوں کی پہچان ہے۔ مولانا نے جیل سے اپنی بیمار بیٹی کو ایک منظوم خط لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؂

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دُور سہی وہ تو مگر دُور نہیں
یاں بھی ہے یوسف و یعقوب میں زنداں حائل
میں ہوں محصور اگر آپ وہ محصور نہیں
تیری حکمت سے الٰہی تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دُور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

ایامِ اسیری اور آلامِ ذاتی کے باوجود مولانا کا دل ہمیشہ امید سے معمور رہا اور ان کی باغ و بہار طبیعت کا طنطنہ آخری وقت تک قائم رہا۔ تحریکِ عدمِ تعاون کے زمانے میں اسمبلی کی ممبری کے سوال پر کانگریس میں دو گروہ بن گئے: ایک وہ جو کہ قانون ساز اداروں کی ممبری کو حکومت سے تعاون سمجھتا تھا اور دوسرا وہ جو کہ اسمبلی کی ممبری کو انگریزوں کو ستانے کا ایک ذریعہ تصور کرتا تھا۔ پہلے گروہ کی قیادت گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے اور دوسرے گروہ کی قیادت پنڈت موتی لال نہرو نے کی۔ مولانا محمد علی کے ہم خیال کانگریسیوں کو سیاست کی زبان میں (No-changer) کہا گیا۔ ایک مرتبہ جب دہلی میں اسمبلی کا سشن ہو رہا تھا تو مولانا وزیٹرس گیلری میں جا بیٹھے۔ ہال میں ان کی موجودگی کا سارے ممبروں کو احساس ہوا اور انھوں نے تالیاں بجا کر مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پنڈت شام لال نہرو نے ان کو مخاطب کر کے کہا، "مولانا جب آپ ہمارے قریب آ ہی گئے تو دو قدم اور بڑھیے اور ہمارے ساتھ اسمبلی کی کرسیوں پر بیٹھیے" مولانا نے جو کہ دوسری منزل پر تھے جواب دیا:

Mr. Nehru, I prefer to look down on you.

اس جواب پر ایک مرتبہ پھر ممبروں نے تالیاں بجائیں۔

ایک مرتبہ جب مولانا اپنے مخصوص لباس میں اسمبلی کی لابی میں کھڑے ہوئے کسی سے گفتگو کر رہے تھے تو پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان پر یہ فقرہ کسا "مولانا میں نے جب آپ کی پشت پر نگاہ کی تو میں سمجھا تھا کہ بیگم بھوپال آ گئیں۔" مولانا ہنسے اور یہ

جواب دیا، "جی ہاں واقعی اس زنانہ اسمبلی میں مردوں کا کیا کام؟"

ایک مرتبہ جب کانگریس کے نیتا سیتا پور میں جمع ہوئے تھے اور مولانا گاندھی جی کے ساتھ ایک کھانے میں شریک تھے حسب معمول ذیابیطس کے مریض ہونے کے باوجود انھوں نے بہت کھیر کھائی اور اس کے بعد جب شریفوں کے ٹوکرے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو گاندھی جی نے انھیں روکا اور کہا، "آپ کو اپنی صحت کا کچھ بھی خیال نہیں ہے، میں اب آپ کو شریفے نہ کھانے دوں گا۔" مولانا نے جواب دیا، "گاندھی جی اگر میں سیتا پور کے شریفے نہ کھاؤں گا تو میرے سسرال والے مجھ سے خفا ہو جائیں گے۔" گاندھی جی نے کہا، "کیا آپ کی سسرال سیتا پور میں ہے؟ مولانا نے جواب دیا، "آپ کو معلوم ہے کہ میں رام پور کا رہنے والا ہوں اور اس رعایت سے سیتا پور میری سسرال ہے!"

مولانا نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انھوں نے گیارہ برس کی عمر سے اُردو میں شعر کہنے شروع کیے۔ رام پور کے ایک مشاعرے میں جس کی صدارت فصیح الملک داغ دہلوی فرما رہے تھے۔ جب مولانا نے اپنی غزل پڑھی تو اس کی داد سب سے زیادہ حضرت داغ نے دی۔ مرزا غالب کی طرح مولانا کا دیوان بھی جتنا ہی مختصر ہے اتنا ہی منتخب ہے۔

آج کی نشست میں میں آپ کو مولانا کے وہ اشعار سناؤں گا جن کی لذت میں چالیس برس سے اٹھا رہا ہوں۔ میں نے اپنی ڈائری میں ان اشعار کو جن چھے ابواب میں تقسیم کیا ہے وہ یہ ہیں، معرفت الٰہی، عشق محمدی، پیروی حسینؓ، دنیائے اسلام سے رشتۂ قلبی، آزادی کی لگن اور روحِ غزل،

معرفتِ الٰہی

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

اِک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
"ہل من مزید" کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
ڈھونڈیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

تنہائی کیسی قید میں ہے وہ جو ہم سخن
کر تو تلاوت اس کے کلامِ مجید کی

ہوں بے ہراس یہ مجھے رکھیں کسی جگہ
ڈر ہو وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو

مے اسلام کا بھلا جوہر نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے
ہے مسلماں کی بس یہی پہچان کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

ملک سمجھو اسے یا مال بچا ہے اک دین
اب تو بس اک یہی دولت ہے مسلمان کے پاس

شمعِ ایماں کو خدا روشن رکھے
قبر میں جوہر کی پہلی رات ہے

تم تو کعبے کے خدا تھے پھر نکالے کیوں گئے
اے بتو کیسی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

کٹ جائیں گے یہ دن بھی یہاں قیدِ سخت کے
کم کچھ مگر وہاں کی سزا ہو تو جانیے

اے سائلِ دولت ہیں نہ عزت کے طلب گار
اس در کے فقیروں کی صدا اور ہی کچھ ہے

شوریدہ سری کا تو ہے الزام ہی الزام
اللہ کے بندوں کی خطا اور ہی کچھ ہے

عشقِ محمدی

مولانا جب چھندواڑہ (سی پی) میں اسیر تھے تو انھیں ایک رات کو خواب میں رسولِ کریمؐ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، صبح کو مولانا کی وہی کیفیت ہوئی جس کیف و مستی میں حضرتِ امیر خسرو نے یہ شعر کہے تھے،

نمی دانم چہ منزل بُود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بُود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

مولانا نے یہ اشعار کہے

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر لحظہ مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں !
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

۱۹۱۸ء میں جب کلکتے میں ہندو مسلم فساد ہوا اور مسلمانوں نے قلت کے باوجود کثرت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تو مولانا نے یہ اشعار کہے،

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شان کلکتہ
روحِ رسولؐ آج ہے مہمانِ کلکتہ
مسرور خلد میں ہیں شہیدانِ کانپور
ہوں گے شریکِ بزم شہیدانِ کلکتہ
تقلید اہلِ بیت کریں ہم تو کیا عجب
میدانِ کربلا بنے میدانِ کلکتہ
نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پر اتنا ہے
کہ ہاں نامِ محمدؐ مرتے دم وردِ زباں پایا

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
تو زندگی کے لیے آخری نظام آیا

اور جب مولانا روضہ رسول ؐ پر پہنچے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور یہ شعر وردِ زبان تھے،

اپنے پلّے کوئی سوغات نہیں اس کے سوا
نقدِ جان نذر کرائے دل بھی دستور ہے آج
رقصِ بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجیے
حسن مستول نہیں عشق بھی مجبور ہے آج

پیروی حسینؑ

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تم یوں نہ سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابنِ علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسانِ حسینؑ

شکرِ حق ہے کہ ابھی حق کی حمایت کے لیے
جان دینے کو ہیں موجود غلامانِ حسینؑ

حق و باطل کی ہے پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے دبیں ہیں وہی شیعانِ حسینؑ

گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر
رہے کوثر پہ بھی وابستہ دامانِ حسینؑ

ہے بُعد کربلا سے بھی قربِ یزید بھی
اور چاہتے ہیں یہ کہ نہ ہوں پنجتنؑ سے دور

ماتمِ شبیرؓ ہے آمدِ مہدیؑ تلک
قوم ابھی سوگوار دیکھیے کب تک رہے

سن لیجیے خلوتوں میں انا الحق کا ادعا
سولی پہ چڑھ سنائیے وہ اب نعرہ زن کہاں

فرصت کسے خوشامدِ شمر و یزید سے
اب ادعائے پیرویِ پنجتنؑ کہاں

جب تک کہ دل سے محو نہ ہو کربلا کی یاد
ہم سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی

ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا
رازِ فتح سبطِ پیغمبرؐ کھلے

کہتے ہیں لوگ ہے رہ ظلمات پُرخطر
کچھ دشتِ کربلا سے سوا ہو تو جانیے

دنیائے اسلام سے رشتہ قلبی

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم میں جب برطانوی فوج نے ترکوں کے خلاف جنگ لڑی اور ۱۹۱۶ء میں بغداد پر قبضہ کر لیا تو مولانا نے مضطرب ہو کر کہا ؎

چند روزہ عیش ہے یہ جنتِ شدّاد کا
اس طرح ہرگز نہ ہوگا فیصلہ بغداد کا

تحریکِ خدّامِ کعبہ میں مولانا محمدؐ علی اور مولانا شوکت علی نے سب سے نمایاں حصّہ لیا۔

جس زمانے میں ترکوں کو انگریزوں کے خلاف فتح سمرنا حاصل ہوئی اس وقت مولانا جیل میں تھے۔ اِس خوش خبری پر انھوں نے یہ شعر کہے :- ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی
سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی

ہیں سب عرب میں شام فلسطین اور عراق
ہے شرط جس کے واسطے صرف ایک دین کی

بہرِ خدا یہود و النصاریٰ کو دو نکال
یہ ہے وصیت اس کے رسولِ امین کی
چودہ برس جو قبلہ رہا ہے رسولؐ کا
اپنا لہو رگوں میں اس کی زمین کی
میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشقِ ناتمام کی بتلاوٗں سرگزشت
دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور
اس شانِ امتیاز کو دیکھو کہ اہلِ کفر
مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر
مجھ سے یہ دیکھی نہیں جاتی تباہی کیا کروں
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا الٰہی کیا کروں
بھلا مایوس کیوں کر اس سے ہو امتِ محمدؐ کی
کہ جس نصرت کا وعدہ ہر ضعیف و ناتواں تک ہے
غنیمت ہے اگر باقی کہیں کچھ پاسِ مذہب ہے
ہماری آبرو جو کچھ ہے اس دھندلے نشاں تک ہے
ہمیں ثابت قدم نکلے تو پھر اس کے قدم اٹھے
یہ جبر و قہر کا جادو ہمارے امتحاں تک ہے
ہم کو بھلا عزیز نہ ہو کیوں وہاں کی خاک
سرحد ملی ہو عرش سے جس سرزمین کی

مولانا تحریکِ خلافت کے رہبر تھے اور ترکوں کی حمایت میں کامریڈ اور ہمدرد میں انھوں نے متعدد مضامین لکھے۔ لندن ٹائمز کے ایک اداریے کے جواب میں جس کی سرخی تھی The choice of Turks مولانا نے جو بسیط اور مدلل جواب لکھا تھا اس کی پاداش میں انھیں ڈیڑھ برس کی سزا ہوئی۔ مولانا کا ردِ عمل یہ تھا ؎

دو برس کی قید کیا ہے قید ہے قیدِ حیات
دیکھو کب ہو خاتمہ اس قیدِ بے میعاد کا

آزادی کی لگن

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

رہے آزاد جو رہتا ہو تمہیں کیا جوہر
تم تو زندانیٔ الفت ہو گرفتار بھی ہو

ہم کو خود شوقِ شہادت ہے گواہی کیسی
فیصلہ کر بھی چکو ملزمِ اقراری کا

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

جنسِ گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہ جان
لائے ہیں ہم بھی رونقِ بازار دیکھ کر

دست و پا بستہ ہوں سائل ہوں یدُاللّٰہی کا
اس کی حاجت نہیں پھر ہاتھ میں تلوار بھی ہو

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو جزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس درجہ ستا دیکھ

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد
شکوہ صیّاد کا بے جا ہے قفس میں بُلبل
یاں تجھے آپ نزا طرزِ فغاں لایا ہے
ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

رُوحِ غزل

لذّت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لُطفِ جُرم تمنّا سزا کے بعد
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری جفا کے بعد
غیروں پہ لطف ہم سے الگ، حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد
ممکن ہے نالہ جبر سے رُک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد
ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر
ہو انتخاب اے نگہ یار دیکھ کر
ہم خاص گانِ اہلِ نظر اور یہ قتلِ عام
جورِ ستم بھی کر تو ستم گار دیکھ کر
جو صحبتِ اغیار میں اس درجہ ہو بے باک
اس شوخ کی سب شرم و حیا میرے لیے ہے
ہے ظلم بہت عام ترا پھر بھی ستم گر
مخصوص یہ اندازِ جفا میرے لیے ہے
ہیں یوں تو فدا ابرِ سیہ پر بھی مے کش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لیے؟
یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو!
میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ
یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے
آج کر لو جو کر سکو، کل تک!
کون جیتا ہے کون مرتا ہے
نادانیاں ہزار سہی دوستو مگر
دانا بھی ہو گئے انھیں نادانیوں میں ہم
پیامِ مرگ ہے پیغامِ یار و مژدۂ وصل
وہ کام اجل نے کیا جو صبا سے نہ ہو سکا

شامِ ہمدرد۔ کراچی
۱۰ر نومبر ۱۹۶۶ء

مولانا محمدؐ سعید

قوم کی ذہنی اور فکری تربیت میں صحافت کا مقام سب سے اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت کی تقدیس اور عفّت کو قائم رکھنے کے لیے اہلِ عزم و ہمت نے سجن و زندان کا خیر مقدم بھی کیا اور دار و رسن کو لبیک کہنے میں بھی تامل نہیں کیا، اور مال و متاع کی ضبطی اور قُرقی کا رُوح فرسا دار بھی ہنستے اور مسکراتے ہوئے سہہ گئے۔

میری رائے میں ایک صحافی کا کردار یہ ہے کہ ہر طرح کی جانب داری، عصبیت اور جماعتی موثرات سے بالاتر ہو کہ وہ اپنے قارئین کے سامنے جو مواد پیش کرے ایک طرف وہ صحیح ہو اور دوسری طرف فکر آفریں بھی ہو۔ آج سے نصف صدی پہلے اس کی بہترین مثال "ہمدرد" اور "الہلال" پیش کر چکے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے وہ فکرِ انسانی آج بھی اتنا ہی بلند پایہ اور موقّر ہے جتنا آج سے پچاس سال پہلے تھا۔

صحافت کا نصب العین بہت بلند ہے۔ وقت گزاری کے لیے جو ہیجان انگیز، غیر صحت مند اور مخرب اخلاق مواد موجودہ دور میں عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ ملک و ملت کے لیے ایک خطرہ ہے، عاقبت کے لیے بھی اور سلامتی کے لیے بھی۔

پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے۔ یہاں کوئی کام بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اس کے سبب تخلیق کو کمزور کر دے۔ پاکستان میں صحت مند صحافت کی شدید ضرورت ہے، ایسی صحافت جو اپنے پڑھنے والوں کے اخلاق، عقائد اور فکر و نظر کی صحیح تربیت کر سکے۔ یہ کام نہ واعظوں سے ممکن ہے نہ کتابوں سے، کیوں کہ دونوں کا حلقہ محدود ہوتا ہے۔ یہ کارِ اہم صرف صحت مند صحافت ہی انجام دے سکتی ہے جس کا حلقہ لامحدود ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد اور قیامِ پاکستان سے اب تک اٹھارہ انیس سال کے طویل عرصے میں حکومتوں اور قوم نے مجموعی طور پر تعمیر ملک و ملت کے لیے کیا کوششیں کیں، میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی صحیح جائزہ

نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے یعنی حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو گویا مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اگر پاکستان کی آئیڈیالوجی کی روشنی میں جچے تلے اور بھرپور اقدامات ہوتے تو پاکستان کا مقام آج سے کہیں زیادہ بلند ہوتا اور اس کا وزن زیادہ محسوس کیا جاتا۔ میری رائے میں قدرت ہمیں مسلسل مواقع دے رہی ہے۔ سترہ روزہ جنگ میں محیّر العقول کامرانی اس کی ایک بڑی بیّن اور بڑی روشن مثال ہے۔ تاریکی میں روشنی کے یہ چراغ پوری آب و تاب سے جگمگا رہے ہیں اور اپنی گرمی اور روشنی سے تاریکی کی لہر کو شبنم میں منتقل کرنے کے درپے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں ملک و ملّت کے لیے اپنی تعمیری کوششوں کو تیز تر کردیں اور اپنے ملک کے مستقبل کو روشن بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔

آج "شامِ ہمدرد" میں تقریر کا موضوع ہے: "تعمیر ملک و ملّت میں ایک صحافی کا کردار"۔ اس موضوع پر اظہار خیال کی ذمے داری ہمارے دوست مولانا محمد سعید صاحب نے لی ہے، جو خود ایک کہنہ مشق صحافی ہیں اور دنیائے صحافت میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ مہمان مقرر ملک کے موقر انگریزی روزناموں پاکستان ٹائمز، ڈان، ٹائمز آف کراچی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ سے منسلک رہے ہیں اور آج کل پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ہیں۔ میں نے مولانا محمد سعید صاحب سے پوچھا کہ ذرا اپنا حال احوال کچھ اور بتائیے تو انھوں نے جواب میں ایک شعر لکھ کر مجھے بھجوا دیا:

"گفتنی درج گزٹ ہے باقی جو ہے ناگفتنی"

سول اینڈ ملٹری گزٹ میں نہ معلوم مہمان مقرر نے کیا کیا لکھا ہوگا۔ اکبر نے یہ شعر نہ معلوم کن حالات میں کہا ہوگا۔

میں مہمان مقرر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ازراہ کرم اپنے خیالات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔ شکریہ۔

حکیم محمد سعید دہلوی
۲۹ر نومبر ۱۹۶۶ ش

تعمیرِ ملّت میں ایک صحافی کا کردار

جناب مولانا محمد سعید

جب سے اس شہر میں شامِ ہمدرد کا آغاز ہُوا ہے مجھے اس میں باقاعدگی سے حاضری دینے کا شرف حاصل رہا ہے اور میں ہر بار اس صحبت سے مستفید ہو کر گیا۔ حکیم صاحب محترم کی تلاش اور کنج کاوش کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ ہر بار ایسے حضرات کو ڈھونڈ کر لاتے رہے ہیں جن کے علم اور تجربے سے مَیں اور آپ فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب کے یہ کہنہ مشق نبّاض مات کھا گیا ہے اور آج وہ ایک ایسے شخص کو آپ کے رُوبرو لے آیا ہے جو علم کے اعتبار سے بے بضاعت ہے اور تجربے کے اعتبار سے صرف اِتنا کہہ سکتا ہے کہ اُس نے دُور ہی سے عظیم صحافیوں کے قافلے کو اُفق کے پار گم ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اور اس پر مستزاد ایک صحافی کے ساتھ شام منانا، صحافیوں کے ساتھ شامیں نہیں صبحیں منایا کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے مغربی اقوام کے بارے میں ایک جگہ کہا ہے۔

روزگارِ شاں چناں زیر و زبر
کز غروب آفتاب او را سحر

یعنی مغربی اقوام کے اوقات کچھ اس انداز سے تلپٹ ہوئے کہ سورج ڈوبتا ہے تو اُن کے لیے دِن طلوع ہوتا ہے۔ کچھ ایسے ہی شب بیدار ہم لوگ ہیں۔ جب سارا عالم سوتا ہے تو ہم راتوں کو اُٹھ اُٹھ بادشاہوں کے محلّوں سے، جنگ بازوں کے معرکہ ہائے کارزار سے، رندوں کی محفل ہائے ناؤنوش سے، درویشوں کی خانقاہوں سے اور سوداگروں کی

منڈیوں سے انسان کے اعمال اور اُن کے نتائج چُن چُن کر جھولیاں بھرتے ہیں اور وہ لے کر صبح دم آپ کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں دراصل وہ وقت ہوتا ہے ہماری اور آپ کی ملاقات کا۔

دیکھا جائے تو ابتدائے آفرینش ہی سے بعض لوگوں نے یہ فرض اپنے ذمے لے رکھا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے قافلے کے نقشِ پا محفوظ کرتے چلے جائیں۔ اہرام مصر سے نکلے ہوئے کتبے ہوں یا موئن جودڑو کی گلیوں سے ملی ہوئی مہریں۔ دیوارِ کعبہ کے ساتھ لٹکتے ہوئے امرؤ القیس یا لبید کے قصائد ہوں یا مہاراج کرشن کے منھ سے بولی ہوئی بھگوت گیتا، وارث شاہ کی ہیر ہو یا شالیمار کے میلے پر گائی جانے والی گنواروں کی بولیاں، یہ سب اسی کاروانِ گزران کے نقشِ قدم ہیں۔ اس لیے اُس زمانے کا مزاج سمجھنے کی خاطر جب کہ اس نیم برِّاعظم میں صحافت نے جنم لیا مجھے مختصراً اُس وقت کی کچھ ایسی ہی نشانیوں کا سہارا لینا پڑے گا۔

۱۸۵۴ء کا ذکر ہے اودھ کے انگریز ریذیڈنٹ سکاٹ نے نواب واجد علی شاہ کے وکیل مولوی سدن کو بلایا اور تلوار بے نیام کر کے میز پر رکھ دی اور پوچھا "مولوی صاحب! اس کا کیا جواب ہے؟" مولوی سدن نے کچھ دلجمعی لیکن زیادہ حسرت و یاس سے کہا "اس کا جواب بکسر کے میدان جنگ میں گم ہو چکا ہے۔" بکسر کی جنگ ۱۷۶۴ء میں ہوئی۔ جس میں میر قاسم حاکم بنگال، شاہ شجاع حاکم اودھ اور شاہ عالم شہنشاہِ دہلی کی متحدہ قوت انگریزوں کے ہاتھوں پٹ چکی تھی۔ یہ مختصر سا مکالمہ نشان دہی کرتا ہے ایک دور کے ختم ہونے کی اور دوسرے دور کے شروع ہونے کی۔ جو دور ختم ہوا وہ شکوہِ ملک و دین کا دور تھا اور جو شروع ہوا وہ دور تھا یاس اور حرمان نصیبی کا۔

اس دور کے ادب پر نگاہ ڈالیے۔ میر تقی میر ملتے ہیں۔ دلّی سے آگرے پہنچے، آگرے سے پھر دلّی اور پھر لکھنؤ۔ دل بریاں اور چشم گریاں لکھنؤ پہنچے تو عجیب ہیئت کذائی میں اجنبی جان کے کچھ ٹھٹھول کے انداز میں لوگوں نے کہا حضرت کہاں سے تشریف آوری ہوئی۔ ایک آہ بھری اور کہا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

میرے زمانے کی دلّی گویا ایک اُجڑی ہوئی بستی تھی۔ اور آگے بڑھیے تو انشاءاللہ انشا ملتے

ہیں یہ کہتے ہوئے:

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

میر درد کہتے ہیں:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اور آگے بڑھیے تو تیموریوں کا مؤرخ اور مرثیہ خواں غالب ملتا ہے۔ بڑے یاس انگیز لہجے میں کہتا ہے:

اے تازہ وارداں بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ع اِک دیا اور بجھا اور بڑھا اندھیرا

ایسے میں ایک شخص آہستہ سے آگے بڑھتا ہے اور ایک چراغ روشن کر دیتا ہے۔ یہ سر سید تھے۔ چوں کہ شخصیت جاذب تھی مقصد بلند تھا، نیت پُر خلوص تھی، کچھ درد مند لوگ شامل ہو گئے۔ سر سید نے دیکھا کہ قوم میں یاس ہے اُمنگ کا فقدان ہے تصنّع اور ریا کاری ہے، امیر ہیں تو فضول خرچ اور غریب ہیں تو جاہل۔ علم کی جگہ میراثیوں اور بھانڈوں کی یاوہ گوئی ہے اور شجاعت کی جگہ نوجوانوں کا نسوانی بانکپن۔ یہ نقشہ تھا سر سید اور اُن کے رفقا کے سامنے۔ چناں چہ سر سید نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی کی تشکیل کی اور اُس کا ایک باقاعدہ گزٹ جاری کیا اس کے بعد ولایت کا دورہ کر کے

جب واپس وطن لوٹے تو تہذیب الاخلاق کی بنیاد رکھی۔ یورپ کی مثال اُن کے پیش نظر تھی کہ کس طرح وہاں کا صحافی تحریر و تقریر کی آزادی کے ساتھ، اوہام پرستی، بردہ فروشی، غلامی اور عدم مساوات انسانی کے قلع قمع کے لیے جنگ لڑ رہا تھا۔ اخبارات انگلستان کے ہوں یا فرانس کے لکھنے والا رُوسو ہو یا والٹیئر، ایڈیسن ہو یا سٹیل سب کے سب ایک نئی دنیا کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ بے باک خیالات کا ایک سیلاب تھا جو موجۂ نور کی طرح یورپ کی ظلمتوں کو روشن کر رہا تھا اور اگرچہ آپس کی سیاسی رقابتوں اور منڈیوں کی جنگ نے ہر قوم میں Chauvinism پیدا کر رکھی تھی اور عام صحافی اُس سے کاملاً بالاتر نہیں ہو سکا تھا تاہم اکثر و بیشتر افکار کی رُو کناروں کی منّت پذیر نہیں رہی تھی۔

سرسید سادہ نویس تھے ٹھکانے کی بات کہنے کے اسلوب سے واقف تھے۔ تجربے اور نئے علوم کی باتیں آہستہ آہستہ دِلوں میں اُترنا شروع ہوئیں۔ اُن کے رُفقا نے اپنے اپنے مورچے اس طرح سنبھالے جس طرح کوئی مختصر لیکن جاں باز فوج کئی محاذوں پر موت و حیات کی جنگ لڑنے پر مجبور ہو۔ حالیؔ کے ذمے قوم کو غیرت دلانے والی شاعری اور نظم و نثر کی اصلاح آئی۔ نذیر احمد خاتونِ خانہ کی تربیت پر مامور ہوئے۔ شبلیؔ اسلاف کے کارناموں کی بگڑی ہوئی صورت کے خد و خال درست کرنے پر متعین ہوئے۔ محسن الملک اور وقار الملک نے تعلیم کے میدان کو اپنی جولانیِ طبع کے لیے منتخب کیا اور خود سرسید نے اپنے لیے مذہبیات اور صحافت کو چُنا۔

اِدھر یورپ میں پہلے گیلیلیو نے پھر نیوٹن اور ڈارون نے اعتقادات کی دُنیا کو تہہ و بالا کر رکھا تھا۔ کلیسا کی بنیادیں نئے نظریات نے ہلا کر رکھ دی تھیں۔ مشرق، مغرب کی مشین سازی سے مرعوب ہو کر اب نظریاتی جنگ میں بھی پسپا ہو رہا تھا۔ یہ صورتِ حال بڑی تشویش ناک تھی۔ سرسید نے سیاسی طور پر انگریز کے ساتھ صلح جوئی کی پالیسی تو اختیار کی ہی تھی، اب وہ یورپ کی دیکھا دیکھی سائنس اور مذہب کے ڈانڈے بھی ملانے لگے اور بعض جگہ شدید ٹھوکریں کھائیں۔ اُن کی اس حکمتِ عملی یا (جیسے اُن کے نقاد کہتے ہیں) "شکست خوردگی" نے اور جگہ ردِ عمل پیدا کیا۔ پمفلٹ بازی شروع ہوئی، نئے نئے جریدے معرضِ وجود میں آئے اور سرسید کے خلاف دوست و دشمن صف آرا ہو گئے۔ جو لوگ مخالفت میں پیش پیش تھے اُن میں سید جمال الدین افغانی جیسے حکیم فرزانہ بھی تھے۔ ایک جگہ سرسید گلہ کرتے ہیں:

"ہمارے مکرم معظم جناب مولوی علی بخش خان بہادر سب جج گورکھپور نے اپنے رسالہ شہابِ ثاقب کے صفحہ ۴۴ میں لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ شیطان کے شاگرد ہوئے اور عمل آیۃ الکرسی کا اُس سے سیکھا (نعوذ باللہ منہا)۔

پس اے میرے بھائیو میں ملحد، مرتد، زندیق، کافر، کرسٹان، شیطان سہی مگر جو بات اچھی بتاؤں اور تمہارے فائدے کی کہوں، دل سوزی سے تمہاری ہمدردی کروں میری وہ بات کیوں نہ مانو۔ حضرت ابوہریرہؓ نے تو نعوذ باللہ شیطان سے نیک کام سیکھنے میں عار نہیں کی سبحان اللہ کیا شانِ اسلام رہ گئی ہے جو شخص ان باتوں پر یقین کرے وہ پکا مسلمان اور جو یہ کہے کہ میاں وہ حدیث ثابت نہیں یا وہ کوئی چور شیاطین الانس میں سے ہوگا تو نیچرلسٹ، کافر، کرسٹان"

علی گڑھ تحریک کا افسوں توڑنے کے لیے اخبار بھی جاری ہوئے اور مدرسے بھی قائم کیے گئے۔ بہت سے نیک دل لوگ واقعی محسوس کر رہے تھے کہ سر سید کا یہ نسخہ قوم کی شفا کا نسخہ نہیں بلکہ ہلاکت کا نسخہ ہے۔ اکبر کچھ روئے کچھ ہنسے اور بالآخر دکھ کے ساتھ کہا:

"ہائے فرعون کو کالج کی نہ سوجھی"

تہذیب الاخلاق اس عرصے میں اپنا کام کرتا رہا۔ کھانا کس طرح کھانا چاہیے، احباب سے کس طرح ملنا چاہیے، بحث مباحثے میں دوسروں کے نقطہ ہائے نظر کا احترام کیوں کر کرنا چاہیے یہ موضوع بھی تھے اور ان کے ساتھ ساتھ زبان، تعلیم، سیاسی بیداری اور نئی ایجادات جیسے اہم مسائل بھی ہوتے تھے غرض کہ اب قوم پر وہ مردنی نہیں چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی شکست کے بعد یک لخت چھا گئی تھی۔ سر سید کو خود اس کا احساس تھا چناں چہ لکھتے ہیں:

"اگرچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پرچے نے لوگوں پر بہت کچھ اثر کیا ہے مگر اتنا ضرور کہتے ہیں کہ کچھ تو اثر کیا ہے۔ ہماری قوم کے دل جو مردہ ہو گئے تھے اُن میں ایک تحریک تو ضرور آ گئی ہے"

ایک جگہ اپنے مذہبی خیالات کی حمایت میں لکھتے ہیں:

"میں تو اپنے تئیں بڑا حامیٔ اسلام سمجھتا ہوں۔
گو سارا زمانہ مجھ کو دہریہ کیوں نہ سمجھے"
نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من
نمی دانم زمنع گیر مطلب چیست ناصح را
دل از من، دیدہ از من، آستین از من، کنار از من"

یہ زمانہ ہنگاموں کے آغاز کا زمانہ تھا۔ سر سید کی پذیرائی بعض حلقوں میں ہوئی تو انھیں ملت کا نجات دہندہ بنا دیا گیا۔ تنقید ہوئی تو انھیں شیطان سے بھی بدتر ٹھیرایا گیا۔ لیکن وہ شخص

دشمن کا پکا تھا۔ قوم اگرچہ بیدار نہیں ہوئی تھی تاہم اُس کی تحریریں اُس کی رگ و پے میں اُتر چکی تھیں، تا آنکہ قوم کو کروٹ لیتا ہُوا چھوڑ کر یہ عظیم صحافی ۱۸۹۸ء میں خود ہی ابدی نیند سو گیا۔ رفتہ رفتہ اُس کے رفقا بھی اُس سے عالمِ بالا میں جا ملے اور صحافت کا پہلا دَور ختم ہو گیا۔ یہ دَور تھا سماجی طور پر اصلاح کا اور سیاسی طور پر صلح جوئی کا۔

باہر کی دُنیا پر ایک اور صحافی چھایا ہُوا تھا۔ سید جمال الدین افغانی یورپین نقادوں کی زبان میں پین اسلامزم کا مبلغ۔ برسوں حیدر آباد دکن، طہران، قاہرہ، لندن اور پیرس کے سیاسی اور علمی حلقوں میں تہلکہ مچاتا رہا۔ اخبار جاری کیے۔ جہاں گیا وہیں کی حکومت اُس کے خیالات کی متحمل نہ ہو سکی۔ دلّی سے لے کر استنبول تک اُس نے ایک دیپ مالا روشن کر دی جس کی روشنی اس برِاعظم کے مدرسوں اور خانقاہوں پر ایک مدت تک پڑتی رہی۔ صدیوں کے بعد لوگوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ آبنائے باس فورس پر بسنے والا مسلمان گنگا کے کنارے رہنے والے مسلمان کے ساتھ ایک ہی رشتے میں پرویا ہُوا ہے۔

سونے والوں کے لیے سوائے خواب دیکھنے کے اور کوئی مشغلہ نہیں ہوتا، لیکن جاگنے والوں کے لیے ہزار مصیبتیں ہیں۔ قوم سوئی ہوئی تھی تو دادِ عیش دے رہی تھی۔ جاگی تو اُس نے اپنے آپ کو خطرات میں گھرا ہُوا پایا۔ یورپ کے نئے نظریات، ہندو مت کا احیائے ثانیہ اور وہ بھی سوامی دیانند جیسے متعصب اور دریدہ دہن رہنما کی قیادت میں۔ عیسائیت حکومت کے جلو میں آ رہی تھی۔ مسلمان سیاسی جنگ انگریز سے ہار چکا تھا اور اقتصادی جنگ ہندو سے، اور اب اُسے خوف تھا کہ مذہبی جنگ بھی اِن نئے عناصر سے ہار جائے گا۔ اس خطرے کے احساس نے اُس کے عُلماء کو صحافت پر مجبور کیا۔ دیوبند، پٹنہ، امرت سر، دلّی، لاہور، قادیان اور حیدر آباد سے رسائل جاری کیے گئے۔ غرض کہ جگہ جگہ رسائل نکل آئے۔ کچھ علمی اور بلند پایہ کچھ مبتذل اور پھبتی باز۔ اِن میں کاتا صحیفہ جو مکھی لڑتا رہا تھا۔ مناظروں کا زور بندھا ہُوا تھا۔ پنڈت رام چند دہلوی، مولوی ثناء اللہ امرت سری اور پادری عبداللہ آتھم گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گھوم رہے تھے۔ حسن نظامی اور مولوی ثناء اللہ ان میں بڑے پائے کے صحافی تھے۔ جو لوگ مناظرے کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس فن میں علم کا دخل کم اور حاضر جوابی کا زیادہ ہوتا ہے۔ ہر مناظر عالم نہیں ہوتا اور ہر عالم مناظر نہیں ہوتا۔ مذہبی صحافت اپنی جگہ خوب مقبول ہوئی۔ یہ مسلمانوں کی دفاعی جنگ تھی۔ اس صحافت کے پروردہ عموماً اپنے نظریات میں شدت پسند، پھبتی کسنے میں ماہر اور دوسری اقوام کے ہادیانِ کرام کی خامیاں تلاش کرنے میں بے باک ہوتے تھے، اور اگرچہ یہ اوصاف اخلاقِ عالیہ کی نگاہ میں کم پسندیدہ ہوتے ہیں تاہم حفاظتِ دین کے لیے جس عصبیت کی ضرورت ہوتی اُسے پیدا

کرنے میں اُن کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ زیادہ اہم سیاسی مسائل توجہ کا مرکز بنتے گئے اور یہ دور ختم ہوگیا۔ اور یہ رسائل بھی اپنی دلچسپی کھو بیٹھے۔ صحافت کے بڑے دھارے کی یہ ذیلی شاخ تھی۔

سیاسی اقتدار چھن جانے کے بعد مسلمانوں کی توجہ زیادہ تر اصلاحِ رسوم پر مرکوز رہی، گو اہم سیاسی مسائل پر بھی اظہارِ خیال ہوتا رہا۔ سرسید کا انڈین نیشنل کانگرس کے عزائم کا جائزہ لینا اور زبان کے مسئلے پر ہندوؤں کے تعصب پر اظہارِ تاسف کرنا اس بات کا ثبوت ہیں۔ لیکن جب بیسویں صدی نے ورق اُلٹا تو اُفقِ عالم بھیانک بادلوں سے تیرہ و تار ہو رہا تھا۔ اقوامِ مغرب کی جوع الارض ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے قطعے ہضم کرنے کے بعد اور چمک اُٹھی تھی اور یورپ "ہل من مزید" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ بے محابا دولت اور خدا کے خوف سے لاپروائی جب ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں تو صفاتِ رذیلہ کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چناں چہ اس چھینا جھپٹی میں قوتوں کا باہمی ٹکراؤ ناگزیر نظر آ رہا تھا۔ ترکی کا ناتواں "یورپ کا مردِ بیمار" شمار ہو رہا تھا۔ ایران قاچاریوں کے نااہل ہاتھوں میں تھا۔ افغانستان کے اکھاڑے میں روسی اور انگریز بیک وقت اُترنا چاہتے تھے۔ عرب ممالک کاہلی اور بے حسی کا شکار تھے اور اُس سمندری گزرگاہ پر واقع تھے جو انگریزوں نے مالا کی طرح کرۂ ارض کے گرد لپیٹ رکھی تھی اور جس کے دانے دانے کو اُس کے ڈریڈناٹ شب و روز شمار کرتے رہتے تھے۔ اسلام کی عالمگیر برادری تتر بتر ہو چکی تھی اور اقوامِ مغرب کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے خون سے صلیبی جنگوں کے آخری معرکہ کو رنگین کرنے کا موقع آن پہنچا ہے۔

ان حالات کے اندر اُس برِ اعظم کی صحافت کے میدان میں تین شہ سوار اُترتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں۔ تینوں زبان اور قلم کے دھنی۔

ابوالکلام آزاد ان میں زیادہ تبحرِ علمی اور رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ خوش پوش اور خوش گفتار۔ عوام کے رہنما لیکن عوام اور اُن کے درمیان صرف اسلام مشترک۔ باقی اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، لکھنا پڑھنا سب رئیسانہ۔ امرتسر میں اُن کی صحافت کی ابتدا ہوئی، پھر کلکتے پہنچے۔ پہلے الہلال اور پھر البلاغ جاری کیا۔ دونوں صحیفے معیاری، مضامین عمیق، عبارت پُر شکوہ، ترتیب حسنِ مذاق کی دلیل، حلقۂ اثر وسیع۔

محمد علی انگریزی اور اُردو کے فقید المثال اہلِ قلم۔ انگریزی ایسی لکھتے کہ لنڈن ٹائمز رشک کرے۔ مزاج اتنا شُستہ و دلآویز کہ وائسرائے ہند اور اُن کی بیگم کو یہ پرچہ نہ ملے تو بے قرار ہو جائیں اور کامریڈ کے پرچے تحفتہً ولایت لے کے جائیں۔ انگریزی آکسفرڈ کے لب و لہجے میں بولتے، شکل ملاؤں کی سی رکھتے۔ نظریات ٹھیٹھ اسلامی۔ خدا اور رسولؐ کے

عشق میں بڑی بڑی خانقاہوں کے وارثوں سے آگے۔ کہا کرتے تھے مجھے ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری نے مسلمان کیا ہے۔ عادتاً سراسر عوامی۔ لاکھوں کے مجمع میں بے باکانہ گھس جائیں۔ تن پر کھدر، پیٹ خالی، سینہ جوش اسلام سے معمور، تہی دست لیکن سخی۔ مولانا عبدالحق کہا کرتے تھے کہ محمد علی لوٹتا تھا اور لٹاتا تھا۔ لاہور کا موچی دروازہ ہو یا لندن کا سینٹ جیمز پیلس، ایک سا بے باک و حق گو۔

ظفر علی خاں۔ سراپا آتش۔ انگریزی اور اردو دونوں پر قادر ہے۔ اردو ایسی کہ جس کا لوہا حسن نظامی اور سراج الدین سائل مانیں۔ زبان ایسی شعلہ بار کہ پنجاب کا فرعون صفت گورنر مائیکل ایڈوائر پناہ مانگے۔ محبت اور نفرت دونوں میں شدید، قصائد اور ہجویات میں یکساں قادرالکلام۔ اسلام کے شیدائی۔ نعت ایسی ڈوب کر لکھتے کہ اقبالؒ بھی سننے کی تمنا لے کر مکان پر آتے۔ عمر بھر میں صرف دو چیزوں میں مستقل مزاجی دکھلائی: اسلام کی دوستی میں اور انگریز کی دشمنی میں۔

یورپ کی آنے والی رستاخیز کے سائے دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے۔ اقبالؒ نے کہا،

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

مغربی اقوام کا پریس اور اُن کی خبر رساں ایجنسیاں جھوٹ تراشنے کی مشین بن کر رہ گئی تھیں۔ ترک مظالم کی زہرہ گداز داستانوں سے بلقان کی عیسائی اقوام کو بھڑکایا جا رہا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کے عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جا رہا تھا۔ طرابلس کے شہیدوں کا لہو اقبالؒ حضورِ رسالتؐ میں پیش کرتے ہیں۔ ابوالکلام، فاطمہ بنت عبداللہ کا مرثیہ نثر میں لکھتے ہیں۔ ظفر علی خاں یہاں کے مجبور و محکوم مسلمانوں کا پیغامِ وفاداری لے کر خلیفۃ المسلمین کے دربار میں استنبول پہنچتے ہیں۔ محمد علی ۲۷ گھنٹوں کی مسلسل محنتِ شاقہ کے بعد لندن ٹائمز کے جواب میں اور ترکوں کی حمایت میں ایسا معرکہ آرا مقالہ لکھتے ہیں کہ دلّی سے لندن تک انگریزوں کا پورا تانا بانا تھرّا اٹھتا ہے۔ مضمون کا عنوان تھا The Choice of Turks اس میں یورپ کے اُس جنگی اور سیاسی نقشے کو طشت از بام کیا گیا تھا جو مغربی اقوام کے نہاں خانۂ دل میں چھپا ہوا تھا اور وہ سازشیں جو اُن کے جی کی گہرائیوں میں پرورش پا رہی تھیں اُن کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ محمد علی کا یہ مقالہ اُتنا ہی ولولہ انگیز، عالمانہ، مدلّل اور سیر حاصل تھا جتنا کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا وہ مکتوب جو انھوں نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا اور جس کے نتیجے میں مرہٹوں

کا اُبھرتا ہُوا فتنہ ہمیشہ کے لیے سلا دیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک تحریر تھی ایک درویش کی اور دوسری ایک صحافی کی۔ درویش کی تحریر کامران و خوش انجام ہوئی، شاید اس لیے کہ اُس پر

"خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست"

کی کیفیت تھی اور صحافی عدالت کے کٹہرے میں پہنچا اور پانچ برس کے لیے زندان کی کال کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔ محمد علی نے لکھا تھا۔

If ever war was sudden it was the Balkan war. If ever war found a nation wholly unprepared it was the Turks in Oct. 1910. If ever war was absolutely unrighteous, it was the one waged by the Balkan allies. If ever sword was thrust into a people's hand it was thrust into the hands of Osmanlis on that occasion. If ever war was waged brutally it was waged by the robber hands of the Balkans ..... If ever a treaty was treated as a mere scrap of paper it was the Treaty of Berlin. And if ever a judge was guilty of gross partiality it was the Powers to whom Turkey appealed repeatedly in her need and appealed invariably in vain.

ابوالکلام کلکتہ میں، محمد علی دلّی میں اور ظفر علی خاں لاہور میں تھے۔ اس طرح پورا شمالی ہندوستان تین صحافیوں کی گرفت میں تھا۔ انگریز کے دبدبے کا طلسم توڑنے میں یہ اس حد تک بے باک تھے کہ ان کے راستے میں جو بھی حائل ہُوا مُسی سے اُن کی ٹھن گئی۔ جس پر انگریز دوستی کا شبہ گزرا وہی غدار ٹھہرایا گیا۔ ابوالکلام کو چھوڑ کر وہ اور ہی مزاج کے بزرگ تھے ظفر علی خاں اور محمد علی چاروں سمت لڑ رہے تھے۔ انگریز سے بھی اور رجعت پسند ہندو سے بھی، اپنوں سے بھی اور آپس میں بھی۔

محمد علی نے حسن نظامی کو قدِ آدم کارٹون کہا۔ حسن نظامی نے ظفر علی خاں کو بھک سے

اُڑ جانے والے مسالے کا انسان کہا جو قادر الکلام تھا لیکن قادر المزاج نہیں تھا ظفر علی خاں نے حسن نظامی پر پھبتی کسی:

صوفی بھی ہیں رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی
اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی
وہ کامیاب اگر ہیں اُس کا یہ بھید ہے
دنیا کے ساتھ اُڑاتے ہیں پتنگ بھی

گاندھی پر برسے تو کہا:

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اِک مکر کی اُٹھتی آندھی ہے

یہ فرماتا ہے گاندھی جی کا چرخہ — وفاداری کا کھدّر آج سے بُن
سُنی سابرمتی کی راگ مالا — تو کاشی نے بھی جھٹ چھیڑی وہی دُھن
سُنی تھی کس نے ان سارنگیوں کی
یہ رُوں رُوں رُوں رُوں - یہ پیں پیں پیں - یہ تُن تُن

آریہ سماجیوں نے عراق عرب میں اپنے مشنری بھیجنے کا فیصلہ کیا تو مولانا جھٹ پکار اُٹھے:

سنا ہے کہ اک آگرے کا مسافر
اُٹھائے ہوئے سر پہ ویدوں کے بستے
عراق عرب میں پہنچ کر پکارا
نمستے علیکم، علیکم نمستے
کبھی بھاؤ مہنگا تھا ہندو دھرم کا
ہیں لیکن اب اس جنس کے دام سستے
یہ وہ بل ہے کہ جس میں گھسا چاہتے ہیں
تمام اہلِ اسلام شُدھی کے رستے
مسخّر کریں گے عرب اور عجم کو
مہا بیر دَل کے گرانڈیل دستے
نہیں یوں ہی اِن کی تباہی پہ ہم کو
برس تین گزرے کمر کستے کستے

وغیرہ وغیرہ

محمد علی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے سے قبل لارڈ اروِن کے ساتھ چائے پی تو بیٹھے لیکن ظفر علی خاں نے ایک قیامت بپا کر دی۔ سر محمد شفیع اور اقبالؒ جب ایک ہی سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تو ظفر علی خاں نے اقبالؒ ہی کا ایک مصرعہ اُلٹ کر دونوں پر چسپاں کر دیا۔

ع این بہ پیری کود کے آں پیر در عہدِ شباب

مولانا ظفر علی خاں کا میدان کچھ تو حالات کی وجہ سے اور کچھ اُن کی اپنی اُفتادِ طبع کی وجہ سے زیادہ ہی گرم رہتا تھا۔ پنجاب میں ہندو پریس زیادہ منظم اور متعصب تھا۔ سراسر آریہ سماجی زہر میں بجھا ہوا۔ مہاشہ کرشن جیسے عمدہ مقالہ نویس اور نانک چند ناز جیسے بسیار گو شعرا کی قیادت اُسے میسّر تھی۔ پھر پنجاب کا پیر اور مسلمان زمین دار انگریز کا ضرورت سے زیادہ نیاز مند واقع ہوا تھا۔ اس لیے مولانا کی جنگ زیادہ شدید بھی تھی اور زیادہ محاذوں پر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اور یوں بھی جب امن چین ہوا کرتا تھا مولانا کا جنون فارغ نہیں بیٹھتا تھا۔

ع یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

جنگ آئی اور گزر گئی اور کرۂ ارض کا نقشہ دگرگوں کر گئی۔ ترکی کا مسئلہ مصطفےٰ کمال کے عروج نے حل کر دیا۔ عرب ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر تہذیب کے پھندے میں گرفتار ہو گئے اور یورپ کا دیو جنگ باز کچھ عرصے کے لیے زخم چاٹنے میں مشغول ہو گیا۔

اندرونِ ملک خلافت کا دور آیا، جلیانوالہ باغ اور مارشل لا کے دل دوز واقعات ہوئے۔ ہندو مسلم اتحاد ہوا اور دو برس کے بعد سنگھٹن کی ایسی آندھی چلی کہ اس اتحاد کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھر گئیں۔ نہرو رپورٹ، سائمن کمشن، گول میز کانفرنس کے ہنگامے پے بہ پے برپا ہوئے۔ نہرو رپورٹ پر مسلمان قوم پھر بٹ گئی اور اخبارات پھر چمک اُٹھے۔ محمد علی ایک جانب اور ظفر علی خاں دوسری طرف۔ نہرو رپورٹ ہندو ذہنیت اور سیاسی شعبدہ بازی کا عجوبہ تھی۔ اس سے بددل ہو کر محمد علی ہمیشہ کے لیے کانگرس سے رخصت ہو گئے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس آئی تو . . . . محمد علی حسین آزادی کی تلاش میں لندن گئے اور ایک نعرۂ حق کے بعد جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ مولانا آزاد کانگرس کا اٹوٹ انگ ہو کر رہ گئے اور ظفر علی خاں ہندستان کی سیاست کے بحرِ مواج میں یوں تیرنے لگے جیسے کشتی بغیر پتوار کے۔ یہ تینوں صحافی جب جوان تھے تو اُن کے اخبار بھی جوان تھے۔ جب یہ بوڑھے ہوئے تو ان کے اخبار بھی بوڑھے ہو گئے اور جب وہ مر گئے تو اُن کے اخبار بھی اُن ہی کے ساتھ مر گئے اور یوں صحافت کا ایک ایسا دور ختم ہوا جو طوفانوں کا دور تھا۔ اس دور میں قوم جاگی، اُبھری اور منزل چوں کہ متعین نہیں تھی اس لیے ہر راہ رو کے ساتھ تھوڑی دور چلی کبھی ٹھوکر کھائی کبھی سنبھلی۔ مولانا آزاد نے کہا مسلمان

چلتا نہیں بھاگتا ہے، رُکتا نہیں گر پڑتا ہے۔

یورپ کی صحافت کا گھریلو مسئلہ زیادہ تر صنعتی انقلاب کی پیداوار تھا۔ ہماری صحافت کا مسئلہ استعماریت کے ہاتھوں اقوامِ مشرق کا برباد ہونا تھا۔ وہاں دولت کی بے پناہ آمد اور اُس کی تقسیم صحافیوں کی توجہ کا مرکز تھی، کیوں کہ وہاں آزادی اور دولت تھی۔ یہاں کا مسئلہ غلامی اور افلاس سے رستگاری تھا، کیوں کہ ہم غلام بھی تھے اور مفلس بھی۔ وہاں کے صحافی کا قلم مذہب کی قبائے مقدس کے بخیئے اُدھیڑ رہا تھا اس لیے کہ نئے تقاضوں کا جواب اُن کے مذہب کے پاس نہیں تھا۔ ہمارا صحافی مذہب کے اور قریب آ رہا تھا اس لیے کہ غلامی کی زنجیروں کو اسی کی تندھی پگھلا سکتی تھی۔

اس صحافت سے قوم نے کیا پایا؟ قوم سراپا جوش تھی۔ منزل کا ادراک نہیں تھا لیکن آگے بڑھنے کی بے قراری تھی، برہمن کا طلسم ٹوٹ چکا تھا، انگریزوں کی ہیبت دلوں سے جا چکی تھی۔ سرسید کی صحافت دیا جلانے کا زمانہ تھا۔ اس دور کی صحافت اُس دیے کی لَو کے لپکنے کا زمانہ تھا۔ سیاسی طور پر وہ صلح جوئی تھی یہ تصادم تھا۔ یہ پورا دور اکبر کے ایک شعر میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے:

ہر چیز بگولا مضطر ہے اک جوش تو اُس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے بے چین سہی برباد سہی

مسلمانوں میں حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ اس سرائے کو لے کر قوم صحافت کے تیسرے دور میں داخل ہوئی۔ یہ زمانہ تھا انھیں بزرگوں کے شاگردانِ رشید کا۔ روزنامہ "انقلاب"، مہر و سالک کی قیادت میں نکلا۔ بحث و تمحیص میں زیادہ مدلل، لب و لہجے میں کم درشت اور زبان میں نسبتاً سادہ۔ نئے اور اہم مسائل اب زیادہ واضح صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ سراسر جوش کے بجائے سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا۔ اور اگرچہ مخالف پر پھبتی صحافت کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی اور یہ رسم علامہ مشرقی کے نزدیک ایسی لعنت تھی جسے ظفر علی خاں نے ایجاد کیا تھا۔ انقلاب بہ ظاہر رجعت پسند تھا لیکن بعض امور میں اس کی رائے صائب تھی خصوصیت سے نہرو رپورٹ کے ہنگامے میں اس کی پالیسی صراطِ مستقیم سے زیادہ قریب تھی۔

اس اثنا میں علامہ مشرقی ایک اخبار اور ایک تحریک لے کر سیاسی میدان میں آ گئے۔ کیمبرج کے فارغ التحصیل، بلند پایہ ریاضی دان، عربی اور فارسی پر عبور، طبیعت میں اکھڑپن، آرام اور آسائش کو تیاگ دینے کی بے پناہ صلاحیت۔ یہ تھے مشرقی۔ تحریک حد درجہ منظم، تحریک کا نام خاکسار لیکن بنیان مرصوص اخبار کا نام الاصلاح، لیکن لہجے میں تلوار کی کاٹ۔

ٹھنڈے مزاج کے لوگ تو مراعات، نشستیں، ملازمتوں میں نمائندگی، آبادیوں میں تناسب، ان سب کو سیاست کے دھرم کانٹوں میں تول رہے تھے لیکن مشرقی قوم کے تن بدن میں آگ لگا رہے تھے۔ نوجوان سر سے کفن باندھے خدمتِ خلق کے نشے میں چور، بیلچے اُٹھائے چپ و راست کرتے گلی گلی کوچے کوچے گھوم رہے تھے۔ تاآں کہ یورپ کی لادینیت اور زبردستی نے ایک مرتبہ پھر دنیا پر جنگ ٹھونس دی اور اقوام عالم آگ اور خون کے دریا میں کود گئیں۔ خاکساروں کا حکومت سے تصادم ہوا اور تحریک اور اس کا ترجمان "الاصلاح" چند ہچکولے کھانے کے بعد ختم ہو گئے۔ مسلمانوں نے مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنی منزل متعین کر لی۔ مہر و سالک رجعت پسند یونینسٹوں کے دامن سے وابستہ رہے اور بالآخر اسی پارٹی کے ملبے تلے کچلے گئے۔ مشرقی ایک مدت تک گنبدِ افلاک میں غلغلہ انداز ہونے کے بعد وادیٔ خموشاں میں پہنچ چکے تھے۔

نئے دور کے صحافی الطاف حسین اور حمید نظامی تھے۔ نوائے وقت اور ڈان معرض وجود میں آئے کچھ عرصہ بعد ان کے ساتھ پاکستان ٹائمز شامل ہو گیا۔ تقسیم ملک کا پرچار کچھ آسان کام نہیں تھا۔ اچھے اچھے اسلام دوست حضرات فیصلہ کرنے میں دقت محسوس کر رہے تھے کہ بٹے ہوئے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کس طرح محفوظ رہ سکے گا۔ لیکن تقسیم ملک سے قبل تقسیم قلوب کی ضرورت تھی اور اگرچہ یہ عمل ایک زمانے سے جاری تھا، دلوں میں خدشے ابھی باقی تھے۔ دونوں طرف سے پرجوش دلائل دیے جا رہے تھے قوم کے لیے یہ لمحہ بڑا نازک تھا۔ ہر فیصلہ کُن لمحہ قوموں کی زندگیوں کا سب سے کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ قوت انگریز کے پنجۂ اقتدار سے نکل چکی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ جوں کی توں یہ ہندو کی مٹھی میں منتقل ہو جائے۔ مسلمانوں کو اپنی بقا اسی میں نظر آتی تھی کہ وہ اس سیاسی اقتدار میں برابر کا حصہ دار ہو۔ ایک طرف قوت اور سازش تھی دوسری طرف عزم اور سیاست ایمان۔ بہر کیف یہ دونوں صحافی اور اُن کے ساتھ لاتعداد اور لکھنے والے ہندو پریس کے زہر کا توڑ بہم پہنچا رہے تھے۔ برطانیہ کی کانگرس پرست لیبر پارٹی کا پریس اکھنڈ بھارت کا پراپیگنڈہ کر رہا تھا اور یہ عجیب ماجرا تھا کہ انگریز اور امریکی صحافی ہندستان کا چند روزہ چکر کاٹ کر اور کانگرس کی میزبانی سے متمتع ہو کر واپس اپنے اپنے وطن پہنچتے تو گاندھی جی کی مہاتمائیت اور پنڈت جی کی لادینیت کے قصیدے ایک ہی زبان سے الاپتے پھرتے۔ اس زمانے کے مسلمان صحافی ہندو اور انگریز پریس کا مقابلہ کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب قائداعظمؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ڈان نے ہندو پراپیگنڈہ کا طلسم توڑ دیا ہے تو الطاف صاحب تو علاحدہ رہے ہم جیسے آخری صفوں میں لڑنے والے خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ایک جگہ فرمایا ہے ——————— بدو اسلام کا خام مسالہ ہیں۔ یہ تحریکیں جو پچھلی پون صدی میں اُبھرتی اور دبتی رہیں پاکستان کی عمارت کے لیے خام مسالہ تیار کرتی رہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہر تحریک قطع نظر اس سے کہ وہ خلافت کی تحریک ہو یا مسلم لیگ کی، احرار ہوں یا خاکسار، سرخ پوش ہوں یا نیلی پوش، قوم کی نشاۃ الثانیہ کی مختلف کڑیاں تھیں جس کا قوام مدت سے تیار ہوتا رہا تا آں کہ یہ خام مسالہ قائدِ اعظمؒ کے ہنرمند ہاتھوں میں پہنچا اور اپنی صحیح صورت میں متشکل ہوا۔

اس زمانے کی صحافت اُتنی عظیم نہ سہی لیکن ایک اعتبار سے زیادہ تاب ناک تھی۔ اس لیے کہ اسے ادراکِ منزل کی روشنی میسّر تھی۔ گویا پہلا دور صلح جوئی کا دور تھا، دوسرا تصادم کا اور یہ فتح مندی کا۔

پاکستان بنا تو صحافت چوتھے دَور میں داخل ہوئی۔ یہ دَور منطقی طور پر صحافت کے استحکام کا دَور ہونا چاہیے تھا۔ لیکن جس طرح پاکستان بننے کے بعد قوم کے خدوخال میں کچھ بدروئی پیدا ہو گئی اسی طرح صحافت اپنی صحیح صورت قائم نہ رکھ سکی۔ استحکام کی منزل ہمیشہ دشوار ترین منزل ہوا کرتی ہے، جو قوم ایک صدی سے جوش کے عالم میں جی رہی تھی اور جو ہر دس سال کے بعد بدیشی حکم رانوں سے متصادم ہو کر اپنے خون سے ملک کا کوئی نہ کوئی گوشہ گل رنگ کر جاتی اُسے ہوش کے کار بار میں لُطف ذرا کم آنے لگا حالاں کہ ہوش کے بغیر نہ صرف زندگی کی تزئین و آرائش ناممکن ہے بلکہ اس کی حفاظت بھی دشوار ہے۔ اب بیرونی مسائل کے ساتھ ساتھ داخلی مسائل کے حل کرنے کا وقت ہے۔ استحکام کے دَور میں صحافی اور قوم دوش بدوش چلا کرتے ہیں۔ صحافی رہبر بھی ہوا کرتا ہے اور مقتدی بھی۔ چوں کہ باقی سفر اب کندھے سے کندھا ملا کے طے کرنا ہوگا اس لیے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری اپنی دُکان کا پکوان پھیکا ہوتا ہے مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی عار نہیں کہ جو لوگ خالی خولی نعروں سے شخصیتیں تعمیر کرنے کی فکر میں ہیں اُن کا اندازِ فکر غلط ہے۔ اخبار کا اُچھالا ہوا نام جس کی تہ میں کوئی مثبت یا ٹھوس کام نہ ہو پانی کا ایک بُلبلہ ہے جو ندی کی سطح پر اُبھرا، قدم دو قدم تیرا اور پھر پھوٹ گیا۔ اخبار شخصیتیں بگاڑ تو شاید سکتے ہوں بنا نہیں سکتے۔ اپنی تعمیر آپ کو خود کرنی ہوگی۔

اس وقت پاکستانی سوسائٹی کے سامنے تین امور سب سے اہم ہیں۔

(۱) آزادی کی بقا کہ اس کے بغیر سب کچھ ہیچ ہے۔

(۲) دولت کی منصفانہ تقسیم کہ اس کے بغیر بعض کا ایمان وفورِ دولت کی نذر ہو جاتا

ہے اور بعض کا دین افلاس کے ہاتھوں غارت ہو جاتا ہے۔

(۳) سماج دشمن عناصر کا قلع قمع کہ اُس کے بغیر نہ دنیا میں چین ہے نہ عقبیٰ میں سرخروئی۔

جو صحافی بقائے وطن پر جان نہ چھڑکے وہ مجرم، جو امیر پاکستان کو باوا کی جاگیر سمجھ کر حرام حلال سمیٹنے میں مشغول ہو وہ مجرم اور جو حاکم سماج دشمن عناصر سے یارانہ گانٹھے ہوئے ہو وہ مجرم۔

شامِ ہمدرد، راولپنڈی
۲۹، نومبر ۱۹۶۶ء

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

دانش وروں، فن کاروں، ادیبوں اور عالموں کے لیے سب سے کٹھن گھڑی وہ آتی ہے کہ جب بچّوں سے بچّوں کی زبان میں انھیں لکھنا یا بولنا پڑتا ہے۔ عالمانہ مقالہ لکھنا، تحقیقی کتاب سپردِ قلم کرنا، نئے نئے افکار و خیالات کا اظہار کرنا، پُر مغز اور ولولہ انگیز تقریر کر لینا کہیں آسان ہے لیکن بچّوں سے بچّوں کی زبان میں بات چیت کرنا ایسا بھاری پتھر ہے جسے اکثر لوگ چوم کر چھوڑ دیتے ہیں —— اور بچّوں کے لیے شاعری کرنا، ان کے لیے ایسے شعر لکھنا اور نظمیں لکھنا کہ الفاظ دل میں اترتے چلے جائیں، وہ مفہوم سمجھتے جائیں اور شعر کے مقصد کی تہہ تک پہنچ جائیں، زیادہ مشکل بلکہ بہت زیادہ مشکل کام ہے۔

بچّوں کے لیے نظم و نثر لکھنے کی یکساں طور پر جو غیر معمولی صلاحیت مولانا اسماعیل میرٹھی میں تھی آج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کی جگہ خالی ہے، یہ مسند کسی سے پُر نہیں ہو سکی۔ ان کی لکھی ہوئی درسی کتابیں، ان کی دل میں اتر جانے والی نظمیں، ان کے میٹھے بول اُردو زبان و ادب کا گراں بہا سرمایہ ہیں اور بچّوں کے ادب کا لازوال شاہکار۔

موجودہ دَور میں یعنی گزشتہ ۲۵ - ۳۰ سال میں اس کٹھن اور نازک کام کو ہمارے کئی ادیبوں اور شاعروں نے بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ انجام دیا ہے۔ نثر نگاروں میں مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی کا نام ناقابلِ فراموش ہے۔ اور شعرا میں ابو الاثر حفیظ جالندھری، شفیع الدین نیّر اور ہمارے آج کے مہمان مقرر جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں —— ان حضرات نے بچّوں کے لیے جو اشعار لکھے ہیں اور جو نظمیں لکھی ہیں وہ اپنی تاثیر اور جاذبیت کے اعتبار سے ایک مستقل مقام رکھتی ہیں۔ اُردو ادب کی، خاص طور پر بچّوں کے ادب کی، جب تاریخ لکھی جائے گی تو اس بیش بہا سرمایۂ فن و ادب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

اپنی سطح سے بلند ہو کر باتیں کرنا یا فن کی تخلیق کرنا آسان ہے، لیکن اپنی سطح سے نیچے اُتر

کر باتیں کرنا یا فن کی تخلیق کرنا کارے دارد کا معاملہ ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اب تک اس طرف خاص توجہ نہیں کی گئی۔ یہ بہت بڑی بلکہ میں تو یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا ناقابلِ معافی خامی اور کوتاہی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب اس طرف ہمارے ادیب، دانش ور اور شاعر متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ فالِ نیک ہے۔ اور مجھے یقین ہے بہت مختصر مدت میں ہم بچوں کے ادب سے متعلق قابلِ ذکر اور قابلِ فخر سرمایہ مہیا کر لیں گے۔ یقیناً وہ بڑا مبارک دن ہوگا۔

اس سلسلے میں غیر مسلم ممالک سے قطع نظر اسلامی ممالک میں بڑا اچھا اور دقیع کام ہو رہا ہے۔ مصر اور ایران سے بچوں کا جو لٹریچر نثر و نظم کی صورت میں مسلسل اور متواتر شائع ہو رہا ہے وہ فکر آفرین بھی ہے، سبق آموز بھی اور معلومات افزا بھی۔ اس لٹریچر کو سامنے رکھ کر اور اس سے صحیح طور پر مستفید ہو کر ہم نژادِ نو کے لیے بڑا عمدہ سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں۔

ہمارے آج کے مہمان مقرر جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب مجموعۂ صفات و کمالات ہیں۔ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ علمی اور فکری موضوعات ان کی طبع رسا کی جولان گاہ ہیں۔ اُردو اور فارسی شاعری میں اُنھیں استادانہ دسترس حاصل ہے۔ اور ان گوناگوں خوبیوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب سے بھی وہ گہرا شغف رکھتے ہیں۔ چوں کہ نظم و نثر دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے۔ اس لیے اس محرومِ التفات صنفِ ادب کے لیے جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ ہماری قیمتی پونجی ہے۔ اور یہ امید بے جا نہ ہوگی کہ جناب تبسم صاحب اس پونجی میں برابر اضافہ کرتے رہیں گے۔

سید حکیم محمد سعید دہلوی

تعمیرِ ملک و ملّت میں بچّوں کے ایک ادیب کا کردار

جناب۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

ایک ادیب بچّے کے بارے میں کہتا ہے:

"بچّوں کا نیند سے بیدار ہونا ایسا ہے جیسے ننھی کلیاں کھل رہی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی تازہ روحوں سے خوش بوئیں فضا میں پھیل گئی ہوں۔ پرندہ چہچہاتا ہے، بچّہ تُتلاتا ہے لیکن نغمہ ایک ہی ہوتا ہے مبہم، دُھندلا، مدھم لیکن گہرے عمیق معنی میں ڈوبا ہُوا۔ لیکن پرندوں کے برعکس بچّے کے سامنے انسانی تقدیر کی وسیع اور گھمبیر وُسعتیں ہوتی ہیں۔ بالغ انسان اس تصوّر کے پیدا ہوتے ہی بچّوں کے مسکراتے ہوئے نغمے سنتا ہے اور ایک گہری سوچ میں کھو جاتا ہے۔

بچّوں کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مترنّم آوازیں ایک نہایت ہی پاکیزہ اور مقدّس نغمہ ہوتا ہے جو انسانی روح سے اُبھر کر فضا میں گونجتا ہے۔ لیکن بچّے کی اس سادہ معصوم سی زبان اور مبہم سے لہجے میں ایک دبا ہُوا احتجاج پنہاں ہوتا ہے اُن ذمّے داریوں کے بوجھ کے خلاف جو آئندہ زندگی اُس پر ڈالنے والی ہوتی ہے۔

اس کی مسکراہٹ اُن قوّتوں کا اظہار ہوتی ہے جو وہ فطرت کی طرف سے جبلّی انداز میں لے کر آتا ہے۔ اُن قوّتوں کی فتح مندی کا اظہار کہ جو اس کے دھندلے سے تصوّرات میں نمایاں ہوتی ہے۔ بچّہ روحانی فضاؤں کے اثرات جلو میں لیے آتا ہے اور بقول ورڈز ورتھ کے سالوں تک اُن روحانی فضاؤں میں کھیلتا چلتا پھرتا اور تگ و دو کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ زندگی کی دشوار راہیں اور تجربات کی شیریں تلخیاں آہستہ آہستہ ان فضاؤں سے دُور لے جاتی ہیں۔"

فطرت کے اس مفکّر شاعر کا جو خیال بھی ہو سو ہو، روحانیت کسی مرحلے پر زندگی کے میدان میں اس نوخیز اور نووارد مسافر کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی۔ یہ اس کے ہمراہ چلتی اور زندگی کے نشیب و فراز میں اُس کا سہارا بنتی رہتی ہے۔ اسی سے اس کی زندگی کے جسمانی اور مادّی پہلو نشو و ارتقا حاصل کرتے ہیں۔ اِس سے اُس کی شخصیّت کی تشکیل، تعمیل اور تکمیل ہوتی ہے۔ البتّہ اس کے لیے

ایک موزوں اور سازگار ماحول درکار ہوتا ہے۔ یہ ماحول اسے ماں کی گود، گھر کی چار دیواری اور درس گاہوں کی فضا اور سوسائٹی کا نظام عطا کرتا ہے جس میں یہ تمام چیزیں برابر کی شریک اور اس لیے برابر کی ذمے دار ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج کا بچّہ کل کا باپ ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی حیثیت خشتِ اوّل کی ہوتی ہے اور مثل مشہور ہے کہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ظاہر ہے کہ کسی بڑی تعمیر کے لیے بنیاد کا مضبوط ہونا لازمی ہوتا ہے اور اگر خشتِ اوّل ہی کج ہو تو دیوار ثریّا تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی زمین پر آگرے گی۔

لیکن بچّہ صرف بنیاد ہی کی اینٹ نہیں ہوتا، یہ اینٹ دیواروں، منڈیروں اور محرابوں میں بھی لگتی ہے، اسے عمارت کو صرف محکم کرنا نہیں ہوتا، اسے زیبا اور حسین و جمیل بنانا بھی ہوتا ہے۔ یہ صلاحیتیں اور استعدادیں بدرجۂ اتم موجود ہونی لازمی ہیں۔

خشتِ اوّل کو درست رکھنا والدین کا کام ہے، اسے دیواروں میں صرف کرنا اور کسی عظیم الشان عمارت کا بوجھ سہارنے کے قابل بنانا استادوں کا فرض ہے۔ اِن اینٹوں کی ساخت و ریخت، ان کا سنگھار اور زیبائش و آرائش اُن ہاتھوں کی قوّت ہے جن کے بل پر فن، ادب اور شعر سنورتے ہیں اور جنھیں عرفِ خاص میں فن کار کہا جاتا ہے۔ فطری اور جبلّی طور پر تمام فنون کا سرچشمہ ایک اور کم و بیش ان کا منصب بھی مشترک اور ایک ہی ہوتا ہے، اگرچہ ان کے اظہار کے ذرائع اور نتائج الگ الگ ہوتے ہیں۔

ہر فن کی اپنی اپنی لطافتیں اور نزاکتیں ہوتی ہیں لیکن ان لطافتوں اور نزاکتوں کا فہم و افہام جبلّی طور پر انسان کے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کسی تعمیری شاہکار کا حسن بچّے کی توجّہ کو اپنی طرف ضرور کھینچتا ہے لیکن تصویر کی دل کشی اس کے ذہن اور ہاتھوں کی دسترس کے قریب تر ہوتی ہے۔ شعر و نغمہ اسے آسانی سے مسحور کر لیتے ہیں۔ کہانیاں انھیں لوریاں دیتی ہیں، انھیں جھولا جھلاتی اور سُلاتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی اہمیت کی طرف بچّہ تو درکنار اکثر بالغ لوگ بھی توجّہ نہیں دیتے۔ لیکن بچّہ اُسے سمجھے یا نہ سمجھے اس کا ننھا سا ذہن پوری مستعدی اور ہوش مندی کے ساتھ ان سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ ننھا سا بچّہ جو کسی انڈے کے خول یا شکمِ مادر میں محصور ہو، کبھی بھی اس سادہ سی دیکھ بھال، نگہداشت اور پرورش کو نہیں سمجھ سکتا جو اسے ایک آنے والی عظیم زندگی کے لیے تیار کر رہی ہو۔ اس کے لیے اس تمام کار بارِ حیات کے اہتمام کا تصوّر کرنا بھی محال ہے۔ اور اگر

فطرت یہ احساس شعوری طور پر بچے میں نہ بھی پیدا کرے تو اس احساس بیداری اور اس کا شعور بڑوں میں جنم لیتا ہے، کیوں کہ ان کا یہ ہی منصب ہے۔ اور یہ بڑے سوسائٹی کے افراد میں اور سوسائٹی کے افراد میں والدین، اساتذہ، فن کار اور ادیب سب ہی شامل ہیں اور یہ لوگ اپنے فرائض منصبی کے اعتبار سے زیادہ ذمے دار ہیں۔

میں نے والدین، اساتذہ، فن کار اور سوسائٹی کے دوسرے اہم افراد کو جو بچّوں کی زندگی سے دُور یا نزدیک سے وابستہ ہوتے ہیں قطع نظر کر کے اپنے مضمون کو بچّوں کے ادب تک محدود رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیب ہیں شاعر بھی شامل ہیں، کیوں کہ شعر آخر ادب ہی ہوتا ہے شاعر یا ادیب کو زندگی کا ترجمان کہا جاتا ہے اور اس کی معنوی آفاقیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر اور ادیب کی نظر کائنات کے ہر گوشے پر پڑتی ہے لیکن ایسی دُور رس نظریں رکھنے والا انسان اپنے قرب وجوار سے کیوں کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ وہ جہاں عالم گیر انسانی برادری سے رشتہ جوڑتا ہے وہاں اسے گھر والوں کی طرف توجّہ کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ہر نیک کام کے لیے پہلے خویش اور پھر درویش کی ترتیب قائم رہتی ہے۔ اپنے ملک اور اپنی ملّت کا حق فائق ہوتا ہے اور جو اپنے کے حقوق نہ پہچانے وہ دوسروں کی کیا خدمت کر سکے گا۔

کوئی کام سر انجام دینا ہو اور وہ کتنا ہی مختصر اور آسان کیوں نہ ہو اس کے لیے پوری توجّہ، تن دہی اور جدّ وجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر کام کے ہزاروں پہلو ہوتے ہیں۔ کوئی فردِ واحد ان تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ ہر کام کے لیے تقسیم کار کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک گھر میں ایک بچّے کو دیکھیے۔ ماں اسے گود میں کھلاتی ہے۔ باپ اس کی آسائش کے سامان مہیّا کرتا ہے۔ بہن بھائی اس کے ساتھ کھیل کر میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کا دل بہلاتے ہیں۔ آیا اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ نانی امّاں کہانی سناتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کنبے کا کوئی واحد فرد یہ تمام کام نہیں سنبھال سکتا۔ اس کے لیے سب کا مل کر اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے منصب کے مطابق بوجھ اٹھانا لازمی ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی ایک ادیب تنہا یہ کام سر انجام نہیں دے سکتا۔ کسی اکیلے ایک شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ اس کام کے لیے سب کو متفقہ طور پر مل کر انجام دینا چاہیے۔

ماں باپ اور گھر والے زیادہ تر بچّے کے جسمانی نشو و نما کے ضامن ہوتے ہیں۔ استادوں کا کام علم کے ذریعے انھیں بصیرت عطا کرنا ہے۔ ادیب کا منصب ان کے ذہنوں کو جلا دینا ہے۔ یہ ذہنی تربیت انسانی کردار اور شخصیت کی تعمیر کے لیے مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔

گھر والے خون کے رشتے کی وجہ سے بچّے سے قطع نظر بھی کر سکتے ہیں۔ اساتذہ کی دل چسپی پیشہ وارانہ ہی کیوں نہ ہو دل چسپی ضرور ہوتی ہے لیکن ایک ادیب اور شاعر کے لیے یہ فرض شناسی

اس کے وسیع منصب سے آشنا ہوتی ہے اور وہ منصب سب سے پہلے ایک انسانی منصب ہے اور پھر قومی اور ملی منصب کہ جس کا احساس و شعور خود اس کی اپنی زندگی سے وابستہ ہے۔

جس طرح گھر والے کھلونوں سے چل کر مناسب غذا، عمدہ لباس اور دوسرے سامانِ سہولت اور آسائش مہیّا کرتے ہیں اس طرح شعرا اور ادیب بھی اپنی اپنی استعداد اور مطمحِ نظر اور عمقِ فکر کے انداز میں یہ ذہنی کھلونے، یہ سامانِ تفریح اور یہ لوازماتِ تربیت بہم پہنچا سکتے ہیں۔

چی چوں، چی چوں چاچا
گھڑی پہ چوہا ناچا
گھڑی نے ایک بجایا
چوہا نیچے آیا

کی بظاہر بے معنی نظم سے لے کر چین و عرب ہمارا، ہندستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا تک اور چڑیوں، چوہوں، بلیّوں، جنوں اور پریوں کی مافوق الفطرت کہانیوں سے چل کر پُر مغز نتیجہ خیز افسانوں تک سب کے سب ضروری ہیں۔ یہ سب بچّوں کے کھلونے ہی سہی لیکن مختلف عمر کے بچّے اپنی اپنی استعداد اور ذہنی سطح کے مطابق ان مختلف کھلونوں سے اپنی کائنات آباد کرتے ہیں۔ یہ اُن کی تفریح کی دنیا ہوتی ہے اور جس طرح کوئی کھیل محض کھیل نہیں اور کوئی تفریح فقط تفریح نہیں ہوتی اس کا ایک تربیتی پہلو بھی ہوتا ہے اسی طرح کوئی بے معنی نظم، کوئی فرضی قِصہ، کوئی پریوں کی داستان مقصد کے حصول سے خالی نہیں رہ سکتی بچّے اس کا اظہار پورے طور پر کر سکیں یا نہ کر سکیں لیکن ان کی توجّہ، دل بستگی اور انہماک، ان کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی مسکراہٹ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یوں بچّوں کا یہ طبعی تاثر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مناسب اور موزوں طریق سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ایک چھوٹا بچّہ ٹیلے وژن پر ایک معروف موسیقار کا گانا سن رہا تھا۔ غزل تھی لیکن دُھن کلاسیکی انداز کی تھی۔ گانے والی اپنی دل کش آواز کے ساتھ اپنے حسین بازوؤں اور ہاتھوں کے سُر ملا رہی تھی۔ اچانک بچّہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیشانی پر شکن پڑی ہوئی تھی۔ پوچھا گیا صاحب زادے کیا ہوا؟ کیوں اُٹھ کھڑے ہوئے؟ بے ساختہ بولا "ہونہہ! یہ گانے سے زیادہ نخرے کرتی ہے"

بچّہ چھوٹا تھا۔ لفظوں کی معنوی نزاکت پہچانتا نہ تھا نہ اُسے سُر تال کی خبر تھی لیکن اس کا طبعی شعور بدستور کام کر رہا تھا۔ موسیقی مجموعی طور پر اپنا اثر دکھا رہی تھی اور اسے موسیقار کے بظاہر بے معنی ہلتے ہوئے ہاتھ موسیقی کی اس اثر انگیزی میں حائل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

بچّوں کا اشیاء کا اِدراک اور اُن کا شعور بڑوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتا ہے اور وہ اس سے پورا اثر لیتے ہیں اور ہر تاثر اِن کی زندگی میں سرایت کر کے اس کی تشکیل میں ایک زبردست محرّک کا کام دیتا ہے۔ اس تیز تاثر سے فائدہ اُٹھانا اور اسے درست راہ پر لگانا ایسی ہی ہستی کا کام ہے جو خود اس تاثر کا پُتلا ہو ——— اور وہ ادیب و شاعر ہے۔

گھر والے ننھّے بچّوں کو کھلونا سمجھیں تو سمجھیں لیکن ایک زبردست شعور کا مالک شاعر اور ادیب یہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے نزدیک یہ کھلونے زندہ کردار ہیں۔ یہ "بچّے" تو اس کی نظروں میں بالغوں کی طرح چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی آواز اور اس کے اشاروں کو، وہ کتنے ہی مُبہم کیوں نہ ہوں، پہچانتے اور سمجھتے ہیں۔

بچّے بھی ان کی زبان اور قلم سے نکلے ہوئے الفاظ میں زندہ کرداروں کو دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی طرف اس توجّہ سے دیکھتے ہیں جس طرح وہ زندہ مخلوق کو۔ ان حالات کے پیشِ نظر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر خواہ وہ کتنا ہی عظیم ادیب اور شاعر کیوں نہ ہو بچّوں کو محض کھلونے سمجھ کر انھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھے اور انھیں مخاطب کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتا ہو۔

ادب و شعر کی سحر انگیزیوں سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ تاریخِ عالم کے اوراق گواہ ہیں کہ شعرا اور ادیبوں نے اپنی نظموں اور تحریروں سے قوموں میں بڑے بڑے حیرت انگیز انقلاب پیدا کیے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ انقلاب انگیزی صرف بالغوں اور بڑے بوڑھوں اور جوانوں کی بیداری کا باعث تھی۔ خیال کیجیے کہ وہ بچّے جن کے ننھّے کانوں میں ان ادبی شاہکاروں کی گونج پڑی ہو گی اور جن کی معصوم اور سادہ آنکھوں نے بڑوں کے جوشِ عمل کو دیکھا ہو گا وہ اس سے کیوں کر اثر قبول کیے بغیر رہے ہوں گے۔ آخر اپنے بڑوں اور بزرگوں کے نتائجِ اعمال کو سنبھالنے والے یہی ننھّے مُنّے ہی تو تھے جنھوں نے ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔

گزشتہ سال کی بھارت اور پاکستان کی جنگ میں قومی ترانوں، تقریروں اور دوسرے ادبی مظاہروں یہاں تک کہ خبروں کے نشر یہ انداز نے ہمارے بچّوں میں کس قدر قومی اور ملّی شعور کو بیدار کیا تھا۔ آخر یہ سب کچھ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے تھے جن کا جاری رہنا دوسرے نہج ہی پر سہی آج بھی ممکن اور ضروری ہے۔

شامِ ہمدرد، لاہور
یکم دسمبر ۱۹۶۶ ش

SHAM-I-HAMDARD PAPERS

1965–66

SHAM–I–HAMDARD

AN EDUCATIONAL, SCIENTIFIC AND CULTURAL FORUM,

providing a window on our traditions, religious thought and socio-economic philosophy

ہمدرد اکیڈمی، کراچی